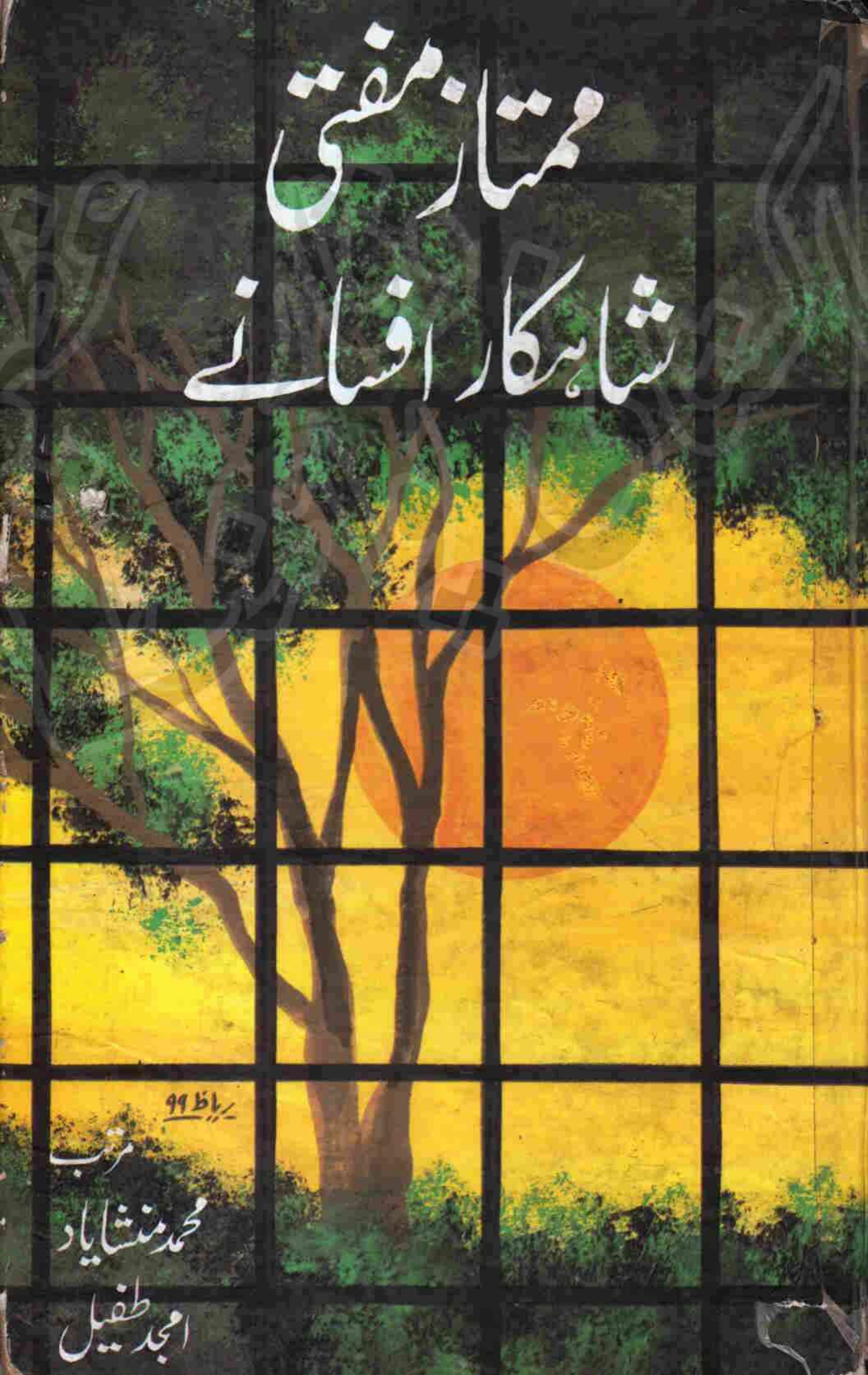

# ممتاز مفتی

# شاہکار افسانے

مرتب
محمد منشا یاد
امجد طفیل

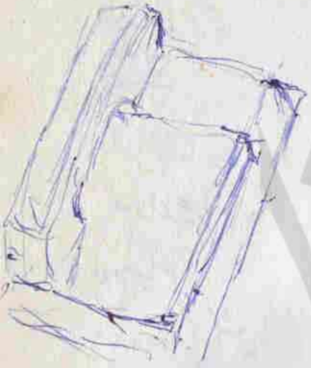

# فہرس

| | |
|---|---|
| ممتاز مفتی کی یادیں | 9 |
| جھکی جھکی آنکھیں | 19 |
| بیگانگی | 34 |
| آپا | 43 |
| نفرت | 54 |
| نیلی | 64 |
| چیپ | 79 |
| پل | 92 |

دوراہا 103
میاں کی مرضی 117
الصدف 129
راں ڑیاں 139
گھور اندھیرا 167
دودھیا سویرا 179
سُندرتا کاراکشس 196
باجوؤں کی ڈھونڈھ 208
کھل بندھنا 214
روغنی پتلے 226
ایلٹنیز 240
وقار محل کا سایہ 250
سمے کا بندھن 264
چکٹ گاڑی، ہونکتا موٹر اور موم بتی 274
عینی اور عفریت 282
دومونہی 292
کہانی کی تلاش 304
دیکھن دکھن 310
چوہا 318
بھول سے 324
آدھے چہرے 328
سبز پتا 342
ممتاز کی افسانہ نگاری (امجد طفیل) 354

# ممتاز مفتی کی یادیں

ممتاز مفتی صاحب کی یادوں اور باتوں کا سلسلہ نہایت طویل ہے۔ اور میرا سرمایہ حیات۔ میں انہیں ایک بہت بڑا ادیب مانتا' ان کی تکریم کرتا اور ان کی ذات سے محبت کرتا اور وہ بھی مجھے بہت عزیز جانتے بلکہ اپنے گھر کا فرد سمجھتے تھے۔ بعض اوقات علالت کی وجہ سے ڈاکٹروں اور گھر والوں نے کہیں آنے جانے پر پابندی لگا رکھی ہوتی مگر وہ مجھے ٹیلی فون پر کہہ دیتے کہ تم فلاں وقت آجانا میں تیار رہوں گا چپکے سے نکل چلیں گے۔ بعض اوقات طبیعت زیادہ خراب ہوتی درد ہو رہا ہوتا' جسمانی رطوبات کے اخراج کی نلکیاں اور تھیلیاں لگی ہوتیں مگر وہ تھیلیاں ہاتھ میں لٹکائے میرے ساتھ کسی ادبی اجلاس میں شرکت کرنے چل پڑتے۔ مگر محفل میں کسی کو اپنی تکلیف کا احساس نہ ہونے دیتے۔ اپنی دلچسپ باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے اور داد وصول کرتے رہتے۔ تنقیدی محفلوں میں اچھی بری ہر قسم کی شاعری پر خوب داد دیتے مگر افسانوں پر نپی تلی اور معقول رائے دیتے۔ نقاد حضرات پر فقرے بازی' تعارفی تقریبات میں عموماً اپنا مضمون اس جملے سے شروع کرتے۔ "صاحبو۔۔۔ میں نقاد نہیں ہوں۔ الحمدللہ کہ نہیں ہوں۔" تنقید اور تحقیق کو عملی کام ضرور سمجھتے مگر تخلیق کے مقابلے میں کم تر درجہ دیتے اور بڑے بڑے نامور دانشوروں اور نقادوں کو کوئی تخلیقی کام کرنے کا مشورہ دیتے رہتے۔ خواتین اہل قلم سے ان کی چھیڑ چھاڑ دیکھ کر ان کی بزرگی اور بڑھاپے پر رشک آتا اور معانقوں سے رقابت محسوس ہونے لگتی۔ مجھے ان کی مابعد الطبیاتی باتوں' اعتقادات اور روحانیت سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ مجھے قائل کرنے کے لیے خوب بحثیں کرتے۔ ایک بار انہوں نے مجھے جن بھوت دکھانے کا وعدہ بھی کیا مگر پھر ٹال گئے۔ میں نے اصرار کیا تو کہا کہ یہ بڑا تکلیف دہ راستہ ہے اور میں تجھے تکلیف اور مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

ممتاز مفتی نے بھرپور زندگی گزاری اور علالت کے باوجود آخری دم تک ذہنی طور پر بیدار اور تخلیقی اعتبار سے سرگرم اور توانا رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ذہنی اور تخلیقی توانائی کا ایک سبب ان کی زندگی گزارنے کا سادہ انداز تھا۔ ہر طرح کے حالات میں خوش طبعی اختیار کیے رکھتے۔ دوستوں' مداحوں اور ملنے والوں سے محبت اور بے تکلفی سے پیش آتے۔ ملنے والوں کو اکثر چائے پانی کا نہیں

پوچھتے تھے۔ ملاقاتیوں کی اتنی تعداد ہوتی کہ یہ ممکن ہی نہ ہوتا کہ ہر ایک کی تواضع کی جائے۔ پانی مانگو تو صرف پانی ہی ملتا لیکن اگر کبھی گھر والے از خود چائے بھجوا دیتے تو خوش ہوتے۔ البتہ ہومیو پیتھی کی دوائیں خود تجویز کرتے۔ بنا کر مفت دیتے بعض احباب کو خود گھر جا کر دے آتے۔

ایک روز مجھ سے جدید افسانے پر بحث کر رہے تھے۔ وہ مجھے جدید ماننے کے لیے کبھی تیار نہ ہوئے۔ کہتے تمہارے افسانے تو میری سمجھ میں بھی آجاتے ہیں پھر تم کہاں کے جدیدیے ہو۔ لیکن آپ جانتے ہیں کوئی بھی شخص خواہ وہ کتنا ہی پیوست زدہ اور روایت پسند ہو، پرانا اور قدامت پسند کہلوانا پسند نہیں کرتا۔ مگر وہ میری ایک بات نہ سنتے۔ میں اپنے اور جدیدیت کے حق میں دلائل دیتا اور زیادہ زچ کرتا تو کہتے۔ ”اچھا جا اپنا سر کھا۔“

ایک روز کہنے لگے۔ مجھے آٹھ دس جدید افسانے چن کر دو میں پڑھ کر دیکھوں۔ میں نے ان کی خواہش پوری کر دی۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے اطلاع دی کہ جدید افسانے پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا ہوں اور میں نے بھی ایک جدید افسانہ لکھا ہے۔ اسے حلقہ ارباب ذوق میں پڑھوانے کا انتظام کرو اور سارے جدید افسانہ نگاروں اور ناقدوں کو بلاؤ تاکہ مجھے اندازہ ہو کہ میرا یہ تجربہ کیسا ہے۔ میں نے ان کی یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ اور انہوں نے حلقہ کی ایک پر ہجوم محفل میں اپنا پہلا اور آخری جدید افسانہ پڑھ کر سنایا۔ حاضرین نے دل کھول کر داد دی۔ اہل نقد و نظر نے علائم و رموز کی مختلف پرتیں دریافت کیں۔ اور ایسی ایسی انوکھی توجیہات اور مطالب بیان کیے کہ ممتاز مفتی کی باچھیں کھل گئیں۔ مگر جب اہل حلقہ ان کے فنی ارتقا اور نئے اسلوب افسانہ نگاری کی تعریف کر چکے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے بتایا کہ مفتی صاحب جدید افسانے سے ہاتھ کر گئے ہیں اور یہ افسانہ جس کی آپ اس قدر تعریف و توصیف کر رہے ہیں، آٹھ دس افسانوں کے مختلف ٹکڑے جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ مگر اس سلیقے اور طریقے سے کہ معلوم پڑے یہ ایک ہی شخص کا لکھا ہوا افسانہ ہے۔

آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دور دور کی کوڑی لانے اور انوکھے انوکھے علامتی مفاہیم و مطالب دریافت کرنے والے نقادوں اور ایک ہی طرح کی ڈکشن میں ایک ہی جیسے افسانے لکھتے چلے جانے والے جدید افسانہ نگاروں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنا بڑا اور سینئر افسانہ نگار اس قسم کا عملی مذاق کرے گا۔ مگر ایسی ہی شوخیاں، خوش طبعیاں انہیں اندر سے جوان اور تازہ رکھتی تھیں اور ہم جیسے لوگوں کو بھی حوصلہ دیتی تھیں۔

ممتاز مفتی اردو فکشن کا ایک عہد تھے۔ ان کا عظیم اور ضخیم ناول ”علی پور کا ایلی“ 1961ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ناول سینکڑوں افسانوں کے مواد پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ”الکھ نگری“ میں ان گنت افسانوں کا مواد موجود ہے۔ یعنی اگر وہ یہ ناول یا آپ بیتیاں نہ لکھتے اور اس سارے مواد کو افسانوں کی صورت میں پیش کرتے تو ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد کئی گنا زیادہ ہوتی۔ اب ان کے آٹھ افسانوی مجموعے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

1- ان کہی (1943ء) 17 افسانے

2- گہما گہمی (1944ء) 15 افسانے

3- چپ (1947ء) 15 افسانے

4- اسمارائیں (1952ء) 17 افسانے

5- گڑیا گھر (1965ء) 14 افسانے

6- روغنی پتلے (1984ء) 18 افسانے

7- سمے کا بندھن (1987ء) 19 افسانے

8- کہی نہ جائے (1992ء) 20 افسانے

اس طرح ان کے 135 افسانے کتابی صورت میں موجود ہیں۔ ان کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ جن میں پہلے سات مجموعے ”مفتیانے“ کے نام سے شائع ہونے والے ان کے کلیات میں شامل ہیں۔

ممتاز مفتی اردو افسانے کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ انہوں نے افسانہ نگاری کے فن میں سب سے مختلف اور منفرد روش اختیار کی۔ بقول ان کے انسانی شخصیت کی گھمن گھیریوں کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ یہ نہایت دلچسپ، نازک اور وسیع میدان تھا اور ممتاز مفتی خوب کھل کر کھیلتے اور کامیابیاں حاصل کرتے رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ موضوع بھی پھیلتا اور زمانے اور ماحول کی تبدیلی کی وجہ سے نازک تر ہوتا گیا۔ سیدھے سادے آپا سجادہ کی طرح کے کرداروں کی جگہ دو موہنے بلکہ کئی کئی مونہوں اور چہروں والے کرداروں نے لے لی۔ وہ خود بھی قصبے سے نکل کر بڑے اور جدید شہروں میں آ بسے۔ افسانے کے فن میں کئی طرح کی تبدیلیاں، تحریکیں اور رجحانات در آئے مگر ان کا فن کہیں رکا یا جامد نہیں ہوا۔ وقت کے ساتھ ان کے فن میں ارتقاء کا عمل برابر جاری رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر عہد کی نوجوان نسل سے نہ صرف ذاتی رابطہ اور تعلق رکھتے تھے بلکہ ان کی تحریریں پڑھتے اور پسند کریں نہ کریں ہر قسم کے اسلوب اور طرز اظہار سے واقفیت رکھتے تھے۔ وہ محفل پسند، ملنسار اور کثیر الاحباب تھے۔ نئے پرانے لکھنے والوں اور والیوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ کسی کی کتاب کا فلیپ یا دیباچہ لکھ رہے ہیں کسی کو کم لکھنے پر ڈانٹ رہے ہیں کوئی ان کا انٹرویو کرنے آیا ہے کسی کو خاکہ لکھنے کی خاطر بٹھا کر سوال جواب کر رہے ہیں کوئی اپنی یا کتاب کی تعریف سن کر پھولے نہیں سماتا کسی کو کوئی فضول تحریر یا کتاب رکھنے پر پیار بھری گالیوں سے نواز رہے ہیں۔

خواتین کی وہ بہت اچھی اور ہم راز سہیلی ثابت ہوئے نہ صرف دکھ سکھ بانٹتے اور مشورے دیتے بلکہ ہر طرح کی مدد بھی کرتے کئی ایک لڑکیوں کی شادیوں کا اہتمام اور انتظام کیا کئی گھر اجڑنے سے بچائے۔ ان کی زندگی کی اپنی اتنی کہانیاں ہیں کہ انہیں بیان کرنے کے لیے دفتر چاہیے۔

عام طور سے ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں قالین پو بیٹھ کر لکھتے۔ اگلے پہر لکھتے، پچھلے پہر میل ملاقاتیں کرتے۔ چھاپہ خانوں اور کمپوٹر کے ردی کیے ہوئے بڑے بڑے صفحات کی پشت پر موٹے موٹے حروف میں لکھتے۔ نوے سال کے لگ بھگ عمر میں بھی نظر کا چشمہ نہیں لگاتے تھے اور اسے کسی بزرگ کے سرے کی کرامت اور برکت بتاتے اور ایک لمبی کہانی سناتے۔ پڑھنے کے لیے عبارت ہوئے لفظوں میں لکھتے اور مناسب روشنی کی ضرورت محسوس کرتے۔ کاغذ کے حاشیوں پر بھی تیروں کے نشانات دے کر بہت کچھ لکھا ہوتا۔ اور خوش خط لکھتے اور نہایت بلند آواز میں لفظوں پر زور دے دے کر پڑھتے اور ایک ایک جملے پر داد وصول کرتے۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ آخری عمر میں بھی گھر کا خرچہ پورا کرنے کے لیے انہیں ریڈیو کے سکرپٹس اور بعض رسائل کے لیے مضامین وغیرہ لکھنا پڑتے تھے۔ کیونکہ پنشن اور کتابوں کی رائلٹی ناکافی تھی۔

گھر کے اندر دو گھر تھے۔ ایک ان کے بیٹے، بہو اور لوگوں کا اور دوسرا ان کا اپنا جس میں ان کی بیوی، ملازمہ اور شادی سے پہلے کی بیٹیاں شامل تھیں۔ وہ اپنے گھر کا خرچ خود اٹھاتے تھے۔ مکان ان کے نام تھا اور اس کا کرایہ بیٹے کے دفتر کی طرف سے ان کو ملتا تھا مگر سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے قلم کی مزدوری کرنا ضروری تھا۔

مفتی صاحب سے میری پہلی ملاقات حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کے کسی اجلاس میں ہوئی وہ مزے لے لے کر اپنا کوئی طویل افسانہ سنا رہے تھے اور شعروں کی طرح جملوں پر داد و تحسین وصول کر رہے تھے۔ پھر جب میں نے اسلام آباد میں حلقہ ارباب ذوق قائم کیا تو ان سے رابطہ اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ نہ صرف خود حلقے میں افسانے پڑھتے بلکہ قدرت اللہ شہاب صاحب بھی اپنے مضامین پڑھنے کے لیے ان کے ہمراہ حلقہ میں آنے لگے۔ لیکن ان سے ایک تفصیلی ملاقات 1975ء میں ان کے گھر پر ہوئی جب میں مظہر الاسلام کے ساتھ پہلی بار ان کے گھر گیا۔ وہ احمد بشیر کے ساتھ لان میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ بڑی محبت سے ملے اور ملتے رہنے کی تاکید کی۔ اور بالآخر ان سے دوستی اور محبت کا رشتہ گہرا ہو تا گیا۔ اس وقت تک ان کے پانچ افسانوی مجموعے چھپ چکے تھے مگر 1965ء کے بعد کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ بے شمار چھپے ہوئے افسانے ادھر ادھر پڑے تھے۔ میں نے ان سے کئی بار اصرار کے ساتھ تقاضا کیا کہ وہ اپنے افسانوں کا مجموعہ مرتب کریں۔ مگر وہ ان دنوں لبیک کی مقبولیت کے ایسے نشے میں تھے کہ افسانوں کے مجموعے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ ڈاک سے انہیں ہر روز عام قارئین کی طرف سے لبیک کی پسندیدگی کے بہت سے خطوط ملتے رہتے تھے۔ بہرحال میں ان سے ایک مجموعہ "روغنی پتلے" مرتب کرانے اور چھپوانے میں کامیاب ہو گیا۔ کتاب کے کنٹریکٹ کے بارے میں خاصے فکر مند رہتے۔ انہوں نے کنٹریکٹ بنا کر دستخط کر کے مجھے دے دیا اور سارا کام مجھ پر چھوڑ دیا۔ ان دنوں میری کتابیں زاہد ملک کے مکتبہ حرمت سے شائع ہو رہی تھیں۔ میں نے یہ کتاب بھی ان کو دے دی اور ایک روز چھپی ہوئی کتاب کا پیکٹ لے کر حاضر ہوا۔ یہ 1984ء کی بات ہے کتاب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے ایک جلد اپنے لیے مانگی مگر انہوں نے کہا۔ "ابھی نہیں۔ میں ذرا دیکھ پڑھ لوں۔" مگر جب میں گھر پہنچا تو تھوڑی دیر بعد ان کا ٹیلی فون آیا کہ میں تمہارے ہاں آ رہا ہوں۔ میں سمجھا کہ کتاب کی چھپائی میں کوئی بڑی کوتاہی ہو گئی ہے تھوڑی دیر بعد وہ سکوٹر پر میرے گھر آ گئے۔ پتہ چلا کہ مجھے کتاب دینے آئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ جب تھوڑی دیر پہلے میں نے خود مانگی تھی تب کیوں نہ دی۔ کہنے لگے یار یہ بھی کوئی طریقہ ہوتا کتاب دینے کا۔

"روغنی پتلے" کی اشاعت سے انہیں تحریک ہوئی۔ اور انہوں نے افسانوں کے مزید مجموعے مرتب کرنے کی طرف توجہ دینا شروع کر دی اور ادبی حلقوں اور ادبی ایڈیشنوں میں ان کی افسانہ نگاری پر رکی ہوئی بات دوبارہ چل نکلی۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی کو ادبی طور پر بیدار، فعال اور زندہ رکھنے میں روزنامہ جنگ راولپنڈی کے ادبی ایڈیشن اور مظہر الاسلام کا بھی بہت حصہ ہے۔ ان کی بعض کتابیں شائع کرانے میں کرنل ڈاکٹر ابدال بیلا نے بہت مدد دی۔

پھر پروین عاطف بھی اسلام آباد آ گئیں اور مفتی صاحب کے ساتھ ہماری خوب محفلیں جمنے لگیں۔ اس دوران ایک دلچسپ واقعہ ہوا حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کے سالانہ الیکشن تھے۔ اکبر حمیدی بلامقابلہ سیکرٹری ہونے والے تھے کہ ادب اور ادبی انجمنوں کا کاروبار کرنے والے ہمارے دوست غضنفر مہدی نے ایک چال چلی اور الیکشن افسر انور بیگ اعوان کو اعتماد میں لے کر اختر امان کو بھی سیکرٹری کے عہدہ کے لیے کھڑا کر دیا۔ کاغذات نامزدگی کی تاریخ گزر چکی تھی مگر الیکشن افسر نے اس میں از خود توسیع کر دی اور اختر امان کے کاغذات شامل کر لیے گئے۔ ہم لوگوں نے احتجاج کیا کہ یہ ضوابط کی خلاف ورزی ہے مگر اس کی مختلف تاویلیں کر کے اکبر حمیدی اور اختر امان کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لا کھڑا کر دیا گیا۔ بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ ممتاز مفتی اور پروین عاطف نے کھلم کھلا اعلان کر دیا کہ وہ اکبر حمیدی کو ووٹ دیں گے۔ اختر امان کے پولنگ ایجنٹ بھی غضنفر مہدی تھے۔ جب ممتاز

مفتی ووٹ ڈالنے آئے تو انہوں نے اکبر حمیدی کے نام پر مہر لگاتے ہوئے اعلان کیا کہ میں اکبر حمیدی کو ووٹ دے رہا ہوں۔ اس پر غضنفر مہدی کی سازشی رگ پھڑکی۔ اس نے الیکشن افسر سے کہہ کر مفتی صاحب کا ووٹ کینسل کرا دیا کہ انہوں نے اس کا اعلان کیوں کیا ہے۔ ہم لوگوں کا موقف تھا کہ ووٹ کو خفیہ ووٹر کے تحفظ کے لیے رکھا جاتا ہے لیکن اگر وہ اعلان کر کے ووٹ ڈالے یا ڈالنا چاہے تو اس سے ووٹ کینسل نہیں ہوتا مگر الیکشن افسر جانبدار تھے۔ انہوں نے اپنا کاسٹنگ ووٹ بھی اختر امان کے حق میں ڈالا اور اس طرح اس ادبی حلقے کے الیکشن میں پہلی بار دھونس اور دھاندلی سے کام لیا گیا اور اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ مفتی صاحب کو اعلانیہ ووٹ ڈالنے کی پاداش میں مخالف گروپ کی طرف سے برا بھلا بھی کہا گیا اور جس کو انہوں نے دھڑلے سے ووٹ ڈالا تھا' وہ بھی ناخوش تھا کہ اس طرح ووٹ ڈالنے کا کیا فائدہ۔ کچھ عرصہ بعد اختر امان کی دفتر کی طرف سے لاہور تبدیلی ہو گئی۔ وہ بانی رکن کی حیثیت سے حلقہ کا چارج مجھے دے گئے۔ میں نے نوے دن میں الیکشن کرانے کا اعلان کیا اور واقعی نوے دن میں الیکشن کرا بھی دیئے۔ اکبر حمیدی سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ ممتاز مفتی صاحب نے اکبر حمیدی کو حلقہ کے پروگراموں کے بارے میں ایک خط لکھا۔ مگر اکبر حمیدی نے ان کے خط کا جواب نہ دیا۔ اس پر وہ مشتعل ہو گئے۔ وہ کسی کو خط لکھیں اور جواب میں خط یا ٹیلی فون نہ آئے۔ یہ وہ کبھی برداشت نہ کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے سخت گلہ کیا اور اکبر حمیدی کے خلاف اخبار میں کالم یا مضمون لکھنے کی دھمکی دی۔ میں نے بیچ بچاؤ کرایا مگر اس کے بعد اکبر حمیدی بھی ان سے خفا رہنے لگے۔

کچھ عرصہ پہلے اسلام آباد میں "سلسلہ" نام کی ایک گھریلو ادبی تنظیم تھی جس کی کرتا دھرتا ادا جعفری تھیں۔ اس کے اجلاس باری باری ہر رکن کے ہاں ہر مہینے ہوتے تھے اور بیگمات بھی ایک ایک ڈش کے ساتھ شامل ہوتی تھیں۔ اسے بیوروکریٹس کی تنظیم سمجھا جاتا تھا۔ جب ادا جعفری کراچی منتقل ہو گئیں تو ممتاز مفتی' پروین عاطف اور میں نے ایک ایسی ہی ادبی تنظیم کی ضرورت محسوس کی جو بیوروکریٹس تک محدود نہ ہو اس میں اچھے ادیب' شاعر ہر مہینے شامل ہوا کریں۔ میں نے اس کا نام "رابطہ" تجویز کیا۔ مفتی صاحب نے اس کا آئین لکھا اور مجھے اس کا انچارج بنایا۔ رابطہ کے حوالے سے بعد میں ہمارے درمیان کئی بار اختلافات اور ناراضیاں ہوئیں۔ کبھی کسی کو ممبر بنانے یا ممبر نہ بنانے پر کبھی اجلاس میں تاخیر ہو جانے پر اور کبھی آئندہ اجلاس کا میزبان مقرر کرنے پر۔

جب زیادہ ناراض ہو جاتے تو مجلس عاملہ یا جنرل باڈی کی میٹنگ بلوا لیتے اور میرے کسی اقدام کو رد کرنے کی کوشش کرتے۔ میں بھی ڈٹ جاتا۔ کبھی وہ مستعفی ہونے کی دھمکی دیتے۔ کبھی میں استعفیٰ دے دیتا۔ مگر ہم ایک دوسرے کے بغیر نہ رہ سکتے۔ جلد ہی صلح صفائی ہو جاتی۔ جب کبھی

ناراض ہوتے مجھے مخاطب کرتے ہوئے میرے نام کے ساتھ صاحب یا جناب کا اضافہ کر دیتے۔ کبھی مجھے معلوم ہوتا کہ ناراض ہیں اور کبھی ان کے رویے سے اندازہ ہو جاتا۔ ناراض ہوتے تب بھی نئی کتاب چھپ کر آتی تو ضرور بھجواتے۔ مگر اس پر لکھی تحریر سے پتہ چل جاتا کہ ناراض ہیں۔ جب تعلقات کشیدہ نہ ہوتے' کتاب پر لکھے گئے حرف حرف سے محبت کا شہد ٹپکتا۔ ان کی کتابوں پر ان کے ہاتھوں کے لکھے لفظوں کو دیکھتا ہوں تو جی بھر آتا ہے۔ آپ بھی ان کی محبتوں اور ناراضیوں کے مناظر دیکھئے۔

1- لبیک--- نئے ساتھی محمد منشے کے لیے--- ممتاز مفتی' مئی 1975ء
2- روغنی پتلے--- مستقبل کے بڑے افسانہ نویس منشایاد کے لیے--- ممتاز مفتی' 11-11-84
3- علی پور کا ایلی (نیا ایڈیشن)--- منشایاد کے لیے جو اپنے مقام سے بے خبر ہے۔ 29-10-85
4- اوکھے لوگ--- پیارے منشایاد کے لیے' 25-7-86
5- رام دین--- منشایاد کے لیے' 10-3-87
6- ان کہی--- منشایاد--- ممتاز مفتی' 28-6-88
7- مفتیانے--- منشایاد--- جس سے میں جلتا ہوں' 15-12-89
8- اسمارائیں--- منشایاد۔ جس سے میں ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوں۔ (ضرورت منشایاد کی' میری نہیں) 4-3-93
9- الکھ نگری--- وہ صراط مستقیم ہے یہ کتاب ایک پگڈنڈی۔ صاحبو میرا حوصلہ دیکھو کہ میں پانچ سو روپے کا زیاں کر رہا ہوں۔ منشایاد کی نذر' 10-12-92
10- اور اوکھے لوگ--- منشا کا بچہ--- دال کا کچا--- و یکھن میں ڈھلا--- لکھن میں باگڑبلا' 15-7-91
11- گڑیا گھر--- مکرمی منشایاد صاحب کی نذر--- ممتاز مفتی' 11-8-93
12- ہندیاترا--- مکرمی منشایاد کی نذر' 11-8-93
13- کہی نہ جائے--- منشو--- مفتی' 15-7-92
14- چپ--- ایوان افسانہ کا صدر دروازہ جناب منشایاد کی نذر' 19-11-93
15- نظام سقہ--- صاحب جائزہ جناب منشایاد کے لیے--- 23-8-93
(اس کتاب میں میرا ایک مضمون بعنوان "جائزہ" شامل تھا۔)

ان کی آخری کتاب "تلاش" ان کے بعد شائع ہوئی جس پر محبت' خفگی یا ناراضی کا کوئی حرف نہیں اور مجھے بہت خطاپن کا احساس ہو رہا ہے۔

کبھی کبھی میں انہیں چھیڑتا کہ آپ خواتین کے بارے میں بڑا نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ کہتے کہ عورت خدا کا عظیم تحفہ ہے عورتوں کے پسینے کی خوشبو کا بھی کچھ ذکر کیا کرتے اور جس عمر میں وہ اب تھے، وہاں کم سنی ہی عورت کا سب سے بڑا حسن تھی۔ اور پچاس ساٹھ سال کی عورتیں بھی انہیں لڑکیاں معلوم ہوتی تھیں اور وہ انہیں کڑی کہہ کر خوش کرتے۔

ایک بار ایک معروف افسانہ نگار نے میری معرفت انہیں اپنی کتاب بھجوائی۔ دوسرے تیسرے روز ٹیلی فون آیا کہنے لگے۔ یار یہ خاتون کیا لکھتی ہے۔ بڑے واہیات افسانے ہیں۔ کیا کہنا چاہتی ہے۔ مجھے تو بالکل پسند نہیں آئی کتاب۔ بڑی خشک اور بور تحریر ہے۔

چند روز بعد ایک تقریب کے آخر میں جب چائے پی جا رہی تھی، میں نے اس خاتون کا مفتی صاحب سے تعارف کرایا۔ خاتون نے عقیدت اور احترام کا اظہار کیا۔ میں انہیں باتیں کرتے چھوڑ کر ادھر ادھر چلا گیا۔ جب میں دوبارہ مفتی صاحب کے پاس آیا تو وہ اس خاتون افسانہ نگار سے کہہ رہے تھے۔ ”بڑی باکمال افسانہ نگار ہو۔ ایسی اچھوتی اور خوبصورت باتیں، تمہیں سوجھتی کیسے ہیں؟ کیا انداز بیاں ہے۔ واہ واہ۔“ خاتون جھینپ رہی تھی اور انکساری کا اظہار کر رہی تھی اور مفتی صاحب تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے۔ میں نے کان میں کہا۔ اس روز تو آپ کچھ اور فرما رہے تھے۔ بتا دوں۔ بولے۔ ”تو بکواس نہ کر۔ جا کر چاٹ، سموسے کھا میرا سر نہ کھا۔“

بعد میں مجھے کہا۔ ”تجھے پتہ نہیں ہے عورتوں سے کیسے پیش آنا چاہیے تو پینڈو اور گنوار ہے۔ پتہ نہیں اتنے اچھے افسانے کیسے لکھ لیتا ہے۔“

دوسری بہت سی خواتین کی طرح میری بیوی سے بھی بے تکلفی تھی۔ وہ اس کے کھانے کی تعریفیں کرتے اور میرے خلاف اسے بھڑکاتے رہتے وہ ہنستی رہتی۔ چڑ جاتے۔ کہتے۔ ”تو بہت سیدھی ہے۔ اس کا اعتبار نہ کیا کر۔ اسے باندھ کے رکھا کر۔“ وہ جب بھی سرسوں کا ساگ اور گڑ کے میٹھے چاول پکاتی، مفتی صاحب کے لیے ضرور بھیجتی انہیں یہ بہت پسند تھے۔ شروع میں جب پروین شاکر ان کے حلقہ ارادت میں شامل نہیں تھی، اس سے ناخوش تھے۔ اس کے خلاف اشفاق ورک کا ایک مضمون انہیں ملا جو انہوں نے ”علامت“ میں چھپنے کے لیے بھجوا دیا۔ مگر مجھے اشاعت سے پہلے پتہ چل گیا اور میں نے مضمون کی اشاعت رکوا دی اور مفتی صاحب سے معذرت کر لی۔ وہ سخت ناراض ہوئے مگر پھر پروین شاکر مرحومہ آہستہ آہستہ ان کے ہاں آنے جانے لگیں۔ اور انہوں نے ان کا ایک بہت عمدہ خاکہ بھی لکھا۔

نیلوفر اقبال بھی ان کی بہت مداح تھیں اور قریب ہی رہتی تھیں۔ انہوں نے مفتی صاحب کی سالگرہوں کے موقعوں پر بہت پر تکلف دعوتیں اور جلسے کیے اور بڑے بڑے کیک بنوائے اور خوب محفلیں سجائیں۔ مفتی صاحب کی آخری سالگرہ کی تقریب میں بھی رابطہ کے زیر اہتمام نیلوفر اقبال، شبانہ حبیب اور نکہت سلیم کے تعاون اور اہتمام سے منعقد ہوئی تھی جس کے دوسرے تیسرے روز ان کا انتقال ہو گیا۔ بلقیس محمود بھی ان کی بہت مداح تھیں اور وہ بھی انہیں بے حد عزیز جانتے تھے۔

گھریلو کاموں، ضرورتوں اور ادبی مسائل میں مجھ سے مشورہ کرتے۔ گھر کا گٹر بند ہوتا، پانی کی سپلائی کم ہوتی یا تعمیر و مرمت میں مشورہ درکار ہوتا تو مجھے فون کرتے۔ کسی کو کتاب بھیجنا ہوتی، یا کسی تقریب میں شامل ہونا ہوتا تو مجھے یاد کرتے۔ یہاں تک کہ ایک بار ان کی پالتو ہرنی کو ”گرمی“ ہو گئی۔ کہنے لگے۔ ”سنا ہے تمہارے محکمہ کے شعبہ جنگلات کے پاس ہرن ہیں۔ تم اس کا انتظام کرو۔“ میں نے کہا۔ ”جی میں اس قسم کا کام نہیں کرتا۔“ کہنے لگے۔ ”اس کا برا حال ہے۔ وہ مر جائے گی۔ اور اس کا خون تمہاری گردن پر ہو گا۔“ میں نے متعلقہ محکمے سے بات کی اور ”وچولا“ بن کر سارے معاملات طے کروا دیئے۔ پتہ نہیں ملاقات ہوئی یا نہیں مگر ایک دن پتہ چلا کہ ہرنی مر گئی ہے۔

سردیوں میں گھر کے ملحقہ لان میں دھوپ میں بیٹھتے تھے اور جب تک دھوپ رہتی، بیٹھے رہتے۔ کبھی تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کا کام کرتے۔ ورنہ صرف بیٹھے رہتے یا کوئی ملاقاتی آ جاتا تو گپ شپ کر لیتے۔ بیمار ہوتے تب بھی پتہ نہ چلنے دیتے کہ تکلیف میں ہیں۔

بھارت سے ایک معروف نقاد، شاعر اور ایڈیٹر اسلام آباد آئے ہوئے تھے۔ ممتاز مفتی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا۔ میں نے بتایا کہ وہ بیمار ہیں۔ مگر انہیں اگلے روز واپس جانا تھا۔ میں مجبوراً انہیں ساتھ لے کر مفتی صاحب کے گھر گیا۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر میں نے مفتی صاحب کو ملاقات کے لیے تیار کیا۔ سردیوں کے دن تھے اور وہ سانس کے عارضے میں مبتلا تھے۔ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے اور دیر تک مہمان سے باتیں کرتے رہے اور اس طریقے سے پیش آئے جیسے مدت سے جانتے ہوں۔ اگلے روز ٹیلی فون پر مجھ سے پوچھنے لگے کہ یار رات کو جو صاحب تمہارے ساتھ آئے تھے، کون تھے۔

ایک بار ہسپتال میں داخل تھے میں مزاج پرسی کے لیے گیا اور کچھ دیر ان کے پاس رہنا چاہتا تھا مگر انہوں نے کہا۔ ”اچھا اب تو جا۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

مجھے یہ روکھا پھیکا جواب برا لگا۔ دوسرے روز ڈاکٹر زاہدی مزاج پرسی کے لیے گئے۔ انہیں یہی کہا۔ ”اچھا ڈاکٹر۔ اب تو جا۔ میں ٹھیک ہوں۔“

پھر انور زاہدی نے مجھے بتایا کہ دراصل مفتی صاحب بہت تکلیف میں تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ دوستوں اور تیمارداروں کی موجودگی میں ان کے منہ سے آہ، کراہ یا چیخ نکل جائے۔

عکسی مفتی بتاتے ہیں کہ وہ آخری وقت تک ذہنی طور پر ہوشیار رہے۔ نرس سے چہلیں کر

رہے تھے کہ تو اتنی خوبصورت ہو کر یہ نوکری کر رہی ہے۔ تجھے تو کسی فلم کی ہیروئین ہونا چاہیے تھا۔ وغیرہ۔ وہ بعد میں بہت روئی کہ ابھی چند منٹ پہلے تو باباجی ہنس بول رہے تھے۔ اتنی جلدی کیسے چلے گئے۔

وہ ایک عرصہ سے سانس اور پیشاب کی تکلیف میں مبتلا تھے کئی آپریشن ہو چکے تھے۔ مگر وہ ذہنی طور پر موت کو گلے لگانے کو تیار رہتے۔ کہتے میں تو مرنا نہیں چاہتا مگر یہ اعضاء جواب دے گئے ہیں۔ اب خدا سے مہلت مانگ رکھی تھی۔ وہ بھی مکمل ہو گئی ہے۔ اب میں اسٹیشن پر تیار کھڑا ہوں۔ میری گاڑی کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ انتقال کے وقت ہنس بول رہے تھے کہ اچانک عکسی مفتی سے کہا۔ ”عکسی میں جا رہا ہوں۔“ اور چلے گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

یہ کتاب ”ممتاز مفتی کے منتخب افسانے“ ایک طرح کا خراج تحسین ہے۔ اسے امجد طفیل اور میں نے مرتب کیا ہے۔ مفتی صاحب کے فن پر امجد طفیل نے روشنی ڈالی ہے۔ میرے پاس تو ان کی محبتوں کی یادیں ہی یادیں ہیں یا پھر ایک آنسو ہے جو ان کے چلے جانے پر آنکھ میں امڈ اتھا یہ آنسو ٹپکتا ہے نہ خشک ہوتا ہے پلکوں پر اٹکا ہوا ہے اور نجانے کب تک اٹکا رہے۔

منشایاد

9۔ جولائی 1997ء

اسلام آباد

# جھکی جھکی آنکھیں

عذرا ان عورتوں میں سے ہے جن سے وصال میں بھی تکمیل حصول کی آرزو میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے۔ جو دلخراش حقائق سے دور کسی رنگین دنیا میں رہتی ہیں۔ یوں تو ہر عورت کی دنیا حقائق سے بے نیاز ہے مگر عذرا میں یہ خصوصیات نمایاں ہے۔

عذرا کو بار بار دیکھ کر بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس لحاظ سے حسین ہے۔ کتابی چہرہ، حساس ناک، مسکین سے ہونٹ، حیران موٹی موٹی آنکھیں اور گداز جسم۔ اس کی حیران خوابیدہ آنکھیں جو اس کی قوت تکلم کا بیشتر حصہ سلب کر چکی ہیں، نہ جانے کون سی دنیا میں رہتی ہیں۔ بہر صورت وہ اس مختصر مکان میں جہاں وہ، اس کا خاوند اور ساس رہتے ہیں، رہتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی کمر کا وہ ہلکا خم جس کی وجہ سے اس کی گردن ذرا بائیں طرف مڑی رہتی ہے، بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ کسی وقت مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہی خم اس کی جاذبیت کا راز ہے۔ جب کبھی عذرا کچھ بن رہی ہو یا پڑھ رہی ہو اور جھکی جھکی آنکھوں سے باتیں کرے تو تمہارے دل میں ایک لطیف احساس پیدا ہو گا کہ بے شک زندگی بسر کرنے کے قابل ہے اور مل بیٹھنے میں ضرور راحت ہے۔ لیکن اگر وہ آنکھیں اٹھ کر تمہاری طرف نظر بھر کر دیکھ لے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ تم کیا محسوس کرو گے۔ اس وقت تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عذرا مجھ سے کوسوں دور ہے۔ یقین نہیں پڑتا کہ وہ زندگی کی حقیقت ہے یا محض خواب۔ اس وقت چراغ مدہم پڑ جاتے ہیں اور دنیا گھوم جاتی ہے۔

کوئی دس بارہ مہینے ہوئے ہوں گے۔ جب وہ یہیں سکول میں دسویں جماعت میں پڑھا کرتی تھی۔ مگر ان دنوں اس کے انداز میں یہ بات نہ تھی۔ حیرانیاں تو اس کی نگاہ میں جھپٹنے ہی سے تھیں۔ شاید اس لیے کہ بچپن سے ہی وہ سوتیلی ماں کے پاس رہتی تھی مگر شادی کے بعد اس کی نگاہیں اور بھی حیران ہو گئیں اور اب وہ ترنم سے بھیگ چکی ہیں۔ اس کی گردن کا جھکاؤ کچھ اور جھک گیا ہے اور اس کی پلکیں کسی خوابوں کی بستی کو ڈھانپے رکھتی ہیں۔

ان دنوں جب سکول سے لوٹا کرتی تو اس کے انداز میں ”بیگانہ روئی“ پیدا کرنے کی کوشش عیاں ہوتی۔ مگر کبھی کبھار کوئی دبی ہوئی مسرت چھلک ہی پڑتی، چلتے چلتے ٹھٹھک جاتی یا آنکھ میں ہلکا سا

تبسم لہرا جاتا، جس سے صاف ظاہر ہوتا کہ اسے زندگی سے دلچسپیاں محسوس ہو رہی ہیں۔ وہ اپنے انداز میں ایسی بیگانہ روئی پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھی جو والدین کے نقطہ نظر سے ہر شریف بچی میں ہونی چاہیے۔ خدا جانے والدین اپنے بچوں میں بیداری دیکھنے کے متحمل کیوں نہیں ہو سکتے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے تبھی کلیوں کی طرح سوئے سوئے ہی رہیں اور یونہی سوئے سوئے ہی مرجھا جائیں۔ اس لیے وہ ان میں بیداری پیدا نہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیتے ہیں اور جو پیدا ہو جاتی ہے، اسے نہ دیکھنے کا۔ عذرا کے والد موخر الذکر قسم کے آدمی تھے۔ گھر میں کھانے پینے کے لیے کافی تھا اور جمع کرنا ان کی سرشت میں نہ تھا۔ بیویوں کے معاملے میں وہ اپنے آپ کو بہت بدنصیب سمجھتے تھے۔ انہیں گلہ تھا کہ ان کی بیویوں کی شادی کے فوراً بعد ہی عام ہو جانے کی قبیح عادت ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ ایسی بیوی ملے جو گوناگوں ہو اور ان کا ایمان تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی اسے ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس لیے وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ ان کے خیال میں بیوی کا یوں عام ہو جانا اس کی بدمذاقی کی دلیل ہے اور وہ اپنے خیال کو اکثر ظاہر کیا کرتے تھے۔

انجنیئر صاحب کی بیوی کو دیکھئے۔ اس کی آنکھوں میں بیسویں نگاہیں ہیں۔ ایک سے ایک نئی۔ کبھی وہ اداسی میں تو کبھی سرخی میں ڈوبی رہتی ہیں۔ کبھی ہم تمہیں جانتے ہی نہیں اور کبھی اب کہئے مزاج کیسے ہیں، کی سی نگاہیں اور پھر ان کا تو رنگ بھی ادلتا بدلتا ہے۔ کبھی گلابی گلابی، گہری گہری، گدری گدری، میلی میلی یہ جو پڑوس میں مسز ملک ہے نہ دیکھنے کے انداز سے دیکھنے میں اسے کس قدر ملکہ ہے، اس کے بھرے ہوئے جسم میں کس قدر خم و پیچ مضطرب رہتے ہیں۔ ایک وہ عذرا کی ماں تھی کہ بیٹھ جاتی تو گھنٹوں اٹھنا محال ہو جاتا۔ بس دن بھر آلو ہی چھیلتی رہتی تھی اور پھر وہ زمرد تھی کہ ایک مرتبہ ساڑھی کے لیے بگڑ بیٹھی تو ہفتوں سوچ کر بیٹھ رہی اور کچھ کہہ دیا تو ایک عرصہ تک چہرے کی زردی کے سوا گھر میں کچھ نظر نہ آیا۔

عذرا کی ماں کے بعد انہوں نے زہرہ سے شادی کی تھی مگر وہ بھی چند سالوں کے بعد لقمہ اجل ہو گئی۔ خیر اس بات سے ان کی زندگی میں کوئی خاص فرق پیدا نہ ہوا۔ چونکہ شادی کے چند ماہ بعد ہی انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ زہرہ میں وہ بات نہیں۔ اب گھر میں ان کی بوڑھی ملازمہ حشمت اور عذرا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ خود تو وہ عام طور پر باہر بیٹھک میں بیٹھے رہتے یا کبھی اندر آتے تو عذرا کو کوئی نصیحت کرنے کے لیے کہتے۔

"عذرا دوپٹہ سنبھال لو۔ بیٹیوں کو یوں ننگے سر بیٹھنا زیب نہیں دیتا۔"

"حشمت وہ کھڑکی کیوں کھلی ہے؟ بند کرو اسے۔ دیکھو تو عذرا بیٹھی ہے اور گلی میں لوگ آتے جاتے ہیں۔"

"عذرا تم یہ مسز ملک ولک کے ہاں نہ جایا کرو، لڑکیاں اپنے گھر بیٹھی اچھی لگتی ہیں۔"

ان نصیحتوں کے باوجود انہوں نے کبھی آنکھ بھر کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ بیٹی جوان ہو جائے تو جانے کیوں اسے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انہیں کبھی عذرا کی شادی کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ نہ ہی انہوں نے اسے کبھی بیٹی کہہ کر بلایا تھا۔ کیونکہ گو وہ چالیس برس کے تھے لیکن ابھی جوان ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے دوست اور احباب انہیں زینت محفل سمجھتے تھے۔ باہر دیوان خانے میں جمگھٹا رہتا تھا اور قہقہوں سے در و دیوار گونجتے۔

ایک روز صبح سویرے جب عذرا سکول جانے کی تیاری کر رہی تھی اور اپنا محبوب نیلا سوٹ پہنے بال بنا رہی تھی تو معمول کے خلاف اس کے والد اندر آ کر خشمگیں انداز سے کہنے لگے۔

"عذرا آج سے تم سکول نہ جایا کرو۔ بس زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔"

"مگر ابا جان۔" عذرا نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔ اس کا چہرہ حیرانی اور خوف سے بدنما ہو رہا تھا۔

"مگر وگر کچھ نہیں۔" انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔ "امتحان دینے کی ضرورت نہیں۔"

ایک ساعت کے لیے عذرا کی آنکھیں اٹھیں۔ شعلے کی طرح چمکیں مگر والد جا چکے تھے۔ حشمت نے ان آنکھوں کو دیکھا اور ایسے محسوس کیا جیسے کائنات کا ذرہ ذرہ تھر تھرا رہا تھا، پھر وہ جھک گئیں۔ دو موٹے موٹے آنسو رخساروں سے ڈھلک کر لباس میں جذب ہو گئے۔ پھر وہ نگاہیں حیران ہوتی گئیں۔ اپنے ماحول سے سمٹ کر اپنے آپ میں جذب ہوتی گئیں۔ اس دن سے عذرا کو ٹھٹکتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا اور اسے بیگانہ روئی پیدا کرنے کی شاید ضرورت ہی نہ رہی۔ شام کو وہ کوٹھے پر چلی جاتی اور گھنٹوں کھیتوں کی طرف نگاہیں جمائے ہوئے کھوئی ہوئی سی رہتی۔ حتیٰ کہ پندرہ دنوں کے اندر اندر اس کے والد نے نذر سے نکاح پڑھوا کر اسے رخصت کر دیا۔ غالباً اس لیے کہ عذرا کی بیداری کا زمانہ اس قدر مختصر تھا کہ آیا اور چلا گیا۔ وہ اس قدر گہرا اثر چھوڑ گیا، جس طرح کسی ویران وادی میں کسی آوارہ طائر کی لرزتی ہوئی تان۔ چند ایک ساعت کے لیے ان خاموش مہیب چٹانوں میں ابھر ابھر کر خاموشیوں کے مسکن کو اور بھی خاموش اور بھیانک تر چھوڑ جاتی ہے۔

اس جھٹ پٹ پر خلق خدا کے ماتھے پر شکن پیدا ہونے ہی تھے۔ چہ میگوئیاں ہوئیں، دبی دبی آوازیں اٹھیں، مگر آواز کسنے کی نوبت نہ پہنچی۔ ایک تو محلے والیوں کو عذرا سے کوئی گلہ نہ تھا اور عذرا کوئی اس قدر حسین یا شوخ یا طرح دار نہیں سمجھی جاتی تھی کہ محلہ والیاں اس سے کینہ دوزی کرتیں۔ دوسرے انہیں عذرا کے والد سے بھی کوئی رنجش نہ تھی کہ انہیں نشتر کرتیں، بلکہ وہ تو ان کی نکتہ رس نگاہوں سے واقف ہونے کے علاوہ ان کی نگاہوں کی قدر دان تھیں۔ چند ایک مثلاً انجنیئر

کی بیوی اور مسز ملک جنہیں آواز کسنے میں ملکہ تھا۔ ان کا تو یہ گلہ تھا کہ نہ ڈھول نہ چھم چھم۔ نہ تاک نہ جھانک۔ نہ تو تو‘ میں میں۔ یہ بھی کیا شادی ہوئی۔ کئی ایک کو تو مدت سے عذرا کی شادی کی تقریب سعید کا انتظار تھا کہ شادی ہو اور مہمان بن کر جائیں۔ حنا ملدیہ ہاتھ ہوں۔ جھلملاتی ہوئی ساڑھیاں ہوں۔ کاجل‘ جھمکے‘ بندیاں چمکیں۔ پلٹیوں سے چوڑیاں بجیں‘ پان بنائے جائیں اور اس افراتفری میں اچانک کوئی آ نکلے تو گھونگھٹ نکالنا تو کیا دوپٹہ سنبھالنا بھی مشکل ہو جائے۔ کوئی گستاخ لٹ جھٹک کر منہ پر آ گرے اور ناک میں دم کر دے یا پتلی پتلی گوری گوری انگلیاں دوپٹے کو سنبھالنے کی ناکام جستجو میں عریاں رہ جائیں۔ باریک تہوں سے نظریں چھن چھن کر پڑیں۔ سفید سفید باہیں گھونگھٹ سے نکل کر کچھ دیں‘ کچھ لیں۔ یعنی ایسی شادی ہو کہ نام رہ جائے بلکہ چرچا ہو۔

آخر خلق خدا خلق خدا ہی ہے اور بات بات ہے جو نکل ہی جاتی ہے۔ کسی نے کہا کسی سے آنکھ لڑ گئی ہو گی۔ کوئی کہنے لگی۔ "لو اب ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی تھی۔" کوئی کہنے لگی۔ "سنا ہے اس کے ابا نے خط پکڑ لیا۔" کوئی بولی۔ "ایلو بی بی وہ تو اس کے ابا نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ دفتر سے آ رہے تھے۔ باغ میں وہ اسے پہلو میں لیے بیٹھا تھا۔ توبہ کیسا زمانہ آیا ہے۔" غرضیکہ کئی باتیں نکلیں بلکہ کون سی باتیں تھی جو رہ گئیں۔ مگر دبی دبی باتیں ہوئیں اور پھر بات آئی گئی ہو گئی۔

اس بے چاری کا یہی قصور تھا کہ سکول جاتے ہوئے تانگے میں یوں آنکھیں جھکائے ہوئے بیٹھی رہتی کہ مرمریں بت کا شبہ ہوتا اگر کسی شوخ چشم کے دل میں اس بت کو دیکھ کر ایک مصور پیدا ہو جائے اور اسے اس بت میں محو کر دے تو عذرا کا اس میں کیا قصور‘ ہاں سکول کی ویران سڑک پر ہوا کھانے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔

پوری تفصیلات سے مجھے واقفیت نہیں‘ ہاں سلیم کا اونچا لمبا قد اور فراخ شانے اور اس کا انداز بے نیازی--- اس امر کا شاہد ہے کہ اسے تانک جھانک سے کوئی دلچسپی نہیں‘ نہ وہ خود ساختہ مصیبت مول لینے کا عادی ہے غرضیکہ وہ ان نوجوانوں میں سے نہیں جو کسی کے تصور میں اوندھے پڑے رہنے‘ آہیں بھرنے اور شعر پڑھنے کی دلچسپ کیفیت میں مبتلا رہنے کے مشتاق ہیں۔ چند دن تو صبح چھ بجے وہ روز اس سڑک پر اپنے سائیکل پر سوار گھومتا رہا‘ پھر ایک روز جب چھٹی کے وقت عذرا سکول کے پھاٹک کے قریب کھڑی اپنے تانگے کی راہ دیکھ رہی تھی تو سلیم نے آ کر اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا اور اسے شانوں سے پکڑ کر پوچھنے لگا۔ "تم کون ہو؟ تمہارا کیا نام ہے؟ تم بولتی کیوں نہیں---؟ اچھا۔" اس نے عذرا سے جھنجھوڑ کر کہا۔ "تم چاہے کوئی بھی ہو تم میری ہو اور تمہیں اب مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا۔" اور پیشتر اس کے کہ عذرا سمجھتی کہ یہ کیا ہو رہا ہے یا اسے کیا کرنا چاہیے۔ سلیم جا چکا تھا۔ پھر اسے یاد نہیں کہ اس روز تانگے والے نے دیر سے

آنے کے لیے کیا عذر پیش کیا تھا یا کس راستے سے وہ آئے تھے یا راستے میں پھاٹک پر کتنی دیر انتظار کرنا پڑا تھا یا رکنا پڑا بھی تھا یا نہیں اس روز اس کی آنکھیں تبسم سے آشنا ہوئی تھیں اور اس کی چال نے ٹھمکنا سیکھا تھا۔

اسے اس واقعے کی حقیقت پر اعتبار نہ آیا تھا۔ مگر اس کے بلوریں شانوں پر دو تین نیلے نیلے داغ کسی دلچسپ گرفت کے شاہد تھے اور اس کے شانوں پر لذیذ سا درد ہو رہا تھا۔

اس روز اپنے طوطے سولی سے کہہ رہی تھی۔ "سولی چاہے تم کوئی بھی ہو‘ تم میرے ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا کوئی بھی نہیں۔" وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ پھر اس مصنوعی سنجیدگی نے شاید اسے گدگدا دیا۔ وہ ہنس پڑی۔ "کیوں سولی ہے نا۔"

اس کے بعد ان کی دو چار سرسری ملاقاتیں ہوئی ہوں گی اور دو چار خطوط آئے گئے ہوں گے اور بس۔ سلیم ہمیشہ کے لیے اس کے لیے چند ایک دھندلے دھندلے نقوش‘ چند ایک دل کی پر کیف دھڑکنیں اور ہاتھوں شانوں اور کمر پر چند ایک لطیف دباؤ اور سینے کی چند مبہم تھرتھراہٹوں کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا۔ جس قدر یہ نقوش مدھم تھے‘ اس کے دل میں ان کے متعلق حسیات اسی قدر گہری تھیں۔

گاڑی میں عذرا اپنی ساس کے ہمراہ درمیانے درجے کے ڈبے میں بیٹھی تھی۔ وہ جا رہی تھی مگر اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ نذر کے ساتھ جا رہی ہے اس کا دل کہہ رہا تھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ سمجھتی تھی کہ خواب دیکھ رہی تھی جیسے قدرت اسے چھیڑنے کے لیے مذاق کر رہی ہو کہ وہ ابھی جاگ پڑے گی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ خواب نہیں تو اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔ ایسی بات کیسے ممکن تھی۔

باہر کھیتوں میں گرمی سے جھلسا ہوا پھیکا سبزہ لہرا رہا تھا اور سبز ہونے کے باوجود آنکھوں میں چبھتا تھا۔ ان کھیتوں کے وسیع پھیلاؤ میں یہاں وہاں بجلی کے بہت دیو نما کھمبے گرد سے اٹے ہوئے کسانوں میں یوں معلوم ہوتے تھے جیسے ٹھگنوں میں کوئی گلیور کھڑا ہو سورج چمک چمک کر تھک چکا تھا اور اس کی کرنیں زرد پڑ گئی تھیں۔ دور کہیں کہیں افق پر کوئی میلا سا ٹیلا ان جھلسے ہوئے میدانوں کے تسلسل میں دھندلے خواب کی طرح آتا اور گزر جاتا۔ عذرا اپنی خوابوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے ایسے معلوم ہوتا جیسے اس ٹیلے پر سلیم اسے بلا رہا تھا جیسے دور سڑک پر جو لاری جا رہی تھی‘ اس میں سلیم بیٹھا ہے۔ پھر اس کے شانے پر کوئی نامعلوم گرفت محسوس کرتی اور وہ سنتی تم میری ہو۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا۔ اور وہ ٹھٹھک کر بیدار ہو جاتی اور دیکھتی کہ نذر کی ماں اور سولی اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں مگر دونوں کی نگاہوں میں ایک دنیائے اختلاف

تھی۔ ماں کی آنکھوں میں تجسس اور تشویش کو اس کی مسکراہٹیں چھپا نہ سکتی تھیں۔ اس کے برعکس سولی کی آنکھیں پرنم معلوم ہوتی تھیں۔ غالباً وہ دونوں عذرا کے دل کی کیفیت سے واقف تھے مگر دونوں کی نگاہوں میں کوئی بھی مناسبت نہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی، سولی بے زبان ہو کر بھی سمجھتا ہے۔ اس وقت غالباً پہلی مرتبہ اس کے دل میں سولی کو آزاد کرنے کی خواہش ہوئی۔ نہ جانے کتنی بہاریں اس نے اس پنجرے میں گزاری ہیں۔ کیا اس کے دل میں بھی اڑنے کی آرزو باقی ہے؟ کیا اس کے دل میں بھی کسی زمانے کی یاد اٹھتی ہے؟ پھر اس نے سنا کہ ماں کچھ کہہ رہی تھی۔ گاڑی سٹیشن پر کھڑی تھی ماں پوچھ رہی تھی۔ "عذرا بیٹی! نذر پوچھتا ہے کچھ پیو گی؟ دیکھو نا کس قدر گرمی ہے تمہیں ضرور پیاس لگی ہوگی کیوں بیٹی!" اس کی آواز میں منت تھی۔ عذرا نے کنکھیوں سے دیکھا۔ کھڑکی میں کوئی کھڑا تھا اسے کنکھیوں سے بھی ادھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ پھر اس نے ایسے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے شانوں سے پکڑ کر اس کا منہ دوسری طرف پھیر دیا ہو۔

اس نے سنا جیسے میلوں دور کوئی کہہ رہا ہو۔ "نہیں اماں تم کہو تو، دیکھو کس قدر گرمی ہے۔" اس بھدی آواز میں کس قدر اداسی تھی۔ ہاں اگر سلیم اس سے پوچھتا اگر وہ سلیم کے گھر جا رہی ہوتی۔ مگر سلیم، سلیم جانے کہاں ہوگا، جانے اسے حالات کا پتہ بھی تھا یا نہیں۔ شاید اپنی بے چاری عذرا کو بھول ہی چکا ہو، شاید ان رنگین باتوں سے صرف مذاق مقصود ہو یا وقت کٹی۔ مگر اس کے دل کی گہرائیوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ الزام ہے۔ سلیم ایسا نہیں۔ پھر دو اداسی بھری متبسم آنکھیں اس کے سامنے معلق ہو جاتیں۔ نہیں۔ وہ آنکھیں مذاق نہیں کر سکتیں۔ حقیقت سے لبریز ہیں۔ اس کے دل میں یقین سا ہو جاتا، وہ آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔ وہ دنیا کا کونہ کونہ چھان مارے گا۔ شاید وہ اسی گاڑی میں موجود ہو۔ کہیں وہ بیمار نہ ہو۔ وہ ایک جھرجھری سی محسوس کرتی۔ نہیں۔ وہ بیمار نہیں۔ بس نہیں عذرا اپنا سر کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹیک دیتی اور اسے ایسے محسوس ہوتا کہ وہ چوکھٹ نہیں، سلیم کے شانے ہیں۔ وہ سمٹ کر ان شانوں پر جھک جاتی۔ چاہے کچھ بھی ہو، اب مجھ کو تم سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا--- کوئی بھی نہیں۔

ساس نے اسے کمرے میں ایک فراخ پلنگ پر بٹھا دیا۔ کمرے میں دھندلی روشنی تھی۔ تمام مکان سنسان محسوس ہوتا تھا۔ دو چار عورتیں عذرا کو دیکھنے آئیں مگر چند منٹ ٹھہریں اور چلی گئیں۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی ویران کھنڈر میں بھوت چل پھر رہے ہوں۔ اس رات لیمپ روشن نہیں معلوم ہوتے تھے اور اندھیرا ہی اندھیرا تھا، اس کی جھکی جھکی آنکھوں کے سامنے سلیم کھڑا تھا، وہ محسوس کر رہی تھی جیسے سلیم کے انتظار میں بیٹھی ہو۔

دور ہوا درختوں میں ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی سامنے کھڑکی کے شیشے سے ایک اداس کالا درخت نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا جھوم جھوم کر منڈلا رہا تھا لیمپ کے شعلے میں سلیم کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کی جھریاں تھیں۔

عذرا کی آنکھ کھل گئی اس نے اضطراب سے چاروں طرف دیکھا وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ سلیم کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ کیسا بیدار حسین خواب تھا۔ اس نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں بند کر لیں وہ اس خواب سے بیدار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بند ہونے کے علاوہ اس کی آنکھ میں نیند کا نشان بھی نہ تھا۔ یکلخت باہر سڑک پر کسی تانگے والے کی "پہاڑی" کی تان اس کے کان میں پڑی۔ تانگے کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ عذرا کے لیے پہاڑی کی تان سے کہیں زیادہ دلکش تھی۔ اس کے سامنے سکول والی سڑک لہرا گئی۔ جب وہ آزاد تھی۔ جب وہ تانگے پر آیا جایا کرتی تھی۔ جب پہلی مرتبہ اس نے سلیم کی حیران اور مخمور آنکھ دیکھی تھی۔ سلیم کی پہلی ٹکٹکی۔

اس کے بند بند میں درد ہو رہا تھا۔ سولی کی چیخ سن کر وہ اٹھ بیٹھی۔ بے چارہ سولی بھی اس چار دیواری میں قید محسوس کر رہا تھا۔ کمرے کی دوسری طرف کپڑے کی کرسی میں نذر سویا ہوا تھا۔ جیسے وہ عذرا کی طرف دیکھتا ہوا سو گیا ہو۔ چہرے پر ایک تبسم سا تھا۔ جیسے کوئی خواب میں اسے گدگدا رہا ہو۔ باہر فضا میں دھیمی رو پہلی روشنی پھیل رہی تھی۔

ساتھ والے کمرے سے کھڑکھڑاہٹ سی سنائی دی۔ عذرا سمٹ کر چارپائی کے کونے پر ہو بیٹھی۔ "عذرا--- نذر۔" نذر کی ماں بلا رہی تھی۔ نذر لپک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر اضطراب چھا گیا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور چاروں طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں عذرا پر آ رکیں۔ پھر اس کے منہ پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے کوئی کسی لطیف خواب کو حقیقت کے لباس میں دیکھ کر کھل جائے۔

"آیا اماں!" کہتا ہوا وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

اگلے روز دن بھر عورتیں آتی جاتی رہیں۔ ہر کسی کو عذرا کو دیکھنے کا شوق تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں جن کے لیے جوانی کے چند دن ایک دھندلے نقوش اور بیگانہ سے احساس تھے۔ عذرا کو اس انداز سے دیکھتیں جیسے کوئی اپنی گزری ہوئی دلچسپیوں کو خواب میں دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔ مگر کوئی دبی دبی ہوئی آہ اُس مسکراہٹ کو اداس بنا دیتی۔ وہ شوق سے آتیں مگر کھوئے ہوئے انداز سے لوٹتیں۔ جس طرح کوئی اپنی گذشتہ زندگی کے کسی رنگین واقعے کو یاد کر کے اپنی کھوئی ہوئی جوانیوں پر کسک سی محسوس کرتا ہے اور اپنے گرد ایک اداسی اور مٹی ہوئی دنیا پاتا ہے۔ دو ایک جوانی سے سرشار لڑکیاں بھی آئیں۔ لچکتی ہوئی، ٹھمکتی ہوئی، مسکراتی ہوئی۔ "ہم جانتے ہیں۔" کی سی مسکراہٹیں۔ "بس یہ ظاہر داری رہنے دو۔" ابھی تو اس نگری پر کی دہلیز پر بیٹھی ہو۔" کی سی نگاہیں اچھالتی ہوئی۔ بنتی سنورتی، ٹہلتی ہوئی مگر عذرا اپنی نگری میں گم صم تھی۔ لیکن جب کوئی نووارد اس کا منہ دیکھنے کے لیے

اس کا گھونگھٹ اٹھاتی تو وہ چونک پڑتی۔ پھر اسے یاد آتا کہ وہ کہاں ہے اور کون ہے اور اس کا چہرہ شرم سے تمتما اٹھتا۔ وہاں صرف سولی ہی ایسا متنفس تھا جو اس کے دل کی کیفیت سے واقف تھا۔

سولی اپنے پنجرے میں یوں مضطرب تھا جیسے اسے از سرِ نو قید کیا گیا ہو۔ وہ چاروں طرف دیکھ دیکھ کر پر پھڑپھڑاتا اور ان دیوواروں کی اجنبیت محسوس کر کے بار بار چیختا۔

شام کے وقت نذر نے سولی کا پنجرہ عذرا کے پلنگ کے قریب رکھ دیا۔ سولی نے عذرا کو دیکھ کر چیخنا بند کر دیا اپنی گردن موڑ کر اپنے بازوؤں پر رکھ دی اور عذرا کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ گیا۔ عذرا نے سولی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھ میں چمک آ گئی۔ صرف سولی ہی اس کا رازدار تھا، جس سے وہ سلیم کی باتیں کر سکتی تھی۔

نذر عذرا کے پاس آ بیٹھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی جھلک تھی۔ "تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا، عذرا کچھ تو کھاؤ، اماں نے تمہاری اتنی منتیں کی ہیں۔" اس نے دھیمی منت بھری آواز میں کہا۔ "یہ تمہارا اپنا گھر ہے عذرا تم اس کی مالکہ ہو۔" اس کا حلق جذبات کی بھیڑ سے رک رہا تھا۔ اس نے اپنے بھدے سے ہاتھوں میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "عذرا تم چپ کیوں ہو؟" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی زبان کہنے والی زبان نہ تھی مگر اس کا ہاتھ خاموش اور مدھم زبان سے اپنا مفہوم ادا کر رہا تھا۔ اس وقت وہ بھدا گرم ہاتھ قوت گویائی سے زیادہ متکلم تھا۔ عذرا نے وہ پیغام کانوں سے نہیں بلکہ جسم کے بند بند میں سنا اور اس کی تمام قوت شل ہو گئی۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی مگر وہ اپنے جسم پر قادر نہ تھی۔ کوئی نامعلوم طاقت اس کی مرضی کے خلاف اس کے جسم کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔ صرف دماغ کا کوئی نحیف حصہ جسم کی اس غداری اور اپنی بے بسی پر پیچ و خم کھا رہا تھا۔ جس طرح ڈراؤنا خواب دیکھ کر کوئی چیخ چلا کر جاگ اٹھنا چاہتا ہے، مگر جاگ نہیں سکتا۔ اسی طرح عذرا بت بنی بیٹھی تھی۔ اس میں اپنا ہاتھ چھڑانے کی قدرت نہ تھی۔ اس نے ایک مخموع دھندلکے میں نذر کا ہاتھ دیکھا۔ سلیم کا ہاتھ بھی اسی طرح بڑا اور گرم تھا۔ ہاں سلیم کا ہاتھ متحرک تھا۔ بلا کا شوخ--- اس کے دل میں خواہ مخواہ آرزو پیدا ہو گئی کہ وہ بھدا ہاتھ متحرک ہو جائے۔ اس کی اپنی تمام قوت شوخی زندگی اس گھڑی کے لیے اس بڑے بھدے ہاتھ اور ان مضبوط بانہوں میں منتقل ہو جائے۔ اس کا جسم اس بھدے ہاتھ کے لیے منتظر تھا۔ بے تاب تھا اور وہ اپنی اس خواہش پر شرم محسوس کر رہی تھی اور پریشان تھی۔ مگر وہ احساس شرم اور پریشانی کسی نقار خانے میں طوطی تھا۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سلیم کا ہاتھ اس کے جسم سے مس ہو رہا تھا۔ اس کی بند آنکھوں کے سامنے سلیم آ کھڑا ہوا۔ تم ہو سلیم---! مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ اس کے شانے جھک گئے۔ سر جھک گیا اور سلیم کے شانوں پر ٹک گیا۔ سلیم کی دو مضبوط بانہیں اس کے گرد آ پڑیں۔ وہ

سلیم کے پاس تھی۔

نذر کسی دفتر میں کلرک تھا۔ اس کے والد نذر کے لیے ایک معمولی سا مکان اور چند واجب الادا رقمیں چھوڑ کر مرے تھے۔ وہ عذرا کے والد کے بہت گہرے دوست تھے۔ نذر نے کچھ عرصہ پہلے کہیں اتفاقاً عذرا کو دیکھ لیا تھا اور عذرا کی نیچی نگاہوں اور اس کی لٹکی ہوئی لٹ نے اسے کئی دن پریشان رکھا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ عذرا کو اپنے خوابوں میں جگہ دینا اپنا شیرازۂ ہستی پریشان کرنا ہے۔ مرحوم دوست کے قلاش بیٹے کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ جب اس نے اپنی ماں سے سنا کہ عذرا کے والد رضامند ہیں بلکہ جلد نکاح کرنے پر رضامند ہیں تو اسے یقین نہ آتا تھا۔ اب بھی وہ کبھی کبھی سمجھتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے اور وہ ابھی جاگ اٹھے گا اور اسے احساس ہو گا کہ ایک غریب کلرک کو ایسی مدہوش کن خوابیں ان لامتناہی فائلوں کے سامنے کس قدر مہنگی پڑتی ہیں۔ مگر شاید یہ بھی فطرت کی ستم ظریفی تھی کہ عذرا اب صریحاً اس کی تھی۔ نذر کے لیے عذرا کی آمد مسرت کی ایسی لہر تھی جو ہر غیر متوقع خوشی میں ہم رکاب ہوتی ہے۔ اس کی خواہشات میں جو صرف ضروریات زندگی تک محدود تھیں، ساڑھیاں جھلملانے لگیں۔ پھول مہک اٹھے اور طلائی چوڑیوں کی جھنکار نغمہ زن ہو گئیں۔ عذرا کے لیے حسین نازک چپک ہو، عذرا کے لیے قد آدم آئینہ ہو، عذرا کے لیے شربتی ریشم ہو۔ عذرا کے لیے--- عذرا اس کی خواہشات میں بھنور بن کر آئی تھی۔

اس نے ایک چھوٹا سا پرانا ٹائپ رائٹر خرید لیا تاکہ فرصت کے وقت ٹائپ کر کے اپنی آمدنی بڑھائے۔ یہ سب کچھ اس کے دل کی گہرائیوں میں ہوا اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ ان گہرائیوں میں کیا ہو رہا ہے۔ اور اس کی خاموشی حسرت بھری تشویش ہے۔

عذرا کو پہلی مرتبہ ساڑھی میں دیکھ کر نذر کی آنکھ میں ایک مخمور چمک آ گئی۔ بوڑھی ماں نے جھکی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کے تبسم کو محسوس کیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے غسل خانے میں یا کسی اور جگہ کوئی ضروری کام بلا رہا ہو۔ اس کی آنکھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر وہ نذر کی جرابوں میں آن ٹھہریں۔ "بیٹا یہ جرابیں مجھے دے دو۔" اس نے کہا۔ "دیکھو کیسی میلی ہو رہی ہیں۔ لاؤ انہیں دھو دوں۔"

نذر نے چونک کر اپنی نگاہوں کو عذرا کی نیلی ساڑھی سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ "نہیں اماں یہ تو اچھی بھلی ہیں۔ پرسوں ہی تو پہنی تھیں۔" "نہیں بیٹا۔ نہیں۔" ماں نے اصرار سے کہا۔ "کیا حرج ہے؟" جرابیں لے کر ماں چلی گئی۔ کچھ دور تک نذر اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر عذرا کی طرف مڑ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "عذرا یہ نیلی ساڑھی تمہیں بہت زیب دیتی ہے میری طرف دیکھو عذرا!"

نذر نے اپنے ہاتھ سے عذرا کا منہ اپنی طرف پھیر دیا' عذرا نے آنکھیں جھکا لیں۔ ہاں اس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا ان کو بھی نیلی پوشاک بہت پسند تھی۔ اس روز پارک میں کس شوق سے دیکھتے رہے تھے کس قدر پیار بھری نگاہیں تھیں۔ کس قدر پیاری آواز تھی عذرا تمہیں نیلا لباس کس قدر زیب دیتا ہے اور کس پیار اور منت سے انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا۔ عذرا وعدہ کرو کہ تم ہمیشہ نیلا لباس پہنا کرو گی میرے لیے۔ میری خوشی کے لیے اور وعدہ لے کر کس قدر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ کس دیوانگی سے جھومے تھے۔

اس نے اپنے ہاتھ پر دباؤ محسوس کیا۔ سولی کی چیخ نے اسے بیدار کر دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے چھڑا لیا اور اٹھ کر سولی کے پنجرے کے قریب جا بیٹھی۔ وہ سولی سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ پوچھنا چاہتی تھی۔ "تم میرے ہو نا سولی؟" وہ محسوس کر رہی تھی کہ صرف سولی ہی ایسی ہستی ہے جس سے بات کرنے کے لیے بولنے کی ضرورت نہیں۔

انہیں نیلا رنگ پسند تھا نا سولی؟ وہ مجھے نیلی کہا کرتے تھے' تم جانتے ہو نا! اس میں ان کے ہاتھوں کی بو ہے۔ ان کے پیار کی سلوٹیں ہیں۔ ان پھولوں کا رس ہے جو وہ میرے لیے توڑ کر لایا کرتے تھے۔ کیوں سولی تم جانتے ہو نا---؟ مگر تم نہیں جانتے۔ تم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تم صرف سمجھتے ہو۔ اور سولی ان کے نچلے ہاتھ' بڑے بڑے پیارے پیارے بے تکلف ہاتھ اور چھیڑ دینے والی شوخ بانہیں---اس کے کندھوں کے گذشتہ دباؤ تازہ ہو رہے تھے۔ وہ اٹھ بیٹھی اور اندر جا کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس کی نیم وا آنکھوں نے اس مختصر کمرے کو اپنے دامن سے جھٹک دیا۔

یوں ہی دن گزر گئے۔ راتیں گزر گئیں۔ مہینے گزر گئے۔

یوں تو رہنے کو عذرا اس مکان میں رہتی تھی مگر اس کی نیم وا آنکھوں کو وہ چار دیواری قید نہ کر سکی۔ یا شاید اس چار دیواری کی وجہ سے ہی وہ آنکھیں دوبین ہو گئیں۔ وہ اپنے دل کی دنیا ان نیچی نگاہوں کی جھکی ہوئی مژگاں پر اٹھائے پھرتی اور شاید جھکی ہوئی ہونے کی وجہ سے ہی ان نگاہوں نے نذر کی دنیا بدل ڈالی۔

گو نذر ان کھوئی کھوئی نگاہوں کو دیکھ کر جیتا تھا۔ کبھی کبھی ان نگاہوں کی وسعتوں کو محسوس کر کے اسے ڈر محسوس ہوتا تھا مگر شاید وہ ہلکا ڈر ان نگاہوں کو نذر کے لیے اور بھی جاذب بنا رہا تھا۔ عذرا جب کبھی اپنی دل کی دنیا سے چونک پڑتی اور دیکھتی کہ نذر اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے تو وہ آنکھوں کو جھکا لیتی۔ وہ ایک تبسم نذر کے لیے پیام حیات بن جاتا۔ وہ اس حیا سے لبریز تبسم کے لیے اپنی زندگی' اپنا آپ--- سبھی کچھ دینے کے لیے تیار تھا۔ پھر اس کی نظر نیلی ساڑھی پر پڑ جاتی اور وہ محسوس کرتا کہ وہ دن بدن پہننے کے ناقابل ہو رہی ہے۔ اس میں وہ چمک نہ رہی تھی۔ وہ سوچتا۔ دیکھو کتنی جگہوں سے پھٹ رہی ہے۔ بوسیدہ ہو چکی ہے۔ چمک نہیں۔ پھر بھی عذرا سے میرے لیے پہنے پھرتی ہے۔ اس لیے کہ میں اسے نیلی ساڑھی میں دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ صرف میری خوشی کے لیے۔ حالانکہ اس کے پاس سرخ ساڑھی بھی تو ہے۔ بلکہ سرخ ساڑھی تو اور بھی قیمتی ہے۔ کتنی پیاری ہے وہ عورت جس کو خاوند کی خوشی زیبائش سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے--- ہندوستانی عورتیں--- دیویاں ہوتی ہیں۔

مگر یہ ساڑھی تو بس اب پہننے کے قابل نہیں۔ گوندا رام کہہ رہا تھا۔ ایسی ساڑھی چالیس روپے کی ملے گی۔ چالیس روپے۔ ساڑھی بھی کس قدر مہنگی پڑتی ہیں۔ اس کے منہ سے بے ساختہ آہ نکل جاتی اور پھر وہ کمر جھکا کر اپنے ٹائپ رائٹر کے سامنے جا بیٹھتا۔ اس کے صبح و شام چالیس روپے کی آرزو میں بسر ہو رہے تھے۔ وہ سوچتا تھا' جب چالیس روپے لے کر وہ ساڑھی لائے گا۔ عذرا دیکھے گی۔ خوشی بھری' تعجب بھری' محبت بھری نگاہ۔ اس لمحہ کی نگاہ حاصل کرنے کے لیے وہ عمر بھر محنت کرنے کے لیے تیار تھا۔

عذرا اس کے پاس بیٹھی رہتی۔ مگر اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نذر کو نہ دیکھا تھا بلکہ وہ نذر کے وجود یا موجودگی کے احساس سے قطعی بے گانہ تھی۔ وہ اس کے چہرے کی بناوٹ سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھی۔ صرف اس کی پیشانی اور دانت دیکھتی۔ باقی خدوخال کو اپنی نگاہوں میں اٹکنے نہ دیتی۔ شاید اس لیے کہ نذر کی پیشانی اور دانتوں میں کچھ سلیم کی سی جھلک تھی۔ وہ دونوں اکثر ایک دوسرے کے پاس بیٹھے رہتے مگر پاس بیٹھنے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے۔ دن بھر وہ سولی سے باتیں کرتی رہتی اور پھر سلیم کے پاس پہنچنے کے لیے اسے صرف آنکھیں جھکانے کی ضرورت تھی۔

ایک روز دوپہر کے وقت جب عذرا اماں کے پاس بیٹھی کچھ بن رہی تھی۔ کوئی اجنبی عورت آ کر ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر ماں جب نماز پڑھنے کے لیے گئی تو اس عورت نے عذرا کا ہاتھ پکڑ کر اس میں لپٹا ہوا کاغذ کا گولا رکھ دیا اور اس کی مٹھی بند کر دی۔ اس نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔ "یہ انہوں نے دیا ہے۔ وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔"

پہلے تو عذرا حیرانی سے اس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی' پھر اس نے اپنی مٹھی کھول کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مڑا تڑا لفافہ تھا۔ اس نے لفافے کو غور سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون آئے ہوئے تھے اور وہ بڑھیا کون تھی۔ اس کی طبیعت میں تشویش اور ڈر پیدا ہو گیا مگر وہ عورت جا چکی تھی۔

غالباً" وہ اپنے خیالی سلیم سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی اور اپنی دنیائے تصور میں اس قدر کھو

چکی تھی کہ اسے کسی جیتے جاگتے سلیم کا انتظار نہ رہا تھا۔ خیال تک بھی نہ رہا تھا۔ شاید اگر سلیم بذات خود اس وقت اس کے سامنے آموجود ہوتا تو اسے بیگانہ محسوس ہوتا۔ بہر صورت اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ لفافہ کس کا تھا۔ اس کے دل میں لفافے کو کھولنے کی ہمت نہ پڑی تھی اور وہ سخت پریشانی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اس کاغذ کے گولے کو پھر سے اپنی مٹھی میں دبالیا۔ اٹھ بیٹھی۔ اندر چلی گئی۔ پھر باورچی خانے میں گئی۔ صحن میں آئی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے یا کس لیے یہاں وہاں گھوم رہی ہے۔ جس طرح طوفان آنے سے پہلے کسی ویران ساحل پر کسی نامعلوم آنے والے کو ڈر محسوس کرتے ہوئے پرندے کالی اداس چٹانوں پر دیوانہ وار منڈلاتے ہیں۔

وہ چاہتی تھی کہ مٹھی میں اس کاغذ کے گولے کو بھینچ بھینچ کر ناپید کر دے اور اپنی دنیا کو محفوظ کرلے۔ کمرہ گھوم رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اپنے ٹرنک کے اوپر بیٹھے ہوئے پایا۔ ٹرنک کھلا تھا۔ وہ لپٹا ہوا لفافہ اس کی گود میں پڑا تھا۔ اس نے کھوئے ہوئے انداز میں اسے پھاڑ کر کھولا۔ اس کی آنکھوں تلے الفاظ ناچ رہے تھے۔ دل دھڑک رہا تھا۔ نگاہیں تیزی سے لفظوں پر سے پھسل رہی تھیں جیسے وہ مضمون کے سحر سے بچنا چاہتی ہو۔ اس نے صرف یہی سمجھا کہ وہ آئے ہوئے ہیں اور اس کو ساتھ لے کر جانے پر مصر ہیں۔ اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زبان حال سے کہہ رہی ہو۔ بس مجھے اسی کا ڈر تھا اور یہی ہو کر رہا۔ وہ بھاگی پھر رہی تھی مگر خط کا مضمون اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اور بوند بوند اس کے دل کی گہرائیوں میں ٹپک رہا تھا۔ اس پر غلبہ پا رہا تھا۔ آخر وہ پلنگ پر لیٹ گئی اور ایک ایک سطر اس کے سامنے ناچ گئی۔ جانا--- چلے جانا--- اس کا دل کانپ اٹھا--- دماغ میں خلاء سا پھیل گیا۔ ماحول میں کوئی مفہوم نہ رہا--- اس وقت کائنات اس کے لیے ایک بے معنی پھیلاؤ تھی۔

رات کو وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ اس رات سلیم کی بجائے کئی اور خوفناک شکلیں اس کے خوابوں میں گھس آئی تھیں۔ بھدے بھدے ہاتھوں اور سفید سفید دانتوں والی ڈراؤنی شکلیں۔ نذر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے عذرا کو تھام لیا۔ "کیا ہے عذرا؟" اسکا چہرہ فکر اور خوف سے بھیانک ہو رہا تھا۔ "آج تمہیں کیا ہے؟ تم بیمار تو نہیں؟" عذرا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میلوں دور کوئی کچھ کہہ رہا ہو۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی یادداشت صاف ہو رہی تھی۔ "ہاں وہ عورت--- دوپہر--- وہ خط--- ان کا خط--- سلیم کا--- وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے لے جانا چاہتے ہیں۔" اس نے جھرجھری سی لی۔ نذر کسی سے خدا جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ عذرا نے آنکھیں بند کرلیں اور اس کا سر کسی کے شانوں پر جا ٹکا۔ آج پہلے دن عذرا کا سر سلیم کے شانوں پر نہ تھا۔ جانے تکئے پر تھا یا پتھر پر--- مگر نذر کے شانوں پر عذرا کا سر تھا اور عذرا کے بالوں کی دھیمی

دھیمی خوشبو نذر کو فکر مند اور پریشان کر رہی تھی۔

عذرا کا دل کئی ایک خواہشات میں جھول رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خواہشات ایک دوسرے سے جھگڑ رہی تھیں۔ ایک حصہ سولی کی شکل میں کہہ رہا تھا۔ تم ان کی ہو عذرا--- اور اب ان سے تم کو کوئی بھی چھین نہیں سکتا۔ فراخ پیشانی اور سفید سفید دانت کہہ رہے تھے۔ عذرا تم بیمار تو نہیں--- تمہیں کیا ہے عذرا--- دو بھدے ہاتھ کہہ رہے تھے۔ تم آنکھیں جھکالو۔ عذرا تمہاری دنیا تو پاس ہے۔ سامنے سلیم کھڑا تھا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا۔ ڈراؤنی ہنسی، پیاری ہنسی---

شام کو وہ سولی سے کہہ رہی تھی۔ "سولی تم اکیلے رہ سکو گے؟ اگر میں چلی جاؤں تو مجھے یاد کرو گے؟ مجھے برا تو نہیں کہو گے سولی؟ کیا میں ان کے ساتھ چلی جاؤں۔ وہ آج رات کو دو بجے شیشم کے درخت کے نیچے آئیں گے۔ وہ درخت جو میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر دکھائی دیتا ہے۔ کیوں سولی میں ان کے ساتھ چلی جاؤں؟ دنیا کیا کہے گی؟ اباجان کیا کہیں گے؟ سولی--- تم تو جانتے ہو--- تم تو سمجھتے ہو نا؟"

شام کو اس نے نیلی ساڑھی کو لپیٹ کر ایک پارسل بنالیا اور اسے میز پر رکھ دیا۔ اس کا دل ہلکا درد محسوس کر رہا تھا۔ پھر وہ جلد ہی اپنے کمرے میں جا لیٹی۔ اس روز وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سوچنے سے ڈر رہی تھی۔ اس نے ایک پرانا رسالہ اٹھالیا۔ پڑھنے کی کوشش کی مگر الفاظ اس کی آنکھوں تلے ناچ رہے تھے۔ صفحات کبھی سفید ہو جاتے اور کبھی الفاظ ایک دوسرے سے ٹکرا کر گھوم جاتے۔ اس نے باہر پاؤں کی چاپ سنی۔ اس روز اس کی قوت سامعہ بہت تیز ہو رہی تھی۔ اسنے نذر کی ماں کے کمرے میں جاتے ہوئے سنا۔ اس کے پاؤں کی آہٹ بتا رہی تھی کہ نذر کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ عذرا کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔ کھڑکی باہر سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے بوڑھا شیشم کا درخت تھا۔ سلیم آج وہاں آنے والا تھا۔ وہ اس بات کو بھول نہیں سکتی تھی۔ اس کی نظر بار بار کھڑکی سے باہر درخت پر جا جمتی۔ اس وقت کھڑکی بند تھی مگر شیشے میں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ باہر سڑک پر کبھی کبھی کوئی راہ گیر گزرتا تو اس کے پاؤں کی چاپ صاف سنائی دیتی۔ شیشم کا درخت متانت سے کھڑا تھا۔ عذرا یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ درخت اس کے راز سے واقف ہو۔ صحن والی کھڑکی میں سولی کا پنجرہ تھا۔ سولی دو روز سے خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے باتیں کرنی چھوڑ دی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سولی دنیا سے بے زار رہ چکا ہو۔ پھر عذرا کی نگاہ میز پر پڑی۔ نیلی ساڑھی والے پارسل کو دیکھ کر عذرا لپک اٹھی۔ اس نے پارسل اٹھایا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کہاں رکھے۔ دروازے کے قریب جا کر اس نے سنا، ماں بیٹا باتیں کر رہے تھے۔

"تم نے تو اپنا آپ تباہ کرلیا۔ صبح شام کام، دن رات کام۔ ہر وقت کی ٹک ٹک--- ایک

ساڑھی کے لیے اپنا آپ حلال کر رکھا ہے۔“

”نہیں اماں۔ یہ نہ کہو۔“ نذر بار بار کھانس رہا تھا۔ ”جب سے وہ آئی ہے۔ ہم نے اس کو دیا ہی کیا ہے۔ مگر اماں وہ ایسی اچھی ہے کہ کبھی گلہ تک نہیں کیا۔ میں اسے دے ہی کیا سکتا ہوں۔ تنخواہ میں بمشکل گزارہ ہوتا ہے۔“

مگر بیٹا اس کے پاس اور بھی تو ساڑھیاں ہیں۔ وہ کیوں نہیں پہن لیتی۔ پھر وہ نیلی ساڑھی کے لیے اس قدر بے تاب ہے۔ میں تو نہیں سمجھتی --- ہمارے زمانے میں ---“

”اماں تم بھولتی ہو۔ اس نے تو مجھے نہیں کہا --- مگر یہ تو معمولی بخار ہے۔ تم فکر نہ کرو۔“

نذر آیا اور آتے ہی لیٹ گیا۔ اسے تیز بخار تھا۔ عذرا کھڑکی کے سامنے چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی خاموشی کسی گہری دلی کشمکش کی چغلی کھا رہی تھی۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ کسی چھپے ہوئے ہنگامے کا حال کہہ رہے تھے۔ ”تم سو جاؤ عذرا!“ نذر نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”تم کیوں میرے لیے بے آرام ہو۔ میری فکر نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ بخار کی شدت میں وہ کچھ کہہ رہا تھا جو اس نے کبھی نہ کہہ سکا تھا۔ اس لیے ہاتھ میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”تم نہ ہوتیں عذرا تو میری زندگی میں یہ بات نہ ہوتی۔ تم میری زندگی ہو --- میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی دکھ نہیں رہتا۔“ اس نے اضطراب سے دو ایک کروٹیں بدلیں۔ پھر وہ عذرا کے پاؤں کے قریب ہو گیا۔ اس قرب پر وہ خوشی محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی بچہ بڑے پیار سے کھلونے سے کھیلتا ہے۔ عذرا بت بنی بیٹھی تھی۔ شاید وہ اس کی باتیں نہیں سن رہی تھی۔ یا نہ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر یکلخت اس نے اپنے پاؤں پر دو گرم ہونٹوں کو مس کرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ چونک اٹھی، کانپ اٹھی۔ اس کی نگاہیں جھک کر نذر پر جم گئیں۔ آج پہلی مرتبہ اس نے نذر کو نگاہ بھر کر دیکھا تھا اور پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ نذر کے پاس ہے۔

رات بخار سے بے چین وہ بار بار بڑبڑا اٹھتا۔ ”چالیس روپے۔ نیلی چالیس روپے۔“ وہ اکثر عذرا عذرا چیخ کر اٹھ بیٹھتا۔ پھر وہ عذرا کی طرف دیکھ کر کہتا۔ ”تم میرے پاس ہو نا عذرا ---؟ ہاں --- تم میرے پاس ہو۔“ پھر وہ آرام سے لیٹ جاتا۔ ”تم آرام کرو عذرا۔ تم اب سو جاؤ --- تم بیمار ہو جاؤ گی۔ میری فکر نہ کرو۔ میں اب اچھا ہوں۔“ اس وقت عذرا کی آنکھیں کھڑکی سے ہٹ جاتیں اور وہ کسی الجھاؤ میں پڑ جاتی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اس کا حلق خشک تھا۔ وہ سوچ بچار کے ناقابل تھی۔ باہر چاند کی چاندنی میں شیشم کا درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا تھا اور کوئی دھندلی سی شکل اس کے نیچے کھڑی نظر آ رہی تھی۔ عذرا بڑبڑا رہی تھی، وہ آئے ہیں۔ ہاں ---! عذرا کا جی چاہتا تھا کہ سلیم سے جا ملے۔ کوئی اس کا دامن پکڑ لیتا۔ عذرا اٹھ بیٹھی۔ اسے پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی

ہے۔ یا کیا کرنا چاہتی ہے۔ باہر ہوا زور سے چل رہی تھی اور درختوں کی ٹہنیاں لپٹ لپٹ کر رو رہی تھیں۔ عذرا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی نیلی ساڑھی اٹھا لی۔ نذر بڑبڑا رہا تھا۔ ”نیلی چالیس روپے۔“ عذرا ڈر گئی۔ اس کا سر انگارے کی طرح گرم محسوس ہو رہا تھا۔ سولی نے چیخ ماری --- دردناک چیخ۔ عذرا نے اسے دیکھا۔ غریب اپنے پنجرے میں یوں پھڑپھڑا رہا تھا جیسے وہ عذرا سے کچھ کہنے کے لیے مضطرب ہو۔ میز پر پنسل پڑی تھی۔ دفعتاً عذرا نے وہ پنسل پکڑ لی۔ وہ پارسل لکھ رہی تھی۔ ”میں نہیں آ سکتی۔“ اس نے پنسل اپنے آپ سے چھین کر پھینک دی۔ اس ڈر کے مارے کہ وہ لکھا ہوا کاٹ نہ دے۔ اس نے کھڑکی کھولی اور باہر دیکھے بغیر وہ پارسل سڑک پر پھینک کر جھٹ دروازہ بند کر لیا جیسے وہ کھڑکی کے کھلے رہنے سے ڈر رہی ہو۔ وہ دھندلی سی شکل آگے بڑھی۔ عذرا پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بھینچ کر بند کر لیں۔ اور اپنے کانوں میں انگلیاں دے دیں۔ اس کے کانوں میں ایک شور محشر سنائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دیکھا، کوئی پارسل ہاتھ میں پکڑے جا رہا تھا۔ وہ چیخ کر اسے بلا لینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے دل میں شکست کی آواز سنی اور دھم سے کرسی پر گر گئی۔ ”یہ میں نے کیا کر دیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔“ اس کے دل سے دیوانہ وار آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کی آنکھ سے آنسو گر رہے تھے۔ بے اختیار اس کے منہ سے چیخ ہچکی کی شکل میں نکل گئی۔

نذر اٹھ بیٹھا --- ”کیوں عذرا --- کیوں --- میں --- تم روتی ہو؟ کیوں رو رہی ہو؟ عذرا میں یہاں ہوں۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارا ہوں۔ عذرا تم فکر نہ کرو۔ سو جاؤ۔“ نذر نے عذرا کا سر اپنے شانوں پر رکھ لیا۔ عذرا کی ہچکیاں رکتی نہ تھیں۔ ”میں نے کیا کر دیا۔ میں نے کیا کر دیا۔“

”سلیم تم نہ جاؤ۔ سلیم --- سلیم۔“ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ سلیم سامنے کھڑا تھا۔ پھر اس کا سر سلیم کے شانوں پر جھک گیا۔ ”سلیم مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا ---“

پھر اس نے سنا جیسے میلوں دور کوئی کہہ رہا تھا۔ ”عذرا میری وفا کی دیوی۔“

# بیگانگی

رشید نے اٹھ کر آنکھیں کھولیں۔ دو ایک انگڑائیاں لیں اور کھوئے ہوئے انداز میں سیڑھیوں کے قریب جا بیٹھا۔ اس نے کوٹھے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ تمام چارپائیاں خالی پڑی تھیں۔ سب لوگ نیچے جا چکے تھے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، سامنے اونچے اونچے مکانوں کا انبار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے لیے دنیا ایک بے معنی پھیلاؤ تھی۔ اچھا اب تو صبح ہو چکی ہے۔ اس نے ایک اور انگڑائی لیتے ہوئے محسوس کیا۔ جیسے وہ نہ ختم ہونے والے دن کی کوفت کا بوجھ محسوس کر رہا ہو۔ اس کے لیے دن، ایک مسلسل کوفت تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ اس کے نزدیک چھٹی سے بڑھ کر کوئی عذاب نہ تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ گھر کے تمام لوگ اس کے وجود سے ہی منکر تھے۔ اس لیے انہیں اپنے وجود اور عظمت کا احساس دلانے کے لیے اس پر لازم ہو جاتا کہ وہ آپا کے چٹکی لے یا محمود کا منہ چڑائے یا محمود کے پالتو طوطے کی دم کھینچ لے۔ اور نہیں تو چیزیں ادھر ادھر کر دے۔

رشید نے ایک اور انگڑائی لی۔ اب میں کیا کروں؟ وہ مبہم طور پر محسوس کر رہا تھا۔ تمام لوگ گھر میں اسے کوئی ایسا کونہ تک نظر نہیں آتا تھا جسے وہ اپنا سکتا یا جہاں اس کی موجودگی سے بیگانگی نہ برستی۔ اس نے اکتائے ہوئے انداز سے قمیض کے دامن سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ شانے جھٹکے اور دیوار سے سہارا لگا لیا۔ زندگی اسکے لیے ناقابل فہم بیگانگی سے بھری ہوئی تھی۔ وہ صرف یہ سمجھ چکا تھا کہ دنیا میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کیا سے کیا ہو جائے گا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیوں رشید ہے اور محمود کیوں محمود ہے۔ اور اس نے محمود کا سا برتاؤ کر کے آزما دیکھا تھا مگر اس کے باوجود گھر والے اس پر "رشیدیت" ٹھونس رہے تھے۔

اس کی نگاہیں اکتائے ہوئے انداز میں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں گھوم رہی تھیں۔ سامنے محمود کا طوطا پنجرے میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر حقارت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ محمود کا طوطا، محمود کا طوطا اس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا۔ جیسے اسے چھیڑ رہا تھا۔ پھر اس کی نظر سامنے کھڑکی پر جا پڑی جو گلی میں کھلتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ صبح شام کی مسلسل کوفت میں صرف وہ کھڑکی ہی خوشی کی ایک امید گاہ تھی مگر وہ بوڑھا فقیر جس پر رشید اس کھڑکی سے پتھر پھینکا کرتا تھا، دو روز سے نہیں گزرا تھا۔ دو روز اس نے بوڑھے فقیر کے انتظار میں گزارے تھے۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور لاشعوری طور پر اس نے ایک پتھر اٹھا کر زور سے کسی طرف پھینک دیا۔

رشید ابھی چھ ماہ کا نہ ہوا تھا اور اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ایک بڑی بہن کا بھائی ہے اور ماں باپ نے اسے سسک سسک کر پایا ہے۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ بذات خود کیا ہے۔ آیا وہ باپ کا نام قائم کرنے یا ماں کا سہاگ مستحکم کرنے کے لیے ہے یا ماں باپ کے کسی خاص مقصد کے لیے ہے یا ویسے ہی ہے۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ اول تو وہ ہے ضرور اور دوسرے وہ کوئی بڑی اہم ہستی ہے اور وہ ماں باپ کی آنکھوں کا نور ہے۔ گو ہستی اور نور کے متعلق اس کے احساسات واضح نہ تھے۔ وہ جانتا تھا کہ بار بار "اگو" کہہ کر وہ اپنی ماں کو بلا سکتا ہے۔ یعنی اپنی کوئی خواہش پوری کرنے کے لیے اسے صرف ہونٹ ہلانے کی ضرورت تھی۔ جب چھ سال کی مسلسل منتوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا تو ماں باپ کے لیے اسے نظرانداز کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔

جب رشید کو پوری طرح اپنی قوت کا احساس ہو گیا تو اسے دودھ پیتے، سونے اور باقی وقت نکمے پڑے رہنے یا فضول اپنا انگوٹھا تلاش کرنے یا دور پڑی ہوئی چیزوں کو پکڑنے کی کوشش میں چنداں دلچسپی نہ رہی۔ البتہ لوگوں کو نچانا ضرور باعث فرحت تھا۔ اس دلچسپ شغل میں اس نے دو سال بسر کیے۔ اس عرصے میں ہزاروں انکشافات کے علاوہ اس پر یہ بھی آشکارا ہوا کہ وہ بدصورت ہے۔ ابتدا میں تو اسے بدصورتی کی تفصیلات کے متعلق کوئی واقفیت نہ ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ اسے معلوم ہو تا گیا کہ اس کی ناک چپٹی ہے۔ پیشانی چھوٹی اور ہونٹ موٹے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اسے یہ نہ معلوم ہوا کہ بدصورتی عیب سمجھی جاتی ہے یا وصف۔ وہ صرف یہ جان سکا کہ ماں باپ اسے بدصورت کہہ کر یا اس کے ناک، ہونٹ اور پیشانی کے متعلق کہہ کر فرط انبساط سے اسے گود میں اٹھا کر پیار کرتے تھے۔ اس لحاظ سے تو بدصورتی بہت پیاری خصوصیت تھی۔

اس زمانے میں دنیا یوں بے معنی نہیں تھی۔ بلکہ مخصوص اصولوں پر چلتی تھی۔ اس کا ہنسنا، رونا، روٹھنا یقینی نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ وہ دو سال اس کی زندگی میں ایک گذشتہ مگر قابل حصول رنگینی سے سرشار تھے۔ ان دنوں زندگی اس قدر پیچیدہ اور لوگ اس قدر ضدی اور اندھے نہ تھے۔ ان دنوں اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے اسے کسی دقیق عمل کی ضرورت نہ تھی۔ مگر جلد ہی وہ دن آ گیا جب وہ بات نہ رہی۔ اس روز وہ اپنی بہن کی گود میں بیٹھ کر حسب معمول قواعد کروا رہا تھا کہ ان

کی ملازمہ رضیہ دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی۔ "بی بی تمہیں مبارک ہو۔ خدا نے تمہارے گھر ایک اور ننھا بھائی دیا ہے۔" سلیمہ نے یہ سنا تو رشید کو یوں پٹک کر بھاگ گئی جس طرح وہ خود نئے کھلونے کی آمد پر پرانے کھلونے پھینک دیا کرتا تھا۔ یہ پہلا دن تھا جب رشید کی یوں تحقیر کی گئی۔ رشید کی تحقیر--- سلیمہ کی اتنی جرات۔ پہلے تو وہ حیران چپ چاپ زمین پر بیٹھا رہا۔ پھر ان سب باتوں کو سوچ کر اس نے یکلخت رونا شروع کر دیا۔ اس کی دانست میں رونے سے بڑھ کر کوئی قوت نہ تھی مگر خدا جانے اس روز اس کے رونے میں کیوں اثر نہ تھا۔ حتیٰ کہ آنسوؤں والا رونا بھی کام نہ آیا۔ پھر اسے تازہ دم ہو کر رونا پڑا۔

آخر رضیہ آئی۔ اس نے رشید کو جھنجھوڑ کر اٹھا لیا۔ اول تو رضیہ اسے منانے کو آئے۔ رضیہ ایک ادنیٰ ملازمہ--- کس قدر بے عزتی کی بات تھی اور پھر وہ بھی اسے جھنجھوڑ کر اٹھائے۔ اس روز اس کے خیال میں دنیا کے اصول ہی بدل رہے تھے۔

ماں کے سامنے جا کر اس نے دو تین چیخوں سے آپا' رضیہ اور دنیا بھر کے خلاف شکایت کی مگر ماں اسے گود میں اٹھانے اور جملہ لوگوں کو برا بھلا کہنے اور گھورنے کی بجائے نحیف سی آواز میں کہنے لگی۔ "یہ کیا سر کھا رہا ہے--- اسے یہاں سے لے جا اور جو نعمت خانے میں مٹھائی پڑی ہے' وہ اسے دے دے۔" یہ تھی اس کی ماں۔ اس کی اپنی ماں جس کی آنکھوں کو اس نے نور بخشا تھا۔ وہ ماں--- اگر اس کی قوت اظہار اپنے باپ کی طرح وسیع ہوتی تو وہ یہ کہہ اٹھتا۔ "بس چودھویں صدی آ گئی ہے جب کہ ماں کو اپنے سگے بیٹے سے محبت نہیں رہی۔ ماں کا خون بھی سفید ہو گیا---"

رضیہ اسے باورچی خانے میں تن تنہا چھوڑ جائے--- اپنے ہاتھ سے مٹھائی کھانے کے لیے--- ماں سے دور ماں کی واری صدقے بغیر--- سوکھی مٹھائی اور ماں اس گوشت کے لوتھڑے کے پاس لیٹی ہے۔ کیسی بے ہودہ شکل تھی۔ نہ سر نہ منہ' یقینی طور پر چودھویں صدی آ چکی ہے جس کے متعلق اکثر ابا ذکر کیا کرتے تھے۔

پھر اسے یہ معلوم ہوا کہ ماں بیمار ہے اور اس نے اخذ کیا کہ بیمار اسے کہتے ہیں جس کے ارد گرد بھیڑ لگی رہے۔ جس کے لیے مٹھائیاں منگوائی جائیں اور جس کی اتنی ہی دیکھ بھال ہو' جتنی کسی زمانے میں اس کی اپنی ہوا کرتی تھی۔ یعنی بیماری میں بھی وہی تاثیر تھی جو کسی زمانے میں اس کے رونے میں تھی اور اب دن بدن ضائع ہو رہی تھی۔ بیمار بن کر اس کی حکومت شاید لوٹ آئے مگر اسے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کس طرح بیمار پڑ جائے۔ اس نے دو ایک مرتبہ اپنی بیمار ماں کو اس امید پر لپٹ کر چوما کہ شاید اس طرح ماں کی بیماری اسے لگ جائے مگر اس کے باوجود گھر والے اسے بیمار سمجھنے سے منکر رہے۔ بہرحال ان دنوں اپنی مٹی ہوئی انانیت حاصل کرنے کے لیے رونے' روٹھنے اور ضد کرنے کے علاوہ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا اور ان کے استعمال میں اس نے بڑی فراخدلی سے کام لیا۔ مگر ان کے استعمال سے مزید مشکلات پیدا ہو رہی تھیں۔

مانا کہ ماں کے دودھ کے علاوہ مٹھائی اور گوشت کے ٹکڑے بھی کھانے کا عادی تھا مگر ماں کے دودھ سے بالکل محروم کر دینا۔ کھیلنے کو بھی نہ دینا کس قدر کمینہ پن تھا۔ اس سے پہلے تو اسے بے روک ٹوک کھیلنے کی اجازت تھی۔

پہلے پہل تو اسے یہ آس رہی کہ صحت ہونے پر ماں وہی پہلی سی ماں ہو جائے گی۔ مگر ماں نے بستر چھوڑ دیا۔ چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ مگر اسے وہ محبت نصیب نہ ہوئی۔ پیار تو وہ کرتی تھی مگر وہ پیار مقابلتاً" ظاہری اور پھیکا محسوس ہوتا۔ ماں کا دھیان تو ہر وقت ننھے کی طرف لگا رہتا تھا۔ اسی کو ساتھ سلاتی اور رشید جب رات کو جاگتا تو وہ دیکھتا کہ وہ تن تنہا کھٹولے پر پڑا ہے۔ وہ بے چارہ اس اندھیر پر رو پڑتا اور چاہتا کہ ماں اسے پاس بلائے مگر ماں کس بیگانگی سے ہاتھ بڑھا کر اسے تھپک دیتی' جس طرح دور سے کتے کو روٹی کا ٹکڑا پھینکتے ہیں۔

آخر رشید لوگوں کی عدم توجہی سے تنگ آ کر احتجاجی حرکات کو جائز قرار دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی حرکات سے متاثر تو کیا' ماں باپ نے انہیں سمجھنے تک کی تکلیف گوارا نہ کی۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ درد دل کا اظہار لفظوں کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ وہ سمجھتے رہے کہ رشید کو بستر پر پیشاب کرنے کی قبیح عادت پڑ گئی ہے اور وہ رات کو بلبلا اٹھتا ہے اور اسے اسہال کی شکایت ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جو گالیوں' بددعاؤں یا لفظوں سے اپنے غصے اور دنیا کی بے وفائی کا اظہار نہیں کر سکتے' وہ درد دل کا اظہار مثانے اور معدے سے کر سکتے ہیں۔

ماں سے مایوس ہو کر رشید نے ابا سے از سر نو رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو اس معاملے میں بالکل مجبور تھے کیونکہ وہ ہر وقت سنتے تھے کہ محمود کی شکل ان پر تھی اور بد صورتی تو خیر رشید کی شکل بالکل ان پر نہ تھی۔ باپ کے لیے اس اہم تفصیل کو نظر انداز کرنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ کس طرح محمود سے غداری کر سکتے تھے۔

آخر آہستہ آہستہ رشید پر انکشاف ہو گیا کہ بلی کی دم کھینچنے اور مرغی کے پر نوچنے میں بھی راحت ہوتی ہے۔ گو یہ راحت ماں باپ کا نور نظر اور گھر کا چراغ ہونے کے مقابلے میں ہیچ تھی' مگر راحت ضرور تھی۔ ماں باپ تو اسے گوشت کے لوتھڑے میں' جسے وہ محمود کہہ کر پکارتے تھے' اپنا وجود کھو چکے تھے۔ صبح سے شام تک محمود کا ذکر۔ محمود کی آنکھوں' پیشانی اور ہونٹوں کے قصے۔ محمود کی صحت' مسکراہٹ اور کھیل کا رونا اور محمود بھی وہ جسے رونے تک کی تمیز نہ تھی۔ کیسی بے سری الاپتا تھا۔ رشید نے کئی دفعہ محمود کا منہ تک نوچنا گوارہ کیا کہ ماں کا قرب حاصل ہو یا اس کا منہ چومنے

سے وہ خود محمود بن جائے۔ مگر والدین بھی پتھر کے بنے ہوتے ہیں۔ ان پر ان باتوں کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

ایک روز جب رشید ابا کی چھڑی کا گھوڑا بنا کر سواری کر رہا تھا اور ان کے کاغذات کو پاؤں تلے روند رہا تھا تو انہوں نے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ جب رشید نے جواب میں چیخوں سے دردِ دل کا اظہار کیا تو انہوں نے ایک دو تھپڑ جڑ دیئے اور جلال میں کہنے لگے۔ “بہت بدمعاش ہوا جا رہا ہے۔ کبھی آپا کو مار۔ کبھی ماں سے لڑ۔ گھر میں کہرام مچا رکھا ہے --- پاجی۔” اس سرزنش کے دوران میں ماں محمود کا پوتڑا ٹھیک کرنے میں شدت سے مصروف رہی۔ گو ادھر سے پیار کی کوئی امید نظر نہ آتی۔ پھر بھی اسے مجبوراً فریاد لے کر ماں کے پاس جانا ہی پڑا لیکن ماں نے بھی “ہر وقت سر کھپاتا رہتا ہے۔” کہہ کر ایک تھپڑ مار دیا۔ اتنا ضرور ہوا کہ ماں نے “یہاں مر۔” کہہ کر جھنجھوڑ کر اسے اٹھا لیا اور اپنے پاس لٹا لیا۔ یہی تو اس کی خواہش تھی کہ وہاں مرے۔ کسی سے تھپڑ کھا کر اسے وہاں مرنا نصیب تو ہوا۔ اس کی معلومات میں یہ ایک اضافہ تھا۔

اب رشید تیسری جماعت میں تھا۔ چونکہ پچھلے سال وہ فیل ہو گیا تھا۔ رشید کے والد کو یقین تھا کہ رشید فطری طور پر کند ذہن ہے بلکہ ان کا خیال تھا کہ اس کے دماغ میں عقلِ سلیم کا خانہ خالی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ تیسری جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔ گھر میں وہ اپنے اس خیال کے متعلق اکثر بات کرنے کے عادی تھے یا وہ محمود کی ایسے انداز میں تعریف کرتے جس سے رشید کی نااہلیت اخذ ہو۔

“محمود سوالوں میں طاق ہے۔ اگر رشید کا ذہن بھی اچھا ہوتا تو کیسی اچھی بات تھی۔ مگر یہ رشید کا قصور نہیں --- اس کی یادداشت ٹھیک نہیں --- بے چارے کو باتیں یاد نہیں رہتیں --- اور --- محمود کی ماں --- تم نے سنا --- ادھر آنا --- باہر محمود کا استاد آیا ہوا تھا۔ کہتا تھا، محمود فر فر سبق سنا دیتا ہے۔”

کسی وقت جب دونوں بچوں کے مستقبل کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ اکثر کہا کرتے۔ “محمود --- محمود --- کو تو انجینئر بنائیں گے۔ اسے رڑکی بھیجیں گے --- رڑکی۔ رڑکی سے بڑھ کر ہندوستان میں کوئی انجینئرنگ کالج نہیں۔ سنا تم نے محمود کی ماں۔ رڑکی میں بہت بڑا کالج ہے --- شاندار۔”

اس دوران میں وہ محمود کی طرف اس زاوئیے سے دیکھتے جیسے کوئی مصور اپنے شاہکار کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر وہ چونک کر ایک موہوم سی آہ بھر کر رشید کی طرف دیکھتے۔ “رشید محمود کے طوطے کو دق نہ کر۔ تمہیں تو ہر وقت شرارت سوجھتی ہے۔ محمود کی ماں --- دیکھا تم نے پنجرے کو بل دے رہا تھا شیطان۔ محمود کی ماں --- اگر رشید بھی ذہین ہوتا تو اسے بھی رڑکی بھیجتے۔ مگر کوئی بات

نہیں --- کوئی بات نہیں --- یہ تو قدرتی باتیں ہیں۔ انسان کو ان باتوں میں دخل نہیں۔ ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کیوں محمود کی ماں --- یہ تم کیا دھو رہی ہو۔ تمہیں تو ہر وقت کام ہی رہتا ہے۔ ہاں رضیہ کہاں ہے۔ رشید میں کہتا ہوں، اس پنجرے کو نہ چھیڑ --- سنتا نہیں۔”

رشید باپ کی ان پیچیدہ باتوں کے دوران جمائیاں لے لے کر تھک جاتا۔ پھر دفعتاً اس کا جی چاہتا کہ زور سے مرغی کی دم کھینچے یا آپا کی ٹانگ میں چٹکی لے یا کسی رینگتی ہوئی چیونٹی کو پاؤں سے مل دے۔ دنیا میں سب سے زیادہ بدنما چیز اس کے نزدیک محمود کا طوطا تھا۔

رشید اپنی جگہ سے اٹھا۔ ایک اور انگڑائی لی --- “اچھا تو اب کیا کروں۔” اس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی مگر کوئی چیز اس کے لیے باعثِ دلچسپی نہ تھی۔ سیڑھیوں سے نیچے اتر کر اس نے دیکھا کہ ماں، آپا اور رضیہ باجی باورچی خانے میں ہیں --- ابا اور محمود کی آوازیں بیٹھک میں سے آ رہی تھیں۔ وہ باورچی خانے میں داخل ہوا۔ “اماں” اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ “بھوک لگ رہی ہے۔”

اماں بولی۔ “آ گئے۔ آنکھ کھل گئی۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ صبح اٹھ کر سکول کا کام کیا کرو۔”

آپا کہنے لگی۔ “اماں! محمود نے آج صبح ہی صبح دس سوال نکال لیے ہیں ---”

رشید نے ان باتوں پر دھیان نہ دیا۔ اس نے چاروں طرف سرسری سی نگاہ ڈالی اور پھر ماں سے لسی کا گلاس لے لیا۔

ماں نے کہا۔ “منہ ہاتھ تو دھو لیا کر۔ کتنا گندا ہے۔”

مگر رشید لسی پی چکا تھا۔ وہ اپنی قمیض سے منہ پونچھ کر گلاس صندوق پر رکھ کر باہر نکل آیا۔ کمرے میں سامنے چاقو پڑا تھا۔ اس نے چاقو اٹھا لیا اور سرسری طور پر میز کا کونہ کھرچنا شروع کر دیا۔ باہر بیٹھک سے ابا اور کسی مہمان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

“یہ بھی کیا عمر ہے --- بادشاہی عمر --- بچپن سے بڑھ کر زندگی میں کوئی خوشی نہیں۔”

رشید سوچ رہا تھا۔ بچپن سے بڑھ کر کوئی عمر نہیں۔ یہی بچپن --- آخر وہ کیا بات ہے جس کی بناء پر لوگ بچپن کو اس قدر سراہتے ہیں۔ کیا باقی، بچپن سے بھی زیادہ اکتا دینے والی ہے۔ اس نے ایک جھرجھری لی --- باہر ابا کہہ رہے تھے۔

“محمود --- محمود تو سوالوں میں بے حد طاق ہے۔ رڑکی ---! رڑکی سے بڑھ کر کوئی درسگاہ نہیں۔ سو روپیہ ماہوار خرچ۔ نصیب کی باتیں ہیں۔ وہ ہمارا رشید --- وہ سال اس سے بڑا ہے۔ بالکل کند ذہن، کام چور، نکما --- اللہ کا ہر حال میں شکریہ ادا کرنا چاہیے۔”

رشید اٹھ بیٹھا اور برابر والے کمرے میں چلا گیا۔ شاید اس کے لیے وہاں ابا کی آواز نہیں

پہنچتی تھی۔ یا اس لیے کہ سامنے پڑی ہوئی چٹائی سے تنکے کھینچنے کی خواہش اسے مجبور کر رہی تھی۔

باورچی خانے میں ماں کہہ رہی تھی کہ ”رضیہ وہ کہاں غائب ہوگیا ہے۔ جادیکھ تو کہیں میں صندوق میں سے کپڑے نکال کر پھاڑ تو نہیں رہا۔ میں بھی کتنی بھول کرتی ہوں۔ صبح صندوق کو کھولا تھا تو اسے بند نہیں کیا۔ جادیکھ تو --- توبہ میں تو اس لڑکے سے عاجز آچکی ہوں۔“

رضیہ کی آہٹ سن کر رشید چٹائی کو چھوڑ کر پرے جا بیٹھا اور ایک لوہے کے ٹکڑے سے ناخن کریدنے میں مشغول ہوگیا۔ رضیہ اندر آئی۔ اس نے نفرت سے کھولتی ہوئی نگاہ رشید پر ڈالی۔ مگر رشید بظاہر اپنے کام میں ہمہ تن مشغول تھا۔ پھر جب رضیہ صندوق کو تالا لگا رہی تھی تو نہ جانے رشید کو کیا ہوا۔ اس نے اپنے بازو میں شدید اکڑ سی محسوس کی۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر لپکا اور انگلیوں نے بڑھ کر رضیہ کی کمر میں چٹکی لے لی۔ اس نے بھاگتے ہوئے ”اوئی“ سنا اور پھر رضیہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی۔ مگر وہ غسل خانے پہنچ کر بالٹی میں ہاتھ ڈبو رہا تھا اور گرتے ہوئے قطروں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ قطروں کو گرتے ہوئے دیکھ کر اسے وہ بوڑھا فقیر یاد آگیا جس پر وہ چوبارے کی کھڑکی میں سے پتھر پھینکا کرتا تھا۔

بوڑھے کی عاجزانہ نگاہ --- بے بسی --- اور بے چارگی --- اس روز جب اس کی آنکھوں سے پانی قطروں میں گر رہا تھا کس قدر مضحکہ خیز شکل تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ باہر ماں غصے سے پوچھ رہی تھی۔

”رضیہ محمود کے طوطے کا پنجرہ یہاں دھوپ میں کس نے رکھا ہے؟“

رضیہ بولی۔ ”توبہ بی بی۔ میں نے تو ابھی اسے چوبارے میں رکھا دیکھا تھا۔ میں تو کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگاتی۔ میری تو بی بی یہ عادت ہی نہیں۔“

ماں نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”بس یہ اسی شیطان کی کارستانی ہے۔ نہ جانے محمود کے طوطے سے اسے کیا بیر ہے۔ اور بھائی ہوتے ہیں۔ آپس میں پیار اور محبت سے رہتے ہیں۔ اس لڑکے پر تو محمود کو دیکھ کر بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ رضیہ ---! لے۔ اسے چوبارے میں رکھ اور اس کی کٹوری میں پانی ڈال دے۔“

رشید دروازے سے جھانک رہا تھا۔ ”محمود کا طوطا“ اس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا۔ ”کیا ہوا۔ کیا ہوا۔ محمود کے طوطے کو؟“ ابا اندر آ کر کہہ رہے تھے۔ ”ہاں بس ایسا کون کام کرے گا۔ اس لڑکے میں تو ذرہ بھر رحم نہیں۔ قصائی ہے قصائی۔ صبح شام چیزیں الٹ پلٹ کرنے کے علاوہ اسے کوئی کام نہیں۔ کل میرے دفتر کے کاغذات کی بیڑیاں بنا رہا تھا۔ نامعقول! --- لے رضیہ اسے چوبارے میں لے جا۔ محمود تو طوطے پر جان چھڑکتا ہے۔ جب تک اسے کھلا نہ لے، خود نہیں کھاتا۔ اسے جانوروں سے کس قدر محبت ہے --- محمود کی ماں ---! محمود کی ماں!“

”کیوں ابا جی ---“ محمود نے اندر آتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں بیٹا۔“ باپ نے جواب دیا۔ ”رشید نے تمہارا طوطا دھوپ میں رکھ دیا تھا۔ بے چارے کا گرمی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ تم کہاں چلے گئے تھے۔“

اس پر محمود بولا۔ ”نہیں ابا جی! میں نے خود طوطے کو دھوپ میں رکھا تھا۔ اس نے پانی کی کٹوری الٹ دی تھی اور پانی میں تر بتر ہو رہا تھا۔ میں نے اسے سکھانے کے لیے دھوپ میں رکھ دیا۔ پھر اسے اٹھانا مجھے یاد نہیں رہا۔“

”محمود کی ماں --- محمود کی ماں ---“ باپ کہہ رہا تھا۔ ”تم نے سنا؟ محمود نے خود طوطے کو دھوپ میں رکھا تھا۔ محمود کی یہ بہت اچھی عادت ہے۔ دیکھو نا سچ سچ کہہ دینے سے بالکل نہیں گھبراتا۔ لو اگر رشید طوطے کو دھوپ میں رکھتا تو چاہے کچھ ہی ہو جاتا، وہ کبھی اقرار نہ کرتا۔ رضیہ --- رضیہ کہاں ہے رشید؟ رضیہ ---!“

”ابھی یہیں تھا۔“ ماں نے کہا۔ ”جانے کہاں چلا گیا ہے؟ گلی میں ہوگا۔ میں تو اس لڑکے سے تنگ آچکی ہوں۔“

”خیر کوئی بات نہیں۔ تم تو گھبرا جاتی ہو۔ یہیں کہیں ہوگا۔“ باپ نے اسے تسلی دی۔

رشید دبے پاؤں غسل خانے سے نکل کر چوبارے میں چلا گیا۔ بوڑھے فقیر کے آنے کا وقت ہو رہا تھا مگر وہ بوڑھا دو دن سے نہیں آیا تھا۔

رشید کے بدن میں ناامیدی سے سستی سی محسوس ہو رہی تھی اس واحد عشرت سے وہ گذشتہ دو دنوں سے محروم تھا۔ اس نے چھ سات موٹے موٹے پتھر چن لیے اور کھڑکی میں بیٹھ گیا۔ سامنے مکانوں کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ گلی میں خاک اڑ رہی تھی۔ دھوپ سے آنکھیں چندھائے جاتی تھیں۔ مکانوں سے پرے ریت کے ٹیلے کھڑے تھے۔ کہیں کہیں بگولے ناچ رہے تھے۔ وہ ان بگولوں کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔

آخر وہ فقیر کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا۔ اس نے جھرجھری لی۔ دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اپنی ٹھوڑی اس پر ٹکا دی۔ اور معصومیت بھرے انداز میں بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی مظلوم کے دکھ کو دیکھ کر وہ خدا سے اس کی نجات کے لیے دعا کر رہا ہو۔

انتظار سے مایوس ہو کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ سامنے والے مکان کے روشن دان پر پڑی۔ روشن دان میں سرخ شیشے کو دیکھ کر ایک بیگانہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آگئی۔ اس نے ایک پتھر اٹھا لیا اور اس سے کھیلنے لگا۔ پھر نہ جانے کیا سوجھی۔ اس کے بازو نے زور سے جھٹکا

کھایا--- پتھر سے سرخ شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی پھر وہ کھڑکی سے ہٹ کر چوکی پر آبیٹھا۔ سامنے محمود کا طوطا پھڑپھڑا رہا تھا۔ محمود کا طوطا--- اس کے دل سے آواز آئی۔ جیسے کوئی اسے چھیڑ رہا ہو۔ محمود کا طوطا--- محمود کا طوطا--- تمام فضا آوازوں سے بھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے لپک کر پنجرہ اتار لیا اور اسے دھوپ میں رکھ دیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ چوکی پر ابا کا بسترا دیکھ کر رشید ٹھٹھک گیا۔ اس نے استرا اٹھا لیا۔ پتہ نہیں اس کے دل میں کیا خیال آیا۔ منہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔ "محمود کا طوطا۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ پنجرے کے قریب ہو بیٹھا۔ پنجرے کا دروازہ کھل گیا۔ دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ حتیٰ کہ اسے بوڑھا فقیر بھی یاد نہ رہا۔ چخ چخ چخ--- لہو کی بوندیں اس کے ہاتھوں پر گر رہی تھیں--- سرخ رنگین مخمل سا لہو۔ کھڑکی سے باہر رنگین سنہری سرخی ناچ رہی تھی۔ دو بگولے آسمان پر مخملی قوس بن کر جھوم رہے تھے۔

"محمود کا طوطا۔" اس کے دل کا کوئی کونہ تمسخر سے کہہ رہا تھا۔ "محمود---!"

# آپا

جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا بلوری دیا آجاتا ہے جو مدھم لو سے جل رہا ہو۔

مجھے یاد ہے ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں' آپا اور امی جان کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا۔ ان دنوں بدو یہی چھ سات سال کا ہو گا۔ کہنے لگا۔ امی جان میں بھی باہ کروں گا۔

"اوہ--- ابھی سے۔" اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگیں۔ "اچھا بدو تمہارا بیاہ آپا سے کر دیں؟"

"اونہوں----" بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں کہنے لگیں۔ "کیوں آپا کو کیا ہے؟"

"ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔"

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگی۔ "کیوں--- دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں---!"

"میں بتاؤں کیسی ہے؟" وہ چلایا۔

"ہاں بتاؤ تو بھلا۔" اماں نے پوچھا۔ بدو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چولہے پر آ رکی۔ چولہے میں اپلے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ بدو نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "ایسی۔" پھر بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا۔ "اور چھاجو باجی ایسی۔" اس بات پر ہم سب دیر تک ہنستے رہے۔ اتنے میں تصدق بھائی آ گئے۔ اماں کہنے لگی۔ "تصدق بدو سے پوچھنا کہ آپا کیسی ہیں۔" آپا نے تصدق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو۔

"ہاں تو کیسی ہے آپا بدو؟" وہ بولے۔ "بتاؤں۔" بدو چلایا۔ اور اس نے اپلے کا ٹکڑا اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اسے ہاتھ میں لے کر ہمیں دکھانا چاہتا تھا مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی۔ "اونہہ۔" بدو رونے لگا تو ماں کہنے لگی۔ "پگلے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے۔ اس میں چنگاری ہے۔"

"وہ تو جلا ہوا ہے اماں!" بدو نے بسورتے ہوئے کہا۔

اماں بولیں۔ "میرے لال یہی تمہیں معلوم نہیں۔ اس کے اندر آگ ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔"

بدو نے بھولے پن سے پوچھا۔ "کیوں آپا! اس میں آگ ہے کیا؟"

اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ "میں کیا جانوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور پھنکنی سے اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں بے مصرف پھونکیں مارنے لگیں۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھی اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات ابھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسے پتے کی بات کہی تھی۔ مگر میں کہا کرتی تھی۔ "آپا تم تو بس بیٹھ رہتی ہو۔" اور وہ مسکرا کر کہتی۔ "پگلی" اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اسے کسی نہ کسی کام کے لیے کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑ جاتے۔ ادھر بدو چیختا۔ "آپا میرا ولیا۔" ادھر ابا گھورتے۔ "سجادہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی؟" بیچ میں اماں بول اٹھتی۔ "بٹیا دھوبی کب سے باہر کھڑا ہے۔" اور آپا چپ چاپ سارے کاموں سے نپٹ لیتی۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اس کے باوجود جانے کیوں اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے اور اسے ادھر سے ادھر گردن موڑنے میں بھی اتنی دیر لگتی ہے اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں سنا۔ زیادہ سے زیادہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس۔ البتہ وہ اکثر مسکرایا کرتی۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ہاں تو میں سمجھتی تھی کہ آپا بیٹھی ہی رہتی ہے۔ ذرا نہیں ہنستی اور بن چلے لڑھک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے۔ جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی تھی جیسے دادرے کی تال پر ناچ رہی ہو۔ اور اپنی خالہ زاد بہن ساجو باجی کو چلتے دیکھ کر میں کبھی نہ اکتائی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس رہے اور چلتی چلتی اسی طرح گردن موڑ کر پنچم آواز میں کہے۔ "ہیں جی--- کیوں جی؟" اور اس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگے۔ باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری لگتی تھی۔

ساحرہ اور ثریا ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ دن بھر ان کا مکان ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کے گھر میں جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ایک بیٹھ رہنے والی آپا، ایک "یہ کرو، وہ کرو" والی اماں اور دن بھر حقے پر گڑگڑانے والے ابا۔

اس روز جب میں نے ابا کو امی سے کہتے سنا، سچ تو یہ ہے کہ مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے۔ "سجادہ کی ماں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں۔"

"کیوں؟" اماں پوچھنے لگی۔

کہنے لگے۔ "بس تمام دن برتن بجتے رہتے ہیں--- اور یا قہقہے لگتے ہیں جیسے میلہ لگا ہو۔"

اماں تنک کر بولی۔ "مجھے کیا معلوم۔ آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔"

ابا کہنے لگے۔ "افوہ---! میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی، برتن بجنے لگے۔ بازار کے موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو نا ہماری سجادہ میں یہ بات نہیں۔" میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ بڑی آئی ہے سجادہ۔ جی ہاں۔ اپنی بیٹی جو ہوئی۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ جا کے باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑاؤں۔ اسی بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ ابا جانتے ہی کیا ہیں۔ بس حقہ لیا اور گڑگڑ کر لیا یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گٹ مٹ، گٹ مٹ کرنے لگے۔ جیسے کوئی بھٹیاری مکئی کے دانے بھون رہا ہو۔ سارے گھر میں لے دے کے صرف تصدق بھائی ہی تھے جو دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے اور جب ابا گھر پر نہ ہوتے تو وہ بھدی آواز میں گایا بھی کرتے تھے۔

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں، آنکھوں میں نمی سی ہے
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

آپا انہیں گاتے سن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو وہ بدو کو ہلکا سا چپر مار کر کہتی۔ "بدو رونا۔" اور پھر آپ ہی بیٹھی مسکراتی رہتی۔

تصدق بھائی میرے پھوپھا کے بیٹے تھے۔ انہیں ہمارے گھر آئے کوئی یہی دو ماہ ہوئے تھے۔ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے۔ پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھی تو باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھوپھی کہنے لگی، بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں۔ لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں۔ کہنے لگیں۔ "اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب۔" پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اماں کی تو عادت ہے کہ اگلی پچھلی بہت

سی باتیں لے بیٹھتی ہے۔ غرضیکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آ ٹھہرے۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدو سے تو وہ دن بھر نہ اکتاتے۔ البتہ آپا سے زیادہ باتیں نہ کرتے۔ کرتے بھی کیسے۔ جب کبھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو آپا کے دوپٹے کا پلو آپ ہی آپ سرک کر نیم گھونگھٹ بن جاتا اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدت سے مصروف دکھائی دیتیں۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا ان کی باتیں بڑے غور سے سنا کرتی تھی گو کہتی کچھ نہ تھی۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے لیکن صرف اس وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے۔ پوچھتے۔ ”بدو تمہاری آپا کیا کر رہی ہے؟“

”آپا---“ بدو لاپرواہی سے دہراتا۔ ”بیٹھی ہے--- بلاؤں؟“

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے۔ ”نہیں نہیں۔ اچھا بدو--- آج تمہیں یہ دیکھو۔ اس طرف۔ تمہیں دکھائیں۔“ اور جب بدو کا دھیان ادھر ادھر ہو جاتا تو مدھم سی آواز میں کہتے۔ ”ارے یار تم تو مفت کا ڈھنڈورا ہو۔“ بدو چیخ اٹھتا۔ ”کیا ہوں میں؟“ اس پر وہ میز بجانے لگتے۔ ڈمگ ڈمگ--- ڈھنڈورا یعنی یہ ڈھنڈورا ہے۔ دیکھا جسے ڈھول بھی کہتے ہیں۔ ڈمگ ڈمگ سمجھے اور آپا اکثر چلتے چلتے ان کے دروازے پر رک جاتی اور ان کی باتیں سنتی رہتی۔ اور پھر چولہے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی۔ اس وقت اس کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا۔ بالوں کی لٹ پھسل کر گالوں پر آ گرتی اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں چولہے میں ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتیں۔ آپا کے ہونٹ یوں ہلتے گویا گا رہی ہو۔ مگر الفاظ سنائی نہ دیتے۔ ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آجاتے تو آپا ٹھٹک کر یوں اپنا دوپٹہ، بال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بیگانہ آ گیا ہو۔

ایک دن میں، آپا اور اماں صحن میں تھیں۔ اس وقت بھائی اندر اپنے کمرے میں بدو سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بھائی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ بھائی صاحب بدو سے کہہ رہے تھے۔ ”میرے یار ہم تو اس سے بیاہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے۔ کتابیں پڑھ سکے۔ شطرنج، کیرم اور چڑیا کھیل سکے۔ چڑیا جانتے ہو؟ وہ گول گول پروں والا گیند بلے سے یوں ڈزٹن ڈز۔ اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزیدار کھانے پکا کر کھلا سکے۔ سمجھے---؟“

بدو بولا۔ ”ہم تو چھاجو باجی سے باہ کریں گے۔“

”اونہہ---“ بھائی نے کہا۔

بدو چیخنے لگا۔ ”میں جانتا ہوں۔ تم آپا سے بیاہ کرو گے--- ہاں۔“

اس وقت اماں نے آپا کی طرف دیکھا مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔ ”واہ تمہاری آپا فرنی پکاتی ہے تو پوری طرح شکر بھی نہیں ڈالتی۔ بالکل پھیکی--- آخ تھو۔“

بدو نے کہا۔ ”ابا جو کہتے ہیں کہ فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہیے۔“

”تو وہ اپنے ابا کے لیے پکاتی ہے، ہمارے لیے تو نہیں۔“

”میں کہوں آپا سے؟“ بدو چیخا۔

بھائی چلائے۔ ”اوہ پگلا۔ ڈھنڈورا۔ لو تمہیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں۔ یہ دیکھو اس طرح--- ڈمگ ڈمگ۔“ بدو پھر چلانے لگتا۔ ”میں جانتا ہوں۔ تم میز بجا رہے ہو نا؟ ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈورا پٹتا ہے نا۔“ بھائی کہہ رہے تھے۔ ”کشتیوں میں۔ اچھا بدو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے۔ آؤ ہم تم کشتی لڑیں۔ میں ہوا گاما اور تم بدو پہلوان۔ ذرا ٹھہرو جب میں تین کہوں تب۔“ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مدھم آواز سے کہا۔ ”ارے یار! تمہاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے۔“

میرا خیال ہے آپا ہنسی نہ روک سکی۔ اس لیے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا اور اماں نے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا۔

میں اور آپا دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھائی صاحب آ گئے اور کہنے لگے۔ ”کیا پڑھ رہی ہو جج ہے نا؟“ ان کے منہ سے جیہنا سن کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی۔ نورجہاں کیسا پرانا نام ہے۔ بولتے ہی منہ میں باسی روٹی کا مزہ آنے لگتا ہے۔ میں تو نورجہاں سن کر یوں محسوس کیا کرتی تھی جیسے کوئی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی اماں سونٹا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہو۔ مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوارنے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے منہ سے جیہنا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور میں محسوس کرتی گویا ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجادہ سے سجدے کہا کرتے تھے۔ مگر وہ تو پرانی بات تھی۔ جب آپا چھوٹی تھی۔ اب تو بھائی اسے سجدے نہ کہتے بلکہ اس کا پورا نام تک لیتے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دیا۔ ”سکول کا کام کر رہی ہوں۔“ پوچھنے لگے کہ تم نے کوئی برنارڈ شا کی کتاب پڑھی ہے کیا؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

انہوں نے میرے اور آپا کے درمیان والی دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہاری آپا نے تو ہارٹ بریک ہاؤس پڑھی ہو گی۔“ وہ کنکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آپا نے نظریں اٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا اور مدھم سی آواز میں کہا۔ ”نہیں۔“ اور سویٹر بننے میں

لگی رہی۔

بھائی بولے۔ "کیا بتاؤں جیہنا کہ وہ کیا چیز ہے۔ نشہ ہے نشہ۔ خالص شہد۔ تم اسے ضرور پڑھو۔ بالکل آسان ہے یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا۔ میرے پاس پڑی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ضرور پڑھوں گی۔"

پھر پوچھنے لگے۔ "میں کہتا ہوں تمہاری آپا نے میٹرک کے بعد پڑھنا کیوں چھوڑ دیا؟"

میں نے چڑ کر کہا۔ "مجھے کیا معلوم۔ آپ خود ہی پوچھ لیجئے۔" حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آپا نے کالج جانے سے کیوں انکار کیا تھا۔ "میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا۔ وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی نمائش گاہ ہو۔ درسگاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی۔ جیسے مطالعے کے بہانے میلہ لگا ہو۔" مجھے آپا کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھر بیٹھ رہنے والی ہے۔ کالج جانا نہیں چاہتی۔ بڑی آئی تھی نکتہ چیں۔

اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو خواہ مخواہ چڑ جاتی۔ آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی اور آپا آپا کر رہے ہیں اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب؟ میں کیا ٹیلی فون تھی؟ خود آپا سے پوچھ لیتے اور آپا بیٹھی ہوئی گم صم بھیگی بلی۔

شام کو ابا کھانے پر بیٹھے ہوئے چلا اٹھے۔ "آج فرنی میں اتنی شکر کیوں ہے؟ قند سے ہونٹ چپکے جا رہے ہیں۔ سجادہ--- سجادہ بیٹی۔ کیا چینی اتنی سستی ہو گئی ہے۔ ایک لقمہ نگلنا مشکل ہو رہا ہے۔"

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھوم رہی تھیں۔ حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا مگر اس وقت اس کے گال تمتما رہے تھے۔ کہنے لگی۔ "شاید زیادہ پڑ گئی ہو۔" یہ کہہ کر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی اور میں دانت پیس رہی تھی۔ شاید کیا خوب شاید۔

ادھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے۔ "چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں، فرنی میں قند بڑھتی جا رہی ہے۔" صحن سے اماں دوڑی دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں جیسے ان کی عادت ہے۔ "آپ تو ناحق بگڑتے ہیں۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں۔ اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے۔ اس کا تو خیال کرنا چاہیے۔" ابا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی کہنے لگے۔ "اوہ یہ بات ہے۔ مجھے بتا دیا ہوتا۔ میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں---" اور وہ دونوں آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔

آپا ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی تو میں بڑی حیران ہوئی۔ آپا ان سے ملنا تو کیا بات تک کو ناپسند کرتی تھی۔ بلکہ اس کے نام پر ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ ضرور کوئی بھید ہے اس بات میں۔ کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کر کے اس پر چڑھ کر ہماری

طرف جھانکتی اور کسی نہ کسی بہانے سلسلہ گفتگو قائم کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے دو ایک باتیں کر کے اسے ٹال دیتی۔ آپ ہی بول اٹھتی۔ "ابھی تو اتنا کام پڑا ہے اور میں یہاں کھڑی ہوں۔" یہ کہہ کر باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ خیر اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر جب آپا لوٹ آئی تو کچھ عرصے کے بعد چپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر جا پہنچی۔ باتوں ہی باتوں میں، میں نے ذکر چھیڑ دیا۔ "آج آپا آئی تھی؟"

ساحرہ نے ناخن پالش لگاتے ہوئے کہا۔ "ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے۔ نہ جانے کیا نام ہے اس کا--- ہارٹ بریک ہاؤس۔"

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا کہ رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی۔ اسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دو ایک چھوٹی انگڑائی لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں لیٹ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا۔ "آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے؟ دل توڑنے والا گھر--- اس کے کیا معنی ہوئے؟" پہلے تو آپا ٹھٹک گئی۔ پھر سنبھل کر بیٹھ گئی مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی خاموشی سے جل کر کہا۔ "اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے۔" کہنے لگی۔ "میں کیا جانوں۔"

میں نے اسے جلانے کو کہا۔ "ہاں ہماری آپا بھلا کیا جانے۔" میرا خیال ہے یہ بات اسے ضرور بری لگی۔ کیونکہ اس نے کتاب رکھ دی اور بتی بجھا کر سو گئی۔

ایک دن یوں ہی پھرتے پھراتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی۔ پہلے تو بھائی جان ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر پوچھنے لگے۔ "جیہنا اچھا یہ بتاؤ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاد بنانا آتا ہے؟" میں نے کہا۔ "میں کیا جانوں۔ جا کر آپا سے پوچھ لیجئے۔" ہنس کر کہنے لگے۔ "آج کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو؟" میں نے ان کی بات کا جواب نہ دیا۔ پھر بولے۔ "نہیں۔ ابھی تو لڑکی ہو۔ شاید کسی دن لڑاکا بن جاؤ۔" اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے۔ "دیکھو جیہنا مجھے لڑنا بے حد پسند ہے۔ میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک مجھ سے لڑ سکے اور نہ اکتائے۔" میں شرما گئی اور بات بدلنے کی خاطر پوچھا۔ "فروٹ سلاد کیا ہوتا ہے بھائی جان؟"

بولے۔ "وہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ سفید سفید، لال لال، کالا کالا، نیلا نیلا سا۔" میں ان کی بات سن کر بہت ہنسی۔ پھر کہنے لگے۔ "وہ مجھے بے حد پسند ہے۔ یہاں تو ہے ناہم فرنی کھا کھا کر اکتا گئے۔"

میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی ہوگی کیونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی "

نعمت خانہ ” پڑھ رہی تھیں۔ اس دن کے بعد روز بلاناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاد بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس جاتا تو جھٹ فروٹ سلاد کی کشتی چھپا دیتی۔

ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدو سے پوچھا۔ “بدو بھلا بوجھو تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے‘ اس میں کیا ہے؟”

بدو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدو کو دینی ہی پڑی۔ پھر میں نے بدو کو اور بھی چمکا دیا۔ میں نے کہا۔ بدو جاؤ تو بھائی جان سے پوچھو۔ اس کھانے کا کیا نام ہے۔”

بدو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا تو آپا نے اٹھ کر کشتی اس سے چھین لی اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس روز پہلی مرتبہ آپا نے مجھے غصے سے گھورا تھا۔

اس رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی۔ مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی بات پر بہت افسوس ہوا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں مگر ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی۔

انہیں دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جسے ہم سب ساجو باجی کہا کرتے تھے۔ میٹرک کا امتحان دینے کے لیے ہمارے گھر آ ٹھہریں۔ ساجو باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ساحرہ اور ثریا چارپائیوں پر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں۔ بدو چھاجو باجی۔ چھاجو باجی چیختا پھرتا اور کہتا۔ “ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔”

باجی کہتی۔ “شکل تو دیکھو اپنی۔ پہلے منہ دھو آؤ۔” پھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گردن موڑتی کہ کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکراتے اور وہ پنچم تان میں پوچھتی۔ “ہے نا بھائی جان۔۔۔!”

باجی کے منہ سے “بھئی جان۔” ایسا بھلا سنائی دیتا تھا کہ میں خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا بھائی صاحب کہتی تو کیسا بھدا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر صاحب جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو مگر باجی صاحب کی جگہ جا آن کہہ کر وہ اس سادے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی۔ جا آن کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ بھئی جا آن کہہ کر وہ ایسی کالی کالی آنکھوں میں مسکراتی کہ سننے والے کو قطعی یہ گمان نہ ہوتا کہ اسے بھائی کہا گیا ہے۔ آپا کے بھائی صاحب اور باجی کے بھائی جان میں کتنا فرق تھا۔

باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھ رہنا بالکل بیٹھ رہنا ہو گیا۔ بدو نے بھائی جان سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ باجی کے گرد طواف کرتا رہتا اور باجی بھائی جان سے کبھی شطرنج اور کبھی کیرم کھیلتی۔

باجی کہتی۔ “بھائی جان ایک بورڈ لگے گا۔” یا بھائی جان باجی کی موجودگی میں بدو سے کہتے۔ “کیوں میاں بدو کوئی ہے جو ہم سے شطرنج میں پٹنا چاہتا ہو؟” باجی بول اٹھتی۔ “آپا سے پوچھئے۔” بھائی کہتے۔ “اور تم۔۔۔” باجی جھوٹ موٹ کی سوچ میں پڑ جاتی۔ چہرے پر سنجیدگی پیدا کر لیتی۔ بھنوئیں سمٹا لیتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی ہو جاتی پھر کہتی۔ “اونہہ مجھ سے تو آپ پٹ جائیں گے۔” بھائی جان کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے۔ “کل جو پٹی تھیں‘ بھول گئیں کیا؟” وہ جواب دیتی۔ “میں نے کہا چلو بھئی جا آن کا لحاظ کر دو۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ وہ مجھ سے ہار گئے۔” اور پھر یوں ہنستی جیسے گھنگھرو بج رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے ہی میں بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو چھاجو باجی‘ چھاجو باجی کہتا ہوا باجی کا پلو پکڑے اس کے ارد گرد گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو چھیڑ رہی تھی۔ کہتی تھی۔ “بھائی جا آن تو صرف ساڑھے چھ پھلکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فرنی کی پلیٹ مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کریں بھی کیا۔ نہ کھائی تو ممانی ناراض ہو جائیں۔ انہیں جو خوش رکھنا ہوا۔ ہے نا بھئی جا آن۔” ہم سب اس بات پر خوب ہنسے۔ پھر باجی ادھر ادھر ٹہلنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا اور کشتی کو اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے آپا کچھ کہہ سکے‘ باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی۔ “لیجئے بھائی جا آن!” اس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا۔ “آپ بھی کیا کہیں گے کہ ساجو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں۔”

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا۔ “خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے۔ کس نے بنایا ہے؟” باجی نے آپا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔ “ساجو باجی نے اور کس نے بھئی جا آن کے لیے۔” بدو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلا اٹھا۔ “میں بتاؤ بھائی جان۔۔۔” آپا نے بڑھ کر بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئی۔ باہر آپا الگنی کے قریب کھڑی تھی۔ بھائی جان نے مدھم آواز میں کچھ کہا۔ آپا نے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باجی کی آواز آئی۔ “چھوڑیئے چھوڑیئے۔” اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے بدو بھی کہیں ادھر ادھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسب معمول بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی۔ “آج ایک دھند ناتا بورڈ کر دکھاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟” بھائی جان بولے۔ “واہ یہاں کک لگاؤں تو جانے کہاں جا پڑو۔” غالباً انہوں نے باجی کی طرف ذرا سے پیر چلایا ہو گا۔ وہ بناوٹی غصے میں چلائی۔ “وہ آپ تو ہمیشہ پیر ہی سے چھیڑتے ہیں۔” بھائی جان معاً بول اٹھے۔ “تو کیا ہاتھ سے۔۔۔” “چپ

خاموش۔" باجی چیخی۔ اس کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ تک تو پکڑ دھکڑ سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آیا۔ کہنے لگا۔ "آپا اندر بھائی جان باجی سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ چلو دکھاؤں تمہیں۔ چلو بھی۔" وہ آپا کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ وہ بت بنی کھڑی تھی۔ بدو نے آپا کو چھوڑ دیا وہ کہنے لگا۔ "اماں کہاں ہے؟" اور اماں کو بلانے کے لیے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھالیا اور باورچی خانے میں لے گئی۔

اسی شام میں نے کتابوں کی الماری کھولی تو اس میں آپا کی ہارٹ بریک ہاؤس پڑی تھی۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو۔ میں حیران ہوئی کہ بات کیا ہے۔ مگر آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاد والی کشتی خالی پڑی تھی۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

بھائی تصدق اور باجی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باجی وہ باجی نہ تھی۔ اس کے قہقہے بھی نہ تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور ماتھے پر شکن چڑھی تھی۔ بھائی جان بھی چپ چپ رہتے تھے۔ ایک شام اماں کے سوا ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ بھائی کہنے لگے۔ "بدو ساجو باجی سے بیاہ کرو گے؟"

"اونہہ۔" بدو نے کہا۔ "ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "بھائی جان یاد ہے جب بدو کہا کرتا تھا۔ ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔" اماں نے پوچھا۔ "آپا سے کیوں نہیں؟" تو کہنے لگا۔ "بتاؤں آپا کیسی ہے--- پھر چولہے میں جلے ہوئے اپلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا--- ایسی۔ اور چھاجو باجی روشن بلب کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے--- ایسی۔" عین اسی وقت بجلی بجھ گئی اور کمرے میں انگاروں کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا۔ "جہاں یاد ہے۔" بھائی نے کہا۔ پھر جب باجی کسی کام کے لیے باہر چلی گئی تو بھائی کہنے لگے۔ "نہ جانے اب بجلی کا کیا ہو گیا ہے۔ جلتی بجھتی رہتی ہے۔" آپا چپ چاپ بیٹھی چولہے میں راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم آواز میں کہا۔ "اف کتنی سردی ہے۔" پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولہے کے سامنے جا بیٹھے اور سلگتے ہوئے اپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے۔ بولے۔ "ممانی سچ کہتی تھیں کہ ان جلے ہوئے اپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے۔ اوپر سے نہیں دکھتی۔ کیوں سجدے۔" آپا پرے سرکنے لگی تو چھن سی آواز آئی جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے۔ "اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ۔ سجدے دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے۔"

---

Nafrat

# نفرت

عجیب واقعات تو دنیا میں ہوتے ہی رہتے ہیں مگر ایک معمولی سا واقعہ نازلی کی طبیعت کو یک لخت قطعی طور پر بدل دے، یہ میرے لیے بے حد حیران کن بات ہے۔ اس کی یہ تبدیلی میرے لیے معمہ ہے۔ چونکہ اس واقعہ سے پہلے مجھے یقین تھا کہ اس کی طبیعت کو بدلنا قطعی ناممکن ہے۔ اس لیے اب میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ نازلی وہ نازلی ہی نہیں رہی جو بچپن سے اب تک میری سہیلی تھی۔ جیسے اس کی اس تبدیلی میں انسان کی روح کی حقیقت کا بھید چھپا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک بہت ہی معمولی واقعہ تھا یعنی کسی بھدے سے بدنما آدمی سے خدا واسطے کا بغض محسوس کرنا--- کتنی عام سی بات ہے۔

سہیلی کے علاوہ وہ میری بھابی تھی۔ کیونکہ اس کی شادی بھائی مظفر سے ہو چکی تھی۔ اس بات کو تقریباً دو سال گزر چکے تھے۔ مظفر میرے ماموں زاد بھائی ہیں اور جالندھر میں وکالت کرتے ہیں۔

یہ واقعہ لاہور اسٹیشن پر ہوا۔ اس روز میں اور نازلی دونوں لائل پور سے جالندھر کو آ رہی تھیں۔

ایک چھوٹے سے درمیانے درجے کے ڈبے میں ہم دونوں اکیلی بیٹھی تھیں۔ نازلی پردے کی سخت مخالف تھی۔ برقعے کا بوجھ اٹھانا اس سے دوبھر ہو جاتا تھا۔ اس لیے گاڑی میں داخل ہوتے ہی اس نے برقع اتار کر لپیٹا اور سیٹ پر رکھ دیا۔ اس روز اس نے زرد رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی جس پر طلائی حاشیہ تھا۔ زرد رنگ اسے بہت پسند تھا اور اس کے گورے گورے جسم میں گلابی جھلک پیدا کر دیتا تھا۔

اس کی یہ بے پردگی اور بے باکی مجھے پسند نہ تھی۔ مگر اس بات پر اسے کچھ کہنا بے کار تھا۔ آتے جاتے لوگ اس کی طرف گھور گھور کر دیکھتے مگر وہ اپنے خیالات میں یوں مگن تھی جیسے جنگل میں ن تنہا بیٹھی ہو۔ دو تین گھنٹے تو یونہی گزر گئے مگر لاہور کے قریب جانے کون سا اسٹیشن تھا، جہاں سے

دو نوجوان لڑکے سوار ہوئے۔ مجھے تو کسی کالج کے طالب علم نظر آتے تھے۔ ان لڑکوں نے ہر اسٹیشن پر گاڑی سے اتر کر ہمیں تاڑنا شروع کر دیا۔ ہمارے ڈبے کے سامنے آ کھڑے ہوتے اور متبسم نظروں سے ہماری طرف دیکھتے۔ پھر آپس میں باتیں کرتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے۔ نازلی ویسے ہی بے باکی سے کھڑکی میں بیٹھی رہی بلکہ میرا خیال ہے کہ اسے اتنا بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ نوجوان اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت وہ ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ میرے لیے اس کی یہ بے نیازی بے حد پریشان کن تھی۔ میں کچھ شرم اور کچھ غصہ محسوس کر رہی تھی۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔

میں نے کہا۔ ”نازلی برقع پہن لو۔ دیکھو لڑکے کب سے تمہیں تاڑ رہے ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“ اس نے چونک کر کہا، پھر مسکرا دی۔ ”دیکھنے دو۔ ہمارا کیا لیتے ہیں۔ آپ ہی اکتا جائیں گے---بے چارے۔“

”مگر برقع اوڑھ لینے میں کیا حرج ہے؟“

”اگر برقع اوڑھنے سے لوگ یوں گھورنا چھوڑ دیں تو شاید عورتیں برقع اوڑھنا ترک کر دیں۔ برقع پہن لوں تو یہی ہو گا کہ سامنے کھڑے ہونے کی بجائے ادھر ادھر منڈلاتے پھریں گے۔“

”تم بھی حد کرتی ہو۔“

”میں کہتی ہوں نجمی ایمان سے کہنا۔ کیا تم اپنے آپ کو چھپانے کے لیے برقع پہنتی ہو؟“ وہ مجھے نجمی کہا کرتی تھی۔ چونکہ اس کے خیال کے مطابق نجم النساء گنگنا نام تھا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔ ”اچھا مان لیا کہ تم واقعی اپنے آپ کو چھپانے کے لیے برقع پہنتی ہو۔ چلو مان لیا برقع پہن کر تم لوگوں پر یہ ظاہر کرتی ہو کہ اس برقعے میں چھپانے کے قابل چیز ہے۔ یعنی ایک خوب صورت لڑکی ہے۔ یقین نہ ہو تو خود دیکھ لیجیے اور یہ برقع تو دیکھو۔“ اس نے میرے برقعے کو ہاتھ میں مسلتے ہوئے کہا۔ ”یہ ریشمی بوسکی فیتے۔ جھالر یہ تو برقع بذات خود خوب صورت ہے اور برقعے والی کیا ہو گی۔ اندازہ کر لیجیے۔ واہ کیا خوب پردہ ہے۔“

”تم خواہ مخواہ بگڑتی ہو۔“ میں نے تنک کر کہا۔ ”بگڑنا تو خیر ہو گا---مجھے تمہاری طرح بننا نہیں آتا۔“ ”پگلی کبھی عورت بھی پردے میں رہ سکتی ہے۔ دیکھتی نہیں ہو۔ عورتوں نے پردے کو بھی زیبائش بنا دیا ہے۔ آخر جو بات ہے اسے ماننے میں کیا حرج ہے؟“ یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی---

”تمہیں تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔“ میں نے بگڑ کر کہا۔

”لو اور سنو۔ جو ہم کہیں، وہ تو ہوا مذاق اور جو آپ کہیں، وہ حقیقت ہے۔“

”اچھا بابا معاف کرو۔ بھول ہوئی۔ اب برقعہ تو اٹھا لو کیا ان درختوں سے بھی پردہ کرو گی؟“

”تمہارے خیالات بہت عجیب ہیں۔“ میں نے برقعہ اتارتے ہوئے کہا۔ اسٹیشن بہت دور رہ گیا تھا اور گاڑی ایک وسیع میدان سے گزر رہی تھی۔

”عجیب---ہاں عجیب ہیں۔ اس لیے کہ وہ میرے اپنے ہیں۔ اگر میں بھی تمہاری طرح سنی سنائی باتیں شروع کر دوں تو تم مجھ سے کبھی ناراض نہ ہو۔“

”سنی سنائی---؟“

”ہاں سنی سنائی۔ اس لیے کہ یہ باتیں ظہیر صاحب کو بہت پسند ہیں اور تم چاہتی ہو کہ وہ تمہیں چاہیں۔ تمہارے میاں جو ہوئے۔ یہ سنہری چوڑیاں ہی دیکھو۔ یاد ہے تم سنہری چوڑیوں کو کیسی نفرت کی نظر سے دیکھا کرتی تھیں؟ مگر یہ انہیں پسند ہیں نا۔ اس لیے یہ بوجھ اٹھائے پھرتی ہو۔ ان کی محبت کی محتاج جو ٹھہریں۔ ایمان سے کہنا۔ کیا یہ غلط ہے؟ مجھے تو ایسی محتاجی گوارا نہیں۔ تم ہی نے تو مردوں کا مزاج بگاڑ رکھا ہے۔ ورنہ وہ بے چارے۔“

”تمہیں بھی تو زرد رنگ پیارا ہے نا؟“

”ہاں ہے اور رہے گا۔ میری اپنی پسند ہے۔ میں اپنے میاں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی نہیں بننا چاہتی کہ جیسا جی چاہیں، نچا لیں۔ میں نے ان سے بیاہ کیا ہے۔ ان کے پاس اپنی روح گروی نہیں رکھی اور تم---تمہاری تو مرضی ہے ہی نہیں۔ تم تو ہوا کے رخ میں اڑنا چاہتی ہو۔“

دفعتاً گاڑی نے جھٹکا کھایا اور وہ لڑھک کر مجھ پر آ گری۔

”یہ جھوٹ بولنے کی سزا ہے۔“ میں نے اسے چھیڑنے کو کہا اور ہم دونوں ہنس پڑیں۔ گاڑی اسٹیشن پر رک گئی۔ دونوں جوان گاڑی سے اتر کر ہمارے سامنے آ کھڑے ہوئے اور نازلی کو تاڑنے لگے۔ اس نے دو ایک مرتبہ ان کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر نفرت بھرا تمسخر کھیل رہا تھا۔ ”بے چارے۔“ اس نے دبی آواز میں کہا۔ ”مجھے تو ان پر ترس آتا ہے۔“ اور وہ ویسے ہی بیٹھی رہی۔ نہ جانے اس کی بے باکی اور بے پروائی دیکھ کر یا کسی اور وجہ سے وہ اور بھی دلیر ہو گئے۔ پہلے تو آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر ان میں سے جو زیادہ دلیر معلوم ہوتا تھا، ہمارے ڈبے کی طرف بڑھا۔ مگر نازلی کے انداز کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ کچھ دیر کے لیے وہ رک گیا۔ ہاتھ سے اپنی نکٹائی سنواری۔ بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ رومال نکالا اور پھر کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر ادھر ادھر دیکھا اور آخر ہمت کر کے نازلی کے قریب آ کھڑا ہوا اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو---“

میں تو ڈر کے مارے پسینہ پسینہ ہو گئی۔ مگر نازلی ویسے ہی بیٹھی رہی اور نہایت سنجیدگی سے کہنے لگی۔ ”ہاں صرف اتنی مہربانی فرمایئے کہ یوں سامنے کھڑے ہو کر ہمیں گھوریئے نہیں۔ شکریہ۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔ اس وقت نازلی کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں حیران ہو رہی

تھی۔ اس میں کتنی ہمت تھی۔ خیر نوجوان کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ کھسیانا ہو کر واپس چلا گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں ہمیں کہیں نظر نہ آئے۔

ان دنوں نازلی کی طبیعت بے حد شوخ تھی مگر شوخی کے باوجود وہ کبھی کبھی ایسی سنجیدگی سے کوئی بات کہہ دیتی کہ سننے والا پریشان ہو جاتا۔ ایسے وقت مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اس نسوانی جسم کی تہہ میں کوئی مردانہ روح جی رہی ہو۔ مگر اس کے باوجود کو مردوں سے دلچسپی نہ تھی۔ یعنی وہ مردوں کی طرف آنکھیں چمکا چمکا کر دیکھنے والی عورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ اسے جذبہ محبت کے خلاف بغض تھا۔ مظفر بھائی دو سال کے عرصہ میں بھی اسے سمجھ نہ سکے تھے۔ شاید اسی لیے وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔ نازلی انہیں اس قدر پیاری تھی۔ حالانکہ وہ ان کے روبرو ایسی باتیں کہہ دینے سے کبھی نہ جھجکتی تھی جو کسی عام خاوند کو سننا گوارا نہیں ہوتیں مگر وہ نازلی کی باتیں سن کر ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔

لاہور پہنچنے تک میں نے منت سماجت کر کے اسے برقع پہننے کے لیے منا لیا۔ رات کو آٹھ بجے کے قریب ہم لاہور پہنچ گئے۔ وہاں ہمیں ڈیڑھ گھنٹہ جالندھر جانے والی گاڑی کا انتظار کرنا تھا۔ ہم اس پلیٹ فارم پر جا بیٹھے جہاں سے ہماری گاڑی کو چلنا تھا۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ یہاں وہاں کہیں کہیں کوئی مسافر بیٹھا اونگھ رہا تھا یا کبھی کبھار کوئی وردی پوش بابو یا قلی تیزی سے ادھر سے ادھر گزر جاتا۔ مقابل کے پلیٹ فارم پر ایک مسافر گاڑی کھڑی تھی اور لوگ ادھر ادھر چل پھر رہے تھے۔ ہم دونوں چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ ”لاحول ولا قوۃ“

میں نے نازلی کو کہتے سنا۔ دیکھا تو اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ”کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے انگلی سے ساتھ والے بنچ کی طرف اشارہ کیا۔

بنچ پر بجلی بتی کے نیچے دو جوان بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

”توبہ---! جانگلی معلوم ہوتے ہے۔“ نازلی نے کہا۔

سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کی ہیئت واقعی عجیب تھی جیسے گوشت کا بڑا سا لوتھڑا ہو۔ سوجا ہوا چہرہ، سانولا رنگ، تنگ پیشانی پر دو بھدی اور گھنی بھنویں پھیلی ہوئی تھیں۔ جن کے نیچے دو اندر دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی سانپ کی سی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چھاتی اور کندھے بے تحاشا چوڑے تھے جن پر سیاہ لمبا کوٹ یوں پھنسا ہوا تھا جیسے پھٹا جا رہا ہو۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے تنگ جسم میں بہت سی جسمانی قوت ٹھونس رکھی ہو۔

چہرے پر بے زاری چھائی ہوئی تھی۔ اس کی حرکات بھدی اور مکروہ تھیں۔ ”دیکھو تو---“ نازلی بولی۔ ”اس کے اعضاء کس قدر بھدے ہیں؟ انگلیاں تو دیکھو۔“ اس نے جھرجھری لی اور اپنا منہ

پھیر لیا۔

”تم کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ جانگلی ہے تو پڑا ہو۔“ میں نے کہا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اس کی نگاہیں بھٹک کر اسی شخص پر جا پڑیں جیسے وہ اسے دیکھنے پر مجبور ہو۔ ”اسے کھاتے ہوئے تو دیکھنا---توبہ ہے۔“ نازلی نے یوں کہا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔

”صرف ایک گھنٹہ باقی ہے۔“ میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تاکہ اس کا دھیان کسی اور طرف لگ جائے مگر اس نے میری بات نہ سنی اور ویسے ہی گم صم بیٹھی رہی۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ ہونٹ نفرت سے بھنچے ہوئے تھے۔

میں نے اسے کبھی ایسی حالت میں نہ دیکھا تھا۔ اس کے برعکس کئی بار جب مظفر بھائی کسی دہشت ناک قتل کی تفصیلات سناتے اور ہم سب ڈر اور شوق کے مارے چپ چاپ بیٹھے سن رہے ہوتے، اس وقت نازلی بے زاری سے اٹھ بیٹھتی اور جمائی لے کر کمرے سے باہر چلی جاتی۔

مگر اس روز اس کا ایک اجنبی کی انگلیوں اور کھانے کے انداز کو یوں غور سے دیکھنا میرے لیے باعث تعجب تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی شکل دیکھ کر مجھے خود ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ ”دیکھا نا؟“ میں نے بات بدلنے کی غرض سے کہا۔ ”تم جو بھائی مظفر کی انگلیوں پر ہنسا کرتی ہو۔ یاد ہے تم کہا کرتی تھیں، یہ انگلیاں تو سوئی کا کام کرنے کے لیے بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یاد ہے نا؟“

”توبہ ہے۔“ نازلی نے نحیف آواز میں کہا۔ ”اس کا بس چلے تو سب کو کچا ہی کھا جائے۔ کوئی مردم خور معلوم ہوتا ہے۔“ وہ اپنی ہی دھن میں بیٹھی کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھی جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ اس کے بعد میں نے اس سے کچھ کہنے کا خیال چھوڑ دیا۔ دیر تک میں ادھر ادھر دیکھتی رہی حتیٰ کہ میں نے اپنے بازو پر اس کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔

”نجمی چلو کہیں دور جا بیٹھیں۔ ضرور یہ کوئی مجرم ہے۔“

”پگلی۔“ میں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر جانگلی کو دیکھتے ہی مسکراہٹ خشک ہو گئی۔ جانگلی اپنے دھیان میں بیٹھا ہاتھ دھو رہا تھا۔ واقعی اس کی انگلیاں سلاخوں کی طرح موٹی اور بے تکی تھیں۔ میرے دل پر نامعلوم خوف چھا رہا تھا۔ پلیٹ فارم میری آنکھوں میں دھندلا دکھائی دینے لگا۔ پھر دونوں نے آپس میں باتیں کرنا شروع کر دی۔

”شادی؟“ جانگلی نے کہا اور اس کی آواز یوں گونجی جیسے کوئی گھڑے میں منہ ڈال کر بول رہا ہو۔ نازلی نے جھرجھری لی اور سرک کر میرے قریب ہو بیٹھی۔ مگر اس نے نگاہیں اس شخص پر یوں گڑی ہوئی تھیں جیسے جنبش کی طاقت سلب ہو چکی ہو۔

”کچھ حالات ہی ایسے ہو گئے کہ شادی کے متعلق سوچنا میرے لیے نہایت ناخوشگوار ہو چکا

ہے۔ میری شادی ہوتے ہوتے رک گئی۔ اسی بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔"

"آخر کیا بات تھی؟ ہم بھی سنیں۔" اس کے ساتھی نے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بس میری اپنی بے ہنگم طبیعت۔" وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی بہت بھونڈی تھی۔

نازلی سرک کر میرے قریب ہو گئی۔

"میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔" جانگلی نے کہا۔ "تمام جھگڑا میری طبیعت کی وجہ سے ہی تھا۔ میری منگیتر میرے دوست ظہیرالدین صاحب کی لڑکی تھی۔ ظہیرالدین ہماری فرم کے منیجر تھے اور ان کا تمام کام میں ہی کیا کرتا تھا۔ چونکہ ان کے مجھ پر بہت سے احسانات تھے‘ میں نے انکی بات کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا حالانکہ میرے حالات کچھ اس قدر بگڑے ہوئے تھے کہ شادی کا بکھیڑا میرے لیے چنداں مفید نہ تھا۔ خیر میں نے سنا تھا کہ لڑکی بہت خوبصورت ہے اور سچ پوچھو تو خوب صورت لڑکی سے شادی کرنا میں قطعی ناپسند کرتا ہوں۔"

"عجیب انسان ہو۔" اس کے ساتھی نے کہا۔

"عجیب ہی سہی مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی بدصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ نہیں یہ بات نہیں۔ مگر کسی حسین لڑکی کو بیاہ لانا مجھے پسند نہیں۔"

"اوہ بڑا گھمنڈ ہے انہیں۔" نازلی نے میرے کان میں کہا۔

"خیر۔" جانگلی نے بات جاری رکھی۔ "ایک دن کی بات ہے کہ مجھے بے موقع ظہیرالدین کے مکان پر جانا پڑا۔ یاد نہیں کہ کیا بات تھی۔ مجھے صرف اتنا ہی یاد ہے کہ کوئی ضروری کام تھا۔ چونکہ عام طور پر میں ان کے مکان میں جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ بہرحال ایک چھوٹی سی لڑکی باہر آئی اور کہنے لگی‘ آپ اندر چل کر بیٹھئے۔ وہ ابھی آتے ہیں۔ خیر میں ملاقاتی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً دروازہ آپ ہی کھل گیا اور کچھ دیر کے بعد ایک نوجوان لڑکی کھلے منہ دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ پہلے تو وہ یوں کھڑی رہی گویا اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی جیسے لڑکیاں مردوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا کرتی ہیں۔ پھر میز پر سے ایک کتاب اٹھا کر چلی گئی۔ میں اس کی بے باکی اور بناؤ سنگھار کو دیکھ کر غصے سے کھول رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس وقت وہ گھر میں اکیلی تھی۔ مجھے اب بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ کسی کو---" اس نے گھونسا لہراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ہنس پڑا۔

نازلی نے اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر چیخ سی ماری۔ مگر ڈر یا نقاہت سے اس کی آواز ان دونوں تک نہ پہنچ سکی۔ ورنہ خدا جانے وہ کیا سمجھتے۔

جانگلی نے بات پھر شروع کی۔ بولا۔ "وہ یوں بن سنور کر وہاں کھڑی تھی گویا اپنی قیمت چکانے آئی ہو۔ ایک زرد رنگ کا رسے کی طرح بل کھایا ہوا دوپٹہ اس کے شانوں پر لٹک رہا تھا۔ سر ننگا۔ اف---! تمہیں کیا بتاؤں۔ اس کے بعد میں نے ظہیرالدین صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں آپ کی بیٹی کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ یعنی میں نے رشتے سے انکار کر دیا۔ اس بات پر وہ بہت بگڑے اور مجھے کوئی اور نوکری تلاش کرنی پڑی۔ مہینوں بغیر نوکری کے رہا۔ کہاں کہاں بھٹکتا پھرا۔ راجپوتانے میں نوکری آسانی سے نہیں مل سکتی۔"

"مگر اس میں انکار کی کیا بات تھی؟" اس کے ساتھی نے کہا۔ "آخر منگیتر تھی۔"

"بس یہی کہ مجھے بے پردگی سے بے حد نفرت ہے اور آج کل کا بناؤ سنگھار مجھے پسند نہیں۔ ہاں ایک بات اور ہے۔ کوئی لڑکی جو زرد دوپٹہ پہن سکتی ہے۔ میں اسے اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ مجھے زرد رنگ سے چڑ ہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ گھر کے کام کاج کو عار سمجھتی تھی۔ یہ آج کا فیشن ہے۔ تم جانتے ہو آج کل لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ بن سنور کر مردوں کو لبھانے کے سوا ان کا اور کوئی کام ہی نہیں اور برتن مانجھنے سے ہاتھ میلے ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہاتھ دکھلاوے کی چیز ہوں۔ یہیں دیکھ لو‘ کتنی بے پردگی ہے۔ عورتیں یوں برقعے اٹھائے پھرتی ہیں جیسے جنگل میں شکاری بندوقیں اٹھائے پھرتے ہیں۔"

اس کا ساتھی ہنس پڑا اور پھر ہنستے ہنستے کہنے لگا۔ "یار! تم تو راجپوتانے میں رہ کر بالکل بدل گئے ہو۔"

"اونہہ ہوں--- یہ بات نہیں۔" جانگلی نے کہا۔ "پردے کا تو میں بچپن ہی سے بہت قائل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ گھر میں دو عورتیں مہمان آئیں۔ ایک تو خیر ابھی بچی تھی۔ دوسری یہی کوئی پچیس سال کی ہو گی۔ ان دونوں میں خود آٹھ نو سال کا تھا۔ خیر وہ مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔" وہ رک گیا۔ پھر آپ ہی آپ بولا۔ "مجھے اس بات پر بے حد غصہ آتا تھا۔ اس لیے میں اکثر باہر مردانے میں ہی بیٹھا رہتا‘ یعنی میں نے ان کے روبرو جانا بند کر دیا۔ ایک دن ابا نے مجھے بلایا اور کہا کہ یہ پیغام اندر لے جاؤ۔ خدا جانے کیا پیغام تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ انہوں نے مجھے کوئی زیور دیا تھا کہ انہیں دکھا دوں۔ شاید ان مہمانوں نے وہ زیور دیکھنے کے لیے منگوایا ہو۔ میں نے ڈیوڑھی سے جھانک کر دیکھا تو وہ عورت صحن میں اماں کے پاس بیٹھی تھی۔ اماں کہنے لگی۔ حمید اندر چلے آؤ۔ اے ہے تم اندر کیوں نہیں آتے؟ تم سے کوئی پردہ ہے؟ میں یہ سن کر ابا کے پاس واپس چلا آیا۔ میں نے کہا۔ اباجی میں نہیں جاؤں گا۔ وہ مجھ سے پردہ نہیں کرتی۔ یہ بات میں نے اس قدر جوش اور غصے میں کہی کہ ابا بے اختیار ہنس پڑے۔ اس کے بعد دیر تک گھر والے میری اس بات پر مجھے چھیڑتے

رہے۔ البتہ زرد رنگ سے مجھے ان دنوں نفرت نہ تھی۔ طبیعت بھی عجیب چیز ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری طبیعت تو ایسی ہے جیسی مداری کا تھیلا۔" اس کے ساتھی نے ہنستے ہوئے کہا اور وہ دونوں دیر تک ہنستے رہے۔ پھر وہ اٹھ بیٹھے۔

اس وقت پہلی مرتبہ جانگلی کی نگاہ نازلی پر پڑی جو اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر شکن پڑ گئی اور آنکھیں نفرت یا خدا جانے کس جذبے سے سرخ ہو گئیں۔ نازلی کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی نگاہیں جانگلی پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ انہیں وہاں سے ہٹانا چاہتی ہو مگر ہٹا نہ سکتی ہو اور تمام بدن کانپ رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نازلی میں ہلنے جلنے کی ساکت نہ رہی ہو۔

یک لخت جانگلی مڑا اور وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ اس وقت نازلی عجیب بے بسی کے ساتھ مجھ سے لگی بیٹھی تھی۔ گویا اس میں بالکل جان نہ ہو۔

کچھ دیر کے بعد جب اسے ہوش آیا۔ عین اس کے قریب سے ایک قلی گزرا۔ وہ ٹھٹک گئی اور اس نے اپنا برقعہ منہ پر ڈال لیا۔

"اگر مجھے ایک خون معاف کر دیا جائے تو میں اسے یہیں گولی مار دوں۔" نازلی نے کہا۔

"کسے؟" میں نے پوچھا۔

"کتنا بنتا ہے۔"

"اوہ تمہارا مطلب اس شخص سے ہے مگر تم خواہ مخواہ اس سے چڑ رہی ہو۔ اپنی اپنی طبیعت ہے۔ اپنے اپنے خیالات ہیں۔ تمہیں اپنے خیالات پیارے ہیں' اسے اپنے۔"

"بڑی طرف داری کر رہی ہو۔" وہ بولی۔

"اس میں طرف داری کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں تو آپ سنی سنائی باتوں سے نفرت ہے۔ اس کے خیالات بھی مانگے کے نہیں۔ باقی رہی شکل' وہ تو اللہ میاں کی دین ہے---- ایمان کی بات پوچھو تو مجھے تو تم دونوں میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔"

"جی ہاں۔ تمہارا بس چلے تو ابھی میری بانہہ پکڑ کر اس کے ہاتھ میں دے دو۔"

"لاحول ولا----" میں نے کہا۔

"لاحول ولا کی اس میں کیا بات ہے----؟ میں کہتی ہوں اس کی بیوی اس کے ساتھ کیسے رہ سکے گی؟"

گاڑی پلیٹ فارم پر آ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں اندر بیٹھے۔ ہم نے انٹر کا ایک چھوٹا سا زنانہ ڈبہ تلاش کیا اور اس میں جا بیٹھے۔ نازلی نے برقعہ اتار کر لپیٹ کر بنچ پر رکھ دیا اور خود کونے میں بیٹھ گئی۔

حالانکہ ڈبے میں بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر بھی اس نے کھڑکی کا تختہ چڑھا دیا۔ میں دوسرے پلیٹ فارم پر ہجوم دیکھنے میں محو ہو گئی۔ میرا خیال ہے ہم بہت دیر تک یونہی خاموش بیٹھے رہے۔

"توبہ ہے۔"

نازلی کی آواز سن کر میں چونک پڑی۔ دیکھا تو میرے پاس ہی وہ جانگلی ہاتھ میں سوٹ کیس لیے کھڑا تھا۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس لمحے میں نازلی نے آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ سامنے اسے دیکھ کر نہ جانے کیا ہوا۔ بس مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس نے لپٹ کر دوپٹہ میرے سر سے کھینچ لیا اور ایک آن میں خود کو اس میں لپیٹ کر گٹھڑی سی بن کر پڑ گئی۔

"لاحول ولا قوۃ" جانگلی کی بھدی آواز سنائی دی اور وہ الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ غلطی سے ہمارے ڈبے میں چلا آیا تھا۔ جب اس نے ہمیں دیکھا تو اپنی غلطی کو جان کر واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک نازلی اسی طرح منہ سر لپیٹے پڑی رہی۔ میرے دل میں عجیب عجیب ہول اٹھنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو گا۔ خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔ ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ خیر جوں توں ہم خیریت سے جالندھر پہنچ گئے۔

اگلے دن دوپہر کے قریب مظفر بھائی میرے کمرے میں آئے۔ ان کے چہرے پر تشویش اور پریشانی کے آثار تھے۔ کہنے لگے۔ "نجمہ! نازلی کو کیا ہو گیا ہے؟ کہیں مجھ سے ناراض تو نہیں؟"

"مجھے تو معلوم نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا ہوا؟"

"خدا جانے کیا بات ہے؟ اس میں وہ پہلی سی بات ہی نہیں۔ آج صبح سے ہر بات کے جواب میں جی ہاں۔ جی ہاں۔ نازلی اور جی ہاں؟ میں سمجھا' شاید مجھ سے ناراض ہے۔"

"نہیں ویسے ہی اس کی طبیعت ناساز ہے۔"

"طبیعت ناساز ہے؟" انہوں نے حیرانی سے کہا۔ "اگر طبیعت ناساز ہوتی تو کیا وہ بیٹھی باورچی خانے کا کام کرتی۔ وہ تو صبح سے حشمت کے پاس باورچی خانے میں بیٹھی ہے۔ کہتی ہے' میں کھانا پکانا سیکھوں گی۔ منہ ہاتھ تک نہیں دھویا۔ عجیب معاملہ ہے۔"

"وہم نہ کیجئے۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔" میں نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

"وہم کی اس میں کیا بات ہے۔ تم جانتی ہو اس کی طبیعت خراب ہو تو اس گھر میں رہنا مشکل ہو جاتا ہے اور باورچی خانے کے کام سے تو اسے چڑ ہے۔ آج تک وہ کبھی باورچی خانے میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ خدا جانے کیا بھید ہے۔"

وہ دو قدم چل کر لوٹ آئے۔

"اور مزے کی بات بتانا تو میں بھول ہی گیا۔ جانتی ہو نا کہ اسے زرد رنگ کتنا پیارا ہے۔ میں

نے اس مرتبہ ایک نہایت خوب صورت زرد دوپٹہ اس کے لیے خریدا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زرد دوپٹہ دیکھ کر خوشی سے ناچ گی۔ مگر اس نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہیں کھونٹی سے لٹک رہا ہے۔ جب میں نے اصرار کیا تو کہنے لگی۔ ”اچھا ہے۔ آپ کی مہربانی ہے۔“

نازلی کے منہ سے یہ بات نکلے۔ سوچو تو--- عجیب معاملہ ہے کہ نہیں۔“ وہ بولے۔

نازلی کی مکمل اور فوری تبدیلی پر ہم سب حیران تھے۔ مگر وہ خود بالکل خاموش تھی۔ اسی طرح ایک دن گزر گیا۔ اسی شام بھائی مظفر تار ہاتھ میں لیے باورچی خانے میں آئے۔ ہم دونوں وہیں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ ”جانتی ہو یہ کس کا تار ہے۔ خالہ فرید کا بڑا لڑکا حمید تھا نا--- جو پندرہ سال کی عمر میں راجپوتانے بھاگ گیا تھا؟ وہ واپس آ گیا ہے۔ اب وہ بہن کو ملنے دہلی جا رہا ہے۔ یہ تار اس کا ہے۔ کل صبح نو بجے یہاں پہنچے گا۔ چند ایک گھنٹوں کے لیے یہاں ٹھہرے گا۔“

”کون حمید؟“

”تم کو یاد ہو گا۔ میں اور حمید اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔“

نازلی کے ہونٹ ہلے اور اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ ہاتھ سے پیالی گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

اگلے دن نو بجے کے قریب میں اور نازلی باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ وہ چائے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی مگر یوں بیٹھی تھی جیسے اسے کسی بات کا دھیان ہی نہ ہو۔ پاس ہی کھونٹی پر اس کا زرد دوپٹہ لٹک رہا تھا۔ بھائی مظفر نے زبردستی اسے وہ دوپٹہ لینے پر مجبور کر دیا تو اس نے لے لیا لیکن پہننے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور کپڑے میلے تھے۔ اس وقت وہ میری طرف پیٹھ کیے بیٹھی تھی۔

باہر برآمدے میں بھائی صاحب کسی سے کہہ رہے تھے۔

”تم یہیں بیٹھو۔ میں اسے بلاتا ہوں۔ نہایت ادب سے بھابی کو سلام کرنا۔“

”اچھا تمہاری مرضی۔“ کسی نے بھدی آواز میں کہا جیسے کوئی گھڑے میں منہ ڈال کر بول رہا ہو۔

”وہی۔“ میرے دل میں کسی نے کہا اور جانگلی کی شکل میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ میں اسے دیکھنے کے لیے دبے پاؤں اٹھی۔

باورچی خانے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو اسی وقت بھائی صاحب حمید سے کہہ رہے تھے۔ ”آؤ تم بھی میرے ساتھ آؤ۔“

میں ے دروازہ زور سے بند کر دیا۔

نازلی نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ دیوانہ وار اٹھی۔ کھونٹی سے لپک کر دوپٹہ اتار لیا۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے اسے چولہے کی طرف پھینک دیا جیسے کوئی بچھو ہو اور دوڑ کر حشمت کی چادر کو پکڑ لیا جو دوسرے دروازے کی پٹ پر لٹک رہی تھی اور اپنے آپ کو اس میں لپیٹ لیا۔ زرد دوپٹہ چولہے میں جلنے لگا۔ اسی وقت بھائی صاحب اندر داخل ہوئے مگر وہ اکیلے ہی تھے۔ انہوں نے حیرانی سے ہمیں دیکھا۔ کچھ دیر ہم تینوں خاموش ہی کھڑے رہے۔ آخر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ نازلی کہاں ہے؟

میں نے نازلی کی طرف اشارہ کیا جو منہ لپیٹ کر کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

”نازلی---!“ انہوں نے حیرانی سے دہرایا۔

وہ نازلی کے قریب گئے۔ ”یہ کیا حماقت ہے؟ چلو--- باہر حمید انتظار کر رہا ہے۔“

وہ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر نحیف آواز میں کہنے لگی۔ ”نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔“

”کیوں؟“ وہ بولے۔

اتفاقاً“ بھائی جان کی نظر جلتے ہوئے دوپٹے پر پڑی۔

”نازلی---!“ انہوں نے دوپٹے کی طرف دیکھ کر حیرانی سے کہا۔

نازلی نے سر ہلا دیا اور چمٹے سے دوپٹے کو پوری طرح چولہے میں ڈال دیا۔ بھائی نازلی کی اس تبدیلی پر بہت خوش دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نازلی کی طبیعت بہت سنور گئی ہے۔ بات ہے بھی درست۔ چونکہ اس کی طبیعت میں وہ ضد اور بے باک شوخی نہیں رہی، مگر کبھی کسی وقت انہیں اکٹھے دیکھ کر میں محسوس کرتی ہوں۔ گویا وہ نازلی کو ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہیں۔

# نیلی

ہائے ری کیسا پیارا بچہ تھا آپ کا۔ بھورا بھورا۔ جیسے زرد روئی کا گالا۔ چھوٹے چھوٹے گدے سے ہاتھ اور اتنا بڑا سر۔ جی چاہتا تھا چھاتی سے لگائے پھروں۔ پر توبہ---! بھائی جان کی اماں نے کتنا پاکھنڈ مچایا تھا' بڑی آئی تھی ننھے کی مالکہ۔ ہونہہ--- گویا اپنی گرہ سے خریدا تھا اسے۔ توبہ اس بڑھیا کی باتیں۔ مجھے تو ہنسی آجاتی سن کر۔ دانت ہوں تو کوئی بات بھی کرے۔ یوں بولتی تھی جیسے بگڑی ہوئی چکی بھبھہ بھبھہ۔ بولی۔ ”بھینہ کو نہ دو۔ گرا نہ دے۔“ بڑی آئی ننھے کی رکھوالی۔ نہ جانے کیا سمجھتی ہے وہ مجھے۔ جیسے میں دودھ پیتی بچی ہوں۔ ہونہہ۔ بھائی جان نے بتیرا کہا۔ لینے دو فیضو کو ذرا۔ کیا حرج ہے۔ لیکن وہ بڑھیا--- اس وقت میرا جی چاہا کہ ننھے کو اٹھا کر کوٹھے پر چڑھ جاؤں اور--- اور--- ہائے میں کیوں پھینکتی اسے۔ کلیجے سے نہ لگائے رکھتی۔ ایسا پیارا بچہ ہے نیلی نیلی کانچ سی آنکھیں۔ زعفرانی رنگ اور پھر لاکھے سنہری بال۔ جی چاہتا تھا' بس اسے دیکھتی ہی رہوں۔ گڈا تھا گڈا۔ ذرا نہ روتا تھا۔ بس رونی صورت بنائی ہونٹ نکالے اور آنکھیں---! اس وقت اس کی آنکھیں--- جیسے نیل میں گہرا رنگ گھول دیا ہو۔ اور پھول سی آنکھیں۔ جیسے کوئی سبز پھول کھل گیا ہو۔ رونا تو جانتا ہی نہ تھا۔

ننھے کی آنکھیں تو اک تماشا بنی ہوئی تھیں۔ جو کوئی آتا' اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ دیکھ کر کہتا۔ نہ جانے کس پر گیا ہے یہ ننھا۔ ہمارے خاندان میں تو کسی کی آنکھ نیلی نہیں اور پھر ایسی نیلی--- یہ بات بھی سچی تھی۔ آپا کا بیاہ اپنے ہی خاندان میں ہوا تھا۔ بھائی جان' آپا اور میرے پھوپھی زاد تھے اور ہمارے گھروں میں تو سب ”کل ننے“ تھے۔ بھائی جان کی آنکھ کبھی کبھی شربتی جھلک مارتی تھی۔ وہ بھی صرف مسکراتے وقت۔ مگر وہ مسکراتے ہی کہاں تھے۔ آپا کی تو گھور کالی تھیں سیاہ اور توبہ---! کیسی موٹی موٹی۔ آنکھ بھر کر دیکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ آپا نظر بھر کر دیکھتی تو دوسرا کھڑا کا کھڑا رہ جاتا۔ میں تو سن ہو جاتی تھی۔ پھر نہ جانے مجھے کیوں غصہ آجاتا اور میں چیختی۔ ہم پر تو نہ نکالا کرے کوئی آنکھیں۔ اس بات پر بھائی جان مجھے چھیڑتے۔ ”نہ بھئی صفی۔ فیضو کو نہ دکھایا کرو آنکھیں۔“ ”واہ آپ تو مذاق کرتے ہیں۔“ میں کہتی اور وہ بن کر کہتے۔ ”توبہ فیضو تمہاری آپا نظر بھر کر دیکھتی ہے تو اندھیرا گھپ ہو جاتا ہے۔ اور تم--- تم دیکھتی ہو تو پھوار پڑنے لگتی ہے۔“ ”اوں۔“ میں چڑ کر کہتی۔ ”کہاں پڑتی ہے پھوار۔ میں جانتی ہوں بناتے ہیں آپ۔“ پر بھائی جان کا اور معاملہ تھا۔ ان کی بات مجھے بری نہ لگتی تھی اور وہ صرف مجھ سے ہی مذاق کیا کرتے تھے۔ گھر میں تو انہیں چپ لگی رہتی تھی۔ آپا سے کبھی یوں بات بھی نہ کی تھی جیسے دولہا دولہن سے کیا کرتا ہے۔ پھر وہ کچھ اور کہتے تو میں چیختی۔ ”بس جی ہمیں نہ چھیڑا کرے کوئی۔“ پر میرے دل میں ذرا بھی غصہ نہ آتا۔ ویسے میں یوں منہ موڑ لیتی جیسے--- پر نہ جانے وہاں سے چلے آنا کیوں میرے لیے اس قدر مشکل ہو جاتا تھا۔ میں جانو--- مجھے نہیں پتہ کیوں---

توبہ---! بھائی جان کی اماں نے ننھے کی آنکھوں پر کیا پاکھنڈ مچایا تھا۔ بولی۔ ”یہ انگریج کہاں سے آگیا۔“ ”اوئی اماں دیکھو تو---“ نجمہ چلائی۔ ”اب تو ہری ہوئی جا رہی ہیں۔ توبہ---!“ اور آپا بولتی۔ ”آنکھیں نہ ہوئیں گرگٹ ہوا۔“ ادھر ہماری ملازمہ بانو شور مچاتی۔ ”دیکھو تو بی بی کیسا جافرانی رنگ ہے اور بال تو سونے کی تاریں ہیں۔“ ”اونہوں۔“ بڑھیا بڑبڑاتی۔ ”یہ تو لاکھے سنہری ہیں۔“ آپا ان کی باتیں سن کر نہ جانے کیوں شرما اور چڑ جاتی تھی۔ شرمانے کی بات ہی کیا تھی اس میں۔ آخر سبھی کے ہاں بچے ہوتے ہیں۔ پر آپا کا پہلا ننھا تھا نا۔ اس وقت آپا کی آنکھیں اور بھی گھور ہو جاتیں جیسے گھٹا چھا جائے۔ پھر وہ منہ موڑ لیتی یا چہرے پر دوپٹہ ڈال کر چھپ جاتی۔ آپا بھی عجیب ہے۔ پر میں جانوں' گھبرانے کے ساتھ ساتھ وہ مسکراتی بھی تھی لیکن چھپ چھپ کر۔ پھر کوئی نہ کوئی چلا اٹھتی۔ ”نہ جانے کس پر گیا ہے ننھا۔ پورا انگریج ہے انگریج۔“ یا کوئی ناواقف آتی تو وہ ننھے کو دیکھ کر غور سے آپا کی طرف دیکھتی۔ اور پھر ننھے کی طرف جیسے حیران ہو رہی ہو۔ جبھی تو آپا کو لوگوں کا آنا جانا پسند نہ تھا اور وہ بات بات پر کہہ اٹھتی۔ ”توبہ میرا سر کھا جاتی ہیں۔“

ننھے کی آنکھوں--- رنگ اور بالوں کے بارے میں اگر کوئی خاموش تھا تو وہ بھائی جان تھے۔ کسی نے ننھے کی آنکھوں یا صورت کا ذکر چھیڑا اور وہ بہانے بہانے اٹھ کر وہ گئے جیسے کچھ دلچسپی ہی نہ ہو اس بات میں۔ بات سن کر ان سنی کر دیتے تھے اور گھر میں تو بس یہی اک بات چلتی تھی۔ ان دنوں۔ ننھے کی آنکھیں' رنگ اور بال--- سبھی اسی بات کے دیوانے ہو رہے تھے۔ بھائی جان نے تو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا ننھے کی طرف۔ اسے پیار بھی کرتے تو دھیان کسی اور طرف ہوتا۔ میری طرف یا جیسے دیوار سے پار کسی چیز کو دیکھ رہے ہوں۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ ان آنکھوں کا بھید جانتے ہوں۔ یا جیسے اسے اپنے آپ سے چھپا رہے ہوں۔ یہ بات نہ تھی تو پھر وہ ہماری باتیں سن کر

دکھی لگیوں ہو جاتے تھے جیسے پھوڑے کو چھیڑ دیا جائے اور اس وقت مسکراتے بھی تو وہ کیا مسکراہٹ ہوتی۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی۔

اس روز وہ کس قدر گھبرائے جب اماں کہنے لگیں۔ “بھیفہ” کس پر گیا ہے ننھا؟” اور کنکھیوں سے بھائی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ یہ سن کر بھائی جان گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ پھر آپا بولی۔ “مجھے کیا معلوم۔ انہیں سے پوچھئے۔” اس نے بھائی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور لگی مسکرانے۔ بھائی جان کا رنگ اڑ گیا۔ بڑی اماں کب چھوڑنے والی تھی۔ بولی۔ “کیوں جلیل کس پر گیا ہے ننھا؟ دیکھ ذرا۔” بھائی بولے۔ “اماں میں پوچھتا ہوں۔ وہ میرا پن کہاں گیا۔ جانے کس نے اٹھا لیا ہے۔ کیا مصیبت ہے۔” “اے ہے مل جائے گا۔” “کہاں مل جائے گا۔” “تو ذرا اپنے بیٹے کو تو لے۔ دیکھ تو تیری طرف ہی دیکھ رہا ہے۔” “لیکن گیا کہاں میرا پن؟” بھائی بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

“توبہ یہ آج کل کے لڑکے---” بڑی اماں بڑبڑاتی۔ “بڑے بیٹے کے نام سے تو چڑ ہے انہیں۔ اور اس کی اماں کو چاہے کندھوں پر اٹھائے پھریں۔” آپا تڑپ کر مڑی۔ اس نے نگاہ بھر کر بڑی اماں کی طرف دیکھا۔ توبہ وہ ایک نگاہ--- جیسے چیخیں بھری ہوئی ہوں۔ پھر آپا نے منہ موڑ لیا۔ بھلا بڑی اماں کی طرف یوں دیکھنے سے فائدہ۔ آپا بھی تو پگلی ہے۔ وہ بڑھیا تو مٹی کی بنی ہوئی ہے--- مٹی کی۔ وہ تو کہی ہوئی بات کو بھی نہ سمجھے جب تک اس بات کو بار بار ڈھولک کی طرح نہ پیٹو۔ نہ جانے سبھی بوڑھی ہو کر مٹی کی کیوں ہو جاتی ہیں۔ ہائے--- مجھے تو موت آجائے‘ بڑھاپا نہ آئے۔ میں تو جیتے جی مر جاؤں۔ یوں مر کر جینے کا مزہ؟

آپا کے دکھ کو کون نہیں جانتا۔ اب کوئی جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لے تو---؟ پر سبھی جانتے ہیں۔ گو آپا نے کبھی ہونٹ تک نہیں ہلائے۔ بس یہی ہے نا‘ کسی نے ایسی ویسی بات کہہ دی تو آپا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس گھور گھٹا کو چھپا لیا اور کسی نہ کسی طرف اکیلے میں جا بیٹھی۔ یا بھائی جان نے آپا کے شوق بھرے سوال کے جواب میں یوں منہ پھیر کر کسی معمولی سی بات کو چھیڑ دیا اور آپا کا سوال ان سنا کر دیا اور پھر بے اعتنائی سے باہر نکل گئے۔ تو ایک آن کے لیے آپا کی آنکھیں چھلکیں اور پھر تیرنے لگیں اور اس نے منہ موڑ کر اس چھوٹی جوڑے کو چھپا لیا اور تو اور مجھ سے بھی چھپاتی تھیں۔ وہ سمجھتی ہوں گی‘ میں بچی ہوں۔ مجھے ان باتوں سے کیا۔ کیوں میں کیا بچی ہوں۔ اتنی بڑی ہو گئی ہوں اور ابھی بچی--- وہ تو خود بچی ہے۔ ایک ذرا سے میاں کو اپنا نہ سکی۔ سبھی اندھے ہیں۔ کیا آپا اور کیا کوئی اور۔ امی بھی تو چھپایا کرتی ہے مجھ سے بات۔ لیکن میں بھی بات جانے بنا نہیں رہتی۔ کیوں رہوں؟ پھر وہ چھپاتے کیوں ہیں مجھ سے؟ وہ نہ چھپائیں تو میں بھی نہ کریدوں۔ آپا تو جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔ جبھی تو لڑا کرتی ہے مجھ سے۔ فیضو تو بھی کریدے بنا نہ رہ سکی۔

توبہ یوں کسی کو بھرے گھر میں سے خارج کر دینا۔ نہ جانے کیسے ہیں یہ لوگ؟ کیا امی اور کیا ابا۔ کہتے ہیں--- کھاؤ‘ پیو‘ ہنسو‘ کھیلو۔ لیکن گھر میں کوئی بات ہو تو بہرے بن جاؤ۔ اندھے ہو جاؤ۔ اور سن بھی لو تو سن کر یوں بھیگی بلی بنی بیٹھ رہو جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ نا بھئی۔ ہم سے تو نہیں بنا جاتا بھیگی بلی۔ اس سے تو ویرانے میں جا رہنا ہی اچھا ہے۔ نہ بھئی ہم سے تو جیتے جی مرا نہ جائے گا کہ دیکھ بھی لو اور پھر جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ سن لینا پر نہ جاننا--- تو بھی۔ یہ ہو سکتا ہے کیا۔ یوں سننے کو تو ہماری چتری مرغی بھی سنتی ہے۔ مزا تو جب ہے کہ بات سن کر اسے جان لیا جائے جیسے وہ آپ بیتی ہو۔ پھر پتہ چلتا ہے بات کا۔ اور وہ بات ہی کیا جو اندر جا کر ناچنے نہ لگے۔ یا کچھ توڑ پھوڑ نہ دے۔ یا کہیں آگ نہ لگا دے۔ وہ نجمہ ہی ہے--- بھیگی بلی۔ جو سنتی بھی رہتی ہوں ہے جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ مکار کہی کی--- ہونہہ!!

کیا میں نہیں جانتی کہ بھائی جان آپا سے بیاہ کرنے پر راضی نہ تھے۔ ان کے ابا اور اس بڑھیا نے زبردستی انہیں آپا سے جوڑ دیا۔ جیسے تانگے میں ٹٹو جوڑ دیتے ہیں۔ ہمارے ابا کو تو پتہ ہی نہ تھا کہ بات یوں ہے۔ وہ تو یہ سمجھتے تھے جیسے دوسری شادیاں ہوتی ہیں‘ ویسی ہی ہے یہ شادی۔ بھائی جان تو ابا کے سامنے جا کر یوں بیٹھ رہتے‘ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر جیسے بڑے اصیل ہوں۔ توبہ--- کیسے مکار ہوتے ہیں مرد۔ کتنے بہروپ دھار سکتے ہیں۔ پر اڑتی اڑتی یہ بات ہم تک پہنچ ہی گئی تھی۔ آخر چھپتی کہاں ہے چھپانے سے ایسی بات۔ جو بھی آتی‘ امی کے کان میں منہ دے کر بیٹھ جاتی اور جب بھی کوئی امی سے منہ جوڑ کر بیٹھتی اور پھر چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی۔ اور مجھ سے کہتی۔ “اے ہے لڑکی تم اب کھیلو نا جا کر۔” اور امی فوراً یہ کہتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتی۔ “فیضہ بیٹی اب دو لفظ پڑھ لو نا بیٹھ کر۔” تو میں جھٹ تاڑ جاتی کہ کوئی بات ہو گی۔ بس پھر تو میرے تن بدن میں چونٹیاں چلنے لگتیں۔ جیسے رگوں میں بات رینگ رہی ہو۔ سرسر کر رہی ہو۔ بات‘ بات‘ بات اور دل یوں بجتا۔ سن--- سن--- سن۔ پھر نہ سننا کس قدر مشکل ہو جاتا تھا میرے لیے۔ دیوار کے پیچھے کھڑکی کی اوٹ میں۔ باورچی خانے کی ڈولی کے پیچھے۔ بھائی جان کے کمرے میں میز کی اوٹ میں۔ اور آپا کے کمرے میں ہو تو کھڑکی کی درز میں سے۔ وہاں سے تو کہنے والی کا منہ بھی دکھتا تھا--- ہائے بات سن لینا پر کہنے والی کو نہ دیکھنا۔ نہ جی ہم تو کبھی نہ سنیں روکھی بات جو صرف کان میں بھنبھنائے اور بس۔ یہ تو ایسا ہوا جیسے کوئی بغیر کھائے حلوہ نگل لے۔ جب وہ ہاتھ چلاتیں‘ منہ بناتیں‘ آنکھیں چمکاتیں اور انگلی ہونٹ پر رکھ لیتیں تو بات میں جان پڑ جاتی تھی اور بن دیکھے سوکھی بات جیسے مری ہوئی ہو۔ جیسے کھٹائی بنا چٹنی۔

ایک بولی۔ “لو سنا تم نے بی بی۔ یہاں تو بیاہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں لیکن وہاں--- آئے

ہائے۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے۔ سنا ہے لڑکا تو مانتا ہی نہیں۔ کہتا ہے میں تو ساری عمر کنوارا ہی رہوں گا۔ لو بی بی بھلا یہ بھی سنا ہے کبھی‘ ساری عمر بھی کنوارا رہ سکتا ہے کوئی؟ توبہ بی بی آج کل کے لڑکے۔ جب تک بیاہ نہ ہو۔ ”تو کنوارا رہوں گا میں۔ اور ہو جائے تو بیگم کے بغیر دم نکلتا ہے۔“

دوسری نے کہا۔ ”چاہے تم برا ہی مانو۔ پر سبھی کہتے ہیں لڑکے کو کسی سے محبت ہے۔ سکول کی ہے کوئی۔ ہائے ری یہ سکول کی۔ توبہ ان کے ہتھے نہ چڑھے کوئی۔ لسوڑی کی گٹھلی کی طرح چپک جاتی ہیں۔“

تیسری ہونٹ پر انگلی رکھ کر بولی۔ ”میں تو سچی بات کہوں گی۔ چہے خوئی مانے نہ مانے۔ ہاں میں نے تو نمخ خایا ہے اس گھر خا۔ لڑخے خے لچھن اچھے نہیں دخیں ہیں مجھے۔“

اور امی کہتی۔ ”اچھا جو لڑکی کے نصیب میں لکھا ہو گا‘ ہو جائے گا۔ اب تو ہم نے ہاں کہہ دی ہے بہن۔ اگلی بات کو پھر کیسے نکل جاؤں۔ اب بس اللہ ہی کارساز ہے بہن۔“

ہونہہ کارساز۔ جیسے اللہ کو کوئی اور کام ہی نہ ہو۔ توبہ ایسے سمے امی یوں بن جاتی تھی جیسے کسی فرشتے کے پر اکھڑ گئے ہوں۔ بڑی حاجن تو دیکھو۔ اور ویسے ابا سے بات ہو تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ اس وقت اس کے کارساز اللہ کہاں ہوتے ہیں۔ توبہ کیا مکر بنانے آتے ہیں بڑوں کو۔

آپا نے بھی سن لی تھی بات۔ نہ جانے کیسے پتہ چل جاتا تھا اسے بیٹھے بٹھائے۔ پر سن بھی لو تو کیا۔ اس کے منہ میں زبان بھی ہو۔ بس آنکھیں چھلکانا ہی جانتی ہے۔ دیوار کی طرف منہ پھیر لیا اور آنسو گرا دیا یا پی گئی۔ اور پھر اٹھ کر کوئی کام لے بیٹھی جیسے کام بھلا سکتا ہو بات کو۔ ہم سے تو نہیں بھولتی‘ چاہے ہزار کام لے بیٹھیں۔ اور ہزار تو کیا ایک بھی لے بیٹھیں تو ستیاناس کر کے رکھ دیں۔ مجھے تو بات کا بخار چڑھ جاتا ہے۔ پھر کام کیسے کروں۔ کام کونین تو ہے نہیں۔ اگرچہ کڑوا ضرور ہوتا ہے--- پر آپا---!

ابا بولے۔ ”آپ ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں یہ لڑکے۔ بیاہ ہو لینے دو۔“ ابا تو بس مونچھوں کو تاؤ دینا ہی جانتے ہیں۔ تاؤ دیا اور سگار سلگا کر بیٹھ گئے۔ یا ہم پر رعب چھانٹ لیا اور امی کے سامنے چوہے کی طرح دبک گئے۔ وہاں چلے بھی رعب ان کا۔ اور امی۔ توبہ اسے کیا کیا گر یاد ہیں۔ صبح و شام بیسیوں سنی اور یوں پی گئی جیسے شربت کے گھونٹ ہوں اور پھر چوٹ تبھی لگائے گئی جب لوہا لال ہو۔ جب موقعہ آیا تو بیگم بن ٹھن کر بیٹھ گئی۔ ہائے کیسی پیاری لگتی ہے امی جب وہ بن ٹھن تیار ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ ہاتھ چوم لوں اس کے۔

پہلی مرتبہ جب آپا سسرال آئی تو امی نے مجھے بھی بھیج دیا ساتھ۔ آئی تو بڑی چاؤ سے تھی پر توبہ ہے پرائے گھر میں یوں آ بیٹھنا۔ میرا جی چاہتا تھا‘ چیخیں مار کر رو پڑوں۔ میں تو پھر نجمہ سے کھیل کر وقت کاٹ لیتی۔ اور دن میں چار چار بار اپنے گھر سے ہو آتی۔ پر آپا---! یوں گٹھڑی بن کر پڑی رہی گویا جان نکل چکی ہو۔ کسی نے پلہ اٹھا دیا تو منہ دیکھ لیا۔ کسی نے ہاتھ یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دیا تو وہیں پڑا رہا۔ جیسے مسالے کی بنی ہوئی جاپانی گڑیا ہو۔

توبہ---! اس روز گھر میں ایک قیامت دبی ہوئی تھی۔ بڑی اماں بھائی جان کے ابا کے کان میں منہ دیئے بیٹھی تھی۔ نجمہ بانو سے پوچھ رہی تھی اور بانو مسکرا کر کہتی۔ ”چپ کوئی سن لے گا۔“ اور بھائی جان چارپائی پر پڑے تھے اور ان کے بڑے بھائی جو ڈاکٹر ہیں‘ دبی زبان میں چیخ رہے تھے۔ ”اگر تمہیں گھر کی لاج کا خیال نہیں تو پھر یہاں رہنے کا مطلب۔“ پھر بڑی اماں ڈاکٹر بھائی کی منتیں کر رہی تھیں۔ ”آپ ہی سمجھ جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا--- اے ہے جوان لڑکا ہے۔ اگر---“ پھر ماں بیٹے کے پاس گئی۔ منتیں کرتی رہی۔ پھر ان کے ابا اندر چلے گئے اور لگے گھورنے۔ بہت چھپا چھپا کر کر رہے تھے بات--- ہونہہ۔ ساری دنیا جانتی تھی کہ بھائی بگڑے ہوئے ہیں اور کوئی رسم ادا کرنے کو نہیں مانتے۔ میں سب سمجھتی تھی۔ آپا کو زبردستی اس ڈھول پر منڈھ دیا تھا اور آپا--- دم پخت دیگ کی طرح ڈھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ جیسے لجائی ہوئی ہو۔ ہونہہ لجائی--- میں کیا جانتی نہیں۔ سبھی یونہی بھیگی بلی بن کر بیٹھ جاتی ہیں سسرال میں--- جیسے بہت لجا رہی ہوں۔ بڑی لجانے والی۔ چاہے دل میں چوہے ناچ رہے ہوں اور بدن پر چونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ اس لیے تو نہیں بیٹھ رہتیں کہ بیٹھنے میں مزا آتا ہے انہیں۔ میں جانوں ڈرتی ہیں کہ کہیں اٹھ کر ناچنے نہ لگیں خوشی سے--- پر آپا--- آپا کس بات پر لجاتی۔ میں نے ایک بار پلہ اٹھا کر دیکھا تو آنسو--- اتنا بڑا آنسو---! ہائے میرا دل بیٹھ گیا اور میں لپٹ گئی آپا سے۔ اپنے اپنے انداز ہیں۔ کوئی شرم کی اوٹ میں مسکراہٹ چھپاتی ہے اور کوئی آنسو کی اوٹ میں۔ آپا سبھی کچھ جانتی تھی۔ نہ جانے آپا کو بات کیسے معلوم ہو جاتی تھی اور پھر بیٹھے بٹھائے۔ میں سارا سارا دن ماری ماری پھرتی۔ کبھی ڈولی کے پیچھے‘ کبھی میز کی اوٹ میں۔ تب کہیں جا کر پتہ چلتا کہ بات کیا ہے۔ مگر آپا ایک جگہ بیٹھے بیٹھے جان جاتی جیسے کان میں ریڈیو لگا ہو۔ خوشی کی بات ہو تو مسکراتی پھرتی اور ایسی ویسی ہو تو چھلکی ہوئی آنکھیں چھپاتی پھرتی بیٹھے بٹھائے بات پا لینے میں اسے کمال حاصل تھا۔ ایک دن مجھ سے بولی۔ ”فیضی! یہ کیا عادت ہے تیری۔ یوں لوگوں کی باتوں پر کان لگائے رکھنا۔ کسی کی بات میں داخل دینا اچھا نہیں ہوتا۔“ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ ”پھر تم کیوں دیتی ہو میری بات میں دخل؟ میں جانوں اور میرا کام جانے۔ بڑی مکے سے آئی ہوئی تو دیکھو۔“ اور میں نے آپا کا منہ چڑا دیا۔

پہلے پہل تو بھائی جان آپا سے پرایوں کی طرح پیش آئے۔ ایک جگہ بھی تو نہ بیٹھتے تھے وہ دونوں۔ آپا اندر ہے تو وہ باہر جا بیٹھے اور وہ باہر آ گئی تو یہ کمرے میں چلے گئے۔ بہانے بہانے۔ ہائے

بے چاری آپا کیسے منہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ اس کے آپا کو چپ لگ گئی۔ نہ جانے کیا ہو گیا اسے۔ جب بھائی کسی کام کو کمرے میں آئے تو وہ آپ ہی آپ بڑبڑائی۔ "اوہ--- میں تو بھول ہی گئی۔" اور باہر نکل گئی اور وہ باہر آئے تو ادھر ادھر ہو گئی لیکن کیا مجال جو چہرے سے ظاہر ہو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ آپا جل گئی ہے بھائی جان سے، لیکن توبہ آپا--- آپا جل جانے والی کہاں۔ وہ تو سلگنا جانتی ہے اور بس۔ بھئی ایسا بھی نہ ہو کوئی۔ اٹھتی ہے اور چل پڑتی لیکن نیچی نظر سے دیکھتی جاتی انہیں۔ جیسے جی چاہتا ہوں۔ اب بھی بلا لیں تو بیٹھ جاؤں۔ نہ جانے کے لیے بہانہ ڈھونڈتی تھی۔ ہائے یہ بھی کیا مصیبت ہے۔ عورتیں کیوں مرمٹتیں ہیں؟ ریجھ جاتی ہیں اور ویسے دیکھنے میں چھوئی موئی۔ ہٹو ہمیں شرم آتی ہے۔ نخرو--- بھئی میں تو کبھی نہ یوں مرمٹوں کسی پر۔

آخر بھائی جان کی اکڑفوں ٹوٹ ہی گئی۔ اگرچہ وہ بات تو پیدا نہ ہو سکی جیسے بڑی آپا کے گھر میں--- ہائے بڑی آپا کے گھر میں تو میلا لگا رہتا ہے جیسے چینی کا ڈپو کھلا ہو۔ یہ آئی--- وہ گئی۔ اور وہ دونوں یوں کندھے سے کندھا جوڑ کر بیٹھے رہتے ہیں جیسے میاں بیوی تو ہیں ہی نہیں۔ اک تماشا لگا رکھتے ہیں۔ اس نے چھیڑا اور اٹھ بھاگی۔ اب وہ پکڑ رہے ہیں۔ اب چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹ رہے ہیں اور اس نے چیخ ماری، جیسے کوئی مر رہا ہو۔ ادھر پڑوس میں دیوار پر اماں نصین جھانکی۔ ادھر چوبارے کی کھڑکی میں ملک صاحب کی ماں آ کھڑی ہوئی۔ کیا ہوا--- کیا ہوا اور یہ ہیں کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے ہیں۔

یا کہیں گے نذرانہ ہمیں تکئے کیوں پسند ہیں؟ اور پھر بڑی آپا کے کندھے پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیں گے اور وہ چلائے گی، کیوں میں کیا تکیہ ہوں؟ نہیں۔ نہیں--- گاؤ تکیہ نہیں، میں تو چھوٹے سے تکئے کی بات کر رہا ہوں اور پھر وہ اٹھ بھاگے اور آپا ہانپتی ہوئی پیچھے پیچھے۔ پھر اس روز جب بڑی آپا کا کندھا چھل گیا تھا اور میں ان کے کہنے پر سنچر کی پھریری لائی تھی تو بولے۔ "فیضی! یہ کیا مذاق ہے۔ اس پھریری سے کیا بنے گا۔ بٹی بوتل ہی اٹھا لاتی۔"

"بوتل--- کیوں؟" میں نے ویسے ہی پوچھا۔

بولے۔ "اوہ نہیں۔ سمجھتی یہاں تو پھاڑ لینا ہے پہاڑ۔" اور بڑی آپا غرائی---

توبہ اس گھر میں قہقہوں کے پٹاخے چھوٹتے ہیں ہر وقت اور یہ گھر--- بس برف پڑ رہی ہے ہر وقت اور وہ ٹوٹی ہوئی بجلی بھپ بھپ--- بھپ--- بھپ اور بس۔ آپا نے منہ موڑ کر دیوار سے پوچھا۔ "مٹر گوشت بنا لوں؟" اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑائے۔ "بنا لو۔" یا انہوں نے صندوق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ رومال تو بہت میلا ہو گیا ہے۔" اور آپا بولی۔ "ابھی دھوئے دیتی ہوں۔" پر ہزار شور ہو۔ چاہے نجمہ بانو اور بڑھیا اکٹھی باتیں کر رہی ہوں لیکن بھائی نے ہونٹ

ہلائے اور آپا کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ آپس میں بات کر بھی لیتے اور ہمیں پتہ بھی نہ چلتا۔ آپا تو شاید اسی بات پر خوش تھی کہ چلو زبان تو ہلی بات کرنے کو۔ بولنا تو سیکھ لیا اور آپا--- حد کر دی آپا نے تو۔ بھائی نے بات کر دی تو سن لی۔ نہ کی تو نہ سہی۔ ان کے ہونٹوں کی طرف تکتے رہنا۔ ہائے کیا غلامی ہے۔ آپا تو بس آئی گئی ہو کر رہ گئی تھی۔ آپا کی اس بات پر یا نہ جانے کیوں کئی بار بھائی جان ٹھٹھک جاتے اور پھر اک بھرپور نگاہ ڈالتے اس پر۔ یوں چونک کر دیکھتے اسے گویا پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں اور آپا مسکراتی۔ چھپی چھپی مسکراہٹ۔ ایسی ایسی باتیں سن کر ہنس دیتی وہ یا جی ہاں کہہ دیتی جو کوئی اور بیوی سن لے تو قیامت ہی کھڑی کر دے۔ بس ہاں جی--- جی ہاں۔ اور جی کے سوائے کچھ کہنا ہی نہ جانتی تھی۔ بہت غصہ آتا تھا مجھے آپا پر اور یوں مسکرائے جاتی جیسے کوئی چشمہ پہاڑی کے اندر ہی اندر راستہ بنا رہا ہو۔ ہائے ری مکار---!

اس روز بھائی جان کس قدر پریشان تھے۔ میں نے انہیں کبھی یوں بے قرار نہ دیکھا تھا۔ کبھی لیٹ جاتے پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھتے۔ پھر آپا کے کمرے میں جھانکتے اور پھر جھینپ کر چلے جاتے یا اندر آتے بھی تو دو ایک ساعت کے لیے ادھر ادھر دیکھ کر لوٹ جاتے یا چونک کر کہتے۔ "تم ہو فیضو--- اچھا--- اچھا۔" اور پھر چلے جاتے۔ آپا بھی حیران تھی--- آخر شام کے قریب وہ بولے۔ "صفی کل مہمان آئیں گے۔ نہیں نہیں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ ویسے ہی کہہ رہا ہوں۔ اچھا میں پھر بات کروں گا تم سے۔" اور وہ چلے گئے۔ آپا نے آنکھیں کھولیں۔ میرا مطلب ہے اس نے نگاہ بھر کر دیکھا اور مسکرا دی۔ عجیب مسکراہٹ تھی وہ۔ تعجب، خوشی اور غم میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ--- وہ چلے گئے تو آپا بڑبڑائی۔ "ہوں--- میں جانتی تھی کہ ایک نا ایک دن آئیں گے۔ آ ہی جائیں تو اچھا ہے۔" پھر وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹکی۔ "تو یہیں بیٹھی ہے فیضو؟"

"کون آئیں گے؟" میں نے آپا سے پوچھا۔

"ہوں گے نا کوئی۔ تم بھی دیکھ لینا۔" وہ مسکرائی۔

میں نے بن جانے بوجھے کہہ دیا۔ "ہوں تمہاری سہیلی ہو گی کوئی۔"

آپا بہت ہنسی۔ ہنستی ہی گئی۔ توبہ ایسا بھی کیا ہے۔ خوامخواہ دوسرے کو شرمندہ کر دینا۔ میں نے کوئی بری بات تو نہ کہی تھی۔ پھر بولی۔ "ہاں میری ہی تو ہے۔" میں چڑ گئی تھی۔ میں نے کہا۔ "چاہے کوئی ہو۔ تمہاری سہیلی ہو یا ان کی دوست۔ ہمیں اس سے کیا مطلب؟" اور آپا پھر ہنسنے لگی۔ کہنے لگی۔ "میری سہیلی جو ہوئی، سو ان کی بھی تو ہوئی کچھ۔"

رات کو بھائی جان نے دو ایک مرتبہ پھر ہمارے کمرے میں جھانکا۔ اس کمرے میں آپا اور میں سوتے تھے۔ پہلے بانو بھی سویا کرتی تھی۔ یہیں آپا کی چارپائی اور ننھے کی کھٹولے سے پرے اس کونے

میں۔ ان دنوں وہ آپا کو دبایا کرتی تھی۔ پھر آپا نے کہا۔ “بانو اب میں اچھی ہوں۔ جب ضرورت پڑے گی، بلا لیا کروں گی۔” بس پھر ہم دونوں اکیلے رہ گئے یہاں۔ ساتھ ہی بھائی صاحب کا کمرہ تھا۔ دروازہ میرے سرہانے کھلتا تھا۔ بھائی جان نے جو جھانکا تو میں بولی۔ “بھائی جان کب آئیں گے وہ مہمان؟” بھائی جان حیران اور آپا کبھی غصے میں اور کبھی مسکراتی ہوئی۔ پھر بھائی جان بولے۔ “فیضو کو الہام بھی ہونے لگا ہے اب۔ بڑی مشکل ہو گئی۔” میں نے کہا۔ “میں کیا جانتی نہیں۔ آپا کی سہیلی آئی۔” “تو پھر پوچھ اپنی آپا سے۔” وہ بولے۔ پھر وہ آپا سے بولے۔ “صفی تمہیں نیند تو نہیں آئے گی۔” آپا نے نگاہ بھر کر دیکھا اور مسکرائی۔ اور وہ بولے۔ “نہیں۔ اگر تمہیں نیند آئی ہے تو بے شک سو جاؤ۔ میرا مطلب ہے میں ذرا سا کام کر لوں۔” اور انہوں نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ پھر آپا کی طرف۔ میں سمجھ گئی کہ بس اس بات کے انتظار میں ہیں وہ کہ میں سو جاؤں۔ پھر کیا تھا، ابھی دو منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ لگی میں انگڑائیاں اور جمائیاں لینے اور پھر پتھر سی پڑ گئی جیسے کل کی مری ہوئی تھی۔ توبہ--- ایسے سمے کیا مجال کہ ذرا سی بھی ہل جاؤں۔ چاہے لاکھ چیونٹیاں رینگیں، کھلجی ہو۔ اونہوں---

بھائی جان نے آکر پہلے میری طرف دیکھا۔ میں نے پہلے سے رضائی میں درز رکھ لی تھی جس میں سے دیکھ بھی سکوں۔ وہ بولے۔ “فیضو سو گئی؟” “فیضو؟” آپا نے مجھے آواز دی اور پھر مسکرا دی۔ میں چپ--- بھائی نے اطمینان کا سانس لیا۔ بولے۔ “یہاں بیٹھ جاؤں میں؟” آپا ذرا پرے سرک گئی۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ میں جانوں وہ گھبرا رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ کیسے شروع کریں بات۔ بات کرنے سے ڈرتے ہوں گے۔ آپا بھی تاڑ گئی اور آپ ہی چھیڑ دی اس نے۔ بولی۔ “کب آئیں گے مہمان؟ فیضی کی بات پر نہ جائیں آپ۔”

“نہیں نہیں۔ ٹھیک ہے۔” وہ بولے۔ “تم نے سچ کہا تھا۔ وہ کل آ رہی ہے۔ کل رات کو۔ میں تمہیں دھوکے میں نہ رکھوں گا صفی--- نہ جانے وہ کیوں آ رہی ہے۔” وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگے۔ “کسی گاؤں میں جانا ہے۔ ضروری کام ہو گا۔ کل رات یہاں پہنچے گی۔ پھر صبح سویرے موٹر سے چلی جائے گی اور شام تک لوٹ آئے گی۔ پھر رات یہاں رک کر صبح کی گاڑی سے واپس چلی جائے گی۔ لیکن وہ ویٹنگ روم میں ٹھہر سکتی تھی۔ نہ جانے کیوں یہاں گھر آکر ٹھہرنے پر ضد کر رہی ہے۔ اف انکی ضد---” بھائی نے کہا۔ “اس کی ضد کون توڑے گا۔ اس کی ضد نے تو کیا کیا توڑ کر رکھ دیا۔ اسے بھی توڑ دیا لیکن--- وہ غصے میں بڑبڑائے۔ “اب آنے کا مطلب؟ یہ میں پسند نہیں کرتا۔ نہ جانے کیوں آ رہی ہے وہ؟”

“بلکہ اچھا ہوا۔” آپ بولی۔ “مجھے تو کب سے ملنے کی آرزو تھی۔”

یہ سن کر بھائی جان حیران رہ گئے۔ “تم نہیں جانتیں صفی---”

“میں جانتی ہوں۔” وہ بولی۔ “مجھے معلوم تھا وہ آئے گی۔ ضرور آئے گی۔ مجھے کتنی خوشی ہو گی۔”

“تم---” بھائی جان نے آپا کی طرف دیکھا۔ جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں آپا کو۔ وہ گھبرائے۔ “صفی تم جانتی نہیں۔”

“ہاں ہاں میں جانتی ہوں۔”

“میں تم سے کچھ نہ چھپاؤں گا۔ میں تمہیں دھوکا نہ دوں گا صفی!”

“میں جانتی ہوں۔” آپا بولی۔ اس نے نگاہ بھر کر ان کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

“صفی!” بھائی نے حیرانی سے دیکھا۔ ان کی نگاہ تشکر سے لبریز تھی۔ “کچھ دن کے لیے یہاں---” وہ زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔

آپا بولی۔ “انہیں روک لیجئے گا۔ کچھ دیر اکٹھے رہیں گے۔ مجھے مدت سے آرزو تھی۔”

“نہ جانے تم کیا سمجھ رہی ہو صفی---؟ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں۔”

“بس وہ تمہاری طرح ہے۔ تمہاری طرح۔” بھائی بولے۔ “میری طرح---؟ میری طرح---؟” آپا کی اس مسکراہٹ میں کیا نہ تھا۔ طنز کی دھار تھی اور چیخ و پکار بھی۔ ہائے--- آپا کی وہ ہنسی۔ میں تو کانپ کانپ گئی۔ “جی۔” بھائی بڑبڑائے۔ “تمہاری طرح بے داغ۔ اجلی۔ ہم کالج میں اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ وہ سب سے الگ تھی۔ باقی لڑکیاں تو چاؤ چونچلے کرنے میں لگی رہتیں لیکن نیلی اس کا نام ہے۔ عیسائی ہے نا وہ۔ میں اسے نیلی کہا کرتا ہوں--- نیلی۔” بھائی مسکرائے۔ معاً آپا نے نِنھے کی طرف دیکھا۔ “نیلی کسی سے نہ ملتی تھی۔ اس میں اک آن تھی۔” بھائی نے پھر بڑبڑانا شروع کر دیا۔ “مجھے اس کی یہی بات بھا گئی۔ ہم اکثر اکٹھے بیٹھے رہتے۔ میں ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ گھنٹوں اکٹھے بیٹھے رہتے لیکن کیا مجال جو کوئی حرکت ہو۔ فضول بات--- میرا مطلب ہے۔” “میں سمجھتی ہوں۔” آپا نے کہا۔ بھائی ہنسنے لگے۔ “ایک دفعہ میں نے کچھ کہہ دیا تھا۔ ویسے ہی مذاق میں۔ اف کس قدر بگڑی۔ بولی، مسٹر جلیل--- میرے خیال میں آپ یہاں آکر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ہفتہ بھر تک اس کا غصہ نہ گیا۔ پھر میں نے ڈرتے ڈرتے اسے پیغام دے دیا۔ شادی کرنے میں تو اسے اعتراض نہ تھا لیکن بڑی کڑی شرط تھی اس کی۔ کہنے لگی، مسٹر جلیل۔ “پرپوزل” دینے سے پہلے یہ جان لیجئے کہ میں شادی اپنے ہم مذہب ہی سے کروں گی--- میں اس کے لیے وہ کام بھی کر سکتا تھا جو کسی کے لیے کرنے کو تیار نہ تھا لیکن مذہب بدلنا--- یہ مجھے گوارا نہ تھا۔ ہزار منتیں کیں۔ کہا، نیلی تم میری ہی نہیں، اپنی زندگی بھی برباد کرو گی۔ پر--- اس کی بات اٹل تھی۔

کہنے لگی، میں جانتی ہوں۔ اس سے زیادہ جانتی ہوں۔ شاید--- شاید میں کبھی کسی سے بیاہ نہ کرسکوں لیکن مسٹر جلیل محبت سبھی کچھ نہیں ہے اس دنیا میں۔ محبت ایک جہان ضرور ہے لیکن اس کائنات میں اس سے بڑے بڑے جہان بھی ہیں۔

چھ مہینے کے بعد جب میں پھر اس سے ملا تو کہنے لگی، بہتر ہے کہ اب یہ چنگاری یا تو بجھ جائے یا بھسم کر ڈالے۔ اب بار بار مل کر اسے بھڑکانا اچھا نہیں۔ ان دنوں وہ کس قدر لاغر ہو رہی تھی۔ اس کی ماں کہتی تھی، اسے دق نہ ہوا تو کہنا لیکن اپنی ضد کی پکی ہے۔ یہ بات اس نے سن لی۔ کہنے لگی، اماں---! دق نہ بھی ہو تو کیا اور اگر ہو بھی جائے تو کیا--- بس ایک ہی افسوس ہے مجھے۔ صرف ایک بچہ۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔" بھائی نے بہانے بہانے آنکھیں پونچھ کر کہا۔ توبہ میں تو بھائی کی حالت دیکھ کر سن ہو رہی تھی۔ نہ جانے لوگوں کو آپ جلنے اور کسی کو جلانے میں کیوں مزہ آتا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ بھائی اس قدر دکھی ہیں۔ "نہ جانے اب وہ کیوں آ رہی ہے؟" بھائی اٹھ بیٹھے۔ "ضد--- اور کیا۔ لیکن صفی۔ یہ نہ بھولنا کہ اب--- اب بے سود ہے۔ اب میں تمہارا ہوں--- صرف تمہارا۔ اب ہمارے درمیان کوئی نہیں آسکتا۔"

بڑی اماں نے سنا تو بھبھک بھبھک کر کے بولی۔ "نہ جی میں نہیں جانتی۔ سہیلی وہیلی۔ توبہ--- کیا زمانہ آیا ہے۔" "یہ تو ویسے ہی چھیڑ رہے ہیں۔ سہیلی تو میری ہے۔" آپا بولی۔ "چاہے کسی کی ہو۔" بڑی اماں بولی۔ "پر ہے تو کافر۔ میں تو کسی کافرہ کو منہ لگنے دوں گی بچہ زچہ کے۔ نہ بھئی۔ یہ شگن اچھا نہیں ہوتا۔"

اس روز میں نے دوپہر کو جی بھر کر سولیا۔ جانتی تھی نا کہ رات کو وہ آنے والی ہے۔ ہائے کس قدر چاؤ تھا مجھے اسے دیکھنے کا۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ دیکھوں تو کیسی ہے۔ بڑی پھبن ہوگی۔ کالج کی جو ہوئی۔ ہائے میری تو جان جاتی ان کالج والیوں سے۔ کس طرح بات کرتی ہیں۔ جیسے شربت کے گھونٹ پی رہی ہوں اور پھر ان کا چلنا پھرنا۔ ہر بات میں لے ہوتی ہے--- لے اور رنگ۔ رنگوں کے چناؤ میں تو حد کر دیتی ہیں۔ مجھے تو ان کالج والیوں سے عشق ہے۔ عشق۔

اپنا کمرہ خالی کر دیا۔ وہاں اس بیگم کی چارپائی ڈلوا دی اور اپنی چارپائی ہمارے کمرے میں لے آئے۔

توبہ کتنا انتظار کرنا پڑا مجھے۔ بھائی تو اسٹیشن گئے ہوئے تھے۔ اور آپا کروٹیں لے رہی تھیں۔ جیسے کسی پہلو قرار نہ ہو--- نہ جانے کیا وقت تھا جب وہ آئے۔ اور میرا دل لگا دھک دھک کرنے۔ میں نے اپنی رضائی میں سے دیکھا۔ پر--- ایسی جگہ پر تھی میری چارپائی کہ وہ نظر نہ آئی۔ میں تو تڑپ کر رہ گئی۔ لیکن ہلتی کیسے۔ میں تو کب کی یوں پڑی تھی جیسے نیند میں بے ہوش ہو کوئی۔ ہلتی تو

آپا کو پتہ چل جاتا--- ادھر ان دنوں کا جھگڑا شروع تھا۔ ہائے کیسی پیاری آواز تھی۔ کیسا لوچ تھا۔ یوں گول گول لفظ نکلتے تھے منہ سے جیسے رس گلے ہوں۔ پر تھی وہ اس طرف دیوار کی اوٹ میں اور سامنے بھائی جان کرسی پر بیٹھے تھے۔

وہ بچے کو دیکھنے کی ضد کر رہی تھی اور بھائی جان کہہ رہے تھے۔ "اگر کچھ ہو گیا تو سب سمجھیں گے کہ بس تم ہی کچھ کر گئی ہو۔" وہ بھائی جان کی باتوں کو مانتی تو تھی۔ پر میں جانوں اسے آپا اور ننھے کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ توبہ--- اس قدر دبی دبی باتیں کر رہے تھے کہ وہ سنی نہ جاتیں۔ کبھی کوئی لفظ کان میں پڑ جاتا۔ آپا بھی تو بار بار کان سے بال ہٹاتی تھی۔ گو دیکھنے کو میں چپ پڑی تھی۔ وہ یوں کھوئی ہوئی تھی کہ ننھے کو تھپکنا بھی بھول گئی تھی۔

نامکمل بندہ [illegible]

"ہاں۔" اس کی آواز آئی۔ "اب میں نے جان لیا ہے۔" اس نے اک آہ بھری۔ "اس بات میں مذہب کو لانا میری بھول تھی۔ لیکن---"

"نہیں نہیں۔" بھائی جان تڑپ کر بولے۔ "اب۔ اب اس بات کو---"

"ہاں۔ اب---" وہ ہنسی۔ دھار سی تیز ہنسی۔ گویا وہ دھار اپنے آپ کو کاٹ رہی ہو۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" بھائی اٹھ بیٹھے۔ "اگر اب جان بھی لیا تھا تو کہنے سے فائدہ---؟ اوہ--- یہ تم نے کیا کہہ دیا نیلی۔ پھر سے مجھے---"

"پھر سے۔" وہ ہنسی۔ "ہاں۔ آپ کے لیے تو پھر سے ہے--- لیکن یہاں جب اور اب سب ایک تار سے بندھے ہیں۔ پھر تو ہوا ہی نہیں۔"

"نیلی---!" بھائی چلائے۔ "تم اب آرام کرو۔ تھکی ہوئی ہو۔"

"ہاں۔ چور ہوں چور--- لیکن میں مسز جلیل سے ضرور ملوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ میں اب اندر چلی جاؤں گی۔"

"نہیں نہیں۔ آج نہیں۔" بھائی بولے۔ "اگر صفی کو اعتراض نہ ہوا تو کل بڑی اماں سے چوری---"

"اور بچہ۔ وہ تو مجھے دے دیجئے گا۔ وہ میرا ہے۔ مسٹر جلیل!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" بھائی بولے۔

"آخر میں کیسے گزار سکوں گی؟"

"لیکن۔ وہ نہ مانے گی۔"

"میں منا لوں گی اسے۔"

بھائی جان گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئے۔

صبح جب میں جاگی تو مہمان جا چکی تھی۔ بھائی جان اسے پہلی موٹر میں بٹھا آئے تھے۔

"سارا دن میں دعائیں مانگتی رہی کہ بھائی جان اسے آپا سے ملانے پر راضی ہو جائیں۔ وہ آپا سے نہ ملتی تو میں اسے کیسے دیکھتی اور اسے دیکھنے کے لیے تڑپ رہی تھی میں۔

شام کو میں اندر آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ آپا بگڑی بیٹھی ہے۔ غصے میں کہہ رہی تھی۔ "میں ضرور ملوں گی۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔ میں آپ ادھر چلی جاؤں گی۔" بھائی جان نے مجھے دیکھ کر اشارہ کیا اور آپا کو چپ کرا دیا۔ میں بھی وہاں سے سرک گئی۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ لیکن بھائی جان کی میز کے پیچھے بیٹھ کر سننے لگی۔ وہ سمجھے 'میں باہر چلی گئی ہوں۔

آپا چمک کر بولی۔ اف --- اس روز آپا لڑ رہی تھی۔ مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہ آتا تھا۔ آپا اور بھائی جان سے لڑے۔ وہ آپا جو جی ہاں کے سوا کچھ کہنا نہ جانتی تھی۔ بولی۔ "اس میں حرج ہی کیا ہے۔ آخر لوگ چار چار کرتے ہیں۔ میں اس کی خدمت کروں گی۔ ایمان سے مجھے کوئی گلہ نہ ہو گا۔"

"لیکن کیوں ---؟" بھائی نے بات کاٹ دی۔

"بس میرا جی کہتا ہے۔" آپا بولی۔ "ایسی اچھی ہے وہ۔ اس کی زندگی کیوں برباد کر رہے ہیں آپ؟"

"لیکن تمہاری زندگی؟" بھائی بولے۔

"میری زندگی۔" آپا نے دہرایا جیسے کوئی ٹوٹا ہوا پیالہ بجتا ہے۔ "میری زندگی کو جانے دیجئے۔ گئی آئی چیز کا کیا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" بھائی غصے میں اٹھ بیٹھے۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ اب تم اور مجھ میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ آپا کا چہرہ ہی کچھ اور ہو گیا۔ جیسے کوئی بیماری کے بعد سکھ کی نیند سو جاتا ہے۔ آپ ہی آپ مسکراتی تھی۔ ایسی جیسے نیا نیا سہاگ ملا ہو۔

شام کو نیلی لوٹ آئی۔ ہم سب انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب بڑی اماں عشاء کی نماز شروع کرے اور نیلی ہم سے ملے۔ چونکہ بھائی جان نے کہہ دیا تھا کہ اماں نماز شروع کرے گی تو ملا دیں گے تم سے۔ اماں کی نماز بھی تو ایسی ویسی نہ تھی۔ نہ جانے کیا کیا پڑھتی رہتی وہ۔ نماز ختم ہوتی تو کھڑی ہو کر کچھ پڑھتی۔ پھر بیٹھ کر ہونٹ ہلاتی رہتی اور پھر ایک لمبا سجدہ۔ یوں معلوم ہوتا جیسے سجدے میں ہی دم نکل گیا ہو۔ توبہ اس روز وقت تھا کہ رک گیا تھا --- نہ جانے کس وقت اماں نے نماز شروع کی۔ اس نے کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی چونکہ نئی پڑوسن سیدانی کو آنا تھا نا --- بچی کو دیکھنے کے لیے، لیکن سیدانی نہ آئی۔ آخر اماں نے انتظار کے بعد شروع کی نماز۔

ہائے ری۔ وہ نیلی --- کیا پھبن تھی۔ کس شان سے وہ اندر آئی۔ گویا میم ہو میم۔ سنہرے بال۔ زرد مخملی رنگ اور نیلی آنکھیں۔ آپا نے نگاہ بھر کر دیکھا اور یوں چونکی جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ پھر بے اختیار پلا اٹھا کر ننھے کی طرف دیکھا اور پھر پاگلوں کی طرح نیلی کی طرف دیکھ کر ہنس پڑی۔ "آیئے بیٹھے۔"

آپا نے ننھے کو اٹھا کر نیلی کی گود میں ڈال دیا اور مسکرا کر بولی۔ "آپ ہی کا تو ہے۔ چاہے ابھی لے لیں یا جب جی چاہے۔ میں تو دایہ ہوں اس کی۔" اف آپا کی وہ بات۔

نیلی پہلے تو حیران بت بنی بیٹھی رہی' پھر چونک کر بولی۔ "آپ کے مزاج تو اچھے ہیں؟" "کیا ٹھکانے ہیں؟" آپا ہنسی۔ بھائی جان گھبرا گئے۔ نیلی نے کہا۔ "کیسا پیارا ننھا ہے۔" اور اس نے ننھے کی طرف دیکھا۔ اف --- اس کا تو رنگ اڑ گیا۔ شرم سے یا نہ جانے کیوں پانی پانی ہو گئی۔ پھر بھائی بولے۔ "نیلی۔ صفی جانتی ہے۔" "مجھے تو بہت خوشی ہے۔" آپا کہنے لگی۔ "کہ گھر والی آ گئی۔" "نہیں۔ نہیں۔" نیلی چلائی۔ "آپ نہیں جانتیں ---" "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" آپا مسکرائی۔ "ہم دونوں بہنیں اکٹھی رہا کریں گی۔ میں خدمت کروں گی۔" آپا کی آواز بھرا گئی۔ "نہیں نہیں۔" بھائی جان چیخنے لگے۔ "اب نہیں۔"

عین اس وقت دروازہ کھلا اور ایک بڑھیا اندر آ گئی۔ "میں پڑوس سے آئی ہوں بیٹی۔" وہ بولی۔ "برا نہ ماننا۔ میرا جی چاہتا تھا ننھے کو دیکھ آؤں۔" بھائی سرک کر کونے میں ہو گئے۔ نیلی نے کرسی کھینچ کر بڑھیا کو بٹھا لیا۔ میں جانوں' وہی سیدانی تھی۔ بڑی اماں انتظار کرتی رہی تھی اس کا۔ سلام کے جواب میں وہ دعائیں دینے لگی۔ پھر بولی۔ "کہاں ہے ننھا؟" ننھے کو دیکھا اور پھر غور سے نیلی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس وقت اس کی گود میں تھا نا وہ۔ "اللہ عمر دراز کرے۔" وہ بولی۔ "کیسا پیارا ہے۔" نیلی کی طرف غور سے دیکھ کر کہنے لگی۔ "بالکل ماں پر گیا ہے۔" بھائی جان کا منہ فق ہو گیا۔ نیلی تو تصویر بنی بیٹھی تھی۔ پر وہ اپنی دھن میں بولتی رہی۔ "اے ہے لڑکی ---" اس نے نیلی سے کہا۔ "یوں کرسی میں بیٹھنا۔ توبہ آج کل کی لڑکیاں تو زچہ بننا جانتی ہی نہیں --- تجھے تو پلنگ پر لیٹ جانا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "نانی --- ننھے کی اماں تو یہ رہی۔" میں نے آپا کی طرف اشارہ کیا۔ بڑھیا نے غور سے آپا کی طرف دیکھا۔ پھر وہ ہنسی۔ "اے ہے لڑکی۔ مذاخ کرتی ہو۔ یہ بال دھوپ میں تو نہیں سفید کیے۔" پھر وہ ننھے سے مخاطب ہوئی۔ "چاہے ننھے سے پوچھ لو کہ کون ہے اس کی اماں۔" نیلی بت بنی بیٹھی تھی۔ ادھر آپا گنگنانے لگی۔ "نہیں اب ہمارے درمیان کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔" وہ پاگلوں کی طرح ہنسی۔

بڑھیا جو اپنی دھن میں بولتی گئی۔ ”کہتے ہیں۔ سچ کہتے ہیں سیانے باپ کی نظر میں جو دلہن کی صورت بچ جائے تو بچے کو تو ماں پر جانا ہی ہوا۔“

بڑھیا بولی۔ ”کیا ہنستی ہے بیٹی۔ بچہ حائل کہاں ہوتا ہے۔ وہ تو بلکے دونوں میں بندھن بن جاتا ہے۔“ بڑھیا نے بھائی اور نیلی پر معنی خیز نگاہ ڈال کر کہا۔ ”اور پھر جب ماں پر شکل ہو اس کی---!“

# چپ

”چپ۔“

جیناں نے چچی کی نظر بچا، ماتھے پر پیاری تیوری چڑھا کر قاسم کو گھورا۔ اور پھر نشے کی شلوار کے اٹھائے ہوئے پائنچے کو مسکرا کر نیچے کھینچ لیا اور از سر نو چچی سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ قاسم چونک کر شرمندہ سا ہو گیا اور پھر معصومانہ انداز سے چارپائی پر پڑے ہوئے رومال پر کاڑھی ہوئی بیل کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا دل خواہ مخواہ دھک دھک کر رہا تھا۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا گویا اس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ قاسم کئی بار یوں چوری چوری جیناں کے جسم کی طرف دیکھتا ہوا پکڑا جا چکا تھا۔ جیناں کے مسکرا دینے کے باوجود وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا اور اس کی نگاہیں چھپنے کے لیے کونے تلاش کرتیں۔ نہ جانے کیوں یوں ان جانے میں اس کی نظر جیناں کے جسم کے پیچ و خم یا ابھار پر جا پڑتی۔ اور وہیں گڑ جاتی۔ اس وقت وہ قطعی بھول جاتا کہ کدھر دیکھ رہا ہے یا کچھ دیکھ رہا ہے۔ مصیبت یہ تھی کہ بات تبھی وقوع میں آتی جب جیناں کے پاس کوئی نہ کوئی ہمسائی بیٹھی ہوتی۔ پھر جب جیناں اکیلی رہ جاتی تو وہ مسکرا کر پوچھتی۔ ”کیا دیکھتے رہتے ہو تم قاسی؟“ ”میں----میں نہیں تو۔“ وہ گھبرا جاتا اور جیناں ہنستی مسکاتی اور پھر پیار سے کہتی۔ ”کسی کے سامنے یوں پاگلوں کی طرح نہیں دیکھا کرتے بلو۔“ اگرچہ اکیلے میں بھی جیناں کا پائنچہ اکثر اوپر اٹھ جاتا اور دوپٹہ بار بار چھاتی سے یوں نیچے ڈھلک جاتا کہ ساٹن میں ملبوس ابھار نمایاں ہو جاتے۔ لیکن اس وقت قاسم کو ادھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی حالانکہ جیناں بظاہر شدت سے کام میں منہمک ہوتی۔ لیکن قاسم بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھتا۔ اب میں جاتا ہوں۔ وہ نظر اٹھاتی اور پھر لاڈ بھری تیوری چڑھا کر کہتی۔ ”بیٹھو بھی۔ جاؤ گے کہاں۔“

”کام ہے ایک۔“ قاسم کی نگاہیں کونوں میں چھپنے کی کوشش کرتیں۔

”کوئی نہیں کام وام۔ پھر کر لینا۔“ لیکن وہ چلا جاتا جیسے کوئی جانے پر مجبور ہو اور آپ ہی آپ

بیٹھی مسکاتی رہتی۔

اس روز جب وہ جانے لگا تو وہ مشین چلاتے ہوئے بولی۔ "قاسی ذرا یہاں تو آنا---- ایک بات پوچھوں بتاؤ گے؟" وہ رک گیا۔ "یہاں آؤ۔ بیٹھ جاؤ۔" وہ اس کی طرف دیکھے بنا بولی۔ وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ زیر لب مسکرائی۔ پھر دفعتاً اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال کر اس کے سر کو اپنی رانوں پر رکھ کر تھپکنے لگی۔ "سچ سچ بتانا قاسی۔" دو ایک مرتبہ قاسم نے سر اٹھانے کی کوشش کی لیکن نشے کی ریشمیں نرمی۔ خس کی ہلکی ہلکی خوشبو اور جسم کی مدھم مخملی گرمی---- اس کی قوت حرکت شل ہو گئی۔ "تم میری طرف اس طرح کیوں گھورتے رہتے ہو---- ہوں؟" اس نے ایک پیارا بھرا تھپڑ مار کر کہا۔ "بتاؤ بھی---- ہوں۔" قاسم نے پورا زور لگا کر سر اٹھا لیا۔ وہ انجانے جذبات کی شدت سے بھوت بنا ہوا تھا۔ آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ منہ نبات کی طرح سرخ اور سانس پھولا ہوا تھا۔ "ہیں---- یہ تمہیں کیا ہوا؟" وہ منہ پکا کر کے پوچھنے لگی۔ "کچھ بھی نہیں۔" قاسم نے منہ موڑ کر کہا۔ "خفا ہو گئے کیا؟" اس نے از سر نو مشین چلاتے ہوئے پوچھا اور دوپٹہ منہ میں ڈال کر ہنسی روکنے لگی۔ "نہیں۔ نہیں کچھ بھی نہیں۔" وہ بولا۔ "اچھا اب میں جاتا ہوں۔" اور باہر نکل گیا۔

اس کے بعد جب وہ اکیلے ہوتے، قاسم اٹھ بیٹھتا۔ "اچھا اب میں جاتا ہوں۔" لیکن اس کے باوجود منہ موڑ کر کھڑا رہتا اور وہ مسکراہٹ بھینچ کر کہتی۔ "اچھا---- ایک بات تو سنو۔" اور وہ معصوم انداز سے پوچھتا۔ "کیا بات ہے؟" "یہاں آؤ۔ بیٹھ جاؤ۔" وہ منہ پکا کر کے کہتی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کر اور بھی معصومانہ انداز سے پوچھتا۔ "کیا ہے؟" معاً حنائی ہاتھ حرکت میں آ جاتے اور قاسم کا سر مخملی، معطر تکیہ پر جا ٹکتا اور وہ حنائی ہاتھ اسے تھپکنے لگتے۔ اس کے تن بدن میں پھلجڑیاں چلنے لگتیں۔ نسوں میں دھنکی بجنے لگتی۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے دوڑ جاتے۔ سانس پھول جاتا۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکتا۔ ایک رنگین اضطراب اسے بے قرار کر دیتا اور وہ اٹھ بیٹھتا۔ "اب میں جاتا ہوں۔" اور وہ نیچی نگاہ کیے مسکاتی۔ مسکائے جاتی۔

پھر نجانے اسے کیا ہوا۔ ایک رنگین بے قراری سی چھا گئی۔ وہ چارپائی پر بیٹھا دعائیں مانگتا کہ وہ اکیلے ہوں۔ اس وقت آنکھیں یوں چڑھی ہوتیں جیسے پی کر آیا ہے۔ جسم میں ہوائیں چھوٹتیں۔ جیناں نیچی نظر سے اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔ اور پھر آنکھ بچا کر کوئی نہ کوئی شرارت کر دیتی۔ مثلاً جب چچی یا بڑی بی کی نظر ادھر ہو تو جیناں جیسے بے خبری میں کوئی کپڑا اپنی گود میں ڈال لیتی اور نیچی نگاہ سے قاسم کی طرف دیکھ کر اسے تھپکنے لگتی اور قاسم---- اف وہ بے چارہ تڑپ اٹھتا اور جیناں منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر ہنسی روکنے کی کوشش کرتی۔ یا وہ دونوں ہاتھ قاسم کی طرف بڑھا کر پھر اپنی گود کی طرف اشارہ کرتی گویا بلا رہی ہو۔ اور جب چچی یا بڑی بی کا دھیان ادھر ہوتا تو جیناں بڑی سرگرمی سے کپڑا سینے میں مصروف ہو جاتی اور مزید چھیڑنے کے خیال سے اپنے دھیان بیٹھی پوچھتی۔ "قاسم آج اس قدر چپ بیٹھے ہو۔ لڑ کر تو نہیں آئے اماں سے؟"

پھر جب وہ اکیلے رہ جاتے تو قاسم چپکے سے اٹھ کر آپ ہی آپ جیناں کے پاس آ بیٹھتا۔ دو ایک مرتبہ ملتجی نگاہوں سے اسے حنائی ہاتھ کی طرف دیکھتا جو شدت سے کام میں مصروف ہوتا اور پھر آپ ہی آپ اس کا سر جھک کر اس معطر سرہانے پر ٹک جاتا۔ یا جب وہ اس کے پاس آ کر بیٹھتا تو وہ منہ پکا کر کے کہتی۔ "کیوں---- کیا ہے؟ اور جب اس کا سر وہاں ٹک جاتا تو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی۔ "بہت شریر ہوتے جا رہے ہو۔ کوئی دیکھ لے تو۔ کچھ شرم کیا کرو۔"

ایک دن جب وہ سر ٹکائے پڑا تھا۔ وہ بولی "قاسی کیا ہے تمہیں؟ یوں پڑے رہتے ہو۔ گم صم۔ مزہ آتا ہے کیا؟" اس روز سر اٹھا لینے کی بجائے نہ جانے کہاں سے اسے زبان مل گئی۔ بولا۔ "مجھے تم سے محبت........" معاً جیناں نے اس کا سر دبا کر اس کا منہ بند کر دیا۔ "چپ۔" وہ بولی۔ "کوئی سن لے تو۔ بیاہتا سے پیار نہیں کرتے۔ انہیں پتہ چل جائے تو میری ناک چوٹی کاٹ، گھر سے نکال دیں۔ سنا بلو۔" وہ اٹھ بیٹھا لیکن اس روز دوڑتے ڈوروں کی بجائے اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ "اب میرا کیا ہو گا؟" آنسوؤں نے اس کا گلا دبا دیا۔ اور جیناں کے بلانے کے باوجود وہ چلا گیا۔ حسب معمول چوری چوری غسل خانے میں منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے لگا۔

نہ جانے ان مخملی، معطر رانوں نے کیا کیا۔ چند ماہ میں ہی وہ قاسی سے قاسم بن گیا۔ گردن کا منکا ابھر آیا۔ آواز میں گونج پیدا ہو گئی۔ چھاتی پر بال اگ آئے اور دونوں جانب گلٹیاں سی ابھر آئیں۔ جن پر ہاتھ لگانے سے میٹھا سا درد ہوتا۔ منہ پر موٹے موٹے دانے نکل آئے۔

پھر ایک دن جب وہ ادھر جانے کی خاطر بولا تو ماں بولی۔ "کدھر جا رہا ہے تو؟" "کہیں بھی نہیں" وہ رک کر بولا۔ "ادھر جیناں کی طرف اور کہاں۔ منہ پر داڑھی آ چکی ہے پر ابھی اپنا ہوش نہیں تجھے۔ اب وہاں جا کر بیٹھنے سے مطلب۔ نہ جانے لوگ کیا سمجھنے لگیں۔ مانا کہ وہ اپنی ہے پر بیٹا اس کی عزت ہماری عزت ہے اور لوگوں کا کیا اعتبار۔" قاسم دھک سے رہ گیا اور وہ چپ چاپ چارپائی پر جا لیٹا۔ جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار ما کر رو پڑے۔

شاید اس لیے کہ قاسی نہ آیا تھا یا واقعی اسے کالے دھاگے کی ضرورت تھی۔ جیناں مسکراتی ہوئی آئی۔ "بھابھی۔" اس نے قاسم کی ماں کو مخاطب کر کے کہا۔ "کالا دھاگا ہو گیا تھوڑا سا۔" اور پھر باتوں ہی باتوں میں ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ "قاسم کہاں ہے۔ نظر نہیں آیا۔ کہیں گیا ہو گا۔" "اندر بیٹھا ہو گا۔" قاسم کی ماں نے جواب دیا۔ "ادھر نہیں آیا آج۔" جیناں نے جھجھک کر پوچھا۔ "خیر تو

ہے۔" میں نے ہی منع کر دیا تھا۔ بھابھی بولی۔ "دیکھ بیٹی اللہ رکھے---- اب وہ جوان ہے۔ نہ جانے کوئی کیا سمجھ لے۔ بیٹی کسی کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھا جاتا اور محلے والیوں کو تو تم جانتی ہو۔ وہ بات نکالتی ہیں جو کسی کی سدھ بدھ میں نہیں ہوتی۔ اور پھر تمہاری عزت ہوئی۔ کیوں بیٹی---- کیا برا کیا میں نے جو اسے جانے سے روک دیا۔" ایک ساعت کے لیے وہ چپ سی ہو گئی۔ لیکن جلد ہی مسکرا کر بولی۔ "ٹھیک تو ہے بھابھی۔ تم نہ کرو میرا خیال تو کون کرے۔ تم سے زیادہ میرا کون ہے۔ تم بڑی سیانی ہو بھابھی۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کہاں چھپا بیٹھا ہے؟" اور اندر چلی گئی۔ قاسی کا منہ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ اسے یوں چپ دیکھ کر وہ مسکرائی اور اس کے پہلو میں گدگدی کرتے ہوئے بولی۔ "چپ۔" پھر با آواز بلند کہنے لگی۔ "مجھے ڈی۔ ایم۔ سی کا اک ڈبہ لا دو گے قاسی۔ سبھی رنگ ہوں اس میں۔ اور پھر اس کی انگلی پکڑ کر کاٹ لیا۔ قاسی ہنسنے لگا تو منہ پر انگلی رکھ کر بولی۔ "چپ۔ اب تو زندگی حرام ہو گئی۔" قاسی نے اس کے کان میں کہا۔ "اب میں کیا کروں گا۔ میرا کیا بنے گا۔" ہونہہ زندگی حرام ہو گئی۔ بس اتنی سی بات پر گھبرا گئے۔" پھر با آواز بلند کہنے لگی۔ "ڈبے میں لال گولا ضرور ہو۔ مجھے لال تاگے کی ضرورت ہے۔" جیناں نے یہ کہہ کر اس کے کان سے منہ لگا دیا۔ "رات کو ایک بجے بیٹھک کی تیسری کھڑکی کھلی ہو گی۔ ضرور آنا۔" ایک آن کے لیے وہ حیران رہ گیا۔ "ضرور آنا۔" وہ اس کا سر بدن سے مس کرتے ہوئے بولی۔ اور پھر با آواز بلند اسے ڈبے کے لیے تاکید کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ "آج نہ سہی۔ کل ضرور آنا۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

اس رات محلے بھر کی آوازیں گلی میں آ کر گونجتیں اور پھر قاسم کے دل میں دھک دھک بجتیں۔ عجیب سی ڈراؤنی آوازیں۔ اس رات وہ آوازیں ایک نہ ختم ہونے والے تسلسل میں پہاڑی نالے کی طرح بہہ رہی تھیں۔ بہے جا رہی تھیں۔ محلّہ ان آوازوں کی مدد سے اس سے انتقام لے رہا تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔ ان کا کھیل اسے برا لگ رہا تھا۔ نہ جانے مائیں اتنی دیر بچوں کو باہر رہنے کی اجازت کیوں دیتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی آوازیں مدھم ہوتی گئیں۔ پھر دور محلّہ کی مسجد میں ملا کی اذان گونجی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی چیخیں مار کر رو رہا ہو۔ کس قدر اداس آواز تھی جسے وہ بھیانک تر بنا رہا تھا۔ ایک ساعت کے لیے خاموشی چھا گئی۔ کراہتی ہوئی خاموشی۔ دروازے کھل رہے تھے یا بند ہو رہے تھے۔ اف کس قدر شور مچا رہے تھے وہ دروازے۔ گویا رینگ رینگ کر شکایت کر رہے ہوں۔

کیا کھڑکی بھی کھلتے وقت شور مچائے گی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ نمازی واپس آ رہے تھے۔ ان کے ہر قدم پر اس کے دل میں "دھک" سی ہوتی۔ توبہ----! اس گلی میں چلنے سے محلّہ بھر گونجتا ہے۔

"چرر---- چوں۔" دروازے ایک ایک کر کے بند ہو رہے تھے۔ نجانے کیا ہو رہا تھا اس روز۔ گویا تمام محلّہ تپ دق کا بیمار تھا۔ "اکھڑ کھڑ دم۔ اہم اہم---- آہم۔" یا شاید وہ سب تفریحاً کھانس رہے تھے۔ تمسخر بھری کھانسی جیسے وہ سب اس بھید سے واقف تھے۔

"ٹن ٹن---- بارہ----" اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے سنا۔ لیکن آوازیں تھیں کہ تھمتیں ہی نہ تھیں۔ کبھی کوئی بچہ بلبلا اٹھتا۔ اور ماں لوری دینا شروع کر دیتی۔ کبھی کوئی بڈھا کھانس کھانس کر محلے بھر کو از سر نو جگا دیتا۔ نہ جانے وہ سب یونہی بیدار رہنے کے عادی تھے یا اسی رات حالات بگڑے ہوئے تھے۔ دوسرے کمرے میں اماں کی کروٹوں سے چارپائی چیخ رہی تھی۔ اماں کیوں یوں کروٹیں لے رہی تھی۔ کہیں وہ اس کا بھید جانتی نہ ہو کہیں۔ چلنے لگے تو اٹھ کر ہاتھ نہ پکڑ لے اماں۔ اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔ شاید جیناں نہ آئے اور وہ مضطرب ہو جاتا۔ اف وہ کتے کیسی بھیانک آواز میں رو رہے تھے۔

شاید اس لیے کہ وہ جیناں کی گود میں سر رکھ کر روتا رہا۔ مجھے تجھ سے محبت ہے۔ میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گا۔ اور وہ حنائی ہاتھ پیار سے اسے تھپکتا رہا۔ اور وہ آوازیں گونجتی رہیں یا شاید اس لیے کہ وہ سارا سارا دن آہیں بھرتا۔ کروٹیں بدلتا اور چپ چاپ پڑا رہتا۔ رات کو علیحدہ کمرے میں سونے کی ضد کرتا اور پھر جیناں ڈی۔ ایم۔ سی کا گولا منگوانے آتی تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ آنکھیں جھومتیں اور وہ بھول جاتا کہ اماں کے پاس محلے والیاں بیٹھی ہیں۔ یا ویسے ہی جیناں کا ذکر چھڑ جاتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ جیناں کے میاں روز بروز بیوی سے جھگڑا کرنے لگے تھے۔ حالانکہ جیناں بظاہر ان کا اتنا رکھ رکھاؤ کرتی تھی، پھر ان دنوں تو وہ اور بھی دلچسپی ظاہر کرنے لگی تھی۔ مگر میاں کو نہ جانے کیوں ایسے محسوس ہوتا۔ گویا وہ توجہ صرف دکھلاوہ تھی اور وہ روز بروز ان سے بے پرواہ ہوتی جا رہی تھی۔ ممکن ہے اس کی وجہ محلے کی دیواریں ہوں جو اس قدر پرانی اور وفادار تھیں کہ جیناں کا یہ رویہ برداشت نہ کر سکتی ہوں۔ اس لیے انہوں نے وہ راز اچھال دیا۔ بہرحال وجہ چاہے کوئی ہو، بات نکل گئی۔ جیسا کہ اسے نکل جانے کی بری عادت ہے۔

پہلے دبی دبی سرگوشیاں ہوئیں۔ "یہ اپنا قاسم---- نواب بی بی کا لڑکا---- اے ہے ایسا تو نہیں دکھے تھا۔" "پر چاچی جیناں تو راہ چلتے کو لپیٹ لیتی ہے۔"

"نہ بڑی بی۔ میرے من تو نہیں لگتی یہ بات۔ ابھی کل کا بچہ ہی تو ہے اور وہ اللہ رکھے۔ بھری مٹیار۔ اونہوں۔" "میں کہتی ہوں بی بی۔ جب بھی جاؤ۔ اتنی آؤ بھگت سے ملتی ہے کیا کہوں۔ لوگوں کا کیا ہے، جسے چاہا اچھال دیا۔" "پر بھابھی۔ ذرا اسے دیکھو تو۔ اللہ مارے نشے کی شلوار ہے۔ سا ٹن کی

قمیض ہے اور کیا مجال ہاتھوں پر مہندی خشک ہو جائے۔ " "ہاں بمن رہتی تو بن ٹھن کر ہے۔ یہ تو مانتی ہوں میں۔ اللہ جانے سچی بات منہ پر کہہ دینا' میری عادت ہی ایسی ہے۔ " "تو اس کے میاں کی بات چھوڑ۔ میں کہتی ہوں' وہ تو بدھو ہے---- بدھو۔ وہ کیا جانے کہ بیوی کو کیسے رکھا جاتا ہے۔ " "اے ری کیا ہو گیا زمانے کو؟"

قاسم نے محسوس کیا کہ لوگ اس کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں۔ پہلے تو وہ شرمندہ ہو گیا۔ پھر اسے خیال آیا۔ کہیں بیٹھک کی تیسری کھڑکی ہمیشہ کے لیے بند نہ ہو جائے۔ اس کا دل ڈوب گیا۔ لیکن جوں جوں محلہ میں بات بڑھتی گئی۔ جیناں کی مسکراہٹ اور بھی رسیلی ہوتی گئی۔ اور اس کی "چپ" اور بھی دلنواز۔

"بس ڈر گئے؟" وہ ہنستی۔ ہم کیا ان باتوں سے ڈر جائیں گے؟" اس کا حنائی ہاتھ بھی گرم ہوتا گیا۔ اور اس کا سنگار اور بھی معطر۔ لیکن ان باتوں کے باوجود قاسم کے دل میں ایک پھانس سی کھٹکنے لگی۔

جب کبھی کسی وجہ سے بیٹھک کی تیسری کھڑکی نہ کھلتی تو معاً اسے خیال آتا کہ وہ اپنے میاں کے پہلو میں پڑی ہے اور وہ معطر گود کسی اور کو گھیرے ہوئے ہے۔ وہ حنا آلود ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ اس خیال سے اس کے دل پر سانپ لوٹ جاتا اور وہ تڑپ تڑپ کر رات کاٹ دیتا۔ پھر جب کبھی وہ ملتے تو شکوہ کرتا۔ رو رو کر گلہ کرتا لیکن وہ ہاتھ تھپک تھپک کر اسے خاموش کر دیتا۔

ادھر قاسم اور جیناں کی باتوں سے محلہ گونجنے لگا۔ مدھم آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ سرگوشیاں دھمکی کی صورت میں ابھر آئیں۔ اشارے کھلے طعنے بن گئے۔ "میں کہتی ہوں چاچی۔ رات کو دونوں ملتے ہیں۔ مسجد کے ملا نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ " "تم اس کے میاں کی بات چھوڑو بی بی۔ آنکھ کا اندھا نام چراغ دین۔ اسے کیا پتہ چلے گا کہ بیوی غائب ہے۔ " "سنا ہے چاچی ایک روز میاں کو شک پڑ گیا پر جیناں----- توبہ اس کے سر پر تو حرام سوار ہے۔ نہ جانے کیسے معاملہ رفع دفع اور ایسی بات بنائی کہ وہ بدھو ڈانٹنے ڈپٹنے کی بجائے الٹا پریشان ہو گیا۔ پیٹ میں درد ہے کیا۔ تم چلو۔ میں ڈھونڈ لاتا ہوں دوا۔ اب طبیعت کیسی ہے----- ہونہہ۔ وہاں تو اور ہی درد تھا بھابھی۔ جبھی تو پھاہار کھوانے آئی تھی۔ مسجد کا ملا کہتا ہے بڑی بی---- اے ہے اس کا کیا ہے؟ اپنی حمیداں کہتی ہے بی بی۔ میں تو ان کی آوازیں سنتی رہتی ہوں۔ کان پک گئے ہیں۔ پڑوسن جو ہوئی ان کی اور پھر دیوار بھی ایک اینٹی ہے۔ توبہ۔ اللہ بچائے حرام کاری کی آوازوں سے۔ نہ جانے کیا کرتے رہتے ہیں دونوں؟ کبھی ہنستے ہیں۔ کبھی روتے ہیں۔ اور کبھی یوں دنگا کرنے کی آواز آتی ہے جیسے کوئی کبڈی کھیل رہا ہو۔ " "پر ماں۔ اپنا گھر والا موجود ہو تو یوں جھک مارنے کا مطلب" "تو چھوڑ اس بات کو۔ " میں کہوں چوری کا مزہ چوری کا سر حرام چڑا ہے۔ پر ماں تو چھوڑ اس بات کو۔ " "دلہن تجھے کیا معلوم کیا مزہ ہے اس "چپ" میں۔ اللہ بچائے۔ اللہ اپنا فضل و کرم رکھے۔ پر میں کہوں' یہ "چپ" کھا جاتی ہے۔ بس اب تو سمجھ لے آپ ہی۔ "

پھر یہ باتیں مدھم پڑتی گئیں۔ مدھم تر ہو گئیں۔ حتیٰ کہ بات عام ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ غالباً" ان لوگوں نے اسے ایک کھلا راز تسلیم کر لیا۔ اور ان کے لیے مزید تحقیق میں دلچسپی نہ رہی۔ نہ جانے جیناں کس مٹی سے بنی تھی۔ اس کی ہر بات نرالی تھی۔ جوں جوں لوگ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے گئے' اس کی مسکراہٹیں اور بھی رواں ہوتی گئیں۔ حتیٰ کہ وہ محلے والیوں سے اور بھی ہنس ہنس کر ملنے لگی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہی اس کی پیٹھ پیچھے باتیں کرتی ہیں اور قاسم-----؟ قاسم سے ملنے کی خواہش اس پر حاوی ہوتی گئی۔ ہنس ہنس کر اسے ملتی۔ اس کے خدشات پر اسے چڑاتی۔ مذاق اڑاتی۔ اس کی ریشمیں گود اور بھی گرم اور معطر ہوتی گئی۔

مگر جب بات عام ہو گئی اور لوگوں نے دلچسپی لینا بند کر دی تو نہ جانے اسے کیا ہوا----- اس نے دفعتاً" قاسم میں دلچسپی لینا بند کر دی جیسے لوگوں کی چپ نے اس کی "چپ" کو بے معنی کر دیا ہو۔ اب بیٹھک کی تیسری کھڑکی اکثر بند رہنے لگی۔ آدھی رات کو قاسم اسے انگلی سے ٹھوکتا۔ اور بند پاتا تو پاگلوں کی طرح واپس آ جاتا اور پھر بار بار جا کر اسے آزماتا۔ اس کے علاوہ اب جیناں کو ڈی۔ ایم۔ سی کے تانگے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ اس لیے وہ قاسم کے گھر نہ آتی۔ جب سے کھڑکی بند ہونا شروع ہوئی تو قاسم پاگل سا ہو گیا۔ وہ رات بھر تڑپ تڑپ کر گزار دیتا اور جیناں کا میاں تو ایک طرف' اسے ہر طرف چلتا پھرتا راہ گیر جیناں کے نشے کی شلوار کی تہوں میں گیند بنا ہوا دکھائی دیتا۔ تعجب یہ ہوتا کہ اب اسے جیناں کی لاپروائی کا شکوہ کرنے کا موقع ملتا تو وہ بے پروائی سے کہتی۔ "کوئی دیکھ لے گا' تبھی چین آئے گا تمہیں۔ مجھے گھر سے نکلوانے کی ٹھان رکھی ہے کیا؟ کیا کروں میں' وہ ساری رات جاگ کر کاٹتے ہیں۔ "

دو ایک مرتبہ ڈھیٹ بن کر کسی نہ کسی بہانے وہ جیناں کی طرف گیا بھی۔ اول تو وہاں کوئی نہ کوئی بیٹھی ہوتی اور جب نہ ہوتا تو بھی جیناں سینے کے کام میں اس قدر مصروف ہوتی کہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ ایک دن جب وہ ادھر گیا تو دیکھا کہ جیناں کے پاس اس کا ماموں زاد بھائی مومن بیٹھا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کبھی وہ خود بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ مومن کا سر بھی کسی ریشمیں' معطر تکیہ سے اٹھا ہے۔ اس پر دیوانگی کا عالم طاری ہو گیا اور جیناں کے بلانے کے باوجود چلا آیا۔ اس وقت اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی کھمبے سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لے۔

ناگاہ وہ واقعہ پیش آیا۔ نہ جانے ہوا کیا؟ آدھی رات کو جیناں کی چیخیں سن کر محلے والیاں

اکٹھی ہو گئیں۔ دیکھا تو جیناں کا خاوند پسلی کے درد سے تڑپ رہا ہے اور وہ پاس بیٹھی آنسو بہا رہی ہے۔ ڈاکٹر بلوائے گئے۔ حکیم آئے۔ مگر بے سود۔ صبح دس بجے کے قریب میاں نے جان دے دی اور جیناں کی پر درد چیخوں سے محلّہ کانپ اٹھا۔ لیکن اس کے باوجود دبی ہوئی سرگوشیاں از سر نو جاگ پڑیں۔ کوئی بولی۔ "اب قدر جانی جب وہ مر گیا۔" کسی نے کہا "ابھی کیا ہے' ابھی تو جانے گی۔ بے چارہ ایسا نیک تھا۔ اف تک نہ کی اور یہ بی بی ہولی کھیلنے میں مصروف لگی رہی۔" چاچی نے سر پیٹ لیا۔ کہنے لگی۔ "آئے ہائے ری۔ تم کیا جانو---- اس کے لچھن۔ میں کہتی ہوں نہ جانے کچھ دے کر مار دیا ہو۔" "ہیں چاچی بس۔ تو چپ رہ۔ ہائے ری جوان میاں کو تڑپا تڑپا کر مار ڈالا۔ وہ منع کرتا تھا اسے۔ اس کے سامنے تو کھیلتی رہی اپنے کھیل۔ پھر جان لے لینا----؟ یا اللہ تو ہی عزت رکھنے والا ہے۔ ہم تو کسی کو منہ نہیں دکھا سکتے۔ محلے کی ناک کاٹ دی۔ میں کہتی ہوں اگر سرکار کو پتہ چل گیا تو۔ وہ تو قبر بھی کھود لیں گے۔" "بس بھابھی بس تو چھوڑ۔ اب اس بات کو دفع کر۔ سمجھ---- کچھ ہوا ہی نہیں۔"

جب قاسم کی ماں نے سنا کہ بیٹا جیناں سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا ہے تو اس نے سر پیٹ لیا۔ اپنا سر پیٹنے کے سوا وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ قاسم اب جوان تھا۔ اپنی نوکری پر تھا۔ ہر ماہ سو پچاس اس کی جھولی میں ڈالتا تھا۔ البتہ اس نے دو ایک مرتبہ اسے سمجھانے کی کوشش ضرور کی مگر بیٹا تو گھر بار چھوڑنے کے لیے تیار تھا۔ اس لیے وہ چپ ہو گئی۔ اگرچہ اندر ہی اندر گھلنے لگی اور جیناں کے متعلق ایسی دعائیں مانگنے لگی کہ اگر وہ پوری ہو جائیں تو قاسم سر پیٹ کر گھر سے باہر نکل جاتا۔

جب محلے والیوں نے سنا کہ قاسم کا پیغام جیناں کی طرف گیا ہے تو چاروں طرف پھر سے چرچا ہونے لگا۔ "کچھ سنا تم نے چاچی----؟" "بس تو چپ کر رہ۔ آج کل تو آنکھوں سے اندھے اور کانوں سے بہرے ہو کر بیٹھ رہو' تب گزارہ ہوتا ہے۔" "پر چاچی کبھی سننے میں نہ آیا تھا کہ بیوہ کو کنوارہ لڑکا پیغام بھیجے---- میں کہتی ہوں' بیوہ مر جاتی تھی مگر دوسری شادی کا نام نہ لیتی تھی اور اگر کوئی پیغام لاتا بھی تو اس کا منہ توڑ دیتی۔ لیکن آج نہ جانے کیا زمانہ آیا ہے۔ پر چاچی وہ تو لڑکے سے سات آٹھ سال بڑی ہو گی۔ اے اپنی فاطمہ سے دو ایک سال ہی چھوٹی ہے۔" "آئے ہائے کیا کہتی ہو تم۔ دکھنے کا کیا بہن۔ ہار سنگار کر کے بیٹھ جاؤ۔ منہ پر وہ اللہ مارا کیا کہتے ہیں' اسے آٹا لگا لو۔ تو تم بھی چھوٹی دکھو گی۔ دکھنے کا کیا ہے؟ اس سے تو عمر چھوٹی نہیں ہو جاتی۔"

قاسم کا خیال تھا کہ جب جیناں بیاہ کا پیغام سنے گی تو اٹھ کر ناچنے لگی گی لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ سوچ میں پڑ گئی تو جل کر راکھ ہو گیا۔ پھر---- اسے مومن کا خیال آیا۔ اور غصے سے منہ لال ہو گیا۔ "صاف انکار کیوں نہیں کر دیتی تم؟" اس نے گھور کر جیناں کی طرف دیکھا۔ جیناں مشین

چلانے میں لگی رہی۔ پھر آنکھ اٹھائے بغیر کہا۔ "تم تو قاسی ہی رہے۔" "قاسی رہتا تو تم اس قدر لاپرواہ کیوں ہو جاتیں؟" وہ بولا۔ "میں تو لاپرواہ نہیں۔" اس نے سوئی میں دھاگا پروتے ہوئے کہا۔ "مجھے جواب دو۔" وہ بولا۔ اس کی آواز میں منت کی جھلک تھی۔ "جواب دو۔ میں یوں انتظار میں گھل گھل کر مرنا نہیں چاہتا۔" "اچھا۔" جیناں نے آہ بھر کر کہا۔ "تمہاری خوشی اسی میں ہے تو یہی سہی" "جیناں-----" اس کا سر اس ریشمیں تکیے پر جا ٹکا۔ "اے ہے کوئی دیکھ لے گا۔" وہ بولی۔ "دیکھ لے۔" اس نے جیسے نیند میں کہا۔ "کہیں مومن نہ آ جائے۔" جیناں نے سرسری طور کہا۔ "مومن-----" اس کے دل پر تیر سا لگا۔ اور وہ اٹھ بیٹھا۔ "مومن آ جائے تو اسے جان سے نہ مار دوں۔" وہ غرایا۔

اس کے نکاح پر محلے والیوں نے کیا کیا نہ کہا۔ کوئی بولی۔ "لو---- یہ یوسف زلیخاں کا قصہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔" کسی نے کہا۔ "ابھی نہ جانے کیا کیا دیکھنا باقی ہے۔ ابھی تیل دیکھو' تیل کی دھار دیکھو۔"

کسی نے کہا۔ "اے ہے جیناں۔ کیا اسے گود میں کھلائے گی۔ میاں نہ ہوا' لے پالک ہوا۔" چاچی ہنسی۔ بولی "تو چھوڑ اس بات کو بی بی۔ آج کل کے لڑکوں کو گود میں پڑے رہنے کا چسکا پڑا ہوا ہے۔ جورو کو ماں بنا لیتے ہیں۔ ہاں-----" کوئی کہنے لگی۔ "خیر چاچی حرام سے تو اچھا ہے کہ نکاح کر لیں۔ کیوں بڑی بی۔ ہے نا یہ بات؟ میں سچی کہوں گی۔ ہاں بہن نہ جانے کب سے کٹے ہوئے تھے ایک دوسرے سے۔"

نہ جانے بیاہ کے بعد کیا ہوا انہیں---- جیناں تو گویا گھر گرہستی عورت بن گئی۔ اس کے نشے کے پاجامے عام پاجامے نظر آنے لگے جو محض جسم ڈھانپنے کے لیے پہنے جاتے ہیں۔ اور خس کی خوشبو تو گویا اڑ ہی گئی۔ حالانکہ اب بھی وہ خس کا عطر لگاتی تھی۔ اس کے اٹھے اور گرے ہوئے پائنچوں میں چنداں فرق نہ رہا۔ البتہ جب کبھی قاسم اس کا پائنچہ اٹھا ہوا دیکھتا تو پھر وہ بے قرار ہو کر اندر چلا جاتا۔ اور چپ چاپ پڑا رہتا۔ شروع میں وہ اکثر جیناں کے پاس آ بیٹھتا۔ لیکن اب جیناں کا حنائی ہاتھ شدت سے کام میں لگا رہتا اور اس کی گود بند رہتی۔ اگر کبھی قاسم کا سر وہاں تک بھی جاتا تو وہ اپنے کام میں یوں مگن بیٹھی رہتی گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ کبھی چڑ کر کہتی۔ کیا بچوں کی سی باتیں ہیں تمہاری؟" اس پر وہ محسوس کرتا۔ گویا وہ گود کسی اور کے لیے مخصوص ہو چکی ہو اور تھپکنے والا ہاتھ کسی اور کا منتظر ہو۔

کئی مرتبہ دفتر میں کام کرتے ہوئے یہ شک سانپ کی طرح ڈسنے لگا کہ دونوں بیٹھے ہیں۔ وہ اور مومن اور اس کا سر ریشمیں تکیے پر ٹکا ہوا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ کانپ اٹھتا اور واپسی پر جیناں کو

ڈھونڈتا تو دیکھتا کہ جیناں یوں مگن بیٹھی ہے، گویا پرانے خواب دیکھ رہی ہو۔ کسی رنگین ماضی کے دھیان میں مگن ہو یا شاید کسی متوقع مستقبل کے۔ وہ چپ ہو جاتا۔ اسے یوں دیکھ کر جیناں مسکرا کر کہتی۔ “کیا ہے آج سرکار کو؟” اور وہ ہنسنے لگتی۔ “پائی ہوئی چیز کو کھونے کا بہت شوق ہے سرکار کو؟ پائی ہوئی ----” وہ ہنستا۔ جسے رنگین خواب میسر ہوں۔ وہ بھلا تلخ حقیقت کیوں دیکھے۔ اسے جاگنے کی کیا ضرورت۔ جاگ کر دکھتا بھی کیا ہے۔ بس چپ چاپ سنائی دیتا ہے۔ ان دنوں تو “چپ” میں بہت مزہ تھا۔ اب ہماری چپ بھی پسند نہیں۔ اور وہ چڑ کر جواب دیتی۔ “کہاں وہ “چپ” اور کہاں یہ ----” وہ غصہ میں آ جاتا۔ “نہ جانے کس کس سے “چپ” کا کھیل کھیلا ہو گا؟” “بس کھا لیا شک نے۔” وہ جل کر کہتی۔ “جی ----” قاسم طنزاً جواب دیتا۔ “تم تو ٹھہرے شکی۔ اب مومن کیسے بنیں؟”

یا کسی روز دفتر سے واپسی پر وہ کہتا۔ “کس کے انتظار میں بیٹھی تھی؟” اور وہ جل کر بولتی۔ “کوئی بھی جو آ جائے۔” “اوہو۔” وہ سنجیدگی سے چھیڑتا۔ “ہم تو غلطی سے آ گئے۔” “تو واپس چلے جاؤ۔” وہ جل کر کہتی۔

اس طرح مذاق ہی مذاق میں وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ جیناں کام میں منہمک رہنے لگی لیکن شاید کام تو محض ایک دکھاوا تھا۔ ایک پس منظر۔ ایک اوٹ جس میں ماضی کے خواب دیکھتی تھی۔ اس کے خواب قاسم کو اور بھی پریشان کرتے۔ اسے اس بات پر غصہ آتا کہ وہ خوابوں کو حقیقت پر ترجیح دے رہی ہے۔ پھر اسے خیال آتا کہ شاید کوئی اور خواب ہوں۔ جن کا اس سے تعلق نہ ہو۔ اس خیال پر اسے جیناں کے خوابوں میں مومن کی تصویر نظر آنے لگتی۔

البتہ ان دنوں جب قاسم کے ماں باپ چند دن کے لیے ان کے پاس آئے تو قاسم نے محسوس کیا کہ جیناں وہی پرانی جیناں تھی۔ اس روز جب اماں سے باتیں کر رہا تھا تو جیناں نے آ کر اندھیرے میں اس کی کمر پر چٹکی بھر لی۔ اور جب وہ گھبرا کر کچھ بولنے لگا تو بولی۔ “چپ” اور ایک حنائی ہاتھ نے بڑھ کر اس کا منہ بند کر دیا۔ پھر اس دن جب وہ ابا کے دیوان خانے میں سویا ہوا تھا، کسی نے اس کے کان میں تنکا چبھو کر اسے جگا دیا۔ ابھی وہ اٹھنے ہی لگا تھا کہ وہ ہونٹ اس کے ہونٹوں سے مل گئے۔ اور پھر ایک ہلکا سا پیارا سا تھپڑ گال پر پڑا۔ ایک حنائی انگلی اس کے ہونٹوں پر آ رہی۔ “چپ” اس معطر اندھیرے میں سے پیاری سی آواز آئی۔ بیشتر اس کے کہ قاسم اسے پکڑ سکتا، وہ جا چکی تھی۔ پھر ایک روز غسل خانے میں جب وہ نہانے لگا تو معاً کوئی دروازے کی اوٹ سے نکل کر اس سے چمٹ گیا۔ وہ گھبرا کر چلانے لگا۔ مگر دو حنائی ہاتھوں نے اس کا منہ بند کر دیا۔ “چپ” وہ دیوانہ وار ان حنائی ہاتھوں کو چومنے لگا۔ پھر جب اس نے جیناں کو پکڑنے کی کوشش کی تو وہ منہ پکا کر کے بولی۔ “شور مچا دوں گی

تو ابھی اماں آ کر سمجھ لے گی تم سے۔” جب اس کے والدین نے جانے کی تیاری کی تو قاسم نے اس خیال سے انہیں نہ روکا کہ ان کے چلے جانے پر اس کی کھوئی ہوئی جیناں مکمل طور پر اسے مل جائے گی۔ حالانکہ جیناں نے ہر ممکن طریقے سے انہیں روکنے کی کوشش کی اس کی منتیں سن کر یوں گمان ہوتا تھا جیسے کوئی ڈوبتا تنکے کا سہارا ڈھونڈ رہا ہو۔ مگر وہ چلے گئے اور جیناں ہار کر بیٹھ گئی۔

ان کے چلے جانے کے بعد قاسم نے ہزار کوششیں کیں لیکن اپنی جیناں کو پانے کی جگہ اور بھی کھوئے چلا گیا۔ اس بات پر قاسم کے شکوک از سر نو چمکے۔ ان شکوک نے جیناں کو اور بھی چڑا دیا۔ جیناں کے چڑنے نے اس کی شبہات کو ہوا دی اور وہ چپ چپ رہنے لگا۔ حتیٰ کے وہ ایک دوسرے سے اور بھی بے گانہ ہو گئے۔ پھر ایک دن جب وہ دفتر سے لوٹا تو اس نے دیکھا کہ جیناں بن ٹھن کر مشین پر کام میں لگی ہوئی ہے اور پاس مومن بیٹھا ہے۔ جیسے اس نے ابھی اس معطر گود سے سر اٹھایا ہو۔ اس کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ مومن کے جانے کے بعد وہ غرایا۔ “مومن اس مکان میں نہیں آئے گا۔ سنا تم نے؟ اس مکان میں کوئی جوان لڑکا نہ آئے۔” “تمہارا ہی لگتا ہے کچھ۔ میں کیا جانوں کون ہے؟” وہ بولی۔ “اپنی گود سے پوچھ لو کہ کون ہے۔” اس نے غصے سے کہا۔ “بس جی۔” وہ غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔۔ “پھر نہ کہنا یہ بات۔” “کہنے کی کیا ضرورت۔” وہ بولا۔ “اب کے آیا تو ہڈیاں توڑ دوں گا۔” وہ شیرنی کی طرح بپھر گئی۔ “ذرا ہاتھ لگا کر تو دیکھو۔ تم مجھ پر ہاتھ اٹھانے والے کون ہو؟” قاسم کی نگاہوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس کا ہاتھ اٹھا ---- محلے والوں نے جیناں کی چیخیں سنیں۔ کوئی گرج رہا تھا۔ “مومن ---- مومن۔” وہ چیخ رہی تھی۔ “بس میں اس گھر میں ایک منٹ نہ رہوں گی۔”

“سنا تم نے۔ اب مومن کا جھگڑا ہے۔ توبہ۔” “یہ عورت کسی لڑکے کو لپٹے بنا چھوڑے گی بھی۔ میں کہتی ہوں اس کے سر پر حرام سوار ہے ---- ہاں۔” “میں کہتی ہوں، اچھا کیا جو میاں نے ہڈیاں سینک دیں ذرا۔” “پر چاچی کہاں مومن کہاں جیناں۔ مومن تو اس کے بیٹے سمان ہے۔” “اللہ تیرا بھلا کرے۔ جبھی چھاتی پر لٹا رکھتی ہو گی نا؟” اب خاوند سے لڑ کر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی ہے۔” “نہ جانے وہاں کیا گل کھلائے گی۔ میں جانوں اچھا ہوا۔ خس کم جہاں پاک۔ مرد ہوتا تو جانے نہ دیتا۔ کمرے میں بند کر دیتا۔ اچھا نہیں کیا جو اسے جانے دیا۔” “بلکہ وہ تو اور بھی آزاد ہو گئی۔” “سنا ہے چاچی خط آیا ہے۔ ہاں ---- طلاق مانگتی ہے۔” “بڑی آئی طلاق مانگنے والی۔” “میری مانے تو ---- ساری عمر بٹھا رکھے۔” “خیر بی یارانے کے بیاہ کا مزا تو پا لیا۔” “میں پوچھتی ہوں، اب اور کسے پھنسائے گی؟ تمہیں کیا معلوم۔ اسی روز سے اپنا مومن غائب ہے۔” “جبھی تو قاسی سر جھکائے پھرتا ہے۔ دنیا کو منہ کیسے دکھائے گا۔” “میں کہتی ہوں۔ بس ایک طلاق نہ دے اور جو جی چاہے

کرے۔" "ہونہہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ اپنی فاطمہ بتا رہی تھی کہ کاغذ خرید لیا ہے۔"

اس واقعہ پر قاسم کی زندگی نے ایک بار پھر پلٹا کھایا۔ اسے عورت سے نفرت ہو گئی۔ محبت پر اعتبار نہ رہا۔ "عورت-----؟" وہ دانت پیس کر کہتا۔ "عورت کیا جانے محبت کسے کہتے ہیں۔ ناگن صرف ڈسنا جانتی ہے صرف ڈسنا۔ اگر اس نے طلاق لکھ بھیجی تھی تو صرف اس لیے کہ محلّہ کے لوگ اسے مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اور عورتیں صبح و شام اس کی باتیں کرتی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس قصہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے اور اپنی زندگی از سر نو شروع کرے۔ لیکن جب اس نے سنا کہ جیناں نے مومن سے نکاح کر لیا تو وہ اس بظاہر بے تعلقی کے باوجود جو وہ جیناں کے متعلق محسوس کرنا چاہتا تھا، تڑپ کر رہ گیا۔ حالانکہ وہ ہر وقت جیناں سے نفرت پیدا کرنے میں لگا رہتا تھا۔ اسے برا بھلا کہتا تھا۔ بے وفا فاحشہ سمجھتا۔ لیکن کبھی کبھی اس کی آنکھوں تلے ریشمیں معطر گود آ کر کھل جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہیں سر ٹکا دے۔ وہ حنائی ہاتھ اسے تھپکے اور وہ تمام دکھ بھول جائے۔ پھر کسی وقت اس کے سامنے ایک مسکراتا ہوا چہرہ آ کھڑا ہوتا۔ دو ہونٹ کہتے۔ "چپ" اگرچہ اس وقت وہ لاحول پڑھ کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا تھا لیکن یہ تصاویر اسے اور بھی پریشان کر دیتیں۔ اور وہ اور بھی کھو جاتا۔ ایک سال کے بعد جب جیناں اور مومن محلے میں آئے تو پھر چرچا ہونے لگا۔ محلے والیاں بڑے اشتیاق سے دلہن کو دیکھنے لگیں۔ اگرچہ ان کی مبارک باد طعنہ آمیز تھی لیکن مومن کی ماں کو مبارک تو دینا ہی تھا۔

اتفاق کی بات تھی کہ جب مومن اور جیناں محلے میں داخل ہوئے، عین اس وقت قاسم گلی میں کھڑا چاچی سے بات کر رہا تھا۔ اس روز وہ ایک سرکاری کام پر ایک دن کے لیے باہر جا رہا تھا اور چاچی سے کہہ رہا تھا۔ "ہاں چاچی سرکاری کام ہے۔ کل رات کی گاڑی سے لوٹ آؤں گا۔" پیچھے آہٹ سن کر وہ مڑا تو کیا دیکھتا ہے، جیناں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ بھاگا حتیٰ کے اسٹیشن پر جا کر دم لیا۔

اس روز دن بھر وہ جیناں کے بارے میں نہ سوچنے کی کوشش کرتا رہا۔ دل میں ایک اضطراب سا کھول رہا تھا مگر وہ تیزی سے کام میں مصروف رہا۔ جیسے ڈوبتا تنکے کا سہارا لینے کے لیے بے تاب ہو۔ کام ختم کر کے وہ رات کو گاڑی پر سوار ہو ہی گیا۔ گاڑی میں بہت بھیڑ تھی۔ اس گہما گہمی میں وہ قطعی بھول گیا کہ وہ کون ہے۔ کہاں جا رہا ہے اور وہاں کون آئے ہوئے ہیں۔ جب وہ محلے کے پاس پہنچا تو ایک بجنے کی آواز آئی۔ "ٹن۔" معاً وہ دبے پاؤں چلنے لگا۔ گویا ہر آہٹ اس کی دشمن ہو۔ گلی میں پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ وہی پرانا قاسی تھا۔ دفعتاً ایک ریشمیں معطر گود اس کی نگاہ تلے جھلملائی۔ دیکھوں تو بھلا۔ اس کے دل میں کسی نے کہا۔ دل دھڑکنے لگا۔ نگاہ بیٹھک کی تیسری کھڑکی پر

جا کر ٹکی۔ انگلی سے دبایا تو پٹ کھل گیا۔ اور وہ اندر چلا گیا۔ معاً سامنے سے اس پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ وہ گھبرا کر مڑنے ہی لگا تھا کہ وہ روشنی ایک حسین چہرے پر جا پڑی۔ "ہاں وہی۔" سیڑھیوں میں جیناں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ "تم؟" وہ غصے سے چلایا۔ ایک ساعت میں اسے سب باتیں یاد آ چکی تھیں۔ اس کا جسم نفرت سے کھولنے لگا تھا۔ "چپ" جیناں نے منہ پر انگلی رکھ لی۔ قاسم کا جی چاہتا تھا کہ اس حسین چہرے کو نوچ لے۔ اور کپڑے پھاڑ کر باہر نکل آئے۔ لیکن اچانک حنائی ہاتھ بڑھا۔ "میں جانتی تھی تم آؤ گے۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔" قاسم کا سر ایک رنگین معطر گود پر جا ٹکا۔ جس کی نیم مدھم گرمی حنائی ہاتھ کے ساتھ ساتھ اسے تھپکنے لگی۔ قاسم نے دو ایک مرتبہ جوش میں آ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ خوشبودار ریشمیں بدن، مدھم گرمی اور حنائی ہاتھ----- اس کا غصہ، آنسو بن کر بہہ گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رو رہا تھا اور وہ حنائی ہاتھ اسے تھپک رہے تھے۔

"چپ" جیناں منہ پر انگلی رکھے مسکرا رہی تھی۔

# پل

آپ پل کو نہیں جانتے۔ بھلا جانیں بھی کیسے جب کہ نہ تو وہاں کوئی شہر آباد ہے۔ اور نہ ہی کوئی گاؤں۔ بس دریا پر اک عام سا پل بندھا ہے۔ جس پر ریل کی لائن بچھی ہے جو سرحدی پہاڑیوں کی طرف نکل گئی ہے۔ وہ ایک عام سا پل ہے۔ ایک ایسے غیر معروف سے دریا پر جو دیکھنے میں نالا نظر آتا ہے۔ البتہ اگر غور سے دیکھیں تو پانی کا بہاؤ اتھاہ گہرائی کا غماز ہے لیکن غور سے دیکھنے کی فرصت بھی ہو۔ جب تک آپ گاڑی کی کھڑکی سے سر نکالتے ہیں' گاڑی پل کے پار جا چکی ہوتی ہے۔

اول تو کوئی پل کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ دیکھ بھی پائے تو یہ راز کھلتا کہ پل ایک ریلوے سٹیشن ہے۔ سٹیشن کے آثار ہی غائب ہیں۔ نہ آہنی جنگلا نہ پلیٹ فارم۔ نہ وہاں سے کوئی مسافر سوار ہوتا ہے اور نہ کوئی اترتا ہے۔ باتوں کے باوجود ایک اہم سٹیشن ہے۔ یہ اہمیت سیاسی نوعیت کی ہے۔ وہ دو حدوں کا "سنگم" ہے۔ گاڑی رکتی ضرور ہے۔ چاہے رکتے ہی چل دے۔ گاڑی وہاں یوں کھڑی ہوتی ہے کہ آپ محسوس تک نہیں کرتے بفرض محال آپ محسوس بھی کر لیں تو آپ سمجھیں گے گاڑی محض رک گئی ہے' کھڑی نہیں ہوئی۔ نہ جانے کیوں---- کوئی بات ہو گئی ہے۔ اور پھر آپ زیادہ ضروری امور کے متعلق سوچنے لگتے ہیں۔ میرا مطلب ہے' وہ امور جنہیں آپ زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔

مصیبت یہ ہے کہ سٹیشن ایک بڑے جنکشن کے قریب ہے۔ اس قدر قریب کہ آپ کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ ایک سٹیشن دوسرے سٹیشن سے اس قدر قریب ہو سکتا ہے جنکشن کی افراتفری کے بعد جب گاڑی چلتی ہے تو آپ اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور جگہ بنانے یا نہ جانے کب تک کھڑے رہنے کا تہیہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پل آتا ہے' گزر جاتا ہے اور آپ کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ایک اہم سٹیشن گزر رہا ہے یا گزر چکا ہے اور آپ غیر علاقہ میں داخل ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں۔

پل سے دو فرلانگ ورے دو مختصر سے کوارٹر گال سے گال جوڑے بیٹھے ہیں۔ جیسے تیز جھکڑ میں مرغیاں بیٹھ جایا کرتی ہیں۔ لیکن جنکشن کی گذشتہ افراتفری کے اثرات کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ آپ کو ان کوارٹروں کو دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ دیکھ بھی لیں تو انہیں کوارٹر نہیں سمجھتے آپ۔ اور سمجھ بھی لیں تو آپ کو شبہ تک نہیں ہوتا کہ وہ آباد ہیں اور پل سے متعلق ہیں۔

ان کوارٹروں میں سٹیشن کے ماسٹر اور نائب رہتے ہیں۔ موجودہ سٹیشن ماسٹر اقبال کو وہاں رہتے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں۔ لیکن نائب کو صرف مہینہ گزرا ہو گا۔ اسی طرح چار سال پہلے اقبال نائب ہو کر آیا تھا۔ ان دنوں بس ایک وہ خود اور ایک اس کی نئی بیاہتا بیوی برجیس تھی۔ برجیس اس ویرانے میں آکر کس قدر ڈر گئی تھی۔ کہاں سکول کی رونق اور پھر بیاہ پر سکھیوں کا سنگ اور کہاں یہ ویرانہ۔ لیکن آہستہ آہستہ جی لگ ہی گیا۔ چونکہ پڑوس کا کوارٹر بچوں سے یوں بھرا پڑا تھا جیسے مٹر کی پھلیاں دانوں سے۔ پھر ان کی ماں بڑی ملنسار تھی۔ اس کے علاوہ دونوں کوارٹروں کے درمیان ایک کھڑکی تھی جس کی وجہ سے دونوں کنبے ایک گھر نظر آتے تھے۔ چونکہ کھڑکی زمین سے اونچی تھی' اس لیے بچوں کی خاطر دونوں طرف سیمنٹ کی سیڑھیاں بنی تھیں اور کھڑکی کا نچلا حصہ سیمنٹ کی محراب سی بن گیا تھا۔ سب ازراہ مذاق اس کھڑکی کو پل کہا کرتے۔ اور یہ بات تھی بھی ٹھیک کیونکہ وہ کھڑکی دونوں گھروں کے درمیان پل کا کام دیتی تھی۔

پڑوسیوں کی تبدیلی پر برجیس نے پریشان تو ہونا ہی تھا لیکن اس کی پریشانی ایسی شدید نہ تھی۔ ایک تو اب اس مقام سے مانوس ہو چکی تھی اور دوسرے اب ان کے دو ننھے منے بچے تھے---- سعیدہ اور انور۔

چق کی اوٹ میں نئے نائب کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ ریل کا بابو تو وہ دکھتا ہی نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالج کا کوئی لڑکا ہو۔ بھرا ہوا جسم۔ سانولا رنگ۔ کنڈل والے بال اور شرابی آنکھیں۔ جو دور---- نہ جانے کہاں دیکھ رہی تھیں۔ خواب آلود آنکھیں---- جیسے کسی اور دنیا میں رہتی ہوں۔ نہ جانے برجیس کو کیا ہوا۔ بڑھ کر چق کا کونا سرکا لیا اور شگاف بنا کر دیکھنے لگی۔

اس روز سلائی کا کام کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ لٹ کھسک کر ماتھے پر آ پڑی۔ دوپٹہ سر سے سرک گیا۔ کان کا آویزہ یوں لرزاں رہا گویا پل کے نیچے گہرے دریا میں کشتی ڈول رہی ہو۔ مشین کی آواز میں ایک نغمہ رقصاں تھا۔ شاید اس لیے کہ نائب اور اس کی نئی نویلی بیوی کو دیکھ کر اسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ آپ نئی نئی پل پر آئی تھی۔ وہ بھی کیا دن تھے۔

اقبال گاڑی پارک کر کے جلدی جلدی گھر آتا۔ اسے یوں کھوئی کھوئی دیکھ کر اس کے پاس آ بیٹھتا۔ "کہاں ہو؟" وہ پوچھتا۔ "کہیں بھی نہیں۔" وہ مسکراتی۔ "اونہوں----" وہ قریب تر

سرک آتا۔ "کہیں دور ---- دور ---- برج۔" وہ اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال کر اسے قریب تر کھینچ لیتا۔ "تم تو یوں کھوئی رہتی ہو جیسے کوئی اکیلا جزیرہ۔ کھلے سمندر میں۔" "تو پھر میں کیا کروں؟" وہ شرما سی جاتی۔ "اچھا۔" وہ ہنس کر کہتا۔ "تو مجھے ہی کرنا پڑے گا۔" "کیا؟" وہ بھولی بن کر پوچھتی۔ "اس اکیلے جزیرے کو کھے کر کنارے لگانا پڑے گا اور کیا۔ چھوڑو بھی نا اب یہ کام۔" وہ اس کے ہاتھ سے کپڑا یا سویٹر چھین کر پرے پھینک دیتا۔ کھویا کے بے تکلف ہاتھ پتوار بن جاتے اور ناؤ ڈولنے لگتی۔ ڈولتی ڈولتی نہ جانے کس کنارے کی طرف بہہ نکلتی ---- "زن ----!" گاڑی پل سے گزر جاتی۔ اور مسافروں کو شبہ تک نہ ہوتا کہ دو سرحدیں مل رہی ہیں۔

"تو یہ ہے نیا نائب۔" برج نے اقبال سے کہا۔

"تم نے دیکھا ہے اسے؟" اقبال نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" وہ مشین چلاتے ہوئے بولی۔ "سٹیشن کی طرف سے آ رہا تھا۔ ریل کا بابو تو دکھتا ہی نہیں۔ کنڈیالے بال۔ سانولا رنگ۔ کھوئی کھوئی نگاہیں۔" "ہاں۔" اقبال مسکرایا۔ "وہی شاعر سا۔ نیا نیا ہے نا۔ آپ ہی بن جائے گا بابو۔ بابو بنتے دیر لگتی ہے کیا؟"

"عجیب سی جوڑی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"کیوں ----؟"

"اس کی بیوی کی بات کر رہی ہوں۔"

"کیا ہے۔ اسے ---- بنتی تو نہیں؟"

"اونہوں ابھی تو بچی ہے۔ بنے گی کیا۔ بالکل لڑکی ہے وہ تو۔"

"تو اس میں عجیب بات کیا ہوئی؟"

"عجیب تو کچھ نہیں۔ ویسے بات کر رہی ہوں۔ لڑکی کو دیکھو تو گلابی پنڈے کی چوکی بھری ہے اور میاں ---- جیسے دور نہ جانے کون سی نگری میں بھٹک رہا ہو ---- کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا ---- بھان متی نے کنبہ جوڑا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "تمہاری تو عادت ہے برج۔ تمہیں کوئی جوڑی، جوڑی معلوم ہی نہیں دیتی۔ یاد ہے مجھے کہا کرتی تھی تم ---- آپ کو تو ہر وقت کنارے لگانے کی ہی فکر رہتی ہے۔ کبھی جزیرے کو اپنی جگہ ڈولنے بھی دیا کیجئے۔ پگلی اس کو شادی کہتے ہیں۔ شادی پل ہے پل۔ دو مختلف علاقے جوڑنے والا پل۔ جیسے تم..........."

"میں ---- وہ شرما گئی۔"

"ہاں۔ تم بھی تو برج ---- میرے دل کے زخموں کو جوڑ دیتی ہو نا۔"

---

"لگے بھرمانے ----" وہ ہنسی۔

"شادی اور ہے ہی کیا۔ ایک دوسرے کا ساتھ دینا۔ ایک دوسرے کو بھرمانا۔ اسی بندھن کا نام ----"

"اچھا بندھن ہے۔" وہ ہونٹ نکال کر بولی۔ "کہیں میاں حاضر اور بیوی کو اس کا پتہ نہیں۔ کہیں بیوی حاضر پر میاں نہ جانے کہاں۔"

"پگلی۔" وہ قریب تر ہو بیٹھا۔ "اگر دونوں غیر حاضر ہوں تو بات کیسے چلے۔" اس نے بات چلاتے ہوئے کہا۔

"کوئی ایک بھی حاضر نہ ہو تو ---- چھوڑو بھی۔" وہ اپنا آپ چھڑا کر بولی۔

"اونہوں۔ حاضر ہونا ہی پڑے گا۔" وہ از سر نو پاس ہو بیٹھا۔

"ہائے میرے اللہ۔ ایسی حاضری سے تو غیر حاضری ہی بھلی۔"

"برج۔" وہ اس کے کان سے منہ لگا کر بولا۔ "تم میری زندگی کے دکھی پانیوں پر ایک پل ہو۔ نہ جانے کہاں رہتی ہو تم۔ پاس ہوتے ہوئے بھی اتنی دور ---- دور۔"

"دور رہنے والوں کو آپ کیا جانیں۔" اس نے اپنا آپ حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں قریب لانے کے لیے مجھے اتنی دور سے آنا پڑتا ہے۔" وہ ہونٹ قریب ترلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"کون آتا ہے۔" وہ دبی زبان سے گویا اپنے آپ سے بولی۔

"میں جو آتا ہوں۔" اس کے ہونٹ بھینچ گئے۔

"خود آنے کے لیے نہیں، دوجے کو صرف اپنے پاس بلانے کے لیے۔" وہ پیچھے سرک کر گنگنائی۔

لیکن اس کی آواز گاڑی کے شور میں دب گئی۔ جو نہ جانے کسے لانے کے لیے آ رہی تھی۔ جا رہی تھی۔ پل ریل گاڑی کے پہیوں تلے جھول رہا تھا۔ نیچے دکھی پانی کا گہرا بہاؤ جھوم رہا تھا۔

اس واقعہ کے بعد ان کے گھر میں نئے پڑوسیوں کی بات چل نکلتی۔ جب کبھی وہ اٹھتے بیٹھتے اور کوئی بات شروع ہوتی تو پتہ نہیں کیسے بات ہی بات میں نائب یا اس کی بیوی کا تذکرہ چھڑ جاتا۔ مثلاً" اسی روز شام کو برجیس بولی۔ "آپ نے سنا؟" اور مسکرا دی۔

"کیا ----؟"

"اس کا نام نظر ہے نظر۔ ویسے کہتے ہیں نظراں۔"

"کس کا؟" وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔

“اپنے نائب کی بیوی کا اور کس کا۔ وہی بات ہے آنکھوں کی اندھی نام۔”

“کیوں بے چاری کو۔۔۔۔” وہ بات کو کاٹ کر بولا۔

“ایمان سے بالکل بے چاری ہے۔” وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ “سبھی باتیں ہیں، اس میں بس ایک نظر نہیں۔”

“اور جانتی ہو میاں کا کیا نام ہے؟ شاعر ہے نا۔۔۔۔”

“کیا نام ہے؟”

“عجیب سا نام ہے۔ نہاں رومانی۔”

“نہاں۔” وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ “بی بی نظر، میاں نہاں۔ سبحان اللہ کیا جوڑی ہے۔”

“کیوں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑی ہو؟”

“خدا کی قسم مذاق نہیں۔ آیئے نا ذرا۔ دکھاؤں آپ کو۔” برج نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا۔

“میں دیکھوں؟ لاحول ولا قوۃ”

“لاحول کی کیا بات ہے۔ ویسی نظروں سے دیکھنا بس۔”

“وہ دیکھئے چولہے کے سامنے چوکی پر۔” برج نے کھڑکی کی درز سے لگ کر کہا۔

“ہے نا مجسم انتظار۔ منتظر بیٹھی ہے۔ توبہ۔۔۔۔ خالص گوشت پوست ہے۔ جیسے قدرت نے عورت کو تنگ کر دیا ہو۔”

“ہاں۔” وہ مسکرایا۔ “اب چھوڑو بھی۔” اور وہ واپس کمرے میں آ گئے۔ “ہاں واقعی عجیب جوڑا ہے۔” اقبال ہنسا۔

“یہ بے چاری راہ تکنے کے سوا کچھ جانتی ہی نہ ہو اور وہ جیسے راہ کھو کر سرگرداں ہو۔”

“ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میاں کسی اور سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔” اقبال مسکرایا۔

“خواہ مخواہ کسی پر الزام دھرنا۔۔۔۔ آپ تو۔۔۔۔” وہ چڑ کو بولی۔

“شاید یہی بات ہو۔”

“ہاں شاید۔۔۔ لیکن بی بی تو علانیہ بیٹھی ہے۔”

“ہاں میاں کی منتظر۔۔۔۔۔” وہ مسکرایا۔

“ہوں میاں کی؟” اس نے بات کاٹ کر کہا۔ “کسی کی بھی کیوں نہیں؟”

“بھئی پھر کیا کرے؟ میاں کسی اور جگہ لو لگالیں تو بیوی کو بھی حق حاصل ہے کہ کسی کے انتظار میں بیٹھ جائے۔”

“واہ۔” وہ تڑپ کو بولی۔ “شادی نہ ہوئی مذاق ہوا۔”

“میرا یہ مطلب نہیں کہ ضرور لو لگالے کسی سے لیکن لگا لینے کا جواز تو مل جاتا ہے۔ اخلاقی طور پر۔”

“سچ۔۔۔۔؟”

“ہاں ہاں انصاف تو یہ ہے۔” وہ سنجیدگی سے بولا۔

“بڑے منصف تو دیکھو۔ اپنے آپ پر بیتے تو.........”

“اللہ نہ کرے، میں کسی سے لو لگاؤں۔” وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

“بڑے بگلا بھگت۔۔۔۔ نہ جانے کس کس سے لگائی ہو گی۔” اس نے ہونٹ نکال کر کہا۔

“نہیں برج۔ صرف تم ہو۔ صرف تم۔” وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔

“اچھا۔ مان لیا لیکن کل کی بات کون جانتا ہے۔”

“ہاں کل کی تو کہہ نہیں سکتا لیکن آج تک ایک تم ہو۔ تم۔” وہ پیار سے بولا۔

“اچھا۔” وہ مسکرائی۔ آپ کو یقین ہے کیا۔۔۔۔؟”

“کیا؟” اس نے پوچھا۔

“کہ میاں لگالے تو بیوی..........”

“ہاں۔ ہاں۔” وہ بولا۔ “انصاف کی بات تو یہی ہے۔”

“مردوں کے انصاف کو۔” وہ ہنسی۔ “کون نہیں جانتا۔ مردوں کے انصاف کو؟”

“ٹھیک ہے۔ ٹھیس تو لگتی ہے لیکن۔۔۔۔” وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

“چلو چھوڑیئے اس قصے کو۔ کیا واہیات بات ہے۔ ہمیں کیا غرض۔ وہی جانیں بی بی نظراں اور بابو نہاں۔” وہ ہنسنے لگی۔

پہلے چند روز اقبال حیران رہا۔ بات ہی ایسی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے برجیس کا برتاؤ قطعی طور پر مختلف تھا۔ اگر اقبال کسی پڑوسن میں دلچسپی ظاہر کرتا تو وہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتی۔ “خیر تو ہے۔ بہت چمک رہیں ہیں آپ؟” اگر کسی غیر عورت کی بات چھڑ جاتی تو اسے اجازت نہ تھی کہ اس کے متعلق دلچسپی کا اظہار کرے۔ گھر میں کوئی آ جاتی تو اسے باہر جا کر ٹہلنا پڑتا۔ صحن میں جانے کی تو بالکل اجازت نہ تھی اسے۔ کیونکہ صحن میں کھڑکی کھلتی تھی۔ اور پڑوسیوں کی بے پردگی کا احتمال رہتا تھا لیکن اب وہی برجیس اکثر آپ دعوت دیتی کہ وہ درز میں سے نظر کو دیکھے۔ دوڑی دوڑی پاس آتی۔ “آیئے آپ کو کچھ دکھاؤں۔” اور اس کا بازو پکڑ کر لے جاتی۔ “آج تو حد ہو گئی۔ آپ کی قسم۔” اگر وہ عذر پیش کرتا تو طنزاً” چلاتی۔ “بس اتنی ہمت ہے۔ اپنے آپ پر بھروسہ نہیں کیا۔ ایک

آنکھ دیکھ کر چھلک جاتے ہیں یہ مرد۔ ہم بھی تو پردے میں سے مردوں کو دیکھتی ہیں۔ پر مجال ہے جو پاؤں ڈگمگا جائیں۔”

“اوہ میں سمجھی---- فکر نہ کریں آپ۔ “فکر کیسا؟” وہ پوچھتا۔ “بس۔” وہ جواب دیتی۔ “آخر کوئی ہو گا ہی نا۔” حتیٰ کہ وہ ساتھ چلنے پر مجبور ہو جاتا۔ پھر وہ درز سے لگے کھڑے رہتے۔ اس دوران برج زبان کی بجائے کہنی سے باتیں کرتی۔ پھر ایک دن جب وہ برج کے کہنے پر کھڑکی سے جھانکنے کے لیے گیا اور درز میں سے دیکھا تو بوکھلا سا گیا۔ “حد ہو گئی۔” اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ چونکہ سامنے نظر صحن میں نہا رہی تھی۔ شربتی پنڈا جو چٹا سفید ہونے کے علاوہ جوانی سے بھرا ہوا تھا۔ بوٹا سا قد۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا لیکن دیکھا تو برج وہاں تھی ہی نہیں۔ ایک ساعت کے لیے وہ ٹھٹھکا۔ پھر ارد گرد دیکھ کر از سر نو نشست باندھ کر کھڑا ہو گیا اور دیر تک دیکھتا رہا۔

پھر وہ آپ ہی آپ موقعہ کی تلاش میں رہنے لگا۔ جب کبھی موقعہ ملتا، چپکے سے درز سے لگ کر نظر کو دیکھتا رہا۔ ایسی دلچسپی ہو گئی اسے۔ بلکہ کئی مرتبہ وہ بھاگا بھاگا برج کے پاس جاتا۔ “آؤ برج تمہیں کچھ دکھاؤں۔” ایک ساعت کے لیے برج کی آنکھ میں چمک لہراتی۔ “آؤ بھی۔” وہ چلاتا۔ “دیکھو تو چولہے کے سامنے بیٹھی ہونٹوں پر سرخی لگا رہی ہے۔ ایک وہ ہے کہ بے چاری کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اور ایک تم ہو---- آؤ بھی نا۔”

“آپ ہی دیکھئے۔” وہ لاپروائی سے کہتی۔ وہ چلاتا۔ “اونہوں---- سرخی لگانے سے کیا بنتا ہے۔” وہ مشین چلاتے ہوئے اپنی دھن میں بولے جاتی۔ “جسم کا جال روح کو کیا پھنسائے گا؟”

“بہت جانتی ہو تم اس کی روح کو۔” وہ طنزاً کہتا۔

“جانتی تو نہیں پر سمجھتی ضرور ہوں۔”

“بہت روحانی طاقت ہے تم میں۔”

“آپ کیا جانیں؟” وہ ہنستی۔

“اب اٹھو بھی نا۔” وہ کھسیا ہو کر کہتا۔

“میں تو روز دیکھتی ہوں۔ آپ ہی دیکھئے جا کر۔”

“نہیں برج۔”

“اوسان کھونے کی کیا ضرورت ہے؟” ایک دن لاپروائی سے طنزاً بولی۔ “ایسا شوق ہے تو ملا دوں دونوں کو۔”

ے “تم۔” وہ چلایا۔ “تم اور ایسی بات۔ پہلے تو.......... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔”

“کیوں؟”

“پہلے تو تم ایسی بات پر غصے سے بھوت بن جایا کرتی تھیں۔ یاد ہے رحمت کی ماں کے متعلق کتنا پاکھنڈ مچایا تھا تم نے۔”

وہ مسکرا دی۔

“اب بھی مذاق کر رہی ہو۔ میں جانتا ہوں لیکن پہلے تو ایسا مذاق سہا نہ جاتا تھا تم سے۔”

“ہاں۔” وہ ہنسی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ جسم کے میل سے کیا ہوتا ہے؟” اس کی ہنسی میں مایوسی اور طنز کی جھلک تھی۔

“لیکن اس کی عزت کا خیال نہیں کیا۔” وہ نظراں کے گھر کی طرف ہاتھ چلا کر بولا۔

“آپ ہی تو کہتے تھے۔ میاں کسی اور سے لو لگائیں تو بیوی..........” وہ رک گئی۔

“اچھا تو اب تم ہم دونوں میں پل بنو گی۔” وہ ہنسنے لگا۔

“میں کیوں بنوں۔ پل تو وہ ہے۔ آپ کی نظراں۔”

“ہوں تو تمہارے حساب سے میں گاڑی ہوا۔ مگر پل اور گاڑی ملائے گی کیسے، دو علاقے بھی تو ہوں۔” اس نے مذاق سے کہا۔

“بے چاری۔” وہ اپنی دھن میں بولی۔ “سارا سارا دن انتظار میں بیٹھتی ہے۔ کب گاڑی آئے اور اوپر سے گزرے۔

وہ کھکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر قریب ہو بیٹھا۔ “برج۔” اس نے پیار بھری آواز میں کہا۔ “برج۔” اس کے بے تکلف ہاتھ کسی پل نما ابھار کو ناپنے لگے۔

“اونہوں----” وہ چلائی۔ “نہ جانے آپ تو ہر سمے..........”

اقبال نے دور سے آتی ہوئی گاڑی کی آواز سنی۔ وہ آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ کنپٹیوں میں تھرکنے لگی۔

“برج۔” وہ چلایا۔ وہ جھجک کر اٹھ بیٹھی---- “کیا کرتے ہیں۔” وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ اور سامنے کھڑی گاڑی کو کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ “دیکھئے نا۔” اس نے اقبال سے کہا۔ “سب مسافر اپنی اپنی دھن میں لگے ہیں۔ کسی کو احساس نہیں کہ گاڑی رک گئی ہے۔”

“ہاں۔” وہ ہنسا۔ “لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ان کا مطلب تو پہنچنے سے ہے۔ آخر پہنچ ہی جائیں گے۔”

“کون جانتا ہے؟” وہ ایک آہ بھر کر بولی۔

“پگلی۔” وہ ہنسا۔ “جو چل پڑے وہ پہنچ ہی جاتا ہے کبھی نہ کبھی۔

"سچ؟" وہ کھوئی کھوئی بولی۔

"ہاں۔" وہ پاس آ کھڑا ہوا۔ اس کے بے تکلف ہاتھ پہنچنے کی کوشش میں لگ گئے۔

وہ تڑپ کر پیچھے ہٹی۔ اور اس کی پہنچ سے دور ہو کر بولی۔ "اونہوں۔ ادھر۔" اس نے نظر کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

باہر سیٹی کی آواز سن کر وہ چونکی اور کھڑکی میں سے دیکھ کر مسکرا دی۔

"کون ---- نائب ہے۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ سیٹی کی آواز سنی آپ نے۔ دور دیس کا رہنے والا بجا رہا تھا۔"

"بے چارہ پرائے دیس گیا ہے نا۔"

"ہاں۔" وہ ہنسی اور پھر اقبال کی بات دہرانے لگی۔ "جو چل پڑے' آخر پہنچ ہی جاتا ہے نا۔"

کہاں تو دن رات وہ دونوں نظر اور نہاں باتیں کیا کرتے۔ روز بروز اقبال کا شوق بڑھتا جاتا۔ اور وہ درز میں سے نظر کو دیکھتا رہتا۔ ادھر نظر میں یہ احساس بڑھتا گیا کہ کوئی اسے چوری چوری دیکھتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے اسے احساس تنہائی اور انتظام کم ہو تا گیا۔ روز بروز برجیس کی نگاہیں اور بھی پڑے ہٹتی گئیں ---- دور ---- دور ----

پھر نظر نے ان کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ سارا سارا دن برج کے پاس رہنے لگی۔ اقبال کر ذکر پر نظر کی آنکھ میں چمک لہراتی۔ برج منہ موڑ کر مسکراتی اور پھر نظر کی طرف ایسے معصوم انداز سے دیکھتی جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ نہاں کی بات ہوتی تو برج انہماک سے کام میں مصروف ہو جاتی۔ یا نہ جانے کیوں عین اس وقت مشین کی سوئی میں سے تاگا نکل جاتا اور اسے جھک کر تاگا پرونا پڑتا۔ اگرچہ یوں کرنے سے اس کے کا نظر کے منہ کے قریب ہو جاتے۔ پھر دوپٹہ سر سے ڈھلک کر نیچے گر جاتا اور نیلا آویزہ ڈولتا۔ جیسے بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی ڈول رہی ہو۔

اکثر جب ایسے سمے اقبال آ جاتا تو نظر مسکرا کر منہ موڑ لیتی اور اپنا آپ چھپانے کی کوشش میں لگ جاتی۔ "لاحول ولا قوۃ" اقبال کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا یا شاید خود ساختہ۔ بہر حال وہ مسکرا کر باہر نکل جاتا۔ پھر نظر دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی۔ "توبہ باتوں میں پتہ ہی نہ چلا ان کے آنے کا۔ نہ جانے مجھے یوں بیٹھے دیکھ کر کیا کہتے ہوں گے دل میں۔" اور برج مسکراہٹ بھینچ کر کہتی۔ "واہ اس میں کیا برائی ہے۔ انہوں نے دیکھ لیا تو کیا یوں گھبرانے لگیں تم' تو گزارہ کیسے ہو گا۔" ایک دن وہ چڑ کر بولی۔ "تو کیا سامنے آ جایا کروں ان کے۔ پھر تم کیوں پردہ کرتی ہو ان سے؟"

"کہاں کرتی ہوں میں؟" وہ مشین میں تاگا پروتے ہوئے بولی۔ اور مسکرائی۔

"لیکن وہ تو کبھی آئے ہی نہیں تمہارے سامنے۔" نظر آپ ہی آپ بولی۔

"تو یہ میرا قصور ہے کیا؟" برج ہنسی۔

"وہ آ بھی جائیں تو نہ آنے کے برابر۔" نظر ہنستے ہوئے بولی۔

"کیوں ----؟"

"ان کی عادت ہی ایسی ہے۔ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ نہ جانے کیا ہے انہیں؟" وہ منہ بنا کر گویا اپنے آپ سے گنگنائی۔ اور پھر کسی گہرے خیال میں ڈوب گئی۔

اس روز شام کو برج اداس بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ پاس سعیدہ کھیل رہی تھی۔ اقبال ابھی سٹیشن پر ہی تھا کہ نظر آئی اور بولی۔ "ذرا سی شکر ہو گی۔" برج کام کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "اندر باورچی خانے میں ہے۔ سبز سا ٹین ہے۔ خود ہی جا کر لے لو۔" اس کے جاتے ہی اقبال آ گیا۔ پٹی ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ آتے ہی پوچھنے لگا۔ "میری دھوتی کہاں ہے؟ عین اس وقت سوئی میں سے تاگا نکل گیا۔ برج جھک کر تاگا ڈالنے لگی۔ اس کا ہاتھ کانپا۔ لٹ منہ پر گر پڑی۔ کان میں نیلا آویزہ لرزنے لگا۔ بولی۔ "اندر باورچی خانے میں کھونٹی پر ہو گی۔" "اچھا۔" کہہ کر وہ باہر صحن میں نکل گیا۔

برج نے منہ اٹھایا تو آنکھیں بھیگی سی تھیں۔ منہ پر سرخی کی جھلک تھی۔

"اماں۔" سعیدہ چلائی۔ "روتی ہو تم؟"

"اوں ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"پھر یہ آنچھوں۔" سعیدہ نے اس کی گال پر انگلی رکھ کر کہا۔

برج نے پیار سے سعیدہ کی انگلی چوم لی۔

"نہیں۔ نہیں............"

"نظر............"

اندر سے آوازیں سنائی دیں۔ برج کے کان میں نیلا آویزہ اور بھی لرزنے لگا۔

"اوں آنچھو ہیں۔" سعیدہ تتلا کر بولی۔

"کہاں ہیں؟"

"گھوشی کے ہیں؟" سعیدہ نے پوچھا۔

برج سر ہلا کر مسکرا دی۔

"آہا ---- گاڑی۔" سعیدہ گاڑی کو آتا دیکھ کر چلائی۔

برج نے اسے اٹھا لیا اور دروازہ میں جا کر کھڑی ہوئی۔ اس وقت اسے قطعی طور پر احساس نہ تھا کہ دروازہ کی چک لپٹی ہوئی ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں ---- اور نجانے کہاں دیکھ رہی

تھیں۔ دور۔۔۔۔

"امی۔۔۔۔بابو۔" سعیدہ نائب کو آتے دیکھ کر چلائی۔ لیکن برج نے اس کی بات نہ سنی۔

گاڑی میں مسافر منزل کے خیال میں کھوئے ہوئے تھے۔ کسی کو احساس نہ تھا کہ پل ایک سٹیشن ہے۔ ایک اہم سٹیشن جو دو سرحدوں کو ملاتا ہے۔ بلکہ وہ سٹیشن کے وجود ہی سے منکر تھے۔ اور انہیں پتہ نہ تھا کہ ایک اہم ریل گزر رہی ہے۔ گزر چکی ہے یا وہ غیر علاقہ میں داخل ہونے والے ہیں۔

البتہ نائب کھڑا حیرانی سے برجیس کو دیکھ رہا تھا۔

"ہائے میرے اللہ۔" وہ دفعتاً" نائب کو دیکھ کر چلائی۔ اور پیچھے ہٹی۔

"ہائے میرے اللہ۔" باورچی خانے سے مدھم سی آواز سنائی دی۔

"ہائے میرے اللہ۔۔۔۔ ہائے میرے اللہ۔" گاڑی شور مچاتی ہوئی غیر علاقہ میں داخل ہو گئی۔

# دوراہا

"یہ سراسر مینجمنٹ کا قصور ہے۔ ناحق پیسنجرز کو تکلیف ہوتی ہے۔" بیگم غصے میں چلائی۔

سٹیشن ماسٹر نے بغور اس کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال کر بولا۔ "لیکن میڈم۔ کیا آپ وہی صاحبہ ہیں جو اس روز غلطی سے پریم نگر کیری اور ہو گئی تھیں؟"

"نان سینس۔" وہ چلائی۔ "آپ کا مطلب ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں کیا؟ یہ صریحاً انسلٹنگ ہے۔ میں سپرنٹنڈنٹ کو لکھوں گی۔" اور وہ ہاتھ کا بٹوا جھلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"ڈیش اٹ۔" سٹیشن ماسٹر نے بجھے ہوئے سگار کے کش لینے شروع کر دیئے۔

"جی ہاں۔ جی ہاں۔" نہا لچند نے اپنی عینک کو ناک کی چونچ پر رکھ کر اوپر سے دیکھا۔

"کہہ رہا ہوں۔۔۔۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" ٹکٹ کلکٹر داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

"جی ہاں۔" نہا لچند بڑبڑایا۔ "کہہ رہا ہوں کوئی ثبوت نہیں کہ یہ وہی شریمتی تھیں۔"

"اوہ مسٹر نہا لچند۔" سٹیشن ماسٹر بولا۔

"جی ہاں۔ وہ شریمتی تو۔۔۔۔ تو یعنی جوان تھی۔ اور یہ دیوی............"

"لیکن پریم نگر کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے میں نے سنا ہے۔" ٹکٹ کلکٹر گھبرا گیا۔ "میں نے سنا ہے کوئی تعجب نہیں کہ یہ وہی بیگم ہو۔ بلکہ مجھے یقین ہے یہ وہی بیگم تھیں۔"

"آب و ہوا۔" کیبن میں ہنسا۔ "ٹیشن ماسٹر صاحب آپ جانیں ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا عورتوں کو راس آئے ہے۔ جیادہ تر عورتیں لوٹیں ہی نہیں ہیں واں سے۔"

"زیٹ از اٹ۔" گارڈ نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ "وہاں کا کلائی میٹ لیڈیز کو سوٹ کرتا ہے۔ جبھی وہاں کا آبادی نوے پر سنٹ زنانہ ہے۔"

“او ڈیئش اٹ آل۔ ہمیں وہاں کا جغرافیہ نہیں لکھنا۔” سٹیشن ماسٹر نے سگار پھینک کر دل ٹھنڈا کیا۔

“جی ہاں۔ جی ہاں۔ وہاں کی آب و ہوا دل کے لیے اچھی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ پھر ان کے منہ پر جھریاں کیوں پڑ جاتی ہیں؟”

“مسٹر نہا پلچند ------ جنٹل مین بات یہ ہے کہ یہ ایک انپارٹنٹ جنکشن ہے۔” سٹیشن ماسٹر چلایا۔

“جی ہاں، جی ہاں۔ ارجنٹ ٹرمینل۔” نہا پلچند مسکرا کر بولا۔

“ٹرمینل ----؟ ہاں ہاں ٹرمینل بھی۔”

“دیٹ از دی ٹربل۔” گارڈ بولا۔ “بوتھ ٹرمینل اینڈ جنکشن۔”

“رائیٹ۔ ٹرمینل بھی ہے اور جنکشن بھی۔”

“جی ہاں۔ یہی میں کہہ رہا ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟”

“اینی ہاؤ۔” گارڈ بڑبڑایا ------ “یہ ہے ضرور۔”

“ہاؤ ایور۔ کرانتی پور سے بھی۔” سٹیشن ماسٹر نے بات جاری رکھنے کی کوشش کی۔

“جی ہاں۔ اور پریم نگر سے بھی۔ سبھی۔”

“بالکل۔” سٹیشن ماسٹر بڑبڑایا۔ خیر خیر۔ کرانتی سے گاڑی ای نمبر پر آتی ہے۔ اور پھر وہ سائڈنگ میں لگا دی جاتی ہے۔ پھر وہ نمبر3 سے پریم نگر کو چلتی ہے۔” نہا پلچند بڑبڑایا۔

جی ہاں، جی ہاں۔ نمبر3 سے پریم نگر کو چلتی ہے۔ نہا پلچند بڑبڑایا۔

“او نو۔ نمبر چارR سے چلتا ہے شنٹل تھری اپ۔” گارڈ چلایا۔

“جی ہاں۔ یہی کہہ رہا تھا میں شنٹل تھری اپ۔” نہا پلچند نے معذرت بھری نگاہ سے دیکھا۔

“لاحول ولا قوۃ۔” ٹکٹ کلکٹر نے منہ بنا کر کہا۔

“صرف گڑبڑیشن اور کیا۔ ٹیشن ماسٹر صاحب ایک بات ہے کہ کبھی وہ آتی ہے دو پر اور کبھی چار پر۔” کیبن مین نے وضاحت کی۔

“نو نو۔” گارڈ اٹھ بیٹھا۔ “کو یچن یہ ہے کہ لوگ بھول کر پریم نگر ہی کیرڈ اوور ہوتے ہیں۔ عقیل پوڑ نہیں۔”

“خدا آپ کا بھلا کرے۔ یہی تو ثبوت ہے کہ ناظم صاحب کا کوئی قصور نہیں، لوگوں کا ہے ---- لوگوں کا۔” ٹکٹ کلکٹر مسکرا دیا۔

“ویٹ از اٹ پریم نگر کا پہاڑی علاقہ گرین ہے۔ کھوبصوٹت اور عقیل پوڑ ریت ہی

ریت۔”

“لیکن حضرات سوال یہ ہے کہ جو گاڑی کرانتی سے آتی ہے، وہ سیدھی عقیل پور کیوں نہ چلی جائے۔ رن تھرو ---- اس طرح غلطی کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا۔”

“جی ہاں، جی ہاں۔” نہا پلچند بڑبڑایا اور پھر چونک کر بولا۔ “لیکن میں کہہ رہا ہوں.........”

“سلی۔” لیڈی ٹکٹ چیکر اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ “یہ بات نہیں چلے گی۔ مینجمنٹ کے لیے صرف ایک راستہ ہے۔ صرف ایک۔”

“لیکن ---- لیکن راستے تو دو ہیں۔” نہا پلچند بڑبڑایا۔ “دو راہا دو راستے جی۔”

“نان سنسن۔” وہ بولی۔ “آئی مین کرانتی سے گاڑی پہلے یہاں آئے۔ پھر وہی گاڑی پریم نگر چلی جائے۔ پریم نگر سے لوپ لائن عقیل پور کو چلی جائے اور یہاں سے عقیل پور کی کارڈ لائن اکھیڑ دی جائے۔ اس طرح غلطی کا سوال ہی نہ رہے گا۔”

“لیکن محترمہ ---- یوں ہو جائے تو پھر پریم نگر جائے گا کون؟” مسٹر امجد داخل ہوتے ہوئے بولے۔

“واٹ ----؟” سٹیشن ماسٹر چلایا۔

“غلطی سے جانا اس نگر کو اور بھی دلچسپ بنا دیتا ہے سٹیشن ماسٹر صاحب۔” امجد مسکرایا۔

“اونہوں۔” اس بات سے ہمیں کوئی کنسرن نہیں مسٹر امجد۔ مطلب ہے کہ ہم مینجمنٹ چاہتا ہے مینجمنٹ۔

“لیکن صاحب سوال یہ ہے کہ جو مسافر نگر میں جانا نہیں چاہتے۔” ٹکٹ کلکٹر بولا۔

“جی ہاں۔ یہی کہہ رہا تھا میں۔” نہا پلچند نے اپنی عینک سنواری۔

“وہ وہاں نہ اتریں۔ سرکار کا راج ہے مہاراج۔ جبردستی نہیں۔” کیبن مین بولا۔

“لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔” ٹکٹ کلکٹر کا منہ لال ہو گیا۔

“نہیں ہو سکتا رول نمبر92 کے مطابق وہ بریک جرنی کر سکتے ہیں۔ گڈ ایوننگ جنٹل مین میں ذرا چائے پی آؤں۔” لیڈی ٹکٹ چیکر مسٹر امجد کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔

“استغفراللہ۔” ٹکٹ کلکٹر نے داڑھی جھاڑ کر کہا۔ “کیا حماقت ہے۔”

“جی ہاں۔” نہا پلچند بڑبڑایا۔ “رول نمبر29-اون۔”

“حضرت آپ کو لیڈی ٹکٹ چیکر کو متنبہ کرنا چاہئے۔ ریلوے بینڈ ہو کر وہ مسافروں کو گمراہ کرتی ہے۔” ٹکٹ کلکٹر نے کہا۔

“گمراہ کرتی ہے؟” سٹیشن ماسٹر نے سر کھجلا کر دہرایا۔

"جی ہاں جیسے آپ کو کمپلین کرنے والی بیگم نے کہا تھا۔ ایل۔ ٹی۔ سی نے اسے غلط اطلاع دے کر بہکایا ورنہ وہ کبھی پریم نگر کیرڈ اوور نہ ہوتی۔"

"لیکن ----- اس سے کیا ہو گا؟" نہا لچند نے عینک سنوار کر کہا۔

"ہمارے پاس ایسے بیسیوں ثبوت ہیں۔" ٹکٹ کلکٹر بامعنی انداز سے مسکرانے لگا۔

"اس بات پر ایل۔ ٹی۔ سی کو انام ملنا چاہئے اور کیا ----؟" کیبن مین بولا۔

"جی ہاں۔" نہا لچند بولا۔ "لیکن انعام ----؟"

"لاحول ولا قوۃ ٹکٹ کلکٹر نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ وہ ریلوے کی انکم جیاوہ کرتی ہے۔" کیبن مین چلایا۔

"انکم کا کیا سوال ہے یہاں؟"

"آئی۔ سی۔" گارڈ بولا۔ "ہی از رائیٹ۔ فرض کڑو ایک پیسنجر غلطی سے پریم نگر جاتا ہے۔ وہاں ہم اسے چاڑج کڑے گا۔ تین ڑوپیہ پھڑ وہ واپس دوڑاہا کو آئے گا۔ ڈیڑھ روپیہ۔ اب اسے پھڑ نیا ٹکٹ خریدنا پڑے گا۔" دوڑاہا تو عقیل پوڑ' پڑانہ ٹکٹ نہیں چلے گا۔ زیٹ از کل۔ چھ روپیہ اکس فیر ڈے گا۔ پیوڑ انکم۔"

"انکم نہیں' یہ دھوکا ہے۔ مسافروں کے ساتھ دھوکا۔" ٹکٹ کلکٹر چلایا۔

"جی ہاں۔ روپیہ روپیہ ہے مہاراج۔ دھن ہے مہاراج دھن۔" نہا لچند متاثر ہو کر بڑبڑانے لگا۔

"لیکن پبلک کو لوٹنا..........."

"پر سوال اے ہے کہ ہم پبلک بینڈ ہیں یا ریلوے۔"

"دیٹ از اٹ۔ ویٹ از اٹ۔" گارڈ چلایا۔ "ریلوے نے صاف بول دیا ہے۔ ٹریول لائٹ۔"

"نان سینس۔" سٹیشن ماسٹر غصے سے چلایا۔ "یہاں ہلکا بھاری کا سوال نہیں' انکم اور خرچ کا سوال ہے۔ ہمارا ریپوٹیشن خراب ہو رہا ہے۔ چاہے پیسنجر غلطی سے پریم نگر کیرڈ اور ہو جائیں یا عقیل پور۔ ہمارا کنسرن نہیں۔ لیکن ہمارا ریپوٹیشن خراب نہ ہو۔ اتنے بڑے جنکشن کا ریپوٹیشن خراب نہیں ہونا چاہئے۔ آج کل سب سے بڑی کوالیفکیشن گڈ ریپوٹیشن ہے۔

"یہی میں کہہ رہا تھا حضرت لیڈی ٹکٹ چیکر کی ریپوٹیشن اچھی نہیں۔" ٹکٹ کلکٹر نے جھرجھری لی۔

"او ڈیم اٹ ---- جینٹل مین ہمیں روز شکایتیں موصول ہوتی ہیں۔ اس کو بند ہونا چاہئے۔

جو پیسنجر اپنی غلطی سے پریم نگر کیرڈ اور ہو جاتا ہے' وہ واپس آ کر ہمارا قصور بتاتا ہے۔ ہمیں ڈانٹتا ہے۔ دس از بیڈ۔"

"جی ہاں' ویری ویری۔"

"یہ تو قدرتی بات ہے حضرت۔ لوگ اپنی غلطی کا الزام دوسروں پر تھوپنا چاہتے ہیں۔ اس میں ناظم صاحب کا کیا قصور ہے؟"

"لیکن سپرنٹنڈنٹ خود موقع پر کیوں نہیں آتا؟ ہم نے بار بار لکھا ہے۔ کوئی جواب نہیں' کوئی جواب نہیں۔"

"ٹرررن ---- ٹرررن۔" گھنٹی بجی۔ "اوہ۔" سٹیشن ماسٹر نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ "یہ کس گاڑی کی گھنٹی ہے؟"

"جی ہاں۔ یہی سوچ رہا ہوں میں۔" نہا لچند بڑبڑایا۔

"ول۔" گارڈ اٹھ بیٹھا۔ "یہ ٹیلی فون کال ہے۔

"او ڈیش اٹ۔" پھر کوئی کمپلینٹ۔ ہمارے کان پک گئے ہیں۔ "سٹیشن ماسٹر نے ٹیلی فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو ---- سٹیشن ماسٹر دوراہا۔ کون نہیں پہنچے۔ عقیل پور ---- آپ کے ہسبنڈ۔ ہاں شاید غلطی سے کیرڈ اوور ہو گئے ہوں۔ نہیں پریم نگر سے ان کا کوئی تار نہیں آیا۔ کیا نام بتایا آپ نے؟ مسٹر رے؟ نہیں کوئی تار نہیں۔" انہوں نے فون رکھ دیا۔

"جی ہاں۔" نہا لچند نے ایک کاغذ پڑھتے ہوئے کہا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ مسٹر رے کا تار یہ رہا۔ پریم نگر سے آیا تھا۔"

"اوہ۔" سٹیشن ماسٹر گنگنانے لگے۔ "اچھا تو تم ان مسافروں کی لسٹ رکھتے ہو جو غلطی سے پریم نگر کیرڈ اور ہو جاتے ہیں۔"

"لسٹ ----؟" نہا لچند نے سر کھجلایا۔ "لسٹ ---- لیکن..........."

"امپاسیبل۔" گارڈ نے کش لگا کر کہا۔ "اتنی لمبی لسٹ۔"

"جی ہاں۔ یہی کہہ رہا تھا میں۔ اس کے لیے ایک الگ دفتر چاہئے۔"

"ویٹ از اٹ ----"

"سب گڑبڑیشن ہے۔" کیبن مین چلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" ٹکٹ کلکٹر بڑبڑایا اور اٹھ کر چل پڑا۔

"ڈیش اٹ آل۔" سٹیشن ماسٹر بولا۔

عین اس وقت پروفیسر نجمی داخل ہوئے۔ "اے صاحب۔ یعنی یعنی مسجرا مٹڈ کہاں ملیں

گے؟”

“مسجرا مسٹڈ؟” نہا پلچند نے سر کھجاتے ہوئے غور سے پروفیسر کی طرف دیکھا۔

“سلی۔” پروفیسر چلائے اور باہر جاتے جاتے رک گئے۔ “آپ سٹیشن ماسٹر ہی؟ میرا مطلب ہے پریم نگر سے گاڑی کب آئے گی۔ یعنی مسٹر ایس۔ ایم مطلب یہ ہے کہ فرض کرو میں غلطی سے کل عقیل پور کی بجائے پریم نگر چلا گیا تھا............”

“اوہ------” نہا پلچند نے سر کھجایا۔ “جی ہاں‘ جی ہاں۔ آپ چلے گئے تھے۔”

پروفیسر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ “تو مطلب ہے آج میں کون سی گاڑی سے واپس آسکوں گا؟”

گارڈ مسکرایا۔ “لیکن شاید آپ ریٹرن کرٹنا پسند نہ کریں۔”

“میں------ کیوں نہ کروں؟” پروفیسر چڑ گیا۔

“جی ہاں۔ ضرور آئیں گے آپ۔ ضرور------ آپ مرد جو ہوئے۔”

“مرد------!” پروفیسر چلایا۔ “اور فرض کرو میں عورت ہوں۔”

“گڈ نس۔” سٹیشن ماسٹر ہنسا۔

“شور۔” گارڈ بولا۔ “پھر تو مشکل ہے۔”

“نان سینس۔ وہ ضرور آئے گی۔ اسے آنا ہی پڑے گا۔” پروفیسر غصے میں چیخا۔

“سوال یہ ہے کہ آپ وہ ہیں یا وہ آپ ہیں؟” نہا پلچند نے سر کھجلا کر اپنے آپ سے پوچھا۔

“پریم نگر کے معاملہ میں جنڈر جانے کے بغیر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔”

“جنڈر------” پروفیسر نے دہرایا۔ “نان سینس۔”

“اوہ------ یعنی نان سٹیٹکل جنڈر۔” نہا پلچند بڑبڑایا۔ “پھر تو واقعی کچھ نہیں کہا جا سکتا آپ کے بارے میں۔”

“مسٹر نہا پلچند۔” سٹیشن ماسٹر نے گھور کر نہا پلچند کو چپ کرا دیا اور پھر پروفیسر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ “جینٹل مین------ آپ آدھ گھنٹے میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ بشرطیکہ آپ رات وہاں بسر کرنا نہ چاہیں۔”

“میں پریم نگر میں------؟” پروفیسر غصے میں بڑبڑایا۔ “لاحول ولا قوۃ۔”

“آخاہ پروفیسر نجمی۔” مسٹر امجد مسکراتا ہوا داخل ہوا۔ اور ان کا تعارف کروانے لگا۔ “آپ ہمارے ایس۔ ایم ہیں۔ یہ مسٹر ڈیوڈ گارڈ اور یہ ہیں نہا پلچند۔ اور یہ صاحبان میرے عزیز دوست پروفیسر نجمی عقیل پور کالج میں نفسیات کے پروفیسر۔”

“گلیڈ ٹو میٹ یو پروفیسر۔ لیکن پروفیسر یہاں اکثر ایسے کیسز ہو جاتے ہیں۔ پنجر غلطی سے پریم نگر............”

“ویٹ از اٹ۔” گارڈ ہنسا۔ “چیئر اپ جینٹل مین۔” اور وہ باہر چلا گیا۔

“غلطی۔” پروفیسر چلایا۔ “غلطی بہانہ ہے بہانہ۔ ایسی ویسی خواہشات پر ڈھکنا اور جو گاڑی پر اتنا بڑا بورڈ ٹنگا ہوتا ہے------ اس کا فائدہ؟ ہوں------”

“جی ہاں۔ بورڈ یا قاعدہ لگا دیا جاتا ہے‘ جی ہاں۔” نہا پلچند چلانے لگا۔

“ہم ان باریکیوں کو نہیں سمجھتے۔” سٹیشن ماسٹر بولا۔ اور پھر اچھا جینٹل مین خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

“باریکیاں۔” پروفیسر نے امجد کو گھور کر کہا۔ “میں کہتا ہوں‘ اس سے موٹی بات اور کیا ہو گی۔ جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور عقیل پور کی بجائے پریم نگر پہنچ کر وہاں سے تار دے دیا۔ غلطی سے یہاں آگئی ہوں۔ اونہہ------ میں کیا سمجھتا نہیں۔”

“تار------” نہا پلچند بڑبڑایا۔ اور سٹیشن ماسٹر کے پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔

“میں نے تو تار نہیں دیا تھا۔” امجد بولا۔ “پچھلی اتوار کو تمہارے پاس آ رہا تھا میں لیکن............”

“جی ہاں۔” پروفیسر نے طنزاً کہا۔ “غلطی سے پریم نگر چلے گئے۔”

“پھر میں مسٹر امین کے یہاں ٹھہر گیا۔” امجد اپنے ہی دھیان میں کہے گیا۔

“مسٹر امین------” پروفیسر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

تم جانتے ہو اسے۔ وہی گورا چٹا نوجوان۔”

“نہیں نہیں۔ مس امین کے بارے میں ایسا نہ کہو۔ میرے دل میں اس کی بے حد عزت ہے۔ امجد نے متاثر ہو کر کہا۔”

“مس امین؟ مس امین کس نے کہا ہے------ ہائیں۔” دفعتاً اسے بات سمجھ میں آگئی۔ “اوہ یہ بات ہے۔” پروفیسر مسکرانے لگا۔ “عزت۔” پروفیسر غصے میں بولا۔ پہلے جذبات کی ہنڈیا پر عزت کا ڈھکنا رکھ دیا تاکہ اندر کھچڑی پکتی رہے اور اوپر عزت ہی عزت نظر آئے۔ اونہوں------ عزت۔ نان سینس------ وہ بھی یونہی کہا کرتی تھی------” پروفیسر نقل اتارتے ہوئے بولا۔ “میرے دل میں مسٹر امین کی بڑی عزت ہے۔ اور اب جا کر وہاں سے تار دے دیا------ غلطی------ نان سینس۔”

“کس نے تار دے دیا۔ کس کی بات کر رہے ہو؟” امجد جھلا اٹھا۔

“فیروزہ ---- اپنی بیوی کی اور کس کی۔” پروفیسر گھورنے لگا۔

امجد نے اطمینان کا سانس لیا۔ “میں سمجھا نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔”

“ایک دم احمق ----” پروفیسر چلایا۔ “اگر ایک جینٹل مین کی بیوی جو میٹریکولیٹ ہو۔ اور جس کی آنکھوں پر اتنے بڑے بڑے شیشوں کی رولڈ گولڈ عینک ہو، وہ گاڑی پر لکھے ہوئے دوراہا تو پریم نگر کو عقیل پور پڑھ کر اس نگر میں جا پہنچے جہاں تمہارا گوراچٹا دوست رہتا ہے۔ جس کے لیے بیگم کے دل میں بے حد عزت ہے۔ تو تمہارے خیال میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایڈیٹ۔ تم سمجھتے ہو، یہ دنیا سیدھی سادی چیز ہے۔ سرخ جھنڈی دکھا دی تو گاڑی ٹھہر گئی۔ سبز ---- چل پڑی۔ یہ گاڑی نہیں بیوی کا معاملہ ہے۔ بیوی کا ---- یہ گاڑی کیا جانتی ہے جھنڈیوں کو۔ کیا سمجھے؟ ہیں ----”

“لاحول ولا قوۃ۔ یعنی اب تم مجھے گھور کر دل ٹھنڈا کر رہے ہو۔ لیکن اس سے کیا ہو گا۔ بیگم کا وہاں جانا امر واقعہ ہو چکا۔ بلکہ اس کا واپس آجانا تو بذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہاں گئی تھی۔”

“یعنی اسے آنے سے روک دوں۔ نان سینس۔ مسجرامٹڈ تم قطعی طور پر شادی نہ کرنا۔ تم عورت کو نہیں سمجھتے۔”

“میں کیا اسے سمجھنے کے لیے بیاہوں گا۔ میں تو اسے سے جرابیں دھلواؤں گا۔ کھانا پکواؤں گا اور.........”

“اور اگر وہ اس نگر میں چلی گئی۔ جہاں تمہارا گوراچٹا دوست رہتا ہے؟”

“تو سمجھوں گا کہ وہ لوٹ آنے کو گئی ہے۔ اوہ پروفیسر تم پریشان ہو کر اس نگر کو اور بھی اہمیت دے رہے ہو۔”

“بالکل ریل کا اثر۔ حرکت۔ موومنٹ۔ یو ہیمین بنا دیتی ہے۔ مثلاً” ٹانگہ والا۔ کوئی ٹانگہ والا دیکھ لو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پکنک پر آیا ہو۔ ریل میں تو مسافر کی ذہنیت بھی بدل جاتی ہے۔ غریب آدمی بھی آنے کی گنڈیریاں چوستا ہے اور چار بیویوں والے لیڈیز کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہیں۔ سلی ---- اور ---- اور ایک میٹریکولیٹ پریم نگر.........”

“تم تو وہمی ہو پروفیسر۔ یہی بات ہے تو بیگم کو پردہ میں ڈال دو۔”

“پردہ میں؟ او ہیونز۔ جوانی میں وہ ننگے منہ پھرتی رہی اور اب برقعہ میں چھپا کر از سر نو خوب صورت بنا دوں ----؟” “تم برقعہ کو پردہ سمجھتے ہو کیا؟”

“پردہ ہی تو ہے اور کیا؟” امجد چڑ گیا۔

“بس ریل ہی ہانکنی آتی ہے۔ یہ رنگ دار برقعے، پردہ ہیں کیا نان سینس۔ جیسے رنگ دار بوتلیں چل پھر رہی ہوں۔ ہر کوئی دور سے بتا سکتا ہے یہاں ابھار ہے، یہاں ڈھلان ہے۔ ہونہہ ---- پردہ۔ مسجرامٹڈ بس شادی نہ کرنا۔ بڑے سکھی رہو گے۔”

“لیکن نجمی تمہیں کیوں نہ سوجھی یہ بات، آج سے پانچ سال پہلے۔”

“اپنی کمزوریاں ہر کسی کو پیاری ہوتی ہیں نا۔”

“فیروزہ میری کمزوری ہے۔”

“پانچ سال پہلے تو وہ تمہارا پریم نگر تھی۔ اور اب جب سے وہ پریم نگر گئی ہے، اور بھی پیاری ہو گئی ہے۔ اس کمرے میں یوں سرگرداں پھر رہے ہو جیسے یہ صحرا ہو۔”

“کیا کہا؟” پروفیسر رک گیا اور دھم سے آرام کرسی میں بیٹھ گیا۔

“نان سینس۔ یعنی تمہارے نزدیک ٹہلنا محبت کی دلیل ہے ---- ڈیش اٹ ----” وہ جھنجھلایا۔ “کیا بے معنی کرسی ہے۔”

“آرام کرسی جو ہوئی۔” امجد مسکرایا۔

“ہائیں؟” پروفیسر جھلا کر بولا۔

“میرا مطلب ہے یہ کرسی صرف اس کے لیے با معنی ہے جو آرام کرنا چاہتا ہو۔”

ٹرررن ---- ٹرررن۔ گھنٹی بجی۔ پروفیسر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ “یہ کیسی گھنٹی ہے؟”

“گھبرائیے نہیں۔” سٹیشن ماسٹر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ اور پھر گھڑی دیکھ کر کہنے لگا۔ “دو منٹ میں آپ یہاں پہنچ جائیں گے۔”

“اوہ۔” پروفیسر چونکا۔ “تو میں ریسیو کر آؤں۔ امجد تم چائے منگوا لو۔ اتنی دور سے آ رہی ہے۔ اتنی دور سے۔”

“جی ہاں ---- ہیں؟” نہا لچند رک گیا۔ “یعنی اپنے آپ کو ریسیو کرنے جا رہے ہیں۔”

“نان سینس۔” وہ گھورنے لگا۔ “بیگم کو ---- بیگم کو۔”

“اوہ۔” نہا لچند نے آہ بھری۔

“سوری کیٹ از آؤٹ آف دی بیگ۔” گارڈ دروازے سے چلایا۔ “صاحب وفادار بیوی سے عمر بسر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔”

“کیوں ----؟” امجد نے پوچھا۔

“وہ خود بھی بیٹھ رہتا ہے۔ کھاوند کو بھی بٹھا رکھتا ہے۔ کبھی اس کی ویٹنگ روم میں انتظار کرتا تازگی دیتا ہے تازگی۔” وہ ہنسا۔

“آپ کا مطلب ہے پروفیسر یہاں بیٹھے تازگی پیدا کر رہے تھے۔ ان کی تازگی نے تو گھنٹہ بھر سے مجھے باسی بنا رکھا ہے۔” امجد نے شانے ہلائے۔

”تازگی اور جوش ایک ہی بات ہے۔ پانی کھڑا رہے تو گندا ہو جاتا ہے۔“
بوائے کو چائے اور پیسٹری لاتے دیکھ کر سٹیشن ماسٹر بولا۔

”اور یہ دعوت ----؟ یہ کیا پریم نگر سے آنے کی رشوت ہے۔“

”پروفیسر صاحب نے آرڈر دیا ہے جناب۔“ کینٹین کا لڑکا بولا۔

پرہیپس وہاں جانے کا ایوارڈ۔“ گارڈ ہنسا۔

”جی ہاں۔“ نہال چند چلایا۔ ”نہ جاتی تو آتی کیسے؟“

”اف۔ پروفیسر نے کیا پاکھنڈ مچا رکھا ہے۔ ایک معمولی شہر کو خواہ مخواہ اہم بنا رکھا ہے۔ میز پر رکھ دو بوائے۔“

”گھبرا گئے مسٹر امجد۔“ اچھا تو آؤ چلیں۔ وہ ابھی یہاں آئیں گے بے چارے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت دیر کے بعد لڑائی جھگڑے کی دلچسپی نصیب ہوئی ہے۔“

”ویٹ از اٹ۔“ گارڈ ہنسا۔ ”میں پرپوز کرتا ہوں کہ ایوری ناؤ اینڈ ون‘ ہر وائف کو نگر کا ایک ٹرپ ضرور لگانا چاہیے۔ آئی مین ’مائی میسٹک کیرڈ اور ہو جانا چاہیے۔ لٹ اس موو آن۔“

ان کے جانے کے بعد جلد ہی پروفیسر اور فیروزہ داخل ہوئے۔

”اوہ۔“ پروفیسر چلایا۔ ”سب چلے گئے ---- مگر یہ چائے۔“

”میرا تو پیاس کے مارے دم نکل رہا ہے۔“ فیروزہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہوں ---- کسی ہوٹل میں ٹھہری تھی کیا؟“ پروفیسر نے پیالہ بناتے ہوئے پوچھا۔

”آپ جانتے ہیں مجھے ہوٹل بازی سے نفرت ہے۔ مسٹر امین کی بیوی ----“

”اوہ تو مسٹر امین بازی کرتی آتی ہیں آپ؟“

”میں تو پہلے ہی کوفت سے چور ہوں لیکن آپ..........“

”کوفت؟ تم تو بنگلہ میں آرام کرتی رہیں۔ مصیبت تو میرے لیے تھی جو دورا ہے کا پلیٹ فارم ناپتا رہا۔“

”بس جی یہ آپ کی کتابی نفسیات نہیں چلے گی۔“ ”بس کتاب کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اور نام کو آپ ہیں ---- فیروزہ میٹریکولیٹ۔“

”مجھے میٹریکولیٹ نہ کہا کریں آپ۔“ وہ غصے میں چلائی۔

”تو اور کیا گریجویٹ کہوں؟“

”میں آپ کا لکچر روم نہیں ہوں۔ خواہ مخواہ گھوڑے کے آگے گاڑی جوتا ----“

”آج کل کی گاڑیاں تو آپ چلنے کے لیے بے تاب ہیں۔ دیکھ لیجیے گاڑی تو پریم نگر جا پہنچی اور

بے چارہ گھوڑا دورا ہا ناپتا رہا۔“

”تو یہ قصور کس کا ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”گھوڑے کا اور کس کا۔ دوسرا پیالہ بناؤں؟“

”بس جی آپ کی قلعی کھل چکی ہے اب ----“ اس نے ترچھی نظر سے گھور کر لاڈ سے کہا۔

”کیا ---- میری قلعی؟“

”جی ہاں۔ بہت بنا کرتے تھے۔ میں ---- میں مس امین کو نہیں جانتا۔“ وہ نقل اتارتے ہوئے بولی۔

”نہیں نہیں۔ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔“ پروفیسر پریشانی سے بولا۔

”جی ہاں اندھیرے میں ملی ہو گی نا۔“ وہ اور بھی سنجیدہ ہو گئی۔

”لاحول ولا قوۃ۔ آخر بات کیا ہے؟“

”بات کیا ہونی تھی۔ بس وہی ایک بات۔ بات بات پر پوچھتی تھی۔ مسٹر نجمی کو کیوں نہ لائیں آپ۔ مسٹر نجمی کو ضرور لائیے گا آپ۔ میں ان کے افسانوں کو بہت اڈمائر کرتی ہوں۔ ہونہہ ---- بڑی ایڈمائیرر۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“ پروفیسر نے مسکراہٹ بھینچ کر کہا۔

”اونہوں۔ یہ شیطان لاحول پڑھنے سے نہ جائے گا۔“ وہ بولی۔

”لیکن فیروزہ..........“

”اور پھر ---- آپ بڑی خوش قسمت ہیں مسز نجمی۔ آپ ایسے قابل رائٹر کی بیوی ہیں ---- سر کھا لیا میرا چڑیل نے۔“

”اوہ۔“ پروفیسر مسکرائے۔ ”عجیب معاملہ ہے۔“

کمرے میں چار آدمی آ گئے۔ اور وہ دونوں چپ ہو گئے۔

”کیا مصیبت ہے۔“ پگڑی والے پٹھان نے دستانے اتارتے ہوئے کہا۔ ”پریم نگر‘ خاک نگر‘ وہاں تو دھول اڑتی ہے دھول۔“

”آپ پریم نگر سے آئے ہیں؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”جانا تو نہیں تھا لیکن جا پہنچا۔ پھر وہی ٹائیں ٹائیں فش۔ سنا تھا بڑا اچھا شہر ہے لیکن خاک۔ بس عورتیں ہی عورتیں ہیں۔“

”اچھا جی۔“ نوجوان نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”عورتیں۔“

"اور مرد ---- اکا دکا مرد۔ بوکھلایا ہوا۔ جیسے شیش محل میں جاٹ۔"

"اچھا جی۔" نوجوان نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "سب عورتیں۔"

تیسری میز پر بیٹھا ہوا سردار بولا۔ "بس جی پریم نگر کو جانے والی گاڑی کی صرف ایک پہچان ہے، صرف ایک۔"

"وہ کیا؟" بنگالی بابو نے بیڑی کو سلگاتے ہوئے شوق سے پوچھا۔

"آپ پریم نگر نہیں جانا چاہتے نا؟"

"اونہوں۔" بنگالی بابو نے سر ہلایا۔ "بالکل نہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ بالکل نہیں۔"

"تو صاحب اس گاڑی پر نہ بیٹھیں جس کے ساتھ دو انجن لگے ہوں۔ ایک آگے، ایک پیچھے۔"

"دو انجن۔ ایک آگے ایک پیچھے۔" بنگالی نے یوں دہرایا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔

"پہاڑی علاقہ ہے نا۔ ایک انجن سے کام نہیں چلتا۔" سردار بولا۔

"پہاڑی علاقہ۔" بنگالی بابو نے دہرایا۔ "ہلز ----"

"کان کھول کر سن لو بیگم۔" پروفیسر نے جھک کر فیروزہ کے کان میں کہا۔ "دو انجن۔ آخر تمہیں کتنی بار کرانتی سے عقیل پور آنا ہو گا۔"

ٹرررن ---- ٹررن۔ گھنٹی کی آواز آئی۔ اور وہ سب اٹھ بیٹھے اور جلدی جلدی باہر نکل گئے۔

"بس ایک پیالہ اور ---- تھینک یو۔" فیروزہ بولی۔

"لیکن گاڑی۔" پروفیسر بڑبڑایا۔

"ابھی بہت وقت ہے۔ پانچ منٹ رکے گی یہاں۔" وہ کراہی۔

"سٹیشن ماسٹر صاحب ---- سٹیشن ماسٹر صاحب۔" نہا لچند گھبرایا ہوا داخل ہوا۔ "وہ یہاں نہیں ہیں۔"

"وٹ از دی ٹربل؟" گارڈ دروازے میں کھڑا ہو کر غور سے نہا لچند کو دیکھنے لگا۔

"سپرنٹنڈنٹ ---- سپرنٹنڈنٹ۔" نہا لچند چلایا۔ "جی ہاں ---- وہ آئے ہیں۔"

"کیا کہا؟" سٹیشن ماسٹر نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ وہ آئے ہیں۔ ڈاؤن میں ---- سپرنٹنڈنٹ۔"

"گڈ لارڈ۔"

"میں ان سے ملوں گا۔" پروفیسر اٹھ بیٹھا۔ "میں انہیں یقین دلاؤں گا کہ انتظام میں خرابی

ہے۔ اور پسنجر کو خواہ مخواہ کوفت ہوتی ہے۔"

"اونہوں ---- وہ نہ مل سکیں گے۔ اونہوں ---- بہت گڑبڑ یشن ہے۔" کیبن مین نے داخل ہو کر کہا۔ "سیلون کا دروازہ بند ہے۔"

"نان سینس۔" سٹیشن ماسٹر چلایا۔

"جی ہاں، جی ہاں۔" نہا لچند بڑبڑایا۔ "وہی نان سینس۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" ٹکٹ کلکٹر بھاگا بھاگا آیا۔ "ضرور کوئی غلط فہمی ہے۔"

"ڈیش اٹ ---- بات کیا ہے؟" سٹیشن ماسٹر غصے میں بولا۔

"حضرت آرڈر یہ ہے کہ ان کی سیلون عقیل پور کی جانے والی گاڑی سے لگا دی جائے۔"

"جی ہاں۔" نہا لچند بولا۔ "عقیل پور کا دورہ کر کے وہ یہاں آئیں گے۔"

"آپ نے سنا۔" امجد نے داخل ہو کر کہا۔ "لیڈی ٹکٹ چیکر کو پریم نگر کا سٹیشن ماسٹر بنا دیا گیا ہے۔"

"نان سینس۔" سٹیشن ماسٹر چلایا۔

"ابھی سپرنٹنڈنٹ صاحب کا حکم ملا ہے ابھی۔ ایل۔ ٹی سی ابھی بوگی میں ہے۔" ٹکٹ کلکٹر چلایا۔

"کون سی بوگی میں؟" سٹیشن ماسٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" نہا لچند بولا۔ "سپرنٹنڈنٹ کی بوگی میں۔"

"ہیونز۔" پروفیسر چلایا۔ "بیگم تم چلو، میں ابھی آیا۔ مسٹر امجد فیروزہ کو لے چلئے۔"

"شوق سے۔" امجد فیروزہ کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "جلدی آنا پروفیسر۔ گاڑی چلنے والی ہے۔"

"دیٹ از آل ویری سٹرینج۔" گارڈ ہنسا۔

"ول ول۔" سٹیشن ماسٹر بولا۔ "مسٹر کیبن مین ان کی بوگی عقیل پور سے لگانے کا انتظام کرو۔ اچھا تو گڈ بائی پروفیسر۔" وہ پروفیسر سے مخاطب ہوا۔

"رائیٹ" پروفیسر نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "سو لانگ جینٹل مین ---- سو لانگ۔" اور وہ دو انجن دو انجن بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

"پروفیسر کہاں ہے سٹیشن ماسٹر صاحب؟" امجد دوڑتا ہوا آیا۔ "وہاں گاڑی چلنے والی ہے اور ان کا پتہ نہیں۔"

"پروفیسر تو چلا گیا۔" سٹیشن ماسٹر نے جواب دیا۔

”جی ہاں۔ میں نے خود دیکھا ہے---- خود۔“

”کہاں؟“ امجد چلایا۔ ”لو عقیل پور کی گاڑی تو چل بھی پڑی۔“ امجد نے کوک سن کر کہا۔

”پریم نگر کی گاڑی میں------ جی ہاں۔ دو انجن------ دو انجن کہتے ہوئے وہ اندر جا بیٹھے تھے۔“

”لاحول ولا قوۃ کیا مصیبت ہے۔ اب بیگم عقیل پور جا پہنچے گی اور میاں پریم نگر۔“ امجد ہنسنے لگا۔

”ڈیش اٹ آل۔“ سٹیشن ماسٹر بڑبڑایا۔

”بالکل گڑبڑیشن ہے ٹیشن ماسٹر صاحب----“ کیبن مین بھاگتا ہوا آیا۔ ”وہ بوگی-----“

”خدا خیر کسی نے غلط کانٹا موڑ دیا اور----اور..........“

”وہ بوگی پریم نگر والی تھری اے۔ بی سے لگ گئی۔“

”گڈ لارڈ۔“ سٹیشن ماسٹر چلایا۔ ”اب کیا ہو گا؟“

”اب---- جی۔“ نہا پلخند بڑبڑانے لگا۔ ”یعنی میں کہہ رہا ہوں۔ اگر وہ مرد ہے تو واپس یہاں آ جائے گا۔ اور اگر عورت ہے تو..........“

”وہ کون؟“ امجد نے پوچھا۔

”سپرنٹنڈنٹ---- جی ہاں سپرنٹنڈنٹ۔“ نہا پلخند بولا۔

”شٹ اپ۔“ سٹیشن ماسٹر چیخ کر بولا۔ ”نان سینس۔“

”جی ہاں---- یہی کہہ رہا تھا میں----- نان سینس ہے پھر تو شٹ اپ۔ مطلب ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا!“

# میاں کی مرضی

”توبہ---- اس گھر میں کوئی کسی کے سنے بھی۔ یہاں تو بس انہیں کی چلتی ہے۔ چاہے کوئی چیخ چیخ کر مر جائے۔ انہیں اپنی مرضی سے کام۔“ سعیدہ باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے چلائی۔ اور پھر حشمت کی مستفسرانہ نگاہ کو دیکھ کر بولی۔ ”کہتے ہیں فرنی ضرور ہو گی کل کھانے پر۔ اور ٹکڑے۔ ٹکرے تو آخر ٹکڑے ہی ہیں۔ چاہے ڈبل روٹی کے ہی ہوں۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ نہ سنیں گے کسی کی۔ بس لے لیا مزہ پوچھنے کا----؟ میں تو اس گھر کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ مجھ سے کیا چھپا ہے---- ابھی تو کل ہی ان کی منہ چڑھی کا رونا ختم ہوا اور آج دعوت کا جھگڑا لا کھڑا کیا۔ اب کوئی کیا کرے۔ اور وہ چڑیل---- توبہ---- گھر میں کہرام مچا رکھا تھا اس نے۔ گئی ہے تو آرام کا سانس لیا ہے۔ دن بھر کبھی نیچے، کبھی اوپر۔ گھر کی دیواریں بھی کانپ اٹھی تھیں---- اب ایک مہینہ تو آرام سے کٹے گا۔“

سعیدہ نے اپنا دوپٹہ اتار کر دروازے پر لٹکا دیا اور ہنڈیا کی چپنی اتار کر بولی۔ ”حشمت ذرا سا پانی تو دے۔ دیکھ تو بالکل ہی سوکھ گئی ہے۔ نہ جانے کہاں سے گوشت لے آتا ہے یہ رحیما۔ اللہ مارا گلنے میں نہیں آتا۔“ پانی کا گلاس لے کر اسے ہنڈیا میں چار ایک چھینٹے دیئے اور چمچہ ہلانے لگی۔

”ایک مہینے کے لئے گئی ہے کیا؟“ حشمت نے کہہ کر اسے از سر نو چھیڑ دیا۔

”کیوں----؟“ سعیدہ چونکی۔ ”ایک مہینہ زیادہ ہے کیا----؟ ایمان سے کہنا حشمت۔ ایسے لچھن تو نے دیکھے ہیں کسی کے۔ آخر ہمارے زمانے میں بھی پڑھا کرتی تھی لڑکیاں۔ میں نے بھی پوری سات جماعتیں کی ہیں۔ پر ہم کو تو باتیں بنانا نہ آیا۔ کہیں آئینہ دیکھا جا رہا ہے۔ اب بال بنائے جا رہے ہیں۔ اب اس کھڑکی میں سے لٹک رہی ہے۔ پھر اس منڈیر سے جھانکا جا رہا ہے۔ دوپٹہ ٹکتا نہیں سر پر۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔ ادھر لٹک، ادھر مٹک۔ توبہ ہے۔“

”توبہ بی بی آج کل کی لڑکیاں۔“ حشمت نے داد طلب نگاہ سے دیکھا۔

”آج کل کی لڑکیاں-----؟ میری بہن ہے۔ خدا کے فضل سے نویں جماعت میں ہوئی ہے۔ کیا مجال ہے کبھی آنکھ اوپر اٹھائے۔ سکول سے آئی ہو گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر پڑھ لیا۔ پھر گھر کے کام میں لگ گئی----- اماں کو تو بیٹھے کھانا ملتا ہے------ بھئی حشمت ایمان سے کہتی ہوں' ان کی لاڈلی خالدہ سی لڑکی میری نظر سے تو نہیں گزری---- ہوں گی' اللہ میاں نے ہر رنگ پیدا کیا ہے لیکن حشمت اللہ پناہ میں رکھے۔ میری اپنی بیٹی ہو تو کھال ادھیڑ دوں۔“

”لو بی بی اب تو بہت بدل گئی ہے وہ تمہاری نصیحتیں سن کر۔“

”کیوں----- میں کیوں نصیحت کرنے لگی۔ میں تو ہوئی سوتیلی---- میری تو وہی بات ہے' نیکی برباد گناہ لازم۔ لڑکی کی عادتیں بگاڑیں اس کی ماں نے۔ پر لوگ تو یہیں کہیں گے کہ سوتیلی تھی۔ لڑکی کو سلیقہ کیا سکھاتی' اور اگر کچھ کہوں تو اور تو اور---- اس کے ابا ہی جتا دیں گے۔“

”ہاں یہی تو بات ہے بی بی۔“ حشمت نے جھک کر کہا۔ ورنہ لڑکی تو دو دن میں سدھر جائے۔ میں تو سچی کہوں گی۔ چاہے تم برا ہی مانو بی بی۔“

”برا ماننے کی کیا بات ہے اس میں۔ میں تو آپ منہ پر کہہ دینے والی ہوں---- ہاں۔“ سعیدہ سرک کر حشمت کے قریب ہو بیٹھی اور رازدارانہ انداز سے بولی۔

”تمہیں کیا معلوم' باپ پر تو اس لڑکی نے جادو کر رکھا ہے۔ جادو---- وہ تو جان دیتے ہیں۔ بھیگی بلی جو بنی رہتی ہے ان کے سامنے۔ گویا منہ میں زبان نہ ہو---- پر چھوٹی سے چھوٹی بات ان سے جا لگاتی ہے۔ میں کیا نہیں جانتی---- توبہ----! اللہ بچائے----! ہم نے تو کسی جوان لڑکی کو یوں باپ کے کندھوں پر چڑھتے نہیں دیکھا۔ کیا زمانہ آیا ہے۔ ایمان سے حشمت۔ جب میں چودہ سال کی ہوئی تو یکلخت ابا کے پاس جانا بند کر دیا۔ توبہ مجھے شرم آتی تھی۔ بس دور ہی سے جو کہنا ہوا' کہہ دیا۔ لیکن یہاں تو بات ہی اور ہے۔ شرم نہیں آتی اسے ابا کے سامنے سینہ چھلکاتے ہوئے۔ ہائے ری کیا زمانہ ہے---- وہ تو اپنے آپ کو دودھ پیتی بچہ سمجھتی ہے----توبہ ہے۔“

”بچی----!“ حشمت چلائی۔ ”کوئی ناواقف دیکھ پائے تو یہی سمجھے کہ گود میں بچہ ہے۔ ہاں---- پر میں پوچھوں ہوں بی بی کیا یونہی گھر بٹھا رکھیں گے اسے۔“

”ہائے ری یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔“ وہ اٹھ کر حشمت کے قریب تر ہو بیٹھی۔ ”تو ہی بتا حشمت۔ ایمان سے کہیو۔ جوان لڑکی کا یوں جھانکتے رہنا------ میں تو ڈرتی ہوں کہ کوئی بات نہ نکل آئے۔ میں کیا دیکھتی نہیں۔ سبھی کچھ دیکھتی ہوں۔ پھر چپ کیوں ہوں میں؟ بس حشمت چھوڑ اس بات کو تو۔ چپ ہی بھلی۔ ایک چپ میں سو سکھ۔“

حشمت بھی گرم ہو گئی۔ ”آخر کب تک رہو گی چپ۔ جب کسی کے ساتھ..........“

”اے ہے۔ تو نے تو وہی کہہ دی میرے دل کی بات۔ اسی ڈر سے تو میں مری جا رہی ہوں۔ لوگ تو یہ کہیں گے' سوتیلی ماں تھی۔ بے چاری تنگ آ کر نکل گئی۔ اور تو اور خود وہی سارا الزام مجھ پر دیں گے۔ اے ہے۔ اپنی بچی کو کون برا کہتا ہے۔ اس گھر میں بس ایک میں ہی پرائی ہوں نا؟ سچ بتا تو---- تجھے میری جان کی قسم۔“

”پر میں پوچھتی ہوں' اس کا رشتہ کیوں نہیں کر دیتے۔ ایک بار اپنا گھر جا کر بسائے تو پھر تمہاری بلا سے۔“

”یہی تو کہتی ہوں میں حشمت۔ میری طرف سے تو کل کا ہوتا آج ہو جائے۔ میری کوئی سنے بھی۔ میں تو اس روز شاہ سلیمان کے مزار پر گھی کا دیا جلاؤں گی---- گھی کا۔“ سعیدہ نے پر معنی انداز سے دیکھا اور پھر اس کے کان میں منہ دے کر بولی۔

”لڑکی کی پھوپھی' وہ کالے منہ والی چڑیل---- اس کا بڑا بیٹا اسلم ہے نا۔“

”اسلم----؟“ حشمت بڑبڑائی۔ ”اسے تو جواب دے دیا ہے بابو جی نے۔“

”جواب دے دیا ہے---- کب؟“

”یہی سات آٹھ دن ہوئے ہوں گے۔ اس روز کی بات ہے جب تم ادھر گئی ہوئی تھی۔ بی بی نہ جانے کیا کہتے ہیں---- انہیں ڈپٹی صاحب کہ کیا----؟ لڑکی کی پھوپھی آپ آئی تھیں۔ بھائی بہن اندر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔“

”کیا کرتے رہے باتیں----؟“

”اسلم کے لیے کہہ رہی تھی۔ کہتی تھی کھالدہ اللہ رکھے جوان ہو گئی ہے اب۔ اس کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟“

”پھر انہوں نے کیا کہا؟“

”بس حیلے حوالے کر کے ٹال دیا۔ اور کیا کہتے۔ کہنے لگے' ابھی بچی ہے۔ بڑی ہو جائے گی تو دیکھا جائے گا۔“

”ہونہہ بچی----!“

”پھر بولے۔ ہم تو اسے بیا کرائیں گے۔ نہ جانے کیا ہوتا ہے وہ---- مجھے کیا معلوم۔ ہوں بی بے کرائیں گے---- آخر لڑکے کے بارے میں بھی کچھ کہا ہو گا۔“

”بس یہی کہہ رہے تھے کہ لڑکا صرف دس جماعت پاس ہے۔ اس سے کیا بنتا ہے آج کل۔“

”کیوں بنتا کیوں نہیں۔ آپ بھی تو یہی دس ہی پاس کی تھیں۔ اب خان صاحب کے بغیر کوئی بلاتا نہیں۔ یہ تو نصیب کی بات ہے۔ اور کیا بولے؟“

"بس اور کیا کہنا تھا۔ بات بات پر بچی بچی کر رہے تھے۔"

"ہائے ری حشمت باپ تو آپ اندھا ہو رہا ہے۔ اب کوئی کیا کرے اور وہ چھوکری۔ توبہ کس قدر پکی ہے۔ بال پن آیا ہی نہیں کبھی۔ میں تو دو سال سے یہی حالت دیکھ رہی ہوں۔ تمہیں یاد ہے، پچھلے سال جب اس نے کہیں سے سن پایا تھا کہ اسلم کی بات ہو رہی ہے۔ توبہ ----! لڑکی نے پورا ہفتہ منہ سجائے رکھا اور میرے منہ پر تو صاف جتا دیا' میں دیکھوں گی۔ میرے متعلق کون ایسی ویسی باتیں کرتا ہے۔ دو کوڑی کا آدمی میرے لیے رہ گیا ہے کیا؟ پر انشاءاللہ دو کوڑی کا ہی ملے گا۔"

"میں کہتی ہوں اسلم نہیں تو اور سہی، رشتوں کا کیا کال ہے۔ بی بی ---- وہ ڈپٹی صاحب کا لڑکا جو ہے۔" حشمت بات سمجھے بغیر بڑبڑائی۔

"کیوں اسلم کو کیا ہے۔ کوئی لولا لنجا ہے کیا۔ اللہ رکھے پڑھا لکھا ہے۔ اور پھر ہوا بھی اپنا قریبی۔ اس کے لیے اس سے بہتر رشتہ ملے گا کہاں ----؟ اور وہ ڈپٹی صاحب۔ انہوں نے کئی بار مجھ سے کہا ہے۔ اللہ رکھے لڑکا ایم اے میں ہے۔ پر تو جانتی ہے نا ----" سعیدہ نے ایک معنی خیز نگاہ سے دیکھا اور پھر ہاتھ چلا کر بولی۔ "ہائے ری ---- تیری سمجھ کو کیا ہوا ----؟ ایمان سے کہیو۔ یہ لڑکی گھر بسائے گی کیا۔ تو میں کیوں آؤں اس بات میں۔ مجھے اپنی ناک چوٹی کی لاج نہیں کیا ---- ہیں؟"

"نہ نہ بی بی۔ تجھے کیا پڑی۔ تیری بلا سے۔ پر مصیبت تو یہ ہے کہ ایک بار انکار کرنے کے بعد وہ کب اسلم کی بات ماننے لگے۔"

"اللہ تیرا بھلا کرے۔ یہی تو مصیبت ہے۔"

"پھر ہو گا کیا؟"

"ہونا کیا ہے۔ بس وہی ہو گا جو ہوا کرتا ہے اس گھر میں۔ ان کی مرضی اور کیا۔ یہاں کون سنتا ہے کسی کی؟"

"آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہئے تمہیں۔ تم کیا برا چاہو گی اس کا۔ تم تو بلکہ لڑکی کی بھلائی ہی سوچتی ہو نا۔"

"ہائے حشمت میرا تو جی ہی ایسا برا ہے کہ کسی کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ اپنے دل کو کیا کروں۔ کسی دشمن کو بھی نہ دے ایسا دل۔ نہ جانے لوگ کسی کی برائی کیسے کرتے ہیں۔ ہم سے تو نہ ہو سکی یہ بات۔"

"پر بی بی۔ یوں نہ بنے گی بات۔ تم ان سے بات تو کرو۔"

"اچھا تو جو کہتی ہے تو کہہ دیکھوں گی میں ----"

"نہ میں مجبور نہیں کرتی بی بی۔ تیری اپنی مرضی ہے۔ نہیں مانتے تو تیری بلا سے = دفع کر۔"

"اچھا تو دیکھ تو سہی۔" سعیدہ بولی۔ اور پھر چولہے کی طرف منہ پھیر کر مسکراہٹ بھینچنے لگی۔ لیکن کوئی ان جانا تبسم خواہ مخواہ اس پر چھائے جا رہا تھا۔ گوشت بھونتے ہوئے اس نے محسوس کیا جیسے اس کی بغل میں کچھ پھڑپھڑا رہا ہو۔ قمیض تنگ ہوئی جا رہی تھی۔ اور بدن پر چیونٹیاں چل رہی تھیں۔ نہ جانے وہ راز کیا تھا جو یوں اس کے بدن میں لہریں لینے لگا تھا جسے وہ اپنی رازدان حشمت سے تو کیا اپنے آپ سے بھی چھپانا چاہتی تھی۔

پکانے سے فارغ ہو کر اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ بال بنائے۔ غازہ مل کر کاجل کی دھار لگائی اور پھر نیا چنا ہوا دوپٹہ شانوں پر ڈال انتظار میں بیٹھ گئی۔

میاں کے سامنے کھانا چن کر سعیدہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"بہت دیر ہو گئی آج۔" وہ بولی۔

"ہیں ----؟" خان صاحب چونک کر بولے۔ "ہاں کچھ کام تھا۔" انہوں نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔

"کچھ اچھی بھی بنی ہے کچنار؟" سعیدہ خواہ مخواہ مسکرائی۔

"ہوں ---- اچھی ہے۔"

"آج کل تو ملتی ہی نہیں۔ میں نے حشمت کو سبزی منڈی بھیج کر منگوائی ہے۔ میں نے کہا' وہ ایک دفعہ تو پکا لوں۔ آپ کو پسند جو ہوئی۔"

"ہوں ---- ہاں۔" انہوں نے ہڈی چباتے ہوئے جواب دیا۔ "پانی۔"

"توبہ دو دن سے گھر ویران پڑا ہے۔" سعیدہ نے پانی دیتے ہوئے گویا اپنے آپ سے کہا۔

"ہوں ----!" ان کے ماتھے پر تیوری بن گئی۔

"خالدہ جو چلی گئی ہے۔ توبہ اکیلا بھی کوئی نہ ہو۔"

"ہاں۔ اس کی نانی اصرار کر رہی تھی نا۔ یہ عورتیں ---- ہونہہ ----!"

"اللہ رکھے اس سال دسویں کرے گی۔ اب تو جوان ہو گئی ہے۔ آپ کو فکر بھی ہے اس کی۔"

"ابھی بچہ ہے۔ دیکھا جائے گا۔" وہ بھرے ہوئے منہ سے مشکل سے بولے۔

"واہ میں کیا یہ کہتی ہوں کہ ابھی کر دو شادی۔" سعیدہ نے لاڈ سے کہا۔ "پر نامزد تو کر دینا چاہئے۔ کوئی کھاتا پیتا شریف خاندان ہو۔ آج کل لائق لڑکا تو ملتا نہیں۔ لوگ پہلے ہی سے بات چیت طے کر لیتے ہیں۔ ورنہ شادی کی جلدی ہی کیا ہے۔"

"ہوں----" وہ بولے۔ "پھر ہے کوئی لڑکا نگاہ میں؟

سعیدہ سوچ میں پڑ گئی۔ ابرو تن گئے۔ پلکیں جھپکیں۔ آنکھوں میں اک بے تعلق چمک لہرائی۔ اسے دیکھ کر وہ رک گئے۔ اور بولے۔ کیا کہتی ہے؟"

"مجھے تو کوئی ایسا لڑکا نظر نہیں آتا۔ سعیدہ نے مزید معصومیت سے کہا۔ "وہ صدیق تھا اس کا تو نکاح بھی ہو چکا۔ اور انور' وہ تو مدتوں سے منسوب ہے اور کوئی لڑکا تو ہے نہیں۔ البتہ اسلم............"

"ڈپٹی صاحب کا لڑکا جو ہے۔ تمہارا تو بہت آنا جانا ہے۔"

"ہاں ہے تو سہی۔ لائق بھی ہے لیکن............"

"لیکن کیا؟" وہ بولے۔

"بس کیا بتاؤں۔ کل ہی اس کی ماں رو رہی تھی۔ سعیدہ رازدارانہ انداز میں ان کی طرف جھکی اور متبسم آنکھوں سے بولی۔ کہتی تھی' کالج کی کسی کرنٹی سے۔" اس کی آنکھیں چمکیں اور پھر پلکیں جھکیں۔ گویا کسی راز پر پردہ ڈال رہی ہوں۔ پھر وہ از سرنو مسکرانے لگی۔

ایک ساعت کے لیے خان صاحب کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ لیکن پھر اسی خشک لہجے میں بولے۔ "جوانی میں لڑکے کیا کیا نہیں کرتے۔ بڑا ہو کر آپ سدھر جائے گا۔"

"پر معاملہ تو حد تک پہنچ چکا ہے۔" اس نے دوبارہ جھک کر کہا۔ "سنا ہے دونوں نے چوری چوری بیاہ بھی کر لیا ہے۔ جبھی تو ماں اندر ہی اندر گھل کر کانٹا ہوتی جا رہی ہے۔"

"اوہ----" وہ کھانسنے لگے۔ "ہاں وہ تمہاری ہمشیرہ کا لڑکا منور جو ہے۔"

سعیدہ نے برا سا منہ بنا لیا۔ "اب آپ سے کیا چھپانا ہے۔" وہ بات کاٹ کر بولی۔ اور پھر رک گئی۔

"لیکن کیا؟"

وہ آبدیدہ ہو گئی۔ "کیا بتاؤں۔ اللہ کی مرضی ہے۔ ہم تو ہر طرف سے دکھی ہیں۔ نہ جانے یہ سب کس گناہ کی سزا ہے۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"آخر بات کیا ہے؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

"بے چارہ منور----" اس نے اک آہ بھری۔ "لے دے کر یہی ایک لڑکا تھا لیکن نہ جانے کیا ہوا۔ آج تین سال ہونے کو آئے ہیں' لڑکے کی چھاتی سے خون آتا ہے۔"

"ہیں---- تم نے مجھ سے تو نہیں کہا کبھی۔"

"کہنے والی بات بھی ہو۔" وہ روئی روئی آواز میں بولی۔ "وہ تو سب یہ بات چھپائے بیٹھے ہیں۔

بہن کو تو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا گئی یہ بات۔" سعیدہ از سرنو آبدیدہ ہو گئی۔

"تم کیوں مفت میں اپنا دل دکھاتی ہو---- تمہارا دل بہت نرم ہے۔" وہ مسکرائے۔

"اے ہے کل اسلم کی ماں آئی تھی۔ اس وقت سے دل بھرا بھرا ہے۔ جی چاہتا ہے رو دوں۔"

"کیوں؟"

"بس خیال آ گیا' اسلم کیسا اچھا لڑکا ہے۔ اتنا فرماں بردار۔ کتنی عزت کرتا ہے وہ آپ کی----"

"میری عزت۔" وہ چونکے۔

"پھر منور کا خیال آیا۔ بس کلیجے میں چھری لگی۔ نہ کرتا ایسے کام تو ایسی بیماری نہ لگتی۔"

"کیسے کام----؟"

"نہ جانے کیا کیا گل کھلاتے ہیں کالج میں۔ یہ بیماری ایسے نہیں لگتی۔ کل اسلم کی ماں سے مل کر جی خوش ہو گیا۔ اپنے بیٹے کی طرف سے کتنی سکھی ہے۔ اللہ ایسی اولاد سب کو دے۔"

"کس لیے آئی تھی وہ؟" وہ خشمگیں انداز میں بولے۔

"کچھ نہیں۔ وہ خالدہ کے بارے میں کہنے آئی تھی۔"

"ہونہہ---- وہ تو پاگل ہے۔" انہوں نے کھانا ختم کر کے کہا۔ "ہم نے اسے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ خیال چھوڑ دے۔ اگر ایسا ہی خیال تھا اس کا تو لڑکے کو بی۔ اے تو کرایا ہوتا۔ دسویں کو تو آج کل............

"ہاں۔ ہاں---- میں نے تو اسے صاف کہہ دیا۔" سعیدہ بات کاٹ کر بولی۔ "یہ رہا حقہ بھرا ہوا ہے۔"

"ہوں۔" انہوں نے حقے کا کش لے کر کہا۔ "کیا کہا تھا؟"

"کہنے لگی' بہن ہم بے چارے غریب ٹھہرے۔ میں نے کہا' بہن یہ نہ کہو۔ ویسے رشتے کے متعلق تم جانو اور تمہارے بھائی۔ وہ آپ سمجھ دار ہیں۔ میں بے چاری کس شمار میں ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں---- تم اس سے کہیں زیادہ سمجھ دار ہو۔"

"آپ کے سامنے میری حیثیت ہی کیا ہے۔"

"خیر۔ خیر---- پھر کیا بولی وہ؟"

"اس نے کیا کہنا تھا۔ میں نے ہی کہا۔ بہن ان کے دل میں اونچ نیچ نہیں ہے حالانکہ اللہ رکھے برادری میں ان کے برابر کون ہے' لیکن ان کی طبیعت میں امیری کی بو نہیں۔ اونچ نیچ کا خیال

نہیں۔“

”ہوں---- ٹھیک ہے۔ ہمارے دل میں یہ خیال تو کبھی نہیں آیا کہ وہ چھوٹے ہیں۔ یہ پڑوس میں رمضان کی اماں رہتی ہے۔ بے چاری کتنی غریب ہے۔ وہ سارا سارا دن آ کر بیٹھ رہتی ہے۔ لیکن ہمارے دل میں کبھی خیال نہیں آیا۔“

”اور پھر اسلم---- میں نے کہا‘ اسلم کو تو وہ اپنا بیٹا سمجھتے ہیں اور مردوں کے دل میں ایسی ویسی باتیں ہوں گی لیکن ان کے دل میں نہیں۔“

”میں نے کہا‘ بہن تم اسلم کی نوکری کی فکر نہ کرو۔ وہ چاہیں تو آج ہی کروا دیں اسے نوکر۔ ان کا رسوخ کیا کم ہے۔ بڑے بڑے افسر آپ اُن سے ملنے آتے ہیں۔ میں نے کہا‘ ابھی کل ہی رمضان کو نوکر کروایا ہے۔ فی الحال بیس لے گا پھر بائیں ہوں گے‘ پھر تیس۔ اسی طرح اک دن مرتبے والا ہو جائے گا۔ اور میں نے کہا‘ صرف آٹھ جماعتیں پاس ہے وہ۔ تمہارا بیٹا تو اللہ رکھے دس پاس ہے۔ افسر نہ بنوا دیں تو کہنا۔ ان کی بات کون ٹال سکتا ہے۔ بہن---- ہاں۔“

”ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسے۔ ”بے چارے بڑی اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ ابھی کل ہی مسٹر صدیقی کہہ رہے تھے‘ بھئی کوئی کام بتایا کرو۔ ریلوے کے افسر ہیں وہ۔ سب ریلیں انہیں کے حکم سے چلتی ہیں۔ مالک ہوئے ریلوں کے۔ رمضان کا کام بھی انہوں نے کیا تھا۔ میں نے ویسے سرسری بات کی تھی۔ سارے ہی لحاظ کرتے ہیں۔“ وہ حقہ پینے لگے۔

”ہر روز دیکھتی جو ہوں۔ بڑے بڑے افسر گھر پر آتے ہیں۔ اکٹھا کھانا پینا‘ ہنسی مذاق۔“

”ہاں ہاں۔ بڑے اچھے ہیں بے چارے---- اور اسلم کو نوکر کروانا کیا مشکل ہے۔“

”میں نے کہا‘ بہن تم جو چاہو سو کہو۔ جو چاہو سمجھو۔ پر میں نے جیسا بھائی نہیں دیکھا۔ میرا اپنا بھائی ہے۔ کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کیا اس نے۔ پر تمہارے بھائی کو اٹھتے بیٹھتے ہر وقت تمہارا خیال رہتا ہے۔“

”ہاں----“ وہ حقے کا کش لے کر بولے۔ ”آخر بہن ہے لیکن بہت بے وقوف ہے۔ ہاں---- پھر کیا بولی؟“

”کہنے لگی بھائی تو چاہتا ہے۔ پر بے چارے کا بس بھی چلے۔“

”ہیں----؟“ وہ چونکے۔ ”بس کیسا؟“

”میرے متعلق کہہ رہی تھی۔“ وہ ایک رسیلی مسکراہٹ سے بولی۔ ”ان کا خیال ہے کہ میری وجہ سے آپ نے رشتے سے انکار کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لڑکا کا رشتہ میں اپنے رشتہ داروں کو دینا چاہتی ہوں بلکہ یہ بات تو وہ کئی بار میرے منہ پر جتا چکی ہے۔ یہ خیال تو آنا ہی ہوا انہیں۔

قدرتی بات ہے۔ ایمان سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔“ اس کے دانت سرخ ہونٹوں تلے چمکے۔

”لاحول ولا قوۃ۔ کیا بے ہودہ خیال ہے۔ پاگل ہے پاگل۔“

”میں نے تو صاف کہہ دیا۔ میں نے کہا‘ بہن مجھے جو جی میں آئے کہہ دو لیکن ان پر جھوٹا الزام نہ دھرو۔ وہ کوئی زن مرید نہیں۔ اللہ رکھے اپنی عقل کے مالک ہیں۔ بڑے بڑے افسران کی صلاح لیے بغیر قدم نہیں اٹھاتے۔ ہاں وہ بھلا عورت کے پیچھے بھیڑ کیوں بنیں۔ ان کی ایسی عادت نہیں۔“

”ہاں سچ کہہ رہی تھی وہ۔ اپنے میاں کی بات کر رہی تھی نا۔ میں جانتا ہوں۔ خدا جانے مرد عورتوں کی باتوں میں آ کر اپنے آپ کو بے وقوف کیوں بناتے ہیں؟“

”بس یہی بات ہے۔ وہ سمجھتی ہے جیسے اس کا مرد ہے‘ ویسے ہی دوسرے بھی ہوں گے۔“

”لاحول ولا قوۃ---- تمہارے متعلق تو اس کا خیال بالکل غلط ہے۔ تم تو الٹا ہمیں آپس میں مل بیٹھنے کی ترغیب دیتی رہتی ہو۔“

”ان سے نہ ملیں تو ہم کس سے ملیں۔ ان سے زیادہ عزیز کون ہے ہمیں۔ آپ ہی بتائیں۔ ویسے میرا آپ کی باتوں میں دخل ہی کیا ہو سکتا ہے۔ توبہ میں کیا آپ کی عقل تک پہنچ سکتی ہوں؟“

”نہیں۔ نہیں۔ تم بڑی سمجھ دار ہو۔ بے وقوف تو وہ ہے۔ پاگل ہے---- پاگل ہے۔“

”میں نے بھی اسے لاجواب کر دیا تھا۔ میں نے کہا‘ بہن خالدہ کے لیے تم سے بہتر ساس کون ہو گی۔ ویسے تو انہیں ہزاروں رشتے ملتے ہیں۔ ان کے دوست کوئی چھوٹے موٹے آدمی نہیں۔ ابھی تو ڈپٹی صاحب کی بیوی کل ہی رشتے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اور پھر وہ ریلوں کے مالک نہ جانے کیا نام ہے ان کا‘ لڑکا ولایت پاس ہے۔ آخر انہیں اپنے عزیزوں کا خیال ہی تھا نا کہ لڑکی منسوب نہ کی۔ ورنہ آج تک..........“

”ہاں۔ ہاں وہ تو اب بھی..........“

”یہی تو میں نے بتایا اسے۔ میں نے کہا‘ بہن سچ کہنا۔ آخر وہ کیوں نہیں کر دیتے رشتہ۔ ایمان سے کہنا‘ کیا تم نے ان سے کبھی بات بھی کی ہے۔ مجھے ہی کہتی ہو نا۔ میں ان سے ایسی باتیں کیسے کروں۔ میری تو جرات نہیں۔“ اس نے لجا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ ”تم خود کہو ان سے۔ میں نے کہا۔ تمہاری بات کیوں رد کرنے لگے وہ۔“

”نہیں۔ اس نے کہا تھا مجھ سے----“

”تو آپ نے کون سا توڑ کر جواب دے دیا تھا۔ بس اتنا ہی کہا تھا کہ لڑکی تعلیم سے فارغ ہو لے اور لڑکا صرف دس پاس ہے۔“

“ہاں ہاں۔ یہی کہا تھا ہم نے اور..........”

“اور میں نے کہا۔ یہ کیا جھوٹی بات ہے۔ سچ کہتے ہیں وہ۔”

“پھر کیا بولی؟”

“میں نے ہی کہا۔ میں نے کہا‘ بہن وہ خالدہ کو اس لیے تو نہیں پڑھا رہے کہ اللہ نہ کرے‘ اس سے نوکری کروانی ہے۔ توبہ کرو۔ بہن وہ تو آپ پڑھی لکھی استانی لڑکی کے لیے نوکر رکھ سکتے ہیں۔ بھلا خالدہ سے نوکری کیوں کروانے لگے وہ۔”

“اونہوں۔ یہ کس نے کہہ دیا ان سے۔ ہمارا تو قطعی ارادہ نہیں----پاگل ہے۔”

“میں نے کہا۔ بہن لڑکی کو جو پڑھا رہے ہیں تو صرف اس لیے کہ پڑھ کر اچھی بیوی بنے۔ اس میں تو تمہاری ہی بھلائی ہے۔ پڑھی لکھی بہو ہو گی۔ اور ماشاء اللہ وہ پہلے ہی ایسی اچھی لڑکی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ وہ آپ بیٹی کی تربیت کا خیال رکھتے ہیں۔”

“ہوں----پھر کیا بولی؟”

“پھر کیا بولتی۔ لگی بغلیں جھانکنے اور پھر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ بولی۔ آخر مجھے بھی تو اپنے بھائی ہی سے امیدیں ہیں۔ اسی پر ناز ہے مجھے اور میرا ہے ہی کون۔ اک بھائی ہے نا جس کے آسرے جیتی ہوں۔ چاہے اٹھالے یا ٹھکرادے۔ اس کی مرضی۔”

“خان حقے کا کش لینا بھول گیا۔ بولا۔ “پاگل ہے۔ پاگل..........”

“میں نے کہا‘ وہ بھائی ایسا نہیں جو ٹھکرادے گا۔ تم نے تو اسے سمجھا ہی نہیں۔”

“ہاں ہاں۔ وہ بے چاری کیا سمجھے گی۔”

“اور میں نے کہا۔ یہ نہ سمجھنا کہ وہ اسی بات پر اڑے رہیں گے کہ اسلم بی۔ اے کر لے۔ اونہوں۔”

“کیا جواب دیا اس نے؟” وہ پھر چمک کر بولے۔

“میں نے کہا‘ وہ ایسی نوکری دلوا سکتے ہیں۔ اسے جو بی۔ اے کو بھی نصیب نہ ہو۔ میں نے کہا‘ بہن آج کل جماعتوں کو کون پوچھتا ہے۔ کئی بی۔ اے دھکے کھا رہے ہیں۔ بیس روپے کی نوکری کو ترستے پھرتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ان کی سفارش پر سو روپے کی نوکری نہ ملی تو کہنا۔ تو نے سمجھا کیا ہے؟”

“ہاں بی۔ اے کو کون پوچھتا ہے آج کل۔”

“یہی تو میں نے کہا تھا۔”

“پھر کیا بولی؟”

“بولی۔ میں تو بھائی کے قدموں پر جا گروں گی۔ ایمان سے----”

“اوہ----پاگل ہے پاگل۔”

“یہ تو خیر آپ ہی جانیں۔ پر جس قدر اسے پیار ہے آپ سے‘ میں جانوں‘ شاید ہی کسی بہن کو ہو گا۔ بس وہ آپ کو سمجھی نہیں۔”

“ہاں۔ بے وقوف جو ہوئی۔”

“اتنی عقل لائے بھی کہاں سے۔ وہ تو ظاہر کو دیکھ کر اصل سمجھ لیتی ہے۔ جبھی تو کہتی ہے کہ بھائی ملتے بھی ہیں تو کس رکھائی سے۔ اسے کیا معلوم کہ روکھی نگاہوں کے نیچے یہ دال کس قدر گرم----” اس نے ہاتھ سے ان کا سینہ تھپکا اور پھر اک دلنواز طریقے سے مسکرا دی۔

“سعیدہ۔” ان کی آنکھ چمکی۔ “ہی ہی ہی۔ تم بات تاڑ جاتے ہو----حد ہو ادھر آنا ذرا۔ میری طرف دیکھو تو۔”

“چلو ہٹو۔” وہ لاڈ سے بولی۔ “خواہ مخواہ میرا نام بدنام کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتی ہے میں ہی ورغلا رہی ہوں جیسے کوئی ورغلا سکتا ہے آپ کو۔”

“خدا کی قسم بڑی شریر ہو تم۔ اچھا میری بات تو سنو۔”

“میں جانتی ہوں۔” وہ بولی۔

“سعیدہ۔” انہوں نے سنجیدگی سے للکارا۔ ایک ساعت کے لیے وہ سہم گئی۔ پھر منہ موڑ کر ان کے روبرو ہو بیٹھی۔ “بات تو سنو تم۔” وہ بولے۔ “میرا مطلب ہے تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن اسلم اچھا لڑکا ثابت نہ ہوا تو----”

“نہ ہوا تو۔” وہ بولی۔ “منگنی چھڑانے میں کیا دیر لگتی ہے۔”

“ہاں ہاں۔ یہی ہمارا خیال ہے۔ اچھا تو تم کل اسے بلا کر بات کر لینا۔”

“واہ۔ میں کون ہوں ایسی بات کرنے والی۔ آپ کے ہوتے ہوئے میرا بات کرنا----”

“لیکن مجھے اتنی فرصت کہاں ہو گی؟”

“تو نہ سہی۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ پھر ہو جائے گی بات کبھی۔”

“سعیدہ۔” وہ بگڑے۔ “تم نہیں سمجھتی ان باتوں کو۔”

“مجھے کیا پتہ۔” وہ بولی---- “لیکن اگر آپ نے اسلم کو نوکر کروا دیا تو شاید وہ جلدی نکاح کے لیے زور دیں۔”

“اس کی نوکری کے لیے تو میں آج ہی بہادر سے کہہ دوں گا۔ آخر لڑکی کو عمر بھر بٹھا نہیں رکھنا ہم نے اور بیاہ سے ہمیں عذر ہی کیا ہو سکتا ہے۔ ہم نے لڑکی سے نوکری تو کروانی نہیں۔ بی۔

اے نہ ہوئی تو کیا ہوا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ بولی۔ "آپ کی خوشی میں، میں بھلا کیا عذر کروں گی---- لیکن آپ اپنی زبان سے کہہ دیتے بہن کو تو بہتر ہوتا۔ ویسے میں بھلا انکار کر سکتی ہوں کیا؟"

"میں چاہتا ہوں کہ یہ بات تمہارے ذریعے ہو۔ سمجھی---- ان کو تمہارے متعلق غلط فہمی نہ رہے۔"

"میرا کیا ہے۔ لیکن........."

"ہم جو کہہ رہے ہیں۔"

"بہت اچھا۔ مگر آپ........."

"بس سعیدہ تمہیں ہی کہنا ہو گا۔ سنا تم نے؟"

"میں کہتی ہوں کسی کی سنیں گے بھی آپ یا اپنی ہی کریں گے۔"

"بس ہماری مرضی۔"

"اچھا بابا تمہاری مرضی ہی سہی۔" وہ مسکرائی۔ دو بڑی بڑی بانہوں نے اسے گھیر لیا۔ "بڑی گستاخ ہوتی جاتی ہے۔" وہ مسکرائے۔ "ہونہہ گستاخ۔" وہ بڑبڑانے لگی۔ "اتنی فرماں بردار تو ہوں۔" اس نے اپنا آپ حوالے کرتے ہوئے کہا۔

---

# الصدف

خط پڑھ کر میں نے محسوس کیا گویا کسی نے میرے کلیجے میں چھری بھونک دی ہو۔ میرے دل میں بیگم کے متعلق شکوک رینگنے لگے۔ اسد کے ان چار لفظوں نے اک قیامت برپا کر دی تھی۔ کس قدر مختصر خط تھا۔ "فوراً" واپس چلے آؤ۔" اس کو بھلا میری واپسی کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے گھر سے دورے پر آئے ہوئے ابھی چار دن ہی ہوئے تھے۔ اگر گھر میں کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہوتی تو کیا وہ مجھے مفصل خط نہ لکھ سکتا تھا۔ ضرور اس نے مجھے بیگم کے متعلق بلایا ہے۔

بیگم کا بے پناہ حسن میرے لیے کبھی سکون کا باعث نہیں ہوا۔ اس کا حسن ایسا نہ تھا جسے دیکھ کر دل میں راحت یا خوشی پیدا ہو یا یہ احساس ہو کہ میں جی رہا ہوں۔ جینا چاہتا ہوں۔ اس کے برعکس اسے دیکھ کر یوں محسوس کرتا گویا کسی رنگین بے قراری نے ڈس لیا ہو۔ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کروں۔ میں دیوانہ وار ادھر ادھر گھومنے لگتا۔ "اب میں کیا کروں؟ کیا کروں میں؟"

اس کی نیم وانوکیلی آنکھیں درپردہ مسکرایا کرتیں۔ بھنچے ہوئے خم دار پتلے ہونٹ زیر لب کچھ کہتے ہوئے محسوس ہوتے۔ کمان سے ابرو اشارے کرتے رہتے۔ رخساروں میں نیم رضامندی کی سلوٹ نمایاں رہتی۔ اف وہ دھار کی طرح چبھ جانے والا حسن---- سریلی چیخ کی طرح چونکا دینے والا۔

ہماری شادی ہوئے پورے دو سال ہو چکے تھے۔ مجھے بیگم سے عشق تھا---- عشق۔

میرے دل میں ایک بھٹی سلگتی رہتی تھی۔ اسے دیکھ کر رگ رگ میں تڑپ اٹھتی اور یوں دیوانہ وار جھومتی جیسے کوئی موت کا ناچ ناچ رہا ہو۔

ہر مرتبہ جب میں بیگم سے ملتا تو مجھے محسوس ہوتا گویا ہم پہلی مرتبہ مل رہے ہیں۔ اس کے انداز میں کچھ ایسا نیا پن تھا جو اکثر بیگانگی یا بے نیازی میں بدل جاتا تھا۔ لیکن وہ اسے خوب پھبتا تھا۔ جب وہ معصومتی سے گردن موڑ کر کہتی۔ "کہیئے۔ آیئے۔ آ گئے آپ۔" اس وقت اسے یہ قطعی

احساس نہ ہوتا کہ قریب ہی کوئی تڑپ رہا ہے اور نہیں جانتا کہ کیا کرے۔

ہمارے نوجوان پڑوسی نواب ظفر علی کے آنے پر تو اس کی آنکھیں اور بھی مترنم اور ہونٹ اور بھی متکلم ہو جاتے ---- بھنوئیں رمز سے تن جاتیں۔ گالوں کی نیم رضا سلوٹ اور بھی واضح ہو جاتی۔ اس وقت محسوس کرتا کہ وہ دور بیٹھ کر بھی بن بولے باتیں کر رہے ہیں۔ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ نواب کی مست آنکھیں اور بیگم کی بے نیازی میرے شکوک کو ابھارتے اور میں تڑپتا۔ ضرور وہ ملتے ہوں گے۔ ان کی نگاہوں میں شوق اور بے تکلفی جھلکتی ہے۔ ان کے انداز میں گذشتہ ملاقاتوں کے متعلق اشارات نمایاں ہیں۔ اس وقت میرا جی چاہتا کہ نوکری سے استعفی دے کر گھر بیٹھ رہوں۔ مہینے میں بیس دن باہر دورے پر رہنا ---- اف کیا مصیبت تھی ----!

انہی دنوں میرا پرانا دوست اسد مجھ سے ملنے کے لیے آ گیا۔ دو ایک دن خوب کٹے۔ لیکن وہ فوراً تاڑ گیا کہ میرے دل میں گھن لگا ہوا ہے۔ اس کے اصرار پر مجھے اپنے شکوک کا قصہ سنانا ہی پڑا۔

“واہ ---- یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔” وہ ہنس کر بولا۔

“بڑی بات۔” میں نے آہ بھر کر کہا۔ “اس بات پر میری زندگی کا دارومدار ہے۔ اسد میں صرف جاننا چاہتا ہوں۔ حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔”

“لیکن ----” وہ کہتے کہتے رک گیا۔

“میں سمجھتا ہوں۔ میں بڑی سے بڑی بات برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن شبہات مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتے۔”

“ہوں۔” وہ سوچ میں پڑ گیا۔ “اچھا تم دورے پر چلے جاؤ۔ میں یہیں رہوں گا۔ جلد ہی سب بھید معلوم ہو جائے گا۔ حقیقت کا انکشاف ہو گیا تو تمہیں بلا لوں گا۔ تم فوراً آ جانا۔ دیر نہ کرنا۔ ممکن ہے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو۔ میں کوشش کروں گا۔”

نہ جانے اسد مجھے کیا دکھانا چاہتا تھا۔ بس اور کیا ہو گا۔ وہی جس کا مجھے ڈر تھا، وہ میری نہیں۔ وہ کسی کی بھی نہیں۔ اف ----! میرا دل عجیب خدشات سے بھرا تھا۔

نوکروں نے جب سنا کہ میں اکیلا جا رہا ہوں تو حیران رہ گئے۔ مجھے نوکروں کو دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ سارے اس بھید سے واقف ہیں۔ ان کا زیر لب تبسم مجھے کس قدر کھلتا تھا۔

“ہاں اکیلے ----” میں نے چلا کر کہا۔ “گھوڑا تیار کرو۔”

“گھور گھاٹ سے چل کر میں نے رات کے دس بجے تک پچاس میل کا سفر طے کر لیا۔ اور پھور پور کے ریسٹ ہاؤس میں آدھ گھنٹہ سستا کر آگے چل پڑا۔ اس رات میرے نصیب میں آرام

کہاں تھا۔ دل میں الجھن لگی ہوئی تھ۔ کوئی کلیجہ مل رہا تھا۔

بھور مندر سے کاش گڑھ کو دو راستے جاتے ہیں۔ سڑک سے جاؤ تو کاش گڑھ پینتیس میل سے کم نہیں۔ مگر پگڈنڈی کے راستے بیس میل ہو گا۔ میرا ارادہ تھا کہ آدھی رات تک گھر پہنچ جاؤں گا۔ اس لیے میں نے گھوڑے کو پگڈنڈی کی طرف موڑ دیا۔

یہ پگڈنڈی ایک جھاڑی دار جنگل میں سے نکل گئی ہے۔ اگرچہ راستہ قطعی سنسان ہے۔ لیکن یہاں وہاں کہیں کہیں کسانوں یا سلیٹ کوئری کے مزدوروں کے جھونپڑے ہیں۔ جنگل میں درندے کثرت سے ہیں لیکن اس روز درندوں کا خوف میرے دل میں نام کو نہ تھا۔ دل میں بس یہی لگن تھی۔ نہ جانے آج مجھے کیا دیکھنا ہے؟

رات کس قدر اندھیری تھی۔ آسمان پر ستارے بھی یوں ٹمٹما رہے تھے گویا کاڑھے ہوئے اندھیرے میں دم توڑ رہے ہوں۔ ہوا جھاڑیوں میں کراہ رہی تھی ---- وہ جھاڑیوں کا رکھ گویا زندگی سے بھرپور تھا۔ پگڈنڈی یوں بل کھا رہی، لہرا رہی تھی جیسے کوئی مہیب اژدھا رینگ رہا ہو۔ چاروں طرف سے عجیب و غریب آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی قہقہہ مار رہا تھا۔ کوئی بڑھیا چیخ رہی تھی۔ بچہ رو رہا تھا۔ کوئی گھنگھرو پہنے ناچ رہی تھی۔ عجیب سی بے معنی آوازیں یہاں وہاں، کوئی دیا جھلملاتا۔ پھر وہ شعلہ بن جاتا اور لپک کر ٹہنیوں پر جا بیٹھتا۔ دفعتاً آگ روشن ہو جاتی اور اس کے گرد سائے ناچتے۔ جنگل نہ جانے چیخوں، یا قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ لیکن میں ایک ہی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ گویا گھوڑے پر خود ایک بھوت سوار ہو جس پر کسی ڈائن کا سایہ ہو۔ میری بغل میں ٹارچ تھی۔ بایاں ہاتھ لگام تھامے اور دایاں ہاتھ پستول پر جو میری پیٹی میں لٹک رہا تھا۔

میں یونہی دو تین گھنٹے چلتا رہا۔ دفعتاً پگڈنڈی پر روشنی نمودار ہوئی۔ سامنے ایک بڈھا وردی پہنے لالٹین لیے کھڑا تھا۔ گویا میرا ہی انتظار کر رہا ہو۔ گھوڑا آپ ہی آپ رک گیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ پھنسا۔ اس ویران پگڈنڈی پر آدھی رات کے وقت ایک بڈھا۔ کچھ دیر تک میرے منہ سے بات تک نہ نکل سکی۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

“جمعدار یہاں سے کاش گڑھ کتنی دور ہے؟” میں نے اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے بات کی۔

بڈھے نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے منہ پر اس قدر جھریاں تھیں جیسے مکڑی نے جالا تن رکھا ہو۔ دو بلوریں آنکھیں چمک رہی تھیں۔

بڈھے نے نفی میں سر ہلا دیا اور پھر لالٹین کی طرف دیکھنے لگا۔ “ہائیں یہ راستہ کاش گڑھ کو نہیں جاتا؟” بڈھے نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

عین اس وقت زبردست گرج کی آواز سنائی دی اور ہوا زور سے چلنے لگی۔

"راستہ بھول گئے ---- راستہ بھول گئے۔ راستہ بھول گئے۔" ہر جھاڑی میں اس کی بات گونجنے لگی۔ "بھول گئے۔" بادل گرجا۔

بڈھے نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ پھر انگلی سے مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے ادھر انکھ اٹھائی۔ دیکھتا ہوں کہ پگڈنڈی سے ذرا ہٹ کر ایک قطعہ نما مکان کھڑا ہے۔ مکان کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ کاش گڑھ کے راستے میں کوئی ایسا مکان نہ تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ واقعی میں راستہ بھول چکا ہوں۔

میں گھوڑے سے اترا۔ اور بڈھے کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ وہ مکان ایک وسیع و عریض مگر ویران تانک چندی قلعہ ہے۔ دروازہ پر پتھر میں "الصدف" کندہ تھا۔

"تمہارے آقا ناراض تو نہ ہوں گے؟" میں نے بڈھے سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے سر ہلا کر کہا۔ "خوش۔"

"پھر وہ گھوڑا لے کر چلا گیا اور میں تن تنہا وہاں کھڑا رہ گیا۔ عین اسی وقت بالائی منزل میں ایک کھڑکی کھلی اور ایک بتی روشن ہو گئی۔ کھڑکی میں دبلی پتلی اداس حسینہ آ کھڑی ہوئی گویا کسی کا انتظار کر رہی ہو۔

"آیئے۔" بڈھے نے واپس آ کر مجھے چونکا دیا۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

اب میرے تمام شبہات مٹ چکے تھے۔ بلکہ میں خوش تھا کہ رات کاٹنے کے لیے ایک محفوظ جگہ مل گئی۔ دو ایک اندھیرے کمروں کے بعد زینے سے ہوتے ہوئے، ہم دونوں اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں میں نے حسینہ کو دیکھا تھا۔ وہ ایک وسیع کمرہ تھا جس کا ایک حصہ باریک پردے سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ بڈھا مجھے اس پردے کے پیچھے لے گیا۔ اور پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ کمرے کے بڑے حصے میں ایک مدھم سی بتی جل رہی تھی۔ پلنگ اور پلنگ پوش دونوں پرانی وضع کے تھے مگر تھے دونوں ہی قیمتی۔ بچھونے پر گرد و غبار کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ بڈھے کا آقا مہمان نواز تھا لیکن اسے رکھ رکھاؤ کا طریقہ مطلقاً نہ آتا تھا۔ اس غبار آلود پلنگ پر سونا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے مڑ کر بڈھے کی طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ بڈھے کی اس عجلت پر مجھے حیرانی ہوئی۔ مایوس ہو کر پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ تمام کمرہ گرد آلود تھا۔ گویا برسوں سے کسی نے جھاڑا نہ ہو۔ بستر کے علاوہ کمرے کا سارا فرنیچر بے حد پرانا تھا۔ اگرچہ تھا قیمتی۔ فرش پر کشمیری قالین بچھے ہوئے تھے۔ دو ایک چوکیاں جو یہاں وہاں رکھی تھیں۔ بہت بھاری اور بھدی تھیں پرلے کونے میں لکڑی کا جالی دار پردہ کھڑا تھا۔ جس کے پاس ہی دیوار پر ایک عجیب سی شکل کا کلاک ٹنگا ہوا تھا۔ جس

کے پنڈولم کی رفتار اس قدر سست تھی کہ اس کے چلنے کی آواز تک سنائی نہ دیتی تھی۔ شمع دان پر ایک بڑا گتہ رکھا ہوا تھا جس پر جلی اور خوش خط قلم سے "بیگم آصف الدولہ" لکھا تھا۔ پاس ہی ایک کیلنڈر ٹنگا ہوا تھا جس پر دسمبر کی تاریخ لگی ہوئی تھی۔ دسمبر۔ میں نے حیرانی سے اسے دوبارہ دیکھا۔ اس دن تو جون کی گیارہ تھی۔

بائیں میں نے دیکھا۔ وہی حسینہ چپ چاپ چوکی پر بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر میں 31 دسمبر کو قطعی بھول گیا۔ حسینہ اٹھ بیٹھی۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ کمرے میں مدھم آہ تیرنے لگی۔

اس کی آنکھیں موٹی تھیں اور جسم لچک دار۔ اگرچہ لباس پرانی وضع کا تھا لیکن اس لباس میں وہ کس قدر پیاری لگتی تھی۔ نہ جانے بے چاری کو کیا دکھ تھا کہ اس قدر اداس تھی۔

باہر دروازے پر مدھم دستک سنائی دی۔ "سعیدہ۔"

حسینہ نے اپنا سر اٹھایا۔ "اسفند۔" اس کا چہرہ خوشی سے چمکا۔

ایک خوش رو جوان کمرہ میں داخل ہوا۔ سعیدہ اور وہ دونوں آپس میں لپٹ گئے۔

"تم آ گئے اسفند۔"

"ہاں میں آ گیا۔"

"میں جانتی تھی کہ تم آؤ گے۔"

"تمہارے میاں؟"

"اونہہ۔" وہ گنگنائی۔

"کیوں؟"

"چلے گئے۔"

"اوہ۔" جوان مسکرایا۔

"دونوں چوکی پر بیٹھ گئے۔ جوان نے اپنی مرصع پگڑی اتار کر رکھ دی۔

"سعیدہ۔" جوان نے آہ بھری۔

"اسفند۔"

"اوہ سعیدہ ----"

"کمرہ میں دو مبہم آہیں تیرنے لگیں۔"

"اگر وہ آ گئے تو؟"

"ایسا نہ کہو۔" سعیدہ نے اس کے منہ پر انگلی رکھ دی۔ جوان نے اس کو چوم لیا۔

"تم میری ہو؟"

”ہاں۔“ ایک بار پھر وہ لپٹ گئے۔

”میں حیران بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ وہ پردہ جو ہمارے درمیان حائل تھا۔ اس قدر باریک تھا کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ ان کی معمولی سی جنبش بھی پورے طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ اگر انہوں نے مجھے دیکھ پایا تو ---- اس خیال سے گھبرا گیا۔ نہ جانے وہ سڑی بڈھا مجھے وہاں کیوں بٹھا گیا تھا۔ پھر دفعتاً“ میرا خیال اپنی بیگم کی طرف چلا گیا۔ نہ جانے اس وقت کس سے مل رہی ہو گی۔ اف میرا راستہ بھول جانا کس قیامت کی غلطی تھی۔

پھر سیڑھیوں کی طرف سے آوازیں سنائی دیں۔ مدھم آوازیں۔ اور میرا سلسلہ خیال منقطع ہو گیا۔

”بیگم کہاں ہیں؟“ ایک بارعب مگر مدھم آواز آئی۔

”بڑے کمرے میں حضور۔“

”اس وقت؟“

”جی۔“

”اچھا تم جاؤ۔“

پھر ایک مدھم مگر گہری آہ کی آواز آئی جو کافی دیر تک میرے ارد گرد منڈلاتی رہی۔ پھر کوئی بڑبڑانے لگا۔

”وہ بے آرام ہو گی۔ کل ہو جائے گی اطلاع ہمارے آنے کی۔ لیکن ---- اوہ ----! اس سے دور رہنا کتنا مشکل ہے۔“

پھر بڑے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دونوں چونک پڑے۔ ”کون ہے؟“ وہ بولی۔

”بیگم ----“

”اوہ۔“ کمرہ میں آہ تیرنے لگی۔ دونوں خوف سے بھوت بن گئے۔ سعیدہ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر مسکرا کر جالی دار پردے کی طرف اشارہ کیا۔ اور وہ پردے کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔

”بیگم ہم ہیں۔“ پھر دستک ہوئی۔

سعیدہ نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ ”آپ ----؟ اس وقت ----؟“

”ہاں اس وقت۔ آرام کر رہی تھیں کیا؟“

”آپ آ گئے۔“

”ہاں تم سے دور رہنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے بیگم۔“

”اوہ۔“ کمرہ میں دو آہیں گونجیں۔ مدھم اداس آہیں۔

”یہ پگڑی؟“ آصف الدولہ نے چوکی سے نوجوان کی پگڑی اٹھا کر حیرانی سے کہا۔

”بیگم بے پرواہی سے کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔“

”بیگم ----“

”بیگم ---- کوئی آیا تھا۔؟“

”نہیں تو۔“ وہ وہیں سے بولی۔

”اوہ ----!“

”آصف الدولہ نے کمرہ میں چاروں طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں لکڑی کے پردے پر جم گئیں۔ کمرہ کے ہر کونہ سے آہیں سنائی دینے لگیں۔“

”آپ کو شک ہے کیا؟“ بیگم نے چتون چڑھا کر پوچھا۔

”نہیں تو۔“

”پھر ----؟“

آصف الدولہ پردہ کی طرف بڑھا۔ بیگم نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو..........“

”تو؟“ وہ رک گیا۔

بیگم شمع دان سے وہ گتہ اٹھا لائی جس پر بیگم آصف الدولہ لکھا ہوا تھا اور اسے یوں پھاڑ دیا کہ بیگم اور آصف الدولہ الگ الگ ہو گئے۔ ”تو کہہ کر اس نے وہ ٹکڑے الگ الگ میاں کو دکھا دیئے۔ اور پھر آپ نہایت متانت سے باہر نکل گئی۔ اور باہر دروازہ کی اوٹ میں کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔

”اوہ ----!“

”ہوں۔“ کمرے میں اداس سی آہیں گونجنے لگیں۔ آصف الدولہ بے تابانہ ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

”آؤ۔“ بیگم نے آہستہ سے پکارا۔

”ہوں۔“ وہ چونک پڑا۔ اور پھر اس کی چوکی پر بیٹھ گیا جو اس کونے میں اندھیرے میں پڑی تھی۔ اس کے بعد ایک عرصے تک خاموشی چھائی رہی۔

پھر وہ بیٹھا بیٹھا بڑبڑانے لگا۔ ”اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو ----؟“

”اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو ----؟“ وہ کمرہ میں ہلکی ہلکی مدھم آوازیں سنائی دیں۔ گویا وہ تانین اور کلاک باری باری اسے دھرا رہے تھے۔

“اگر وہاں کوئی نہ ہوا تو-----” اس کا چہرہ ایک ساعت کے لیے نہ جانے خوف یا غصہ سے چمکا۔ وہ اٹھ بیٹھا لیکن پھر کچھ سوچ کر چپ چاپ آہستہ سے بیٹھ گیا۔

“ہوں-----” وہ بڑبڑایا جیسے کوئی خوف ناک فیصلہ کر چکا ہو۔

“اب آ بھی جاؤ۔” بیگم باہر سے بولی۔ “آؤ بھی نا۔”

نوجوان لکڑی کے پردے سے باہر نکل آیا۔ بیگم نے اسے دیکھا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔

آصف الدولہ نے کنکھیوں سے اسے دیکھا۔ لیکن سر جھکائے رکھا۔ پھر وہ بڑبڑایا۔

“کوئی ہے----- خدمت گار ہے۔ خدمت گار۔ جاؤ ہمارے لیے حمام تیار کرو اور بیگم کو یہاں بھیج دو۔” ان لفظوں کو کہتے ہوئے آصف الدولہ کے ماتھے پر کرب کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ اور اس کی روح میں ڈوب گئی۔ ایک ساعت کے لیے اس کا چہرہ اذیت سے بھیانک ہو گیا۔

نوجوان پہلے تو ڈرا اور حیرانی سے ٹھٹھکا لیکن پھر جلدی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ میں پہنچ کر اس نے بیگم کی طرف پر معنی نگاہ ڈالی لیکن سعیدہ نے منہ موڑ لیا اور اندر آ گئی۔

کمرہ میں عرصہ تک خاموشی چھائی رہی۔ کراہ زدہ خاموشی۔

“تم آ گئیں سعیدہ۔” آصف شوق سے اٹھ بیٹھا۔

بیگم کی آواز میں شرمساری کی جھلک تھی۔

“مغموم کیوں ہو۔ آؤ یہاں۔” آصف بولا۔ “بیگم تم خاموش کیوں ہو گئیں؟”

“میں----- میں..........” پریشانی کی وجہ سے بیگم کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

کمرہ میں ایک قہقہہ گونجا۔ “یہ میں----- میں..........” کیا ہوا۔ کیا مذاق کر رہی ہو سعیدہ؟”

“مجھے افسوس ہے۔” سعیدہ گنگنائی۔

“الٹا ہم شرمندہ ہیں کہ ہم نے تم پر شک کیا۔ ہمیں معاف کر دو سعیدہ۔” اور وہ دونوں آپس میں لپٹ گئے۔

انہیں تخلئے میں دیکھنا مجھے گوارہ نہ تھا۔ میں نے جھٹ آنکھیں نیچی کر لیں۔ لیکن رہ رہ کر مجھے خیال آتا کہ وہ عورت کس قدر چالاک تھی اور وہ مرد سب کچھ جاننے کے باوجود----- سارا قصہ ہی عجیب تھا۔

میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ انگیٹھی پر ایک کی بجائے دو دیئے جل رہے تھے۔ دونوں شعلے ابھر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے وہ شعلے بہت بلند ہو گئے اور اوپر جا کر یوں خم کھا کر مل گئے کہ ایک محراب بن گئی۔

ڈر کے مارے میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لیکن حلق میں آواز نہ تھی۔ میں بھاگا اور نہ جانے کیسے ٹھوکریں کھاتا ہوا سیڑھیوں میں جا پہنچا۔ وہاں وہی بڈھا لالٹین اٹھائے سڑک کی طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ دروازہ پر میرا گھوڑا کھڑا تھا۔

“چلیئے۔” اس نے مجھے گھوڑا پکڑاتے ہوئے کہا۔ اور ہم دونوں چپ چاپ پگڈنڈی کی طرف چل دیئے۔

میرے دائیں بائیں چاروں طرف سے مدھم اور مبہم آوازیں آ رہی تھیں۔

“اب ہم آزاد ہیں۔ بیگم آزاد ہیں----- ہم چاہتے ہیں کہ سب کو آزاد کرا دیں۔ سب قیدیوں کو آزاد کر دو۔ قیدیوں کو آزاد کر دو۔”

“پگڈنڈی پر آصف الدولہ کھڑا گنگنا رہا تھا۔” سب قیدیوں کو آزاد کر دو۔ قیدیوں کو۔ تم آزاد ہو----- آزاد۔” خوف کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ “بھوت۔”

“بھوت۔” بڈھا چلایا اور اپنی بلوریں آنکھیں میری طرف اٹھائیں۔ اس کا چہرہ ڈر سے بھیانک ہو گیا۔ اور وہ کانپ کانپ کر گر پڑا۔ لالٹین گل ہو گئی۔

“میں نے فوراً ٹارچ جلائی۔ پگڈنڈی ویران پڑی تھی۔ وہاں نہ بڈھا تھا اور نہ اس کی لالٹین۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اپنے گرد چاروں طرف پھینکی۔ ارد گرد کسی مکان کا نام و نشان نہ تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، جھاڑیوں کا ایک وسیع پھیلاؤ دکھائی دے رہا تھا۔

----- سامنے دور دو ایک میل پر کاش گڑھ کی مسجد کے گنبد صبح کے دھندلکے میں جھلملا رہے تھے۔

“آزاد-----” کوئی موذن مینار پر کھڑا چلا رہا تھا۔ “آزاد۔

نہ جانے کیا ہوا مجھے۔ دفعتاً میرے دل کا ڈر دور ہو گیا۔ اطمینان سا پیدا ہو گیا۔ ایسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ تمام زنجیریں کٹ گئی ہوں جو مجھے جکڑے ہوئے تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ کاش گڑھ کو جانا بے کار ہے۔ نہ جانے کیوں۔ حقیقت حال جاننے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ میں نے گھوڑے کا منہ واپس بھور گھاٹ کی طرف موڑ دیا اور اسے ایڑ لگا دی۔

کئی ایک سال کے بعد مجھے پہلی مرتبہ کشمیر جانا پڑا۔ پہاڑیوں میں پھرتے پھراتے ایک دن میں جھن وادی کی طرف جا نکلا۔ راہ میں ایک ویران سے دروازے پر جو نظر پڑی تو میں ٹھٹھکا۔ دروازے کے پتھر پر “الصدف” کندہ تھا۔

میں نے مکان کی طرف دیکھا۔ اف----- میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ نکتائی گویا

گلے میں پھندہ بن گئی۔ بالکل وہی۔ وہی الصدف جہاں میں نے وہ رات بسر کی تھی۔ وہی سیڑھیاں‘ وہی دروازہ اور چوبارہ۔ وہی ”الصدف“ جو اس رات بھور مندر سے کاش گڑھ جانے والی ویران پگڈنڈی پر آگیا تھا۔

وہ قلعہ نما مکان ویران پڑا تھا۔ صرف چار دیواری کھڑی تھی۔ چھتیں بوسیدہ ہو کر گر گئی تھیں۔

”یہ مکان کس کا ہے؟“ میں نے ایک بیرے سے پوچھا جو ملحقہ کوارٹر میں رہتا تھا۔

”معلوم نہیں جناب۔“ وہ بولا۔ ”یہ تو برسوں سے یونہی ویران پڑا ہے۔“

عین اس وقت وہ بڈھا عیسائی وہاں آگیا جو پڑوس میں رہتا تھا۔

”یہ مکان؟“ اس نے کھانستے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھ میں چمک لہرائی۔

”یہاں یہی۔“

”یہ مکان کسی نواب صاحب کا تھا۔“

”اب کیا اس کا کوئی وارث نہیں؟“

”اونہوں۔“ اس نے سر ہلا کر کہا۔ ”مکان پر بجلی کوندی اور سب مر گئے۔ ایک قیامت بپا ہو گئی تھی یہاں اس روز۔ کوئی ساٹھ سال ہوئے ہوں گے۔ صاحب ساٹھ سال۔ میرا مکان پاس ہی ہے وہاں۔ ہاں وہ رات 31 دسمبر کی رات تھی۔ ہم نئے سال کی خوشی میں لگے ہوئے تھے کہ نواب صاحب کا سارا کنبہ تباہ ہو گیا۔“

”تباہ ہو گیا۔“ میں نے دہرایا۔

”ہاں جب سے یہ محل نما مکان ویران پڑا ہے۔“

صاحب ساری رات نہ جانے کیا کیا چیخ پکار سنائی دیتی ہے۔ کبھی کوئی آزاد آزاد چیختا ہے۔ کبھی بیگم بیگم اور کبھی قیدیوں کو آزاد کر دو۔“ بیرا بولا۔

”اس نواب کا کیا نام تھا؟ بڑے میاں تمہیں یاد ہے کیا؟“ میں نے شوق سے مبہوت ہو کر پوچھا۔

ایک منٹ کے لے بڈھا خاموش رہا۔

”ہاں ایسا ہی تھا کچھ۔ نواب دولا---- آصف دولا۔“

”آصف الدولہ۔“ حیرانی سے میری چیخ نکل گئی۔

”آزاد کر دو۔“ مکان سے کوئی چمگادڑ چیختی ہوئی اڑی---- ”آزاد کر دو۔“

---

# راں ڑیاں

”ہائیں----!“ پھول دار لہنگے والے نے مونچھیں مروڑتے ہوئے کہا۔ ”سچ؟“

”ہاں۔“ بڈھے نے داڑھی جھاڑ کر کہا۔ ”سب کار کھ رکھاؤ اکیلی کرے ہے وہ بدراں۔“

”گھر میں کوئی نہیں کیا؟“

”سبھی کھیت پر رہیں ہیں۔ بھائی‘ باپو چاچا---- ساری بستی میں چار ایک مرد ہوں گے۔ ویسے تو آتے جاتے رہتے ہیں ہفتے میں ایک بار۔“

”اچھا۔“ نوجوان ہنسا---- ”مالوم ہوتا ہے انہیں کوئی ملا نہیں۔“

بڈھا قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”میاں یہ راں ڑیاں ہے---- راں ڑیاں سمجھے----؟ وہ پھر ہنسنے لگا۔ اپنے چودھری کا گھر سونے سے بھرا ہے۔ پریوں سمجھو جیسے مندر میں موورتی۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ لو وہ رہا کنواں۔ درختوں کے اس جھنڈ میں ہے۔ پی لو پانی جا کر اس جھنڈ میں اللہ بیلی۔ یہ کہہ کر بڈھا ڈنڈی پر اتر گیا۔

”بدراں----!“ نوجوان مسکرا دیا۔ لہنگا سنوار کر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے زیر لب بولا۔ ”راں ڑیاں کی بدراں۔“

”راں ڑیاں۔ ہو اور اں ڑیاں آں آں۔“

دور کہیں سے پہاڑی کی تان سنائی دی۔

”جس جاں ڑیاں‘ اوس نہ ماں ڑیاں۔ جس ماں ڑیاں۔ ان جانڑیاں۔“

”راں ڑیاں۔ ہو اور اں ڑیاں۔ آں آں۔“

چناب کے شمال مغرب میں چلے جاؤ تو پتن وال سے آگے درختوں کی تعداد کم ہو جاتی اور قد چھوٹا۔ درختوں کے جھنڈ اور گاؤں سڑک سڑک کے دور ہٹتے جاتے ہیں۔ زمین پتھریلی ہوتی جاتی ہے اور مٹی کا رنگ لاکھا۔ یہ علاقہ پچھی کا ہے جس کے عین وسط میں راں ڑیاں کا گاؤں آباد ہے۔

گاؤں کے اردگرد خودرو گلابڑی کی جھاڑیاں دیکھ کر یقین نہیں پڑتا کہ اس زمین میں کاشت کرنے کے لیے اس قدر مشقت کی ضرورت پڑتی ہو گی، لیکن وہاں کے مردوں کو دیکھ کر اجنبی راہ گیر ایک ساعت کے لیے رک جاتے ہیں۔ اونچا لمبا قد، ابھری چھاتی، فراخ شانے، پٹھوں میں موروثی جدوجہد کا تناؤ، آنکھ میں ردعمل کی جھلک۔۔۔۔ شاید کامیابی۔ اور عورتوں کو دیکھ کر سبھی دیکھتے انہیں۔ چونکہ وہ پردہ وردہ نہیں جانتیں، لیکن وہی تناؤ، قد و قامت۔ شاہانہ چال۔ نڈر آنکھیں جو شرما کر کسی کو دعوت دینے کے فن سے بیگانہ ہیں اور بھرا بھرا امیار جسم گھبرا کر یا سمٹ کر راہ گیر کی توجہ اکسانے سے بے نیاز ہے ان کی آنکھ چھلکی ہوئی ہونے کے باوجود چھلکتی نہیں۔ سرخ ہونے کے باوجود گال شرم سے تمتماتے نہیں۔ شاید راں ڑیاں کے مردوں نے ان کے نسوانی پہلو کو عریاں دیکھا ہو۔ لیکن اجنبی۔۔۔۔ اجنبی کو تو وہ یوں دیکھتی ہیں جیسے سڑک پر گڑا ہوا کھمبا۔ شاید اسی لیے اس علاقے کی عورتوں کو راں ڑیاں کہتے ہیں۔ بہرحال پنجھی کی عورتیں واقعی راں ڑیاں ہیں اور راں ڑیاں کی ہر عورت ملکہ۔

وہ سرمہ، سیندور اور اخروٹ کے چھلکے کی شوقین ہیں۔ رنگ دار کپڑوں کی دلدادہ اور خوشبو۔۔۔۔ خوشبو سے تو انہیں عشق ہے عشق۔ حتیٰ کہ لونگ ابالے پانی بغیر نہاتی نہیں۔ شاید اسی لیے انہیں راں ڑیاں کہا جاتا ہے۔ لیکن اس نفیس مزاجی کے باوجود ان کے انداز میں نسائی نمائش نہیں، دعوت نہیں۔ جیسے مندر ہو، مورتی ہو، پوجا کا سامان ہو، سیس نوانے کی آگیا نہ ہو۔

شاید ان کا "عورت" کو چھپائے رکھنا تلاش پر مائل کرنے کا انوکھا انداز ہو۔ لیکن راں ڑیاں کے مرد متلاشی دکھائی نہیں دیتے۔ ان میں جستجو کی بے تابی نہیں بلکہ پا لینے کا نشہ ہے۔ وہ عموماً اپنی زمین پر رہتی ہیں۔ انہیں اس پتھریلی زمین کو تسخیر کرنے کا شوق ہے اور اپنی رنگین مگر سنگین راں ڑیاں پر بھروسہ ہے۔

قاسو پہلی مرتبہ اس علاقہ میں آیا تھا۔ ویسے تو بیلی پر سوار ہو کر رات رات میں سو سو میل کا سفر کرنا اس کا شغل تھا، لیکن عموماً پو پھوٹنے سے پہلے وہ اپنے گاؤں میں واپس پہنچ جایا کرتا تھا۔ جاکھڑاں کے گردونواح میں کون تھا جو قاسو اور بیلی کو نہ جانتا تھا۔ لیکن وہ سب اس کے متعلق اظہار خیال کرنے سے گریز کرتے تھے۔ بہرحال ہر کوئی کوشش کرتا کہ قاسو کے بارے لاعلمی ظاہر کرے۔ آدھی رات کو لوگ بیلی کا ہنہانا سنتے، ٹھٹھک جاتے اور پھر معاً بات ٹالنے کے لیے کوئی موضوع چھیڑ دیتے۔ پو پھٹتے وقت ہل چلاتے ہوئے کسان قاسو کی تان سن پاتے تو دوسری جانب منہ موڑ کر شدت سے کام میں مصروف ہو جاتے۔ "تاتا۔۔۔۔ تاتا" چلتے ہوئے بیلوں کو ہانکنا شروع کر دیتے۔ عورتیں معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسری کی طرف دیکھتی ڈر کر دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتیں اور

بالاخر مسکرا کر دہی بلوہنے میں مصروف ہو جاتیں۔

اس روز قاسو اور بیلی نوسار کی جانب آئے۔ بھیلی پورہ کے پاس جہاں سے نوسار کو ڈنڈی نکل جاتی ہے، قاسو نے بیلی کو موڑنے کے لیے لگام کھینچی لیکن خلاف معمول بیلی اڑ کر کھڑا ہو گیا۔ قاسو نے دوسری مرتبہ اسے موڑا تو وہ بدک کر رک گیا۔ قاسو نے غصے میں ایڑ لگائی۔ تو بھی اپنی جگہ سے نہ سرکا۔ پھر نہ جانے کیا خیال آیا۔ قاسو نے اسے گردن پر تھپکی دی اور بولا۔ "اچھا بیلیا۔ تیری مرضی نہیں تو نہ سہی۔ آج قاسو بیلی کی مرضی پر چلے گا۔" یہ کہہ کر اس نے لگام ہاتھ سے پھینک دی اور بیلی ہوا ہو گیا۔ اندھیرے میں قاسو کو معلوم نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ لیکن اسے یقین تھا کہ بیلی اسے واپس لے آئے گا۔ اس لیے وہ بے پروائی سے بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ وہ راں ڑیاں آ پہنچے۔ بیلی رک گیا اور قاسو نے پگڑی سر تلے رکھی اور سو گیا۔ شام کو وہ جاگا تو اسے بڑی شدت کی پیاس لگی تھی۔ پانی پینے کے لیے خشک درختوں کے اس ویران جھنڈ سے باہر نکلا تو اس بڈھے سے ملاقات ہو گئی۔

"راں ڑیاں۔۔۔۔ ہو راں ڑیاں۔"

"کن جاں ڑیاں نے کن ماں ڑیاں۔"

پانی پینے کے بعد مونچھ مروڑتا ہوا وہ گاؤں کی طرف چل دیا۔

قاسو ڈیوڑھی سے ہوتا ہوا ایک کھلے صحن میں پہنچا۔ "چودھری۔" اس نے آواز دی۔ "کون ہے؟" بدراں نے سرسری طور پر آواز دی اور چرخہ کاتنے میں لگی رہی۔ قاسو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سفید سفید بھرے ہوئے ہاتھ میں تاگا اور حرکت میں بے نام سی لچک۔۔۔۔ نسائیت کا پتہ دے رہے تھے۔ سر اٹھائے بغیر بدراں نے دوپٹے کو سرکا کر ماتھا ڈھانپ لیا اور بولی۔ "کون ہے؟"

"پیاس لگی ہے۔" قاسو دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

وہ اٹھ بیٹھی۔ "لسی پیو گے ویر یا دودھ؟"

"لسی۔" قاسو نے اس کے ہاتھ کی چوڑیوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ ویر۔" بدراں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پیڑھی ادھر سرکا دی اور گڑوا اٹھا چاٹی کے قریب جا بیٹھی۔ اس نے اتنی بڑی چاٹی کو یوں اٹھا لیا گویا وہ تنکوں کی بنی ہو۔ "میٹھا گراؤں یا نمک۔ کیوں ویر؟" "نہیں نہیں۔ نمک نہیں۔" وہ چونک کر بولا۔ اجنبی کی آواز میں اضطراب کی جھلک پا کر اس نے آنکھ اٹھا کر پہلی مرتبہ غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس بات پر بدراں کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی۔ "میٹھا ڈال دوں؟" وہ منہ موڑ کر بولی۔۔۔ "نہیں۔" قاسو نے جواب دیا۔ "ایسے ہی دے دے۔" بدراں نے منہ موڑے بغیر گڑوا ادھر بڑھا دیا۔ دو ایک ساعت وہ یونہی گڑوا لیے کھڑی رہی۔ لیکن اجنبی نے گڑوا نہ پکڑا۔ بدراں نے مڑ کر دیکھا، وہ حریص

نگاہوں سے اس کے کڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ ماتھے کی تیوری اتر گئی۔ ”لے ویر لسی۔“ وہ بولی۔ گڑوا دے کر وہ اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور آنکھ بچا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ گڑوے کے کنارے کی اوٹ لے کر مکان کا جائزہ لے رہا تھا۔

”پردیسی ہو ویر؟“ بدراں نے سرسری طور پر پوچھا۔

”کہیں دور جانا ہے؟“

”نہیں، نہیں۔ ادھر ہی کام تھا۔“

”راں ڑیاں میں“

”ہاں ہاں۔ یہاں پاس ہی ادھر۔“

”اب روٹی کھا کر ہی جانا ویر۔“

”روٹی---- نہیں نہیں۔ مجھے جلدی ہے۔“ غٹاغٹ لسی پی کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ”یہ لو۔ اس نے گڑوا بڑھایا۔ وہ بیٹھی رہی۔ غالباً“ وہ اسے دعوت دے رہی تھی کہ گڑوا زمین پر رکھ دے لیکن اسے منتظر دیکھ کر بدراں کو اٹھنا ہی پڑا۔

گڑوا پکڑتے ہوئے اس نے آخری مرتبہ اس کے کڑوں پر نگاہ ڈالی۔

”پسند ہیں ویر؟“ وہ خشک لہجے میں بولی۔

”کیا؟“ وہ چونکا۔

وہ کڑے اتارنے لگی۔ ”یہ کڑے---- میری طرف سے اپنی گھر والی کو دے دینا۔ میری بھابھی کو۔“

وہ کھکھلا کر ہنس پڑا۔ ”تکلیف نہ کرو۔ کڑوں کی کیا کمی ہے۔ گھر والی بھی ہو۔“

”کمی نہیں ویر تو اس کام کا فائدہ؟“

”کون سا کام؟“

”میری مانو تو یہ کام چھوڑ دو۔“

وہ پھر ہنسا۔ ”ہم باکھڑاں والے دان نہیں لیتے۔ ہاتھ کا کمایا کھاتے ہیں۔“ اس نے بازو دکھاتے ہوئے کہا۔

”اسے ہاتھ کا کمایا نہیں کہتے ویر۔“

”اپنا اپنا کام ہے۔ اپنی اپنی بولی۔ تجھے زیادہ فکر ہے تو لا پلا دے نمک والی لسی۔“ اس نے معنی خیز انداز سے کہا۔ ”پھر تو تسلی ہو جائے گی۔“

بدراں کی آنکھیں انگارہ ہو گئیں۔ ”میں راں ڑاں ہوں ویر۔ ہم تسلی نہیں چاہتے، تسلی

دیتے ہیں ہم۔ میں نے تجھے ویر کہا ہے، میں پھر بھی لحاظ کروں گی تیرا راں ڑیاں میں۔ اور کسی نے تجھے ویر نہیں کہا۔ ٹھہر ذرا---- ادھر آ۔“ اس نے قاسو کو للکارا۔ وہ ایک بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ بدراں نے صندوق کھولا۔ ”یہ دیکھ---- یہ چوڑیاں۔ چوک۔ ہنسلی تعویذ۔“ اور اس نے کڑے اور ہار اتار کر وہیں ڈھیر کر دیئے۔ پھر جلدی جلدی قفل لگا چابی طاقچہ میں رکھ کر بولی۔ ”یہاں ہو گی چابی۔ اندر والے صندوق سب کھلے ہیں۔ دروازے کھلے ہوں گے۔ میں وہاں سوتی ہوں۔ اس پلنگ پر---- اکیلی جب تیرا جی چاہے۔ آ جائیو ویر۔ صرف جاتے ہوئے مجھے جگا دینا۔ پھر اگر تو گٹھڑی باہر لے جائے تو تیری اور اگر تو یہاں آنے سے پہلے کسی اور جگہ یہ کام کرے تو اپنے باپ کا نہ ہو گا۔ سنا تو نے؟“

”عورت کے ساتھ شرط باندھوں۔“ وہ ہنسا۔

”عورت------“ وہ ہنسی۔ ”یہ راں ڑیاں ہے ویر۔ راں ڑیاں۔“

”راں ڑیاں---- ہو راں ڑیاں۔“

دور کسی کے گانے کی آواز آئی۔ وہ چونکا۔ جیسے کسی نے اس کی مردانگی کو للکارا ہو۔

بدراں نے سر اٹھایا اور یوں تن کر کھڑی ہو گئی جیسے لڑائی کا ڈھول سن کر کوئی سورما۔ ”جب تیرا جی چاہے آ جائیو۔“

دیوار پھاندنے سے پہلے اسے خیال آیا۔ بھلا آزماؤں تو سہی۔ کیا وہ سچ کہتی تھی۔ کیا واقعی دروازہ کھلا ہے اور وہ دروازے کی طرف چلا۔

اف کس قدر اندھیری ہے یہ رات۔ اس نے سوچا۔ آخر عورت ہے نا۔ مسکرا کر اس نے پٹ پر انگلی کا دباؤ دیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ہوں---- کتا ہو گا۔ کتا----! وہ پھر مسکرایا اور اندر داخل ہو گیا۔ آہٹ کرنے کے باوجود کوئی آواز نہ آئی۔ اونہوں---- اس نے سر ہلایا۔ طاقچہ پر دیا ٹمٹما رہا تھا۔ پلنگ پر چادر لپیٹے وہ سو رہی تھی۔ اس کے علاوہ مکان خالی پڑا تھا۔ دیئے کے پاس صندوق کی چابی دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی۔

گٹھری باندھ کر وہ بدراں کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔ فضول بے آرام کرنا---- اس نے سوچا۔ جگا بھی دوں تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ معاً“ اسے خیال آیا کہ وہ کس قدر نڈر تھی۔ ورنہ یوں بے فکر گہری نیند میں پڑے رہنا آسان کام نہیں۔

”قاسو نے بدراں کی بائیں کلائی پکڑ کر اسے ہلایا۔ بدراں نے کروٹ بدلی لیکن اس کی آنکھ نہ کھلی۔ دوبارہ قاسو کے جھنجھوڑنے پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک ساعت کے لیے جوں کی توں پڑی رہی۔ پھر اس نے لپک کر دائیں ہاتھ سے قاسو کی کلائی پکڑ لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بولی۔ ”اب اگر

تو کلائی چھڑوالے تو وہ گھڑی تیری ہے۔"

وہ ہنس پڑا اور بے پرواہی سے ہاتھ چھڑانے کے لیے جھٹکا دیا۔ لیکن بدراں کی گرفت اور بھی آہنی ہو گئی۔ ابھی وہ دوسرا جھٹکا دینے کی سوچ رہا تھا کہ بدراں نے کلائی مروڑ کر اسے چارپائی پر گرا لیا۔ "آرام سے بیٹھ کر ویر۔" وہ بولی۔ "لے اب چھڑا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے کلائی پکڑ کر کہا۔

قاسو غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ لیکن رراں کی گرفت بلا کی تھی۔

ایک بار پھر وہ چلائی۔ قاسو نے دوسرے ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کی اس بات پر وہ بھوکی شیرنی کی طرح اٹھ بیٹھی۔ "افسوس ہے کہ میں نے تجھے ویر کہا ہے ورنہ.........." اس نے قاسو کو دھکا دیا اھروہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔

کچھ دیر کے لیے وہ خاموش کھڑا رہا۔

"میں تو تجھے آزما رہا تھا۔" قاسو نے اپنا انداز بدلا۔

"تو آزما دیکھا۔" وہ اکڑ کر بولی۔

"تو نے مجھے ویر کہا ہے۔" وہ مسکرایا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "ورنہ.........."

بیلی کے ہنہنانے کی آواز سن کر وہ چونکا۔ "اچھا میں جاتا ہوں۔"

"قول دے پہلے۔" وہ مسکرائی۔

"اونہوں----" اس نے سر ہلایا۔ "مجھ سے نبھایا نہ جائے گا۔"

"اچھا۔" وہ سوچ کر بولی۔ "نہ سہی۔"

"ادھر نہ آؤں گا کبھی راں ڑیاں کو۔"

"تو دودھ پی کر جا۔"

"ضروری ہے کیا؟"

"ہاں۔" وہ بولی۔ "یا قول دے یا دودھ پی کر جا۔ یہاں کی ریت ہے۔"

"اچھا۔" وہ بیٹھ گیا۔ "لا دودھ۔"

بدراں اٹھ کر کاڑھنی کی طرف چلی۔ ڈول میں دودھ ڈالا۔ پھر اندر جا کر شکر تلاش کرنے لگی۔ شکر کے علاوہ وہ دودھ میں سبز سا سفوف گھول کر لے آئی۔

قاسو نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

"اونہوں۔ زہر نہیں۔" وہ بولی۔ "ویر کو زہر نہیں دیتے۔"

"اچھا راں ڑی۔" وہ بولا۔ "جو چاہے دے دے، اب کیا ہے۔ اور غٹاغٹ پی گیا اور پھر۔

"اللہ بیلی۔" کہہ کر وہ صحن کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

جاکھڑاں کے لوگ چند دن تو خاموش رہے۔ پھر دبی دبی باتیں شروع ہو گئیں۔ کسی نے کہا۔ "میں کہتی ہوں تم نے سنا کچھ؟ اب تو بیلی ساری ساری رات گلیوں میں ہنہناتا رہتا ہے۔" کوئی بولی۔ "اچھا نہ ہو گا۔ اللہ مارا۔" تیسری نے کہا۔ "اوں----اچھا نہ ہو گا۔ بھلا چنگا پھرتا ہے۔"

رات کے وقت ہر آہٹ پر کسانوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ پھر کوئی بول اٹھتا۔ "اوہ----یہ تو بگی چلا رہی ہے۔ صبح سویرے پو پھوٹنے کے وقت وہ متوقع نظروں سے دیکھتے اور پھر دارے میں جا کر چہ مگوئیاں کرتے۔ "چھوڑ دیا اپنا کام۔ بھئی اللہ ہی جانے۔ کہتے ہیں رات بھر پیر جیلانی کے روضہ پر سویا تھا۔" "بس یہ تو پتے کی کہی تو نے۔ اجی بڑی کرامت والے ہیں وہ۔

ہر جگہ قاسو کی بات چھڑ جاتی۔ اس ہر بات میں قاسو کی اس تبدیلی کا ذکر چل نکلتا۔ قاسو کے متعلق پہلے جس قدر چپ رہتے تھے، وہ اب اسی قدر زیادہ باتیں کرنے لگے۔

قاسو کا بھائی ماجو آپ حیران تھا۔ اگرچہ قاسو کے دھندے کے حق میں نہ تھا مگر اب اس کے اسے چھوڑ دینے پر یوں چڑ گیا جیسے اسے قاسو کی وہ تبدیلی اچھی نہ لگی ہو۔ یا شاید اسے یہ شکایت تھی کہ قاسو نے اپنے بھائی سے ساری حقیقت کہہ دی۔

"لیکن آخر تھا کیا اس دودھ میں؟" ماجو نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" قاسو نے آہ بھر کر کہا۔ "جب سے بدن میں جان نہیں، ہمت نہیں رہی۔

"ہمت نہیں رہی؟"

"ہاں جیسے چوڑیاں پہن لی ہوں میں نے۔" وہ زہر خند ہنسی ہنسا۔

"کیوں عورت بن گئے ہو کیا؟"

"اس سے بھی بدتر۔" قاسو نے شرم سے سر جھکا لیا۔

"قاسو----؟" ماجو حقیقت حال جان کر چلایا۔

"ہاں ماجو۔" قاسو یوں خاموش ہو گیا جیسے کسی جرم کا اقبال کر لیا ہو۔

"لیکن---- لیکن----کیا تم نے اس پر ہاتھ.........."

"اونہوں۔" وہ بولا۔ "میں نے اپنی ہار تک مان لی۔ میں نے اسے بہن کہا۔"

"پر کیوں؟"

"پتہ نہیں۔"

"تعجب ہے۔ تمہیں ایسا بنا دینے سے اسے کیا ملا۔ حرام زادی---- میں----

میں.........” دفعتاً” وہ رک گیا اور خاموش ہو رہا۔

اس وقت ماجو کے دل میں ایک خاموش جذبہ پرورش پانے لگا۔ کوئی ارادہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

رات بھر وہ سو نہ سکا۔ دن بھر کھیت پر کچھ کام نہ کر سکا۔ پھر وہ مادو قصائی کے پاس جا بیٹھا اور تفریحاً” ایک چھری تیز کرنے لگا اور گھر آتے ہوئے ان جانے میں وہ چھری ہاتھ میں لیے چلا آیا۔ “اونہوں----” وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ “یہ چھری۔” اس نے چھری کی طرف دیکھ کر کہا۔ “یہ چھری کام نہ آئے گی۔ اور وہ مادو کی طرف لوٹا۔ چھری لوٹانے گیا تو مادو سے پوچھنے لگا۔ “مادو کوئی ایسی چیز ہے کیا جو کسی کو بے ہوش کر دے۔”

“کیوں؟” مادو نے پوچھا۔

“ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔”

“صمدو کے پاس ہے۔ صمدو نائی کے پاس۔” مادو بولا۔ “فوراً” بے ہوش ہو جائے، بس سونگھنے کی دیر ہے۔” کیا چیز ہے؟ اس نے پوچھا۔ “پتہ نہیں۔” مادو نے کہا۔ “سرکاری چیز ہے کوئی۔ دواخانے کی ڈبیا میں بند کر کے رکھتا ہے صمدو۔”

رات کو چارپائی پر پڑے پڑے نہ جانے وہ کیا کیا سوچتا رہا۔ اور پھر خواب میں ایک اونچی لمبی عورت بے ہوش پڑی تھی۔ اور وہ غصے میں اپنے بھائی قاسو سے کہہ رہا تھا۔ “یہی ہے نا وہ؟”

اور قاسو منہ کھولے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ جاگ اٹھا۔ “جاؤں گا---- ضرور جاؤں گا۔”

اندھیرے میں دبے پاؤں سرک سرک کر وہ بدراں کے مکان کے دالان تک جا پہنچا۔ سامنے پلنگ پر کوئی سویا ہوا تھا۔ اس نے ایک بڑی سی ڈبیا لہنگے کے پلہ سے نکالی۔ اسے مضبوطی سے تھام کر وہ پھر چوپائے کی طرح چلنے لگا۔ چارپائی کے پاس پہنچا تو بدراں نے کروٹ لی۔ ماجو چارپائی تلے چھپ گیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے سر باہر نکالا۔ بدراں دائیں پہلو پر یوں لیٹی تھی کہ اس کی ناک چارپائی کے سرے کے قریب تھی۔ وہ سرک کر قریب ہو بیٹھا اور ڈبیہ کھولنے لگا۔ بیشتر اس کے کہ وہ ڈھکنا کھولتا۔ اس کے دونوں ہاتھ بدراں کی گرفت میں تھے۔

“ہوں----” وہ اٹھ بیٹھی۔ “مجھے معلوم تھا تو آئے گا۔” لیکن ماجو کے چہرے کی طرف دیکھ کر ٹھٹھکی۔ “تو---- تو کون ہے؟” وہ بولی۔ “اونہوں----” اسے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ کر وہ گنگنائی۔ “چوری کرنے آیا تھا کیا۔ کر لے چوری۔ کس لیے آیا تھا تو؟” بدراں نے پوچھا۔ ماجو کو جوش آ گیا۔ بولا۔ “تیرے لیے۔”

“میرے لیے؟” وہ حیران ہو گئی۔

“ہاں تجھے لینے کے لیے۔” اس نے دانت پیسے۔

“تو۔” بدراں نے نفرت سے ہونٹ نکالے۔ “اپنی جان کی خیر نہیں کیا؟”

“اونہوں۔” ماجو نے نفی میں سر ہلا دیا۔ “ایک روز مرنا تو ہے ہی۔”

“حرام موت۔”

“نہیں حرام کیوں۔ نہ چلے گی میرے ساتھ تو تجھے مار ڈالوں گا۔ آپ مر جاؤں گا۔”

“بڑا بہادر ہے تو۔ پر یہ ڈبیا کیا ہے---- ہوں۔”

“کچھ ہے ہی نا۔”

“زہر ہے کیا۔”          “زہر----؟” وہ مسکرایا۔

“تو پھر۔” وہ بولی۔

“دوائی ہے اور کیا۔”

“دوائی؟”

“ہاں تجھے بے ہوش کرنے کو---- تو سونگھ لیتی تو میں کب سے تجھے اٹھا کر چل دیتا۔”

“اچھا۔ مجھے بے ہوش کر کے لے جانا تھا تو نے۔ بڑا بہادر مرد ہے۔” بدراں نے اسے دیوار پر دے پٹخا۔ ماجو کھسیانا ہو کر اٹھ بیٹھا۔

“بس یہی ہمت ہے تیری۔ گھر سے راں ڑی لینے آیا تھا۔ ہمت بھی ہے تجھ میں۔”

“نہ سہی۔” وہ بولا۔ “خواہش تو ہے۔”

“تیرے جیسے تو ہمارے کمین ہیں کمین۔” وہ غرائی۔

“چل دفعہ ہو۔” وہ بولی۔ “دور ہو جا یہاں سے۔ جاتا ہے یا نہیں۔” بدراں نے اسے پھر دھکا دیا۔ اور وہ دہلیز پر گر پڑا۔ منہ پر خراش آئی لیکن جلد ہی سنبھل کر اٹھ بیٹھا۔

“جائے گا یا نہیں؟” وہ پھر غرائی۔

“اچھا۔” وہ کھڑا ہو گیا۔ “پھر سہی۔”

“تو..........” وہ غصہ سے چلائی اور اسے پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

“کون ہے؟” پڑوس سے دتا بھاگتا ہوا اندر آیا۔ “کون ہے بدراں؟”

“کون ہے یہ؟” دتے نے ماجو کو دیکھ کر بدراں سے پوچھا۔

“پتہ نہیں۔” وہ بولی۔

“چور ہے؟” دتے نے پوچھا۔

“پوچھو اس سے۔ کہتا ہے تجھے لینے آیا ہوں۔” وہ ہنسی۔

“تجھے۔”

“ہاں۔”

“حرام خور------” دتے نے اس کی گردن پر ایک دی۔ اور وہ چکرا کر بدراں کے پاؤں میں آگرا۔

“پاگل ہے کوئی۔” وہ بولی۔

“خون پی لوں گا اس کا---- میں۔” دتا ایک بار پھر اس کی طرف بڑھا۔

ماجو بدراں کی اوٹ لے کر بیٹھ گیا۔ اور یوں اس کا دامن کھینچنے لگا گویا بچہ ماں سے پناہ مانگ رہا ہو۔ “دتے۔” بدراں چلائی۔ “تو کچھ نہ کہہ اسے۔ میں کر لوں گی ٹھیک---- دتے۔” وہ پھر چیخی لیکن دتے نے ایک اور لگائی اسے اور وہ چیخا۔ “راں ڑی۔” ماجو نے اعلانیہ اس سے پناہ مانگی۔ “رہنے دے بہادری تو۔” وہ دتے کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ “تو جا۔” اس نے دتے کو دروازے کی طرف دھکیلا اور خود رسی لے کر ماجو کو باندھنے لگی۔

یہ دیکھ کر دتا ہنسا۔ بولا۔ “اچھا جیسے تیری خوشی۔

“کہتی جو ہوں پاگل ہے کوئی--- سر پھرا۔”

دتا ہنسا اور باہر نکل گیا۔

اسے بندھا ہوا دیکھ کر بدراں کی ہنسی نکل گئی۔ “مجھے لے جانے کا خبط نہیں گیا۔”

“اب تو باندھ دیا ہے مجھے تو نے۔” ماجو بولا۔ “بندھے ہوئے کو باندھنے میں بڑی بہادری ہے۔” اس نے دکھلاوے کی محبت جتائی۔

“اوہ۔” وہ ہنسی اور اسے کھولنے لگی۔ “اچھا۔ اگر میں سونگھ لیتی اسے تو کیا ہوتا؟ اس نے ڈبیہ کی طرف اشارہ کیا۔

“بے ہوش ہو جاتی تو۔”

“پھر؟”

“پھر میں گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا تجھے۔”

“سچ۔” وہ بولی۔ “پھر؟”

“پھر----” وہ گھبرا گیا۔ “بس۔” لیکن عین اس وقت اسے سوجھی۔ “تو نے میرے بھائی کو نہ جانے کیا پلا دیا ہے۔ اس میں ہمت نہیں رہی۔ اب سارا گاؤں دشمن ہے۔ ہم کیا کریں۔”

“اچھا۔” وہ بولی۔ “تو اس کا بھائی ہے۔”

“ہاں۔” وہ بولا۔ “جب سے قاسو نے کام چھوڑا ہے۔ سبھی دشمن ہو رہے ہیں۔”

“میں وہاں چلی جاتی---- پھر کیا ہوتا؟” وہ بولی۔

“پھر---- پھر ہمیں کیا پروا تھی۔” وہ جوش میں اٹھ بیٹھا۔ “تو چلی جاتی تو کسی کو ہم پر ہنسنے کی جرات نہ ہوتی۔”

“اچھا۔” وہ مسکرائی۔ “کیا اس ڈبیہ کو سونگھ لیتی تو واقعی بے ہوش ہو جاتی۔” اس نے ڈبیہ سے کھیلتے ہوئے کہا اور کھیل ہی کھیل میں اسے کھول کر ناک کے قریب لا کر بولی۔ “دیکھوں---- ہائے میں نہیں دیکھتی۔” وہ رک گئی۔ “ہائے بے ہوش ہو گئی تو تم لے جاؤ گے--- لے جاؤ گے نا؟ وہ ہنسی۔ ماجو خاموش بیٹھا رہا۔

“تلخ سی بو ہے۔” اس نے ڈبیہ کو ناک کے قریب لاتے ہوئے کہا۔ “اوئی۔” ایک چیخ سی سنائی اور بدراں دھڑام سے ماجو کے پاؤں پر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

ماجو حیران کھڑا دیکھ رہا تھا۔

دور---- دور---- کہیں کوئی گا رہا تھا۔

“راں ڑیاں---- ہو راں ڑیاں۔”

“کن جاں ڑیاں تے کن ماں ڑیاں۔”

“راں ڑیاں----!”

# گھور اندھیرا

امر سنگھ نے آنکھیں کھول دیں۔ چاروں طرف گاڑھا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اندھیرے کے یہ در تہ در تہ انباروں تلے اسے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ اپنے جسم کو اٹھا نہیں سکتا جیسے اسے اپنے جسم پر قدرت نہ رہی ہو۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔

نہ دیکھنے کے باوجود وہ محسوس کرنے لگا کہ بوجھل اندھیرے کے بادل اس کے ارد گرد جمع ہو رہے تھے۔ اندھیرے کے بڑے بڑے بھیانک ٹکرے چمگادڑوں کی طرح پر پھڑپھڑاتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے۔ اور گدھوں کی طرح اس کے اردگرد اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

تاریک اندھیرے کا ایک کلہاڑا اس کی طرف بڑھا۔ پیٹ کے دائیں پہلو میں ایک ٹھیس لگی۔ درد سے وہ بلبلایا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

ہائیں---- وہ حیران رہ گیا۔ بوجھ کے اس کی طرف بڑھا۔ پیٹ کے دائیں پہلو میں ایک ٹھیس لگی۔ درد سے وہ بلبلایا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

ہائیں---- وہ حیران رہ گیا۔ بوجھ کے اس بے نام سے احساس کے باوجود وہ یوں اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے اسے سپرنگ لگے ہوں۔ اس نے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ اس پھیلے ہوئے اندھیرے میں وہ خود بھی سیاہ بادل کے ٹکڑے کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ سیال متحرک ٹکڑا۔ یہ بات اس کے لیے حیران کن تھی۔ اس کا نچلا دھڑ یوں لہرا رہا تھا جیسے الگنی پر لٹکا ہوا کپڑا ہوا میں پھڑپھڑاتا ہے۔ امر سانگھ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اندھیرا دھندلا ہوا جا رہا تھا۔ اس دھندلکے میں سیاہ فرش کی ایک لکیر دور تک جا رہی تھی جس پر یہاں وہاں سیاہ ستون سے کھڑے تھے۔ جن کے سرے پر زور سے گولے ٹنگے ہوئے تھے۔ جن سے زرد زرد سا دھواں نکل رہا تھا۔ ستونوں کے پیچھے دھندلے دھندلے پردے لٹک رہے تھے جن پر مکانات کے مبہم نقوش دکھائی دے رہے تھے۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ جگہ مانوس تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کون سی جگہ ہے اور

وہ اس جگہ کیوں پڑا ہے۔ دفعتا” اس کی توجہ اپنی طرف مبذول ہو گئی لیکن میں؟ میں کون ہوں----؟ وہ سوچنے لگا۔ اسے خیال نہیں پڑتا تھا کہ وہ کون ہے۔ عجیب بات تھی کہ اسے اپنی ذات کے متعلق واضح طور پر کچھ معلوم نہ تھا۔

پاوم----پاوم---- دور موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

پاوم---- وہ پھر اٹھ بیٹھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ آواز مانوس تھی۔ دفعتا” اس کے ذہن میں حرکت ہوئی۔ ریڈیو---- ہاں۔ ہاں وہ خوشی سے چلایا۔ وہ ریڈیو کا سیٹ ٹھیک کر رہا تھا اور اس روز جلد ہی گھر سے آ گیا تھا۔ ٹفن کیریئر میں اس کا کھانا تھا۔ ہائیں---- وہ دایاں ہاتھ دیکھ کر بولا۔ روٹی کا ڈبہ کہاں گیا۔ وہ لپک کر اٹھ بیٹھا۔ اور آپ ہی آپ بغیر کوشش کیے یوں تیرنے لگا جیسے اندھیرے کے سمندر میں وہ ایک ناؤ ہے۔

دور تک ٹفن کیریئر کا نشان نہ تھا۔

گھوں گھوں---- دور سے کوئی چیز چیختی ہوئی آ رہی تھی۔ سیاہ ڈراؤنی چیز۔

"اوہ ملٹری کی لاری۔" سمجھے بغیر وہ ڈر کر درخت کے پیچھے چھپ گیا۔

موٹر میں بندوقیں تانے ہوئے سپاہی دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ فسادات کے دن تھے اور اسے محتاط رہنا چاہیے۔ اس احساس پر چاروں طرف سے سیاہ سائے اس کی طرف لپکنے لگے۔ اس نے بایاں پہلو ٹٹولا۔ گرپان----؟ اس کی گرپان کہاں تھی۔ روٹی کا ڈبہ اور کرپان۔ اب وہ کرپان کو دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔

دفعتا” وہ رکا۔ سامنے سرخ توپ زمین میں گڑی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ "اوہ یہ تو پٹرول پمپ ہے۔" وہ اس کی طرف غور سے دیکھ کر گنگنایا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ کچھ بھی یاد نہ پڑتا تھا۔ چیزیں نئی نئی دکھ رہی تھیں اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اسے ان چیزوں سے دور کا تعلق نہ ہو۔

اس پٹرول پمپ سے تو میں روز گزرا کرتا تھا۔ روز---- کھانے کا ڈبہ اور کرپان اٹھائے۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ کیا ہوا تھا----؟ ہاں وہ سب دکانیں بند کر رہے تھے۔ بھاگ رہے تھے۔ اور چھاپے خانے کا وہ مزدور کھڑا تھا۔ کھڑا گھور رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا۔ میں مزدور سے پوچھوں۔ اس کی طبیعت کیسی ہے۔ لیکن اس کے ماتھے پر تیوری کیوں تھی؟ دفعتا” وہ سب مجھے گھورنے لگے۔ اور پھر ایک سیاہ ڈراؤنی شکل لپکی اور........ میرے پہلو میں بجلی سی چمکی۔ معا” اس نے پہلو میں دردناک ٹیس محسوس کی۔

"پھر کیا ہوا؟" اس نے بصد مشکل سوچنے کی کوشش کی۔ دھندلکا---- دھندلکا۔ اندھیرا---- وہ سب دور بھاگ رہے تھے۔ جیسے میں بھوت بن گیا تھا۔ بھوت---- اور میں انہیں

پاس بلانا چاہتا تھا۔ مجھے اکیلے میں ڈر لگ رہا تھا۔ اور چاروں طرف سے بوجھل اندھیرا گرد جمع ہوا جا رہا تھا۔

وہ چھاپے خانے کا مزدور مجھ سے دور کیوں بھاگ رہا تھا۔ حالانکہ اس روز جب چھاپے خانے پر بم پڑا تھا تو میں نے مزدوروں سے کس طرح ہمدردی محسوس کی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ جا کر ان سے خیریت پوچھوں۔ پھر---- پھر میں ڈر کیوں گیا تھا۔ کیوں----؟ شاید وہ بھی مجھ سے ڈر گیا ہو۔ میری کرپان سے ڈر گیا ہو۔ لیکن وہ تو میرے مزدور بھائی تھے۔ پھر ڈر کیسا۔ کیوں---- اور کرپان---- وہ تو میں نے اپنے بچاؤ کے لیے پکڑ رکھی تھی۔ کرتار سنگھ کی بات میرے جی لگی تھی۔ جب میں نے پوچھا' کرتار تم کرپان کیوں نہیں رکھتے تو وہ بولا تھا۔ مجھے شرم آتی ہے۔ نہتے لوگوں میں کرپان لیے پھرتے شرم آتی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے ڈر مجھ پر حاوی ہو۔ اس کے بعد مجھے شرم آنے لگی تھی۔ لیکن میں کرپان اٹھا لیا کرتا تھا۔ محض عادت کے طور پر۔

نہیں نہیں۔ وہ میری کرپان سے نہیں ڈرا تھا۔ پھر اس نے وہ بجلی سی کیوں گرائی تھی۔ اور وہ ٹیس---- اور پھر سارے جسم میں بند بند میں درد ہو رہا تھا۔

ایک بار امر سنگھ نے پہلو میں ٹیس محسوس کی اور درد کی شدت سے وہ ایک تاریک ستون تلے گر کر ڈھیر ہو گیا۔ چاروں طرف سے بوجھل اندھیرے کے انبار تہ در تہ اس کے ارد گرد اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ بڑی بڑی چمگادڑیں پر پھڑپھڑاتی ہوئی اترنے لگیں۔ گدھ----

نہ جانے کب تک وہ یونہی پڑا رہا۔

گھنگھرو کی آواز سن کر وہ چونکا۔ سامنے سے ایک تانگہ آ رہا تھا۔ تانگہ----؟ اس وقت----؟ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر نہ جانے کس خیال پر اس نے جست بھری اور پھسل کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔

"نہیں۔ نہیں----" کوچوان نے لپکتا ہوا سایہ دیکھ کر چلانا شروع کر دیا۔ "نہیں نہیں۔ میں مسلمان نہیں ہوں۔ میں تو کوچوان ہوں۔ کوچوان۔"

"کوچوان؟" امر سنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "پھر؟"

"پھر----" کوچوان بولا۔ "پھر کیا۔ میں تو کہہ رہا ہوں۔ میں---- میں تو کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ بھی نہیں۔ اوہ۔" امر سنگھ کھو سا گیا۔ "اور میں' میں----"

"تم۔ تم----" اس نے اس کے کیسوں کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر دفعتاً گھبرا کر چلانے لگا۔ "نہیں' نہیں۔ میں کرشن نگر نہیں جاؤں گا۔ اس دن بھی میں وہاں جانے کے لیے تیار نہ تھا۔"

کوچوان نے یوں بیان کرنا شروع کر دیا جیسے وہ دبی دبی ہچکیاں لے رہا ہو۔ "تیار نہیں تھا۔ حالانکہ وہ دس دس روپے دینے کو تیار تھے۔ لیکن روپے کا کیا جی۔ چلتی پھرتی چھاؤں۔ میں وہاں کبھی نہ جاتا۔ مگر وہ بڑھیا---- اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھے ماں یاد آ گئی۔ ماں۔" امر سنگھ کے ہاتھ پر نہ جانے کہاں سے پانی کے قطرے گرے۔ "انہوں نے اسے امرتسر میں.........."

"پھر؟" امر سنگھ نے اپنے گیلے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر؟" کوچوان چونکا۔ "پھر کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ بڑی بڑی دکانیں' اونچے محل' کچھ بھی نہیں۔"

"لیکن ماں----" امر سنگھ گنگنایا۔

"ماں---- وہ بڑھیا۔ آنسوؤں والی بڑھیا۔ میں نے کہا' میں لیے چلتا ہوں تمہیں ماں۔ اور وہ مجھے دعائیں دینے لگی جس طرح میری ماں دعائیں دیا کرتی تھی۔"

"پھر؟" امر سنگھ نے آہ بھری۔

"پھر پھر---- وہ بہت سے تھے۔ بہت سے۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ وہ بڑھیا انہیں کوس رہی تھی۔ پھر وہ ان کی منتیں کرنے لگی اور آخر رونے لگی۔ لیکن ان پر اثر نہ ہوا۔ ان پر اثر کیوں نہ ہوا؟ لیکن مجھ پر اس کے آنسوؤں کا اثر کیوں ہوا تھا؟ کیوں----؟ کیا وہ ان کی ماں نہ تھی۔ بولو۔ تم کرشن نگر کے ہو۔ بولو۔"

"میں----" امر سنگھ چونکا۔ "میں----" اس کے گلے میں گویا آنسو ٹپک رہے تھے۔

"انہوں نے گھسیٹ کر بڑھیا کو اتار لیا اور وہ میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔" کوچوان نے آہ بھری اور گھوڑا رک گیا۔ اس نے مظلوم نگاہوں سے کوچوان کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمبی چیخ ماری۔ "مجھے [illegible] دیتے تو کوئی حرج نہ تھا۔" کوچوان بڑبڑایا۔ "لیکن موتی---- بے زبان موتی پر ہاتھ اٹھانا۔" امر [illegible] نے گھوڑے کی طرف پر نم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "موتی تو مسلمان نہ تھا۔"

موتی نے ایک چیخ ماری۔ ڈراؤنی لمبی چیخ۔ اور پھر بدک کر چل پڑا۔

"وہ سب۔" کوچوان اپنی ہی دھن میں بولتا گیا۔ "وہ سب جیو ہتیہ کے نام پر کانوں پر ہاتھ رکھا کرتے تھے۔ میں جانتا ہوں۔ عمر بھر کرشن نگر کے اڈے پر رہا ہوں۔ پھر انہوں نے موتی پر بھالے' کرپان---- دفعتاً" وہ چپ ہو گیا۔

چاروں طرف فضا سے سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ موتی کراہتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ امر سنگھ آہیں بھر رہا تھا۔ اور کوچوان دور افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے افق میں کھو گیا ہو۔ [illegible] اس نے اپنے ہی آپ گنگنانا شروع کر دیا۔ "پھر---- اندھیرا۔ چاروں طرف سے اندھیرا' گھپ اندھیرا۔

“ٹھہرو۔” سڑک پر کھڑا ہوا سپاہی چلایا۔ “ٹھہرو۔”

کوچوان نے چونک کر لگام ڈھونڈنی شروع کر دی۔ لیکن تانگہ رکنے سے پہلے ہی سپاہی اوپر چڑھ آیا۔

“تم کہاں جا رہے ہو؟” سپاہی نے تحکمانہ انداز سے پوچھا۔

“میں۔” کوچوان بولا۔ “میں کہاں جا رہا ہوں---- کیوں بابو جی؟ اس نے امر سنگھ سے پوچھا۔

امر سنگھ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ “میں، میں یعنی ہم----” وہ خاموش ہو گیا۔

“کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔”

“کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔” سپاہی آپ ہی گنگنانے لگا۔ “لیکن مجھے ضرور وہاں پہنچنا چاہیے ورنہ وہ سب بھوک سے مر جائیں گے---- اوہ۔” وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ “مجھے جانا ہے۔ مجھے انہیں بچانا ہے۔ مگر---- کہاں جانا ہے۔ کہاں جانا ہے مجھے؟ “تھانے جانا ہو گا۔” کوچوان بولا۔

“نہیں نہیں۔” وہ بولا۔ “وہاں سے تو میں آ رہا ہوں۔”

“ہاں ہاں۔” امر سنگھ خواہ مخواہ بول پڑا۔

“مجھے کہاں جانا ہے؟ سنتری نے امر سنگھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ “بولو ورنہ وہ سب بھوکے مر جائیں گے۔”

“کیا فرق پڑتا ہے؟” کوچوان نے آہ بھری۔ “کیا فرق پڑتا ہے؟”

“نہیں نہیں۔” سنتری چلایا۔ “بکو نہیں۔ وہاں گیہوں نہیں ہے۔ لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔”

“میں تھانے میں رپورٹ کرنے آ رہا تھا۔ ادھر سے نہ جاؤ، وہ بولے۔ وہ تمہیں مار دیں گے۔ بے وقوف مجھے رپورٹ کرنی تھی۔ ورنہ وہ سب بھوکے مر جاتے۔”

“پھر؟” امر سنگھ بولا۔

“پھر چھتوں سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ اور پھر اندھیرا۔ گھپ اندھیرا۔ اور وہ ہنس رہے تھے۔ بے وقوف انہیں معلوم نہ تھا کہ مجھے ضروری طور پر جانا ہے۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ میں ان کو سمجھوں گا۔ مل لیں۔ بغیر وارنٹ کے ہتھکڑی نہ لگائی تو میرا نام، میرا نام.......... لیکن میرا نام کیا ہے، میرا نام---- بتاؤ---- بولو----؟ کہاں جانا ہے مجھے---- اور میرا نام---- کیا نام ہے میرا۔ کون ہوں میں؟ بولو---- نہیں بتاتے۔ اچھا میں تمہارا چالان کروں گا۔” یہ کہتے ہوئے وہ تانگے سے اتر گیا اور چلانے لگا۔ “ٹھہرو۔ ٹھہرو۔”

موتی نے ایک چیخ ماری اور بدک کر بھاگا۔

“نہیں نہیں۔” کوچوان چلایا۔ “ہم کرشن نگر نہیں جائیں گے بیٹے۔ ہم تو شاہ عالمی جا رہے ہیں---- شاہ عالمی۔”

“شاہ عالمی نہ جانا۔ شاہ عالمی نہ جانا۔” کسی نے بڑھ کر گھوڑے کی لگام تھام لی۔

“شاہ عالمی۔” نوجوان پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ “اف---- آگ۔ آگ۔”

“آگ۔” امر سنگھ چلایا۔

“بھگوان۔” نوجوان غصے سے بولا۔ “نہیں نہیں بھگوان تو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب تو یہاں شیطان بستے ہیں---- شیطان۔ بھگوان کی دنیا میں اینٹوں سے شعلے نہیں نکلتے۔”

“ہاں۔” امر سنگھ گنگنایا۔ “یہ شیطان کی دنیا ہے۔ بھاگ چلو۔ بھاگ چلو۔”

نوجوان قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔ رام لال بھاگا تھا۔ وہ بھاگ کر کھڑکی سے اترنے لگا۔ اف گولیوں کی بوچھاڑ۔ پٹاک پٹاخ اور ننھا مادھو۔ اسے کیا معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ آتش بازی چل رہی ہے۔ اور پھر وہ خود انار کی طرح چلنے لگا۔ دھڑا---- دھڑ۔ بھگوان۔

“پھر؟” کوچوان نے کہا۔

“پھر----” وہ چونکا۔ “پھر دیواریں مل گئیں۔ آسمان گر گیا۔ زمین---- زمین۔ اندھیرا۔ گھپ اندھیرا۔ ٹھہرو۔ ٹھہرو۔” دفعتاً وہ چلایا۔ “دینا مجھے دینے کو بچانا ہے۔ دینا۔ دینا۔” وہ چلاتا ہوا چلا گیا۔ دور سے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ “دینا۔ دینا۔”

کوچوان ہاتھ میں باگ پکڑے بالکل چپ چاپ بیٹھا تھا۔ امر سنگھ ہونٹوں میں کچھ گنگنا رہا تھا۔ موتی منہ اٹھائے افق کی طرف گھور رہا تھا۔ وہ سب یوں ساکت تھے جیسے کپڑے پر تصویر کھینچی ہو۔

“دینو----” کسی نے دینو کو پکارا۔ ایک بڑھیا نہ جانے کہاں سے آ گئی۔

“کہاں ہے میرا دینو؟” وہ تانگے کے پاس آ کر رک گئی۔ اور پھر امر سنگھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ “تمہیں نے دینو کو مارا ہے۔ تم اس کے قاتل ہو۔ تم۔ مارو۔ مجھے بھی مارو۔” وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔

“نہیں نہیں۔” امر سنگھ گنگنانے لگا۔

“پکڑ لو۔” وہ کوچوان کی طرف لپکی۔ “پکڑ لو۔ یہ قاتل ہے۔”

کوچوان چپ چاپ بیٹھا اس کا منہ تکتا رہا۔

“کوئی نہیں سنتا۔ کوئی نہیں۔” وہ چلانے لگی۔ “انہوں نے بھی کچھ نہیں سنا تھا----

ان کی لمبی لمبی داڑھیاں تھیں۔ خاکی وردیاں۔ انہوں نے پولیس کے بھیس میں ہمیں گھیر لیا۔ اور وہ سب اللہ دتہ، غفورا، رحیم۔۔۔۔ سبھی گئے کہ ان کے پاس شکایت کریں۔ میرے اللہ اور۔۔۔۔ وہ سب بھون دیئے گئے جیسے مکئی کے دانے ہوں۔ پھر وہ سب ہمارے پاس آ گئے۔ اور ہمیں گھیر لیا۔“

”____ اور دینا مجھے بھی مارو۔“ وہ پھر چلائی۔ ”دینے کے بغیر میں جی کر کیا کروں گی؟ مجھے بھی مارو۔“ دفعتاً اس نے اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ”ہائے۔۔۔۔“ وہ چلائی۔ ”میرا سر۔ اف۔“ وہ بیٹھ گئی۔ ”میرا سر۔ میرا سر۔“

موتی نے مڑ کر کوچوان کی طرف دیکھا۔ اس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ کوچوان نے آسمان کی طرف دیکھ کر لمبی آہ بھری۔ امر سنگھ مدھم آواز میں کراہنے لگا۔ فضا میں اس کی کراہ گونجی۔ گرد و پیش سے آہوں اور کراہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

”دینا۔ دینا۔“ دور بہت دور سے آواز آئی۔

”دینا۔“ بڑھیا چونکی۔ ”کہاں ہے میرا دینا۔ کس نے پکارا میرے دینے کو۔“ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”دینا۔“ بہت دور سے پھر آواز آئی۔

”آئی۔“ بڑھیا چلائی۔ ”میں آ رہی ہوں۔ آ رہی ہوں۔“ اور وہ دیوانہ وار اندھیرے میں کود کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

دفعتاً موتی نے چیخ ماری اور اٹھ بھاگا۔

ارد گرد اڈا تھا۔ بل کھاتا ہوا بوجھل اندھیرا گویا کراہ رہا تھا۔ ستونوں کے اوپر لٹکی ہوئی بتیاں دم توڑ رہی تھیں۔ نیچے سیاہ سڑک سسکیاں بھر رہی تھی۔

”اسے رکھ لو۔“ بڈھا گڑگڑا رہا تھا۔ ”اسے رکھ لو۔ بھگوان کے لیے لیکن مجھے چھوڑ دو۔ میری جان بخش دو۔ میں تو بوڑھا ہوں۔ مجھے مار کر کیا لو گے؟“ اس کی حسین پتری حیرانی سے بوڑھے باپ کی باتیں سن رہی تھی۔

”نہیں نہیں۔ یہ میرا بچہ نہیں۔“ بڑھیا چلائی۔ ”نہیں بہن۔ میں سچ کہتی ہوں، یہ بچہ میرا نہیں۔“

”میں، میں اسے کہاں تک اٹھائے پھروں۔ میں تو اس کی دیکھ بھال کرتے ہار گئی۔“

بچہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماں۔۔۔۔ اس کے ہونٹ یوں کھلے جیسے ”ماں“ کہنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”سردار جی یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ نہیں، نہیں۔ میرا نام تو کوشلیا ہے۔ یہ دیکھ لو۔ یہ کلائی پر ہندی میں نام۔ کوشلیا۔“

”ہاہاہاہاہا۔۔۔۔“ مرد ہنسا۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سردار جی کا منہ ہوس سے سوجا ہوا تھا۔ اس کے جونک سے ہونٹ خون چوسنے کے لیے کوشلیا کی طرف بڑھے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ نہیں نہیں۔“ کوشلیا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔

”میں سکھ نہیں۔“ وہ ہنسا۔ ”مسلمان ہوں۔ یہ کیس تو دھوکا ہیں۔“

”میں انہیں بتاؤں گا۔ مجھے اپنوں نے............“ اس کی آواز مدھم ہو گئی۔ دب گئی جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اور ایک سیاہ فام برہنہ جسم نے اسے اپنے چنگل میں لے لیا۔

تانگہ رک گیا۔

سامنے مٹیالے اندھیرے میں ایک بہت بڑا پنجرہ رکھا ہوا تھا جس میں سائے متحرک تھے۔ پاس ہی چند قلی بیٹھے تھے۔ دفعتاً ایک ریڑھی والا آ نکلا۔ اور بے تکلف قلیوں کی طرف بڑھا۔ ہائیں۔۔۔۔ امر سنگھ نے کلیجہ تھام لیا۔ ”وہ سب کچلے جائیں گے۔“ لیکن ریڑھی گزر گئی اور وہ قلی جوں کے توں بیٹھے تھے۔ امر سنگھ حیران رہ گیا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ کتے بلا تکلف دیوار میں سے پھاند کر ادھر سے ادھر نکل آتے۔ کوے اڑتے اڑتے موتی کے پیٹ میں سے نکل جائے جیسے وہاں کوئی کھڑکی کھلتی ہو۔ عجیب بات تھی۔ وہ سوچنے لگا۔

سوچتا سوچتا وہ قلیوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔

اسے دیکھ کر بڈھا قلی چلایا۔ ”نہیں بھئی۔ تم جانو۔ تمہارا کام۔ ہم سامان نہیں اٹھائیں گے۔“ وہ بھی میری منتیں کرتی تھی۔ منتیں اور مجھے اس پر ترس آ گیا۔ اور وہ صندوق کتنا بھاری تھا۔ وہ صندوق۔۔۔۔ وہ میرے کندھے سے پھسل گیا۔ پھر۔۔۔۔ نہ جانے ہوا کیا۔ بادل کڑکا اور بجلی، پھر.........“ قلی کا چہرہ بھیانک ہو گیا اور پھر ہوا میں ٹکڑے سے اڑ اور جیسے سب ہوائی جہاز بن گئے ہوں۔ سبھی۔۔۔۔ چاروں طرف ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور مدھم آوازیں۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ اور پھر۔ پھر اندھیرا اندھیرا۔“

کو۔۔۔۔ کوکو۔ گاڑی کے وسل کی آواز سنائی دی۔

”میں جاؤں گا۔ میں جاؤں گا۔“ امر سنگھ چلایا۔ ”میں یہاں نہیں رہوں گا۔“ وہ ہوا میں تیرنے لگا اور آہنی پل کے درمیان سے گزرتا ہوا گاڑی کے پاس جا پہنچا۔ ”امرتسر امرتسر۔“ وہ خوشی سے چلایا۔

”امرتسر۔“ ایک بھاری اور بھیانک آواز آئی۔ ”امرتسر۔۔۔۔“

امر سنگھ نے گھبرا کر دیکھا۔ گاڑی کے پائیدان کے پاس پڑا اکٹا ہوا سر دانت نکال رہا تھا۔

امر سنگھ گھبرا گیا۔

گاڑی سے ایک عورت نے سر نکالا۔ اس کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ جس سے ایک بچہ لٹکا ہوا تھا۔ عورت نے اپنی چھاتیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”امرتسر۔۔۔۔

امر سنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر بولا۔ ”امرتسر۔“ اور پھر ڈر کر ایک ڈبے میں گھس گیا۔

ڈبے کی دیواریں سرخ چھینٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ نیچے لہو کی چھپڑیوں میں گوشت کی گٹھڑیاں رکھی تھیں۔ امر سنگھ سہم کر ایک طرف ہو گیا۔

سیٹ پر پڑے کٹے ہوئے سر نے آنکھیں کھول دیں۔ امر سنگھ کو کھڑا دیکھ کر اس کی آنکھیں اور بھی ابل آئیں۔ ”نہیں۔ نہیں۔ میں مسلمان نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی قسم۔“

سیٹ پر لڑھکتا ہوا وہ نیچے گرا اور پائیدان سے پلیٹ فارم پر جا پڑا۔

”الحمد للہ“ بائیں طرف کے ڈھیر سے ایک بزرگانہ آواز آئی۔ ”الحمد للہ۔ اشہد ان لا............“

دفعتاً ایک شور بلند ہوا۔ گوشت کی گٹھڑیاں حرکت کرنے لگیں۔ اعضاء میں جنبش ہوئی۔

”میری ٹانگ۔ میری ٹانگ۔“

”خدا کے لیے مجھے مار دو۔ مجھے مار دو۔“

”پاکستان۔۔۔۔!“

”پاکستان۔“ باہر پلیٹ فارم سے آواز گونجی۔ امر سنگھ سہم کر باہر کی طرف بھاگا۔

پلیٹ فارم پر انسانی اعضاء رینگ رہے تھے۔ کٹے ہوئے سر ربڑ کے گیندوں کی طرح لڑھک رہے تھے۔

”پاکستان۔“ کٹا ہوا سر گردن کے بل کھڑا ہو کر چلایا۔ ”ہاہاہاہا۔“ وہ بھیانک قہقہہ چاروں طرف گونجنے لگا۔ کٹے ہوئے سر کی آنکھوں سے موتی ڈھلک آئے۔

کٹے ہوئے بازوؤں والا بڈھا مسکرا دیا۔ ”پاکستان۔“ اس کی مسکراہٹ حسرت آلود تھی۔

”الحمد للہ۔“ قریب ہی کوئی زیر لب بولا۔ ”الحمد للہ ہم پہنچ گئے۔“

”پہنچ گئے؟“ جوان عورت ہنسی۔ ”پہنچ گئے۔“ اس قہقہے میں طنز گونج رہا تھا۔

”شکر ہے۔“ بڑھیا بولی جو کہنیوں کے بل رینگ رہی تھی۔ اور پھر تھک کر منہ کے بل گر پڑی۔

امر سنگھ نے منہ موڑ لیا۔ ارے اس کے ساتھ کوچوان کھڑا تھا۔ ”کوچوان۔۔۔۔“ وہ بولا۔

لیکن کوچوان بڑھیا کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

کوچوان بڑھیا کی طرف بڑھا۔ اور اسے سہارا دیتے ہوئے بولا۔ ”اٹھو۔۔۔۔ اٹھو۔

”اسے اٹھاؤ۔“ اس نے ساتھ والی جوان عورت کی طرف اشارہ کیا۔ جس کا نچلا دھڑ لٹک رہا تھا۔ کوچوان نے محسوس کیا کہ وہ اکیلا اسے اٹھانے کے لیے کافی نہیں۔ ”تمہارے ساتھی۔“

اس نے عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ساتھی۔“ جوان عورت نے نفرت سے کہا۔ ”ساتھی وہیں تھے‘ وہیں۔۔۔۔“

”وہیں۔“ کوچوان نے حیرانی سے دہرایا۔

وہ سامنے کھڑے تھے میرے سامنے۔“ اس کی آواز میں نفرت کی شدت تھی۔ ”وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں پھٹ نہ گئیں۔ ایمان‘ جرات۔۔۔۔ جھوٹ سب جھوٹ۔ اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ اور عزت۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی اور پھر دھڑام سے منہ کے بل گر پڑی۔

”پانی پانی۔“ وہ اپنا آپ گھسیٹتے ہوئے بولی۔

امر سنگھ نے چاروں طرف دیکھا۔ سامنے کمرے پر پانی والا لکھا دیکھ کر وہ لپک کر ڈبے میں داخل ہو گیا۔ کمرا خالی پڑا تھا۔

”نہیں نہیں۔“ کونے میں دبکا ہوا بچہ چلایا۔ ”مجھے پیاس نہیں لگی۔ میں نے تو پانی نہیں مانگا۔“ وہ رونے لگا۔ ”مجھے نہ مارو۔ مجھے نہ مارو۔ میں پانی نہیں مانگوں گا۔ نہیں مانگوں گا۔ مجھے پیاس نہیں لگی۔“

”پانی نہیں مانگوں گا۔“ امر سنگھ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ چلایا۔ اس کے سوکھے ہونٹوں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ چلایا۔ اس کے سوکھے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ لکڑی سی زبان باہر آئی۔ پا۔ پا۔۔۔۔ پا۔“ اس کی آنکھیں پتھرانے لگی۔

”پا۔ پا۔ پا۔ پا۔ پا۔۔۔۔“ سیٹوں تلے سے آوازیں آنے لگیں۔ امر سنگھ نے جھک کر سیٹوں تلے نگاہ دوڑائی۔ ”پا۔ پا۔ پا۔۔۔“ بیسیوں سوکھے ہوئے ہونٹ حرکت کر رہے تھے۔ زبانیں لٹک رہی تھیں۔ ”پا۔ پا۔“

”نہیں نہیں۔ میں مسلمان نہیں ہوں۔“ پلیٹ فارم پر کوئی چیخنے لگا۔

”ساتھی۔۔۔۔ ہاہاہا۔“ عورت نے قہقہہ لگایا۔

”الحمد للہ ہم پہنچ گئے۔“

”اشہد ان لا الہ.........“

امر سنگھ نے ایک جست بھری اور فضا میں تیرنے لگا۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دور دور ---- جہاں شاہ عالمی نہ ہو۔ امرتسر نہ ہو۔ کچھ بھی نہ ہو۔ دور۔ دور۔ جہاں وہ آوازیں نہ پہنچ سکیں۔ وہ آوازیں مدھم پڑتی گئیں۔ مدھم پڑتی گئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا کسی نامعلوم اثر سے بھیگی ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ دور افق کے قریب بجلی چمکتی اور پھر گہرا اندھیرا چھا جاتا۔ نیچے زمین گویا سنسان پڑی تھی۔ کبھی کبھی مدھم سی آوازیں سنائی دیتیں جو کبھی تیز ہوتی جاتیں۔ پھر ایک چیخ' پھر خاموشی چھا جاتی۔ اور خاموشی کے پس منظر پر کراہیں اور سسکیاں۔ اور پھر وہی چیخ۔ اور پھر آوازیں اور سرگوشیاں۔

"دینا۔ دینا۔"

"آگ۔ آگ۔"

"میں مسلمان ہوں۔ دھرم کی قسم۔ میں مسلمان ہوں۔"

"پاکستان ---- ہاہاہاہاہا ---- !"

"راولپنڈی۔ امرتسر۔ شاہ عالمی ---- !"

"مجھے پیاس نہیں لگی۔ نہی نہیں۔ بیسیوں سوکھے ہوئے ہونٹوں سے لکڑی سی زبانیں لٹک پڑیں۔ "پاپا۔ پاپا۔"

بھاگتے بھاگتے وہ تھک چکا تھا۔ لیکن وہ آوازیں ختم نہ ہوتی تھیں۔ جیسے اتفاقاً" اس کا پیچھا کر رہی ہوں۔ ہار کر امر سنگھ نے آنکھیں بند کر لیں اور دھڑام سے نیچے آگرا۔

چاروں طرف کھیت لہرا رہے تھے جن میں مویشی چر رہے تھے۔ جن کے پاس ہی بیسیوں مویشی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ان کے پیٹ پھولے ہوئے تھے جیسے کھا کھا کر گر پڑے ہوں۔ ادھر دھندلکے میں گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔ بائیں طرف ایک ٹوٹا ہوا شیڈ تھا۔ جس میں دیا ٹمٹما رہا تھا۔ دور کہیں کتے رو رہے تھے۔ ادھر سڑک کے کنارے گدھ اور چیلیں پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ اتنے گدھ ---- اتنے گدھ اس نے عمر بھر ایک جگہ نہ دیکھے تھے۔ سڑک پر ٹوٹے ہوئے ٹرک کھڑے تھے۔

وہ پھسل کر سڑک کی طرف چل دیا اور گدھوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ لیکن گدھ جوں کے توں بیٹھے رہے۔ کبھی کبھار کوئی سرکتا تو یوں محسوس ہوتا کہ اس میں جنبش کی ہمت نہیں۔ وہ پر پھڑپھڑاتا مگر اس کا جسم حرکت نہ کرتا۔ ان کے پاؤں میں گلابی گٹھڑیاں سی پڑی تھیں۔ ان کی چونچیں رنگی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی طبیعت متلانے لگی۔

اور وہ شیڈ کی طرف چل دیا۔

اس نے شیڈ کا دروازہ کھولا۔ تاک پر دیا ٹمٹما رہا تھا۔ دیئے کی مدھم روشنی چاروں طرف پڑ رہی تھی۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ایسی ویرانی جو ہنگامے کے عقب میں آتی ہے۔ اور ہیبت ناک خاموسی کو جنم دیتی ہے۔ ایسی خاموشی جس میں سے چیخوں اور سسکیوں کی بو آتی ہے۔

امر سنگھ گھبرا کر باہر نکل رہا تھا کہ دروازے کی اوٹ سے بچہ نکل آیا۔ "وہ چھو رہی ہے۔" بچے نے تتلا کر کہا۔ "چھو رہی ہے۔ جاگی نہیں۔ جاگتی نہیں۔"

"سو رہی ہے۔" امر سنگھ نے حیرانی سے دہرایا۔

"ہاں" وہ بولی۔ "وہ" اس نے فرش کے درمیان انگلی سے اشارہ کیا۔

فرش پر وہ پڑی تھی بازو اور ٹانگیں پھیلائے' لیکن کپڑے۔ امر سنگھ نے آنکھیں ملیں۔ سفید جسم' سنہرے بال۔ سرخ رنگ جیسے ہولی کھیل کر سو گئی ہے۔ اس کی نیلی سوجی ہوئی چھاتیاں لٹک رہی تھیں۔

"چھو رہی ہے۔" بچی چلائی۔ پھر وہ بھاگی بھاگی اس کی طرف گئی۔ "امی امی دیکھا۔ وہ چھو رہی ہے۔ بیمال ہے امی۔ ہاں۔"

"بیمار۔" امر سنگھ نے آہ بھری۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "ڈاکو آئے تھے۔ لیکن انہوں نے امی کو ڈاکوؤں سے بچا لیا۔ ہاں وہ بڑے اچھے تھے۔ وہ کہتے تھے' امی ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر انہوں نے امی کو مالس کی۔

"مالش ---- ؟" اس نے ایک بار پھر غور سے عورت کی طرف دیکھا۔

"وہ سب امی کے پنڈے پر مالس کرتے رہے۔" وہ بولی۔ "وہ کہتے تھے' امی اچھی ہو کر سو گئی ہے۔ وہ بہت اچھے تھے۔"

امر سنگھ نے محسوس کیا" گویا عورت کے ہونٹوں پر تبسم آ رہا ہے۔ طنز بھرا تبسم۔ "وہ داکتل کو لینے گئے ہیں۔" بچی نے کہا۔

"اوہ۔" امر سنگھ کا سر چکرانے لگا۔ اس اجالے سے تو باہر کا اندھیرا ہی اچھا تھا۔ اور اس معصوم بچی کی بھولی بھالی باتوں سے تو سڑک کے گدھوں کی خاموش حقیقت بیانی کہیں قابل برداشت تھی۔ امر سنگھ گھبرا کر باہر نکل آیا۔

"امی۔ امی۔" اندر سے بچی کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن وہ دور بھاگا جا رہا تھا۔ دور ---- دور۔ ہائیں ---- وہ حیران رہ گیا۔ سامنے سڑک پر موتی دوڑا جا رہا تھا۔ تانگے میں کوچوان سر تھامے بیٹھا ہوا تھا۔

“موتی۔ موتی۔” وہ چلایا اور پھر تانگے کے پیچھے بھاگا۔ اور لپک کر سیٹ پر جا بیٹھا۔ کوچوان اپنی ہی دھن میں بیٹھا رہا۔ اسے امر سنگھ کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا۔ البتہ موتی مسرت سے ہنہنایا۔ اور پھر نہ جانے کیوں سڑک چھوڑ کر کھیتوں میں ہو لیا۔

کھیت ویران پڑے تھے۔ یہاں وہاں مویشی پکی ہوئی گیہوں کے خوشوں پر منہ مار رہے تھے۔ میدانوں میں کتے موتی کو دیکھ کر بھونکنے کی کوشش کرتے لیکن ان کی آواز گلے میں پھنس کر رہ جاتی اور جسم میں حرکت نہ ہوتی۔ مرغیاں زمین پر بچھی ہوئی آنتوں کو پاؤں سے رول رہی تھیں۔ بستیوں پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔

دفعتاً موتی رک گیا۔ اس کے رکنے سے امر سنگھ تانگے کے نیچے پھسل گیا۔

کوچوان نے چونک کر سر اٹھایا۔ “نہیں نہیں۔ بیٹے ہم کرشن نگر نہیں جائیں گے۔ نہیں جائیں گے۔” لیکن موتی کھڑا رہا۔ دو ایک ساعت کے بعد کوچوان پھر سر کو ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔

امر سنگھ تیرتا ہوا گاؤں میں جا پہنچا۔

حویلی کے صدر دروازے پر دراز قد آدمی کھڑا تھا۔ اس نے مونچھوں اور داڑھی کے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر اپنا منہ نکالا اور امر سنگھ سے کہنے لگا۔ “تمہیں شک ہے کیا؟ شک ہے تو آ کر دیکھ لو۔ آؤ۔” اس نے حویلی کی طرف اشارہ کیا۔ “میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں۔ میں نے کسی مسلمان کو پناہ نہیں دی۔ سنا تم نے۔ جاؤ دوڑ جاؤ یہاں سے۔ بدمعاش۔ کمینے۔” دراز قد آدمی دوڑ کر حویلی میں گھس گیا اور پھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

“آہ۔ آہ۔” اندر سے آواز آئی۔ “میرا سر۔ میرا سر۔ مجھ کو پکڑو۔ نہیں نہیں۔ میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں۔”

“کوئی “مچھلمان” نہیں۔” بچے کی آواز آئی۔ “وہ چھیدہ کے ابا ہیں۔ مچھلمان تو نہیں۔ وہ بڑے اچھے ہیں۔ چھیدہ میری چھیلی کے ابا۔” پھر بچے کی ایک لمبی چیخ سنائی دی۔ اور پھر مکان پر سناٹا چھا گیا۔

دفعتاً امر سنگھ کو خیال سا آیا اور وہ تانگے کی طرف بھاگا۔

اس نے کوچوان کو جھنجھوڑا۔ “بھاگ جاؤ۔” وہ بولا۔ “تم کرشن نگر آ گئے ہو۔” موتی نے چیخ ماری اور تڑپ کر ساز توڑ کر بھاگ نکلا۔

“موتی موتی۔” کوچوان چلایا مگر موتی جا چکا تھا۔ کوچوان نے قمیض کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔

“میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟” امر سنگھ چلایا۔ “چلے جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔”

“کہاں؟” کوچوان نے ٹوٹے ہوئے تانگے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

“پاکستان۔”

“پاکستان ـــــ ہاہاہاہاہا۔” فضا سے قہقہے کی آواز سنائی دی۔

کوچوان نے ٹوٹے ہوئے تانگے کی طرف دیکھا۔ “موتی۔” وہ زیر لب گنگنایا۔ “میرا ساتھی۔”

“ساتھی۔” اندھیرے سے آواز آئی۔ اور سوجے ہوئے جسم والی عورت رینگتی ہوئی سامنے آ گئی۔ “ساتھی۔” وہ ہنسی۔ “جھوٹ جھوٹ۔” وہ کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔

جیسے جیسے وہ تماشا ہو ـــــ “ساتھی۔” وہ منہ کے بل گر پڑی۔ اس کے بازو اکڑ گئے۔ گردن مڑ گئی۔

“چھیدہ چھیدہ۔” حویلی سے معصوم بچہ نکل ایا۔ تمہارے ابا یہاں ہیں۔ یہاں ـــــ” دفعتاً اس کی نگاہ امر سنگھ پر پڑی۔

“نہیں نہیں۔ وہ مچھلمان نہیں۔ وہ تو چھیدہ کے ابا ہیں۔”

“چپ ـــ” وہ بولی۔ “چپ۔ امی چھو رہی ہے۔ چھو رہی ہے۔ وہ بڑے اچھے تھے۔ انہوں نے امی کو مالس کی اور امی اچھی ہو کر چھو گئی۔”

“کوچوان ـــــ کوچوان۔” امر سنگھ نے اسے گھسیٹا۔ “آؤ آؤ بھاگ چلیں۔” اور وہ دونوں بھاگنے لگے۔

“لیکن کہاں؟ کہاں ـــــ؟” کوچوان نے بھاگتے ہوئے امر سنگھ کی طرف دیکھا۔

“کہاں؟” امر سنگھ نے دہرایا اور دفعتاً رک گیا۔

اس کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ راستہ روکے کھڑی تھی وہ۔

“مجھے مار دو۔” وہ چلائی۔ “مار دو مجھے۔” اس نے امر سنگھ سے کہا۔ “میں مسلمان ہوں۔ مجھے مار دو۔”

اس کا حسن اور جوانی دیکھ کر وہ دونوں ٹھٹھک گئے۔

“تم پاکستان کیوں نہیں چلی جاتی؟” امر سنگھ چلایا۔

“نہیں۔ نہیں۔” وہ بولی۔ “میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔ مجھے قتل کرو لیکن میں پاکستان نہ جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی۔ تمہیں اپنے گرو کی قسم۔ مجھے قتل کر دو۔ مار دو۔ میرا جینا بے کار ہے۔ بے کار۔”

“وہ کہاں ہیں، وہ دونوں؟” وہ بکنے لگی۔ “میں انہیں یہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ اس کھیت میں وہ

دونوں کرپانوں سے لڑ رہے تھے۔ بھائی بھائی لڑ رہے تھے میرے لیے۔“ وہ خاموش ہو گئی اور ایک فخر سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

“وہ کون؟” امر سنگھ نے پوچھا۔

“وہی جو ہمارے گھر آئے تھے۔” جوان عورت نے ملامت سے اس کی طرف دیکھا جیسے اس کے نہ جاننے پر شکایت کر رہی ہو۔

“انہوں نے میرے پانچوں بھائی شہید کر دیئے۔ اور پھر اماں کی طرف بڑھے۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا۔ میں نے دوپٹہ اتار پھینکا اور اماں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ مجھے مار دو۔ مجھے۔ میں مسلمان ہوں۔ میں کافروں کے منہ پر تھوکتی ہوں۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ رک گئے۔ اس نے اپنے بھائی سے کہا۔ یہ سب تمہارا مال ہے۔ سب اور۔ یہ۔۔۔۔ اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ یہ میرا حصہ ہے۔ یہ کہہ کر وہ گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اور مجھے اس کھیت تک لے آیا۔ یہاں اس نے مڑ کر دیکھا تو چھوٹا پیچھے آ رہا تھا۔ “ٹھہرو۔” سجن سنگھ بولا۔

“اسے مجھے دے دو۔”

“بے وقوف۔” بڑا چلایا۔

“جوڑ میرا ہے۔” وہ بولا۔

“لیکن وہ مال۔” بڑے نے کہا۔

“تھو۔” چھوٹے نے تھوک دیا۔ “میں اس پر تھوکتا ہوں۔”

بڑے نے گھونسہ مارا۔ چھوٹے نے کرپان نکال لی۔ اور وہ دونوں کرپانوں سے لڑنے لگے۔ اور میں یہاں بیٹھی دیکھتی رہی۔ اور وہ لڑتے رہے میری خاطر۔

“پھر؟” امر سنگھ بولا۔

“پھر سڑک پر موٹر رکی اور میں اٹھ کر بھاگی۔ اور وہ لڑتے رہے میرے لیے۔ لڑتے رہے۔ انہوں نے میرے بہن بھائی قتل کر دیئے۔ گھر تباہ کر دیا۔ لیکن انہوں نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔ اور۔ اور۔۔۔۔ وہ اف وہ پاکستان کا فریبی اس نے کہا تھا‘ آؤ میں تمہیں کیمپ پہنچا دوں۔ اور۔ اور۔۔۔۔ میں پاکستان میں پہنچ کر لٹ گئی۔ پاکستان پہنچ کر لٹ گئی۔ نہیں نہیں۔ میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی۔ مار دو مجھے۔”

کھیت میں دو کٹی ہوئی سریاں لڑھکنے لگیں۔

“وہ میری ہے۔” چھوٹا سر بڑے سے ٹکرایا۔

“میری۔” بڑا چلایا۔ اور وہ ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔

“بھاگو۔ بھاگو۔” امر سنگھ چلایا۔

“کہاں؟” کوچوان نے اپنے ارد گرد حسرت بھری نگاہ سے دیکھا۔

“نہیں میں نہیں جاؤں گی۔” حسین عورت چلائی۔ “پاکستان میں جا کر لٹنے سے یہاں مر جانا بہتر ہے۔”

“نہیں۔ نہیں۔ جھوٹ ہے۔ یہاں نہ ٹھہرو۔ یہاں نہ رکو۔” نہ جانے ٹمیار عورت کہاں سے آ کر شور مچانے لگی۔ “یہ دیکھو۔ میری کلائی پر۔ ہندی۔ شکنتلا میرا نام یہ دیکھو۔” اس نے امر سنگھ کی طرف کلائی بڑھا دی۔ اس نے اس کی بھی پرواہ نہ کی۔ وہ مجھے چاہتا تھا۔ وہ میرا پڑوسی تھا۔ لیکن وہ کہنے لگا کہ میں مسلمان ہوں۔ کیس والا مسلمان۔۔۔۔ ہاہاہا مسلمان۔ ہاہاہا۔۔۔۔!”

وہ ہنسی۔ زہر خند ہنسی۔۔۔۔ “سب جھوٹ۔ کوئی مسلمان نہیں۔ کوئی ہندو نہیں۔ سکھ نہیں۔ یہاں درندے بستے ہیں۔ درندے۔”

“پاگل نہ بنو۔” امر سنگھ چلایا۔ “بھاگ چلو۔ بھاگ چلو۔”

“کہاں؟” کوچوان نے سر اٹھایا۔

“جہاں انسان بستے ہوں۔” وہ بولا۔

“انسان۔” دوسری عورت ہنسی۔ “انسان کہاں ہیں؟ کہاں۔۔۔۔ کہیں بھی نہیں۔”

“اوہ۔” کوچوان نے پھر سر تھام لیا۔

“میں بھاگوں گی نہیں۔” ٹمیار عورت چلائی۔ “نہیں۔ مجھے جنم دینا ہے۔ انسان کو جنم دینا ہے۔ میں جنم دوں گی۔” اس نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

“جنم دینا ہے۔” دوسری عورت نے حیرانی سے دیکھا۔

“ہاں میں نے۔۔۔۔ تم نے‘ ہم نے۔”

“خدا کرے۔” کوچوان بولا۔

“کدا۔۔۔۔” دوسری عورت کھلکھلا کر ہنسی۔ “کاش کہ وہ کچھ کر سکتا۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔!”

“میں کروں گی۔ میں۔” ٹمیار چلائی۔ “انسان۔۔۔۔ انسان۔”

“کس نے پکارا۔۔۔۔؟ کون ہے۔۔۔۔؟” اس گھور اندھیرے میں؟ لنگوٹی والا لاٹھی پکڑے نہ جانے کہاں سے آ گیا۔ “کون؟”

“انسان۔” لنگوٹی والے نے آہ بھری۔

“تم کون ہو؟” ٹمیار نے پوچھا۔

"میں کوئی بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔" وہ بولا۔

"کوئی بھی نہیں؟" کوچوان نے حیرانی سے دیکھا۔

"شانتی شانتی۔" بڈھے نے اس کی طرف دیکھا۔ "نہیں نہیں، بھگوان نہیں۔"

"انسان۔" وہ چلائی۔ "میں جنم دے رہی ہوں۔"

"تم ---- دھن ہو ماتا۔" بڈھا بولا اور اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے پرنام کیا۔

"میں تمہاری مدد کروں گی۔" دوسری عورت بولی۔ اور وہ دونوں کھیت میں گھس گئیں۔

"انسان۔ انسان ----" دور سے آوازیں بلند ہوئیں۔

"انسان۔ انسان ----" گدھ ڈر کر چیخنے لگے۔

"انسان۔" گویا لاکھوں بھنورے بھنبھنانے لگے اور وہ آواز تیز ہوتی گئی۔ تیز ہوتی ہے۔

"انسان ---- انسان ---- انسان ---- انسان ----!"

# گڑیا گھر

سفید بنگلے پر ہو کا عالم طاری ہے۔ بنگلے کے نفیس ساز و سامان میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ ریشمیں پردے جوں کے توں لٹکے ہوئے ہیں۔ غالیچے ویسے ہی شوخ رنگ ہیں۔ بنگلے کے افراد حسب معمول اس شوکیس میں کلدار گڑیوں کی طرح چلتے پھرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی حرکات میں وہ روانی نہیں رہی۔ ان کی مسکراہٹوں میں وہ نمائشی چمک نہیں رہی۔ ان کے جملے تو وہی ہیں، وہی چمک دار جملے۔ لیکن ان میں وہ شوخی نہیں رہی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی افتاد آ پڑی ہو۔ جیسے سفید بنگلہ شیش محل کے محرابوں سے لڑھک کر غلام گردش میں آ گرا ہو۔

شام ہوتے ہی سفید بنگلے کے مکینوں پر تشویش کا عالم چھا جاتا ہے۔ رات کو وہ ہر آہٹ پر گھبرا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ اور ان کے دل دھڑکنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ان میں سے کسی سے پوچھئے تو وہ حیرانی سے آپ کی طرف دیکھے گا اور بس۔

فوضیہ سے پوچھئے تو اس کی آنکھیں دھندلا جائیں گی اور وہ دیوانوں کی طرح آپ کی طرف دیکھنے لگے گی۔ فوضیہ بے چاری بتائے بھی کیا۔ اسے کچھ معلوم بھی ہو۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو نوبت اس حد تک نہ پہنچتی۔ اسے تو ابتدا ہی سے ایسے ریشمیں ماحول میں پالا گیا تھا جہاں بات معلوم ہی نہیں ہو سکتی۔ اس سے کیا پوچھنا اور پھر وہ بے چاری تو بستر پر پڑی رہتی ہے۔ نقاہت کی وجہ سے رنگ زرد ہو چکا ہے۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے ہیں اور گویا وہ اپنے آپ سے جا چکی ہے۔

نوازش سے پوچھئے تو وہ مونچھ مروڑنے لگے گا۔ اس کی آنکھ میں میلی سی چمک لہرائے گی۔ دفعتاً اپنی حیثیت بھول کر اسے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگے گا لیکن اس کے باوجود وہ آپ کی بات کا جواب نہیں دے گا اور جواب میں کچھ کہے گا بھی تو اسے اصل بات سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ "پھر کیا ہوا!؟" وہ مسکرائے گا۔ "رات کو جاگنا پڑتا ہے تو کیا ہوا۔ اپنے لئے کچھ مشکل نہیں۔ ہم نے تو راتیں آنکھوں میں گزار دی ہیں۔ ہاں کیا پوچھتے ہو اپنی بات۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ ہونہہ۔"

فوضیہ کی ماں بڑی بیگم سے پوچھئے تو وہ یوں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرے گی جیسے کوئی گرا ہو شخص فوراً اٹھنے کی کوشش کرتا ہے کہ کوئی دیکھ نہ پائے۔ "بات کیا ہے؟" بڑی بیگم درشتی سے کہے گی۔ "شکر ہے اس کی جان بچ گئی۔"

ڈاکٹر سے پوچھئے تو وہ جواب دے گا۔ "ول ول---- شی از آل رائیٹ۔ معمولی شاک کا کیس ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔" اور سفید بنگلے کے نوکروں سے پوچھئے۔ مگر ان سے کیا پوچھنا۔ وہ تو نوکر ٹھہرے۔ بے چارے خواہ مخواہ سہمے ہوئے ہیں۔

خواہ مخواہ----!

آدھی رات کے وقت سفید بنگلے کا وہ پروقار سکوت ٹوٹ جاتا ہے اور بیگم کی خواب گاہ سے چیخوں کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ ننگی چیخیں جیسے ریشم میں ملبوس گڑیا کپڑے پھاڑ کر مخملی کیس سے باہر نکل آئی ہو۔ اول تو شریف گھرانے کی بیگم کی خواب گاہ سے آدھی رات کے وقت چیخوں کا سنائی دینا اور پھر بیگم کا نوازش کو پکارنا۔ نوازش ایک معمولی موٹر ڈرائیور۔ نوازش---- بیگم کی آواز بنگلے میں یوں گونجتی ہے جیسے وہ پکار رہی ہو، منتیں کر رہی ہو۔

فوضیہ کی چیخیں سن کر بڑی بیگم جاگ پڑی ہے۔ آج پھر اس کے ہونٹ ہلتے ہیں اور دل ڈوب جاتا ہے۔ اور وہ محسوس کرتی ہے جیسے نوازش سامنے کھڑا مونچھ مروڑ رہا ہو۔ نوازش ایک معمولی خدمت گزار اس کے روبرو کھڑا ہو کر مونچھ مروڑے۔ اف آپا کی چیخوں کی آواز سن کر آسیہ کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ گھبرا کر پھر سے آنکھیں بند کر کے پڑ جاتی ہے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ جیسے کوئی چیخ ہی نہ رہا ہو۔

نرس بیگم کی چیخ سن کر ایک نظر اس کی طرف دیکھتی ہے اور پھر احتیاط سے کاغذ کی سلپ کی نشانی رکھ کر ناول بند کر دیتی ہے۔ پھر پنجوں کے بل چل کر خواب گاہ کے دروازے کی چٹخنی کھول کر واپس کرسی پر آ بیٹھتی ہے۔ اور یوں مطمئن ہو کر بیٹھ جاتی ہے جیسے بیگم کی چیخ بھری پکار ایک معمولی سی بات ہو۔

بیگم کی چیخوں کی آواز سن کر نوازش پہلے تو گھبرا کر جاگ پڑتا ہے۔ پھر آنکھیں ملے بغیر مسکرانا شروع کر دیتا ہے۔ پھر وہ اپنا اوور کوٹ کھونٹی سے اتار کر چوڑے شانوں پر ڈال لیتا ہے اور مونچھ مروڑتا ہوا بیگم کی خواب گاہ کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چل پڑتا ہے۔

خواب گاہ میں داخل ہو کر وہ شان استغنا سے بیگم کی چارپائی کے قریب کھڑا ہو کر کھرج آواز میں کہتا ہے۔ "بیگم صاحبہ کچھ فکر نہ کرو۔ نوازش تمہارے پاس ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ مونچھ مروڑنے لگتا ہے اور اس کی آنکھوں میں دو دیئے روشن ہو جاتے ہیں۔ نوازش کی آواز سن کر بیگم کی چیخیں بند ہو جاتی ہیں۔ آواز بیٹھ جاتی ہے اور وہ زیر لب کہتی ہے۔ "نوازش وہ آ رہے ہیں۔ وہ نوازش---- وہ........." یہ کہتے ہوئے وہ اٹھنے کی کوشش کرتی ہے۔ "پڑی رہو بیگم۔ پڑی رہو۔" نوازش تحکمانہ انداز سے کہتا ہے۔ "جب نوازش یہاں موجود ہے تو کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" "نوازش---- نوازش۔" بیگم کی آواز مدھم پڑ جاتی ہے جیسے کوئی پرائیویٹ بات کہہ رہی ہو۔ اس کے ہونٹ ہلتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور سفید بنگلے پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔

نوازش ایک نظر بیگم کی طرف دیکھتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں دو شعلے روشن ہوتے ہیں۔ پھر وہ پروقار انداز سے کمرے سے باہر نکل جاتا ہے اور نرس چٹخنی بند کر کے پھر سے "فار ایور ایمبر" کے مطالعے میں کھو جاتی ہے۔

ساتھ والے کمرے میں آسیہ زور سے آنکھیں بند کر لیتی ہے اور پہلو بدلنے لگتی ہے اور بڑی بیگم ایک لمبی آہ بھر کر نہ جانے کس سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ اور دور کتے رونے لگتے ہیں جیسے وہ واقعہ کی اہمیت سے واقف ہوں۔ اور نوازش اپنے کمرے میں پہنچ کر لحاف میں بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیتا ہے اور اسے مٹھی میں دبا کر حقے کی طرح کش بھرنے لگتا ہے۔ بار بار چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہوئے ان جانے میں گنگناتا ہے۔ "اب کون تجھے سمجھائے۔"

نوازش نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ بیگم صاحبہ رات کو ڈر کر چیخیں کیوں مارتی ہیں اور خاص طور پر اس کا نام لے کر کیوں پکارتی ہیں۔ اور پھر جب وہ بیگم صاحبہ کی خواب گاہ میں جا کر اسے تسلی دیتا ہے تو اس کی آواز سن کر کیوں مطمئن ہو کر سو جاتی ہے۔ وہ اس واقعہ کو خصوصی اہمیت نہیں دیتا بلکہ اب تو وہ اسے ایک دلچسپ کھیل سمجھنے لگا ہے۔ اگرچہ اس کھیل میں وہ اپنے پارٹ کو بے حد اہم سمجھتا ہے۔ اہم تو سمجھنا ہی ہوا کیونکہ بیگم صاحبہ پر کسی اور کی آواز کا اثر نہیں ہوتا بلکہ اس کی دیوانگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ البتہ جب پہلی مرتبہ رات کو بیگم نے چیخیں ماری تھیں تو وہ گھبرا گیا تھا اور یوں بے تحاشا خواب گاہ کی طرف بھاگا تھا جیسے نہ جانے کیا ہو گیا ہو۔ لیکن اب اسے معلوم ہے کہ اس کی آواز سن کر بیگم کا ڈر دور ہو جائے گا۔ جبھی تو بیگم کے سامنے جا کر اس کی آواز میں تحکمانہ لہجہ پیدا ہو جاتا ہے اور خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی وہ ان جانے میں مونچھ مروڑنے لگتا ہے۔

اس بات کے متعلق سفید بنگلے کے کسی فرد نے بھی نہیں سوچا۔ وہ سب تو گھبرائے ہوئے ہیں۔ البتہ ڈاکٹر نے اس بات پر بہت غور کیا تھا۔ اور غور و خوض کرنے کے بعد اعلان کر دیا تھا کہ اس سانحہ سے بیگم کے ذہن کو جھٹکا لگا ہے اور ابھی وہ شاک کی حالت میں ہے۔ آپ جانتے ہیں، ایک بار ڈاکٹر کچھ سوچ لے تو اس کے لئے مزید سوچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب روزانہ آ کر مریضہ کو

دیکھتے ہیں۔ اس کی نبض ٹٹولتے ہیں۔ زبان کا رنگ دیکھتے ہیں۔ ٹونٹیاں لگاتے ہیں۔ دو ایک سوال پوچھتے ہیں اور پھر ٹیکہ لگا کر نرس کو ہدایت دینے کے بعد اپنا بکس اٹھا کر باہر نکل جاتے ہیں۔

باہر برآمدے میں بڑی بیگم، آسیہ اور امجد ان کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں۔ "ڈاکٹر صاحب----" بڑی بیگم انہیں دیکھ کر کہتی ہیں۔ "آج پھر ڈاکٹر صاحب۔" اور آسیہ خوف سے آنکھیں جھپکنے لگتی ہے۔

"ہوں----" ڈاکٹر صاحب یوں سوچ میں پڑ جاتے ہیں جیسے اس واقعہ کا پھر سے جائزہ لے رہے ہوں۔ ایک ساعت کے بعد وہ سر اٹھاتے ہیں۔ "ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبرائیے نہیں۔ ابھی شاک کا اثر نہیں گیا۔ میں کل پھر آؤں گا۔ خدا حافظ۔"

صرف تین کردار اس واقعہ سے متعلق اہم تھے۔ پاؤڈر سے تھپی ہوئی ایک معصوم گڑیا، ایک بے جان کلدار گڈا اور بالآخر ایک جیتا جاگتا نوکیل مونچھ والا میلا سا ڈرائیور۔

گڑیا بالکل ویسی ہی تھی جیسے مال روڈ پر چلتی پھرتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ وہ پاؤڈر سے اس حد تک تھپی ہوئی تھی جیسے مال روڈ کی گڑیاں ہوتی ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر بھی سرخی کی ایک تہہ چڑھی رہتی تاکہ آتے جاتے لوگ انہیں نظرانداز نہ کر سکیں۔ اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ہونٹوں کو سرخ کرنے سے اس کا مقصد کیا ہے اور راہ چلتے لوگ کیوں اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہیں۔ وہ چپ چاپ موٹر سے باہر نکلتی۔ ایک وقار بھرے انداز سے ادھر ادھر دیکھتی۔ راہ چلتوں کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے اس کی ناک نفرت سے سکڑتی اور پھر چپ چاپ شاپنگ میں مصروف ہو جاتی۔ اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ سفید چہرے کے پس منظر اس کے ہونٹ خطرے کا نشان بنے ہوئے ہیں اور راہ گیروں کو عورت اور خطرہ دونوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ سوچتی بھی کیوں۔ سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ شوہر صاحب جائیداد تھے۔ بنگلہ تھا۔ ساز و سامان تھا۔ موٹر تھی۔ میز پر کھانا خود بخود لگ جاتا تھا۔ پرس یوں روپے اگلتا جیسے الہ دین کا جن تابع فرمان ہو۔ اسے تو صرف یہی تکلیف تھی کہ راہ چلتے لوگ اور وہ بھی عام سے لوگ اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ پاؤڈر تو وہ صرف اس لئے لگاتی تھی کہ جلد نرم رہے۔ کاجل کی دھار اس لئے کھینچتی تھی کہ بینائی تیز ہو۔ اور ہونٹوں پر سرخی---- لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہر بات کی وجہ بیان کی جائے۔ چاہے کسی وجہ سے لگاتی تھی۔ بس لگاتی تھی۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ جس میں دوسروں کو دخل دینے کا حق نہ تھا۔ مال روڈ کی اس گڑیا کے دل میں کسی کے خلاف بغض یا نفرت نہیں تھی۔ الٹا اسے تو ان پر ترس آتا تھا۔ اور بازاروں میں گھومنے والے عوام کی حالت پر اسے سچے دل سے افسوس ہوتا تھا کہ دیکھنے کے علاوہ انہیں بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں۔ کپڑے پہننے کا ڈھنگ نہیں اور چلنے پھرنے میں ان کی حرکات کس قدر بھدی ہوتی ہیں۔

سماجی گڑیا ہونے کے علاوہ فطری طور پر بھی ایک گڑیا تھی۔ سماجی زندگی نے تو اس پر صرف رنگ و روغن کیا تھا اور جیتے جاگتے میلے عوام سے محفوظ رکھا تھا۔ وہ خوب صورت تھی جیسے کہ فطری گڑیاں ہوتی ہیں۔ مگر وہ خوب صورتی صرف دیکھنے تک ہی محدود تھی۔ گڑیا خانے نے اس کی جذبات منجمد کر رکھے تھے۔ اور اسے ایسی حسین ساکن جھیل بنا دیا تھا جس میں سطحی لہروں کے علاوہ کوئی مد و جزر پیدا نہیں ہوتا۔

وہ ایک ایسے شریف گھرانے میں پیدا ہوئی تھی جہاں بہت سی گڑیاں مخملی کیسوں میں رہتی تھیں۔ وہ سب مقررہ وقت پر چلتی پھرتیں۔ مقررہ وقت پر موزوں باتیں کرتیں۔ مقررہ وقت پر باہر جاتیں اور مقررہ وقت پر اپنے اپنے کیسوں میں پڑ کر سو جاتی تھیں۔ ان کی ہر بات مناسب طور پر عمل میں آتی تھی۔ مناسب اور موزوں فقرے انہیں ازبر کرا دیئے جاتے تھے۔ اور مناسب اور موزوں حالت میں وہ انہیں دہرا دیتی تھیں۔

اس گڑیا سے چند قدموں کے فاصلے پر جیتے جاگتے انسان بھی رہتے تھے۔ مگر اصول کے مطابق ان کی طرف غور سے دیکھنا مناسب نہ تھا۔ بیرا لوگ---- چوکیدار لوگ اور خدمت گار کیا اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں غور سے دیکھا جائے۔ ان سے تو صرف خدمت کروائی جا سکتی ہے۔ نوکروں کو چھوڑیئے، یہاں تو عزیز و اقارب کو بھی غور سے دیکھنا گناہ تھا۔ غور سے دیکھنا تو ایک غیر مہذبانہ فعل ہے جو دخل در معقولات کے مترادف ہے۔ گڑیا گھر میں تو دیکھنے کی بجائے دکھائی دینے کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اور وہ سب اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ اچھے اور پیارے نظر آئیں۔

بچپن ہی سے فوضیہ کو گڑیا گھر کے اصولوں کی پوری تعلیم دی گئی تھی۔ صبح سویرے اسے نہلایا دھلایا جاتا۔ اور اس کے بال بنا کر ربن لگا کر منہ پر پاؤڈر سرخی جما کر تیار کر دیا جاتا۔ پھر وہ اپنے جیسی ایک گلابی گڑیا بغل میں دبا کر باغ میں جا بیٹھتی۔ زمین پر نہیں، بچہ گاڑی میں۔ یا بید کی اس کرسی پر جو اس کے لئے بنائی گئی تھی۔ زمین پر تو خدمت گاروں کے بچے کھیلا کرتے تھے۔ پھر اس زمین پر وہ کیسے بیٹھ سکتی تھی۔ البتہ تیتری کی طرح وہ باغ میں ادھر ادھر دوڑ سکتی تھی۔ یا مہمانوں کے آنے پر ڈرائنگ روم میں مور کی طرح چل پھر سکتی تھی۔

ڈرائنگ روم کے لئے اسے چند ایک خوب صورت جملے سکھا دیئے گئے تھے۔ مزاج اچھے ہیں۔ تھینک یو۔ آپ کو نظم سناؤں۔ کیسے اچھے ہیں آپ۔ ڈیڈی، ممی اور شب بخیر---- جیسے خوب صورت جملے۔ ڈرائنگ روم پر ہی کیا موقوف تھا۔ ان کا تو سارا گھر ایک ڈرائنگ روم تھا۔ سارا دن وہ ڈرائنگ روم میں رہتی اور پھر رات پڑتی تو وہیں ایک کونے میں اسے ایک ریشمیں کیس میں احتیاط سے رکھ دیا جاتا۔

پھر وہ جوان ہو گئی۔ لیکن اس کی زندگی میں کچھ زیادہ فرق پیدا نہ ہوا۔ اگرچہ جسم میں عجیب و غریب قسم کے اضافے ہو گئے۔ سیدھے خطوط گھوم کر گولائیاں اختیار کر گئے۔ اعضاء پھول گئے۔ گندمی رنگ پر سفیدی نے یورش کر دی اور سفیدی میں سرخی کی جھلک پیدا ہو گئی۔ بال بنانے کا سٹائل بدل گیا۔ کپڑوں کی وضع قطع بالکل تبدیل ہو گئی۔ ان سکہ بند جملوں میں اضافہ ہو گیا جو گفتگو میں استعمال کئے جاتے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم بہت وسیع ہو گیا اور اس میں بہت سے اور گھرانے بھی شامل ہو گئے اور بہت سے نئے اجلے گدے اس کے حلقے میں داخل ہو گئے۔ اس کی مسکراہٹوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اس کی حرکات میں لے پیدا ہو گئی۔ لیکن ان تمام فروغی باتوں کے باوجود اس کی زندگی میں کوئی بنیادی تبدیلی واقعہ نہ ہوئی۔ خوش نما کنول کے پھولوں کے علاوہ جو اس نیلی جھیل میں اگ آئے تھے، اس کی زندگی وہی ساکن جھیل ہی رہی۔ گویا وہ کسی رنگ دار کیلنڈر پر چھپی ہوئی تصویر ہو۔

پھر جلد ہی ایک نیا کلدار گڈا ان کے ڈرائنگ روم میں آپہنچا اور وہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں سے فوضیہ کو ڈر لگتا تھا لیکن ساتھ ہی عجیب سی لذت بھی محسوس ہوتی۔ پھر اس گڈے نے تنہائی میں اس سے عجیب باتیں کرنی شروع کیں۔ ایسے جملے فوضیہ نے ڈرائنگ ردم میں کبھی نہ سنے تھے۔ اور اس نے محسوس کیا جیسے اس کلدار گڈے کے آنے سے ایک نئی انوکھی کھڑکی کھل گئی ہو جس سے ایک انوکھی دنیا کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔

اگر چند ماہ کے اندر اندر فوضیہ کی فرخ سے شادی نہ ہو جاتی اور اسے مزید کلدار گڈوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ نہ تو فرخ کی باتوں میں کوئی انوکھی خصوصیت تھی اور نہ اس کی نگاہوں میں کوئی انفرادیت۔ اس کے وہ جملے بظاہر نئے ہونے کے باوجود بے حد پرانے اور سکہ بند تھے اور اس کی نگاہیں بھی صرف دکھانے کی تھیں، دیکھنے کی نہیں جنہیں فرخ نے مسلسل عشق سے اپنا رکھا تھا۔ لیکن فوضیہ کو ان تفصیلات کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ انوکھے پن کا وہ سراب در حقیقت اس لئے تھا کہ اس کی اپنی زندگی میں نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ لہروں کی سی وہ حرکت جو وہ محسوس کرنے لگی تھی، محض سطحی تھی۔ اگر فرخ کی جگہ کوئی اور گڈا ان دنوں اس سے آملتا تو بھی فوضیہ کے احساسات وہی ہوتے۔

شادی کے بعد بھی فوضیہ کی زندگی میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا کیونکہ وہ ایک گڑیا گھر سے نکل کر دوسرے میں چلی گئی۔ جہاں ویسے ہی ریشمیں پردے لٹک رہے تھے۔ ویسے ہی شوکیس رکھے ہوئے تھے۔ ویسا ہی باغیچہ تھا اور ویسے ہی لوگ تھے بلکہ شادی کے بعد تو وہ بالکل گڑیا بن کر رہ گئی۔ اس کے رکھوالوں میں فرخ کا اضافہ ہو گیا جو صبح شام اس کے لئے دروازے کھولتا۔ کرسیاں کھنچتا، جگہ بناتا، کوٹ پہناتا۔۔۔۔ اس کا پرس اٹھاتا اور مسکرا کر ڈارلنگ کہنے کے لئے ہر وقت تیار کرتا۔ اس کے علاوہ اب یہ بیگم فوضیہ بن گئی تھی۔ گو فرخ اسے فزی کہا کرتا تھا اور وہ اپنی فزی کو یوں رکھتا جیسے وہ کانچ کی بنی ہوئی ہو اور اگر احتیاط نہ کی تو ٹوٹ جائے گی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ زیادہ احتیاط سے ٹوٹنے کی صلاحیت اور بڑھ جاتی ہے۔

فرخ کے گھر میں پہلی مرتبہ فوضیہ نے نوازش کو دیکھا۔ لیکن اس کے لئے تو وہ محض شوفر تھا، نوازش نہیں۔ اس نے کبھی اسے دیکھا ہی نہ تھا اور اسے اس بات کا علم نہ ہوا تھا کہ وہ جسم کا دبلا پتلا ہے۔ اس کا قد بے حد موزوں ہے۔ چھاتی چوڑی ہے اور اس کی نوکیلی مونچھیں اور متبسم آنکھیں بے حد شریر ہیں۔

عام طور پر فوضیہ کو نوازش سے بات چیت کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔ کیونکہ ہر وقت فرخ خود وہاں موجود ہوتا تھا۔ البتہ جب کبھی اسے جائیداد کے انتظامات کے سلسلے میں کراچی جانا پڑتا اور فوضیہ سفید بنگلے میں اکیلی رہ جاتی تو اسے نوازش کو بلانا پڑتا تھا۔ باہر پورچ میں پنجوں کے بل کھڑے اسے چلاتے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا جیسے کوئی پالتو کوئل تو ہو، تو ہو کی رٹ لگا رہی ہے۔

نوازش اس کی آواز سن کر اطمینان سے سگریٹ کے چند آخری کش لگاتا اور پھر اوور کوٹ شانوں پر ڈال کر سیٹی بجاتا ہوا بیگم صاحبہ کی طرف دیکھے بغیر سیدھا گیراج کی طرف چل دیتا۔ اس نے کبھی بیگم سے پوچھنے کی تکلیف نہ کی تھی۔ "کیا حکم ہے حضور؟" نہ ہی کبھی اس نے اسے حضور کہا تھا۔ گیراج سے گاڑی نکال کر وہ پورچ میں لا کھڑا کرتا اور پھر چپ چاپ سگریٹ پیتے ہوئے انتظار کرتا۔

نوازش فطری طور پر موٹر ڈرائیور تھا۔ اس کے کردار میں استغنا کا عنصر حاوی تھا۔ چلتا یوں تھا جیسے بادلوں کا دیوتا زمین پر آگیا ہو۔ یوں موٹر چلاتا تھا جیسے وہ اس کے ہاتھوں کا ایک کھلونا ہے۔ حرکت اور رفتار کے سلسلے میں اس کی ذہنیت خانہ بدوش کی سی تھی۔ اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ وہ بیگم یا صاحب کا ڈرائیور ہے۔ اس کے برعکس وہ سمجھتا تھا کہ وہ موٹر کا ڈرائیور ہے جو اس کے اشاروں پر چلتی ہے۔

جبھی تو نوازش کی شخصیت میں "جی حضور" کی جھلک تک نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت چمک لہراتی - ہونٹوں پر ایک فلمی دھن کھیلتی۔ اور گردن کے زاویے سے لاپرواہی نمایاں رہتی۔ اس نے کبھی بیگم کو غور سے نہ دیکھا تھا۔ اور نہ اسے اہمیت دی تھی۔ اس کے نزدیک وہ عورت نہیں بلکہ صرف صاحبہ تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کبھی وہ مسکراہٹ نہ چمکی تھی جو عورتوں کو دیکھ کر آپ ہی آپ اس کی آنکھوں میں جھلک آتی تھی۔

ممکن ہے فوضیہ نے دل میں شعوری طور پر اس کا اعتراف کئے بغیر نوازش کی بے پروائی کو محسوس کیا ہو مگر اس نے کبھی اس کا اظہار نہ کیا تھا۔ ایک نوکر کے متعلق سوچنا اس کے نزدیک مناسب نہ تھا۔ صرف ایک بار اس نے نوازش کے خلاف غصہ محسوس کی تھا۔ اس روز اس کے احساسات مجروح ہو گئے تھے۔ اس کی توہین ہو گئی ہو اور وہ آدھ گھنٹے تک بل کھاتی رہی تھی۔

ان دنوں فوضیہ نے موٹر چلانے کی مشق شروع کر رکھی تھی۔ اس روز ایک ویران سڑک پر خود موٹر چلا رہی تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر نوازش بیٹھا اپنی ہی دھن میں مونچھ مروڑ رہا تھا۔ موڑ پر ایک تانگے کے آجانے سے دفعتاً" فوضیہ کے ہاتھ کانپے۔ موٹر نے جھٹکا کھایا۔ فوراً" دو بھدے بھدے بازو اس کے گرد حائل ہو گئے اور اس کے بازوؤں اور ہاتھوں پر نوازش کے بازوؤں کا بوجھ پڑ گیا اور اس کا جسم گرفت میں آ گیا۔ "بیگم صاحبہ" نوازش نے اسے ڈانٹا۔ اور دھکا دے کر فوضیہ کو پرے دروازے میں دھکیل دیا ور خود اس کی جگہ لے لی۔ اور بات کئے بغیر موٹر چلانا شروع کر دیا۔ پھر یہی نہیں، وہ یوں بے پروائی سے ایک فلمی دھن گنگنانے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے اس کے ساتھ والی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہی نہ ہو۔

وہ پہلا روز تھا جب فوضیہ نے محسوس کیا کہ وہ بیگم صاحبہ نہ تھی بلکہ ایک گڑیا تھی جسے ایک بدتمیز نوکر نے زمین پر پھینک دیا تھا۔

اس کے بعد فوضیہ نے پہلی مرتبہ غور سے نوازش کی طرف دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا کہ وہ نوازش تھا، شوفر نہیں۔ "کتنا بدتہذیب ہے۔" اس نے دل میں کہا تھا۔ اس کے بعد فوضیہ اس واقعہ کو بھولنے کی کوشش میں کھو گئی تھی۔

انہیں دنوں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ ہجوم جلوس کی صورت میں سڑکوں پر گشت لگاتا تھا اور ایک مخصوص فرقے کے خلاف نعرے لگائے جاتے تھے۔ رات کے وقت شور و غل بلند ہوتا۔ اشتعال انگیز نعروں کی آوازیں آتیں اور پھر پکڑ لو، پکڑ لو کا ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ اگرچہ نہ تو فرخ اس مخصوص فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور نہ فوضیہ اور انہیں اس سلسلے میں کوئی خدشہ نہ تھا۔ پھر بھی ان دونوں کو عوام کی اس بدتمیزی پر غصہ آتا تھا۔ فرخ شور و غل سن کر غصے سے بھوت بن جاتا۔ "جنگلی۔" وہ دانت بھینچ کر کہتا۔ "انہیں گولی سے ختم کر دینا چاہئے۔ بدتمیز دیوانے-----!" لیکن رات کے وقت جب کبھی آوازیں بہت قریب آجاتیں تو وہ غصے کا اظہار کرنا بھول جاتا اور خوف سے کانپنے لگتا۔ "یہ کیا حماقت ہے۔ فزی ادھر آجاؤ۔ اور ادھر دیکھو۔ اگر یہ لوگ بنگلے کی طرف آجائیں تو ہم ادھر سے نوکروں کے کوارٹرز کی طرف چلے جائیں گے۔ وہ جگہ محفوظ ہے سمجھیں بیگم۔ ان فسادیوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ ان کا مطلب تو لوٹنا ہے لوٹنا۔ مذہب تو محض دکھلاوا ہے۔ کمینے۔" وہ زیر لب کہتا کہ کوئی سن نہ لے۔ فوضیہ حیران ہوتی تھی کہ صبح کے وقت فرخ اس قدر غصہ دکھاتا ہے لیکن رات کو چھپنے کے لئے کونے تلاش کرتا ہے۔ بہرحال وہ معمولی سی حیرانی محسوس کرتی اور اسے بھول جاتی۔ کیونکہ اسے خود فسادیوں کے خلاف غصہ آتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ان اصولوں سے منحرف ہو رہے تھے جن کے تحت فوضیہ کو تربیت دی گئی تھی۔

پھر فرخ کو کراچی سے ایک ضروری بلاوا آگیا۔ جانے سے پہلے اس نے فوضیہ کو ہدایات دیں۔ "فزی ان شرپسندوں کی قطعی پروا نہ کرنا۔ یہ ذلیل لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ سمجھیں----- اگر ضرورت پڑے تو پولیس کو فون کر دینا اور اگر وہ بنگلے میں آداخل ہوں۔ اول تو ان کی جرات نہیں ہو سکتی، لیکن ایسا ہو ہی جائے تو تم نوکروں کے کوارٹروں میں چلی جانا۔ میں انہیں ہدایات دے جاؤں گا اور چوکیدار اور شوفر یہیں بنگلے میں کونے والے کمرے میں سوئیں گے۔ سمجھیں ڈارلنگ۔"

فرخ کے جانے کے بعد اسی رات ہجوم کا شور غوغا سن کر فوضیہ جاگ پڑی۔ اور گھبرا کر اس نے چلانا شروع کر دیا۔ "چوکیدار، چوکیدار۔" ہجوم کا شور قریب آ گیا۔ وہ گھبرا گئی۔ اس حد تک گھبرا گئی کہ وہ تمام اصول بھول گئی۔ "نوازش----- نوازش۔" اس نے پہلی مرتبہ اس کا نام پکارا۔

شانوں پر بے پروائی سے کوٹ ڈالے نوازش ایک شان استغنا سے اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ "نوازش----- نوازش۔" وہ چلانے لگی۔ "وہ----- وہ۔ وہ آرہے ہیں۔ وہ" "چلاؤ نہیں بیگم صاحبہ۔" اس نے درشتی سے ڈانٹا۔ "اگر انہوں نے آواز سن لی تو........." اس کی ڈانٹ سے وہ بوکھلا گئی۔ لیکن ہجوم کا شور قریب تر آچکا تھا۔ اس لئے اس کا غصہ ڈر میں تبدیل ہو گیا۔ "وہ آرہے ہیں۔ وہ آرہے ہیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں پولیس کو فون کرتی ہوں۔" وہ ٹیلی فون کی طرف بھاگی۔ نوازش اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ "چپ کرو بیگم صاحبہ وہ سن لیں گے۔" وہ غرایا۔ اس ساکن نیلی جھیل میں پہلی مرتبہ ایک طوفان ابل آیا۔ گویا ایک بہت بڑی بلونی ساکن نیلے پانی کو بلونے لگی تھی۔

غصے میں اس نے جھٹک کر اپنے ہاتھ چھڑا لئے۔ اور ساتھ والی کرسی پر جا بیٹھی۔ نوازش نے ایک شان استغنا سے سگریٹ سلگایا۔ اسے مٹھی میں تھام کر حقے کی طرح دو کش لگائے اور پھر کھلے دروازے میں جا کر کھڑا ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ہجوم سفید بنگلے میں داخل ہو گیا۔ ان کے نعروں سے خواب گاہ میں رکھی ہوئی چیزیں لرزنے لگیں۔ نوازش کو دروازے میں بے خبری سے دیکھ کر بیگم نے ایک جست عقبی دروازے کی طرف بھری۔ "میں نوکروں کے کوارٹروں میں۔" ابھی اس کے منہ سے پورا جملہ نہ نکلا تھا کہ نوازش نے لپک کر اسے بچے کی طرح اٹھا لیا اور بستر پر دے مارا۔ "چپکے سے پڑی رہو بیگم۔" وہ غصے سے بولا۔

جو ہے کہ جب تک نواز ش موجود ہے، کسی میں جرات نہیں ہے کہ..........‘‘

نوازش کی اس گرفت نے نہ جانے کیا کر دیا۔ کسی انجانے شعلے سے بھڑک کر انگارے اڑے اور پھر سون کر کے پانی میں جا گرے۔

بستر پر گرتے ہی وہ نقاہت محسوس کرنے لگی جیسے صدیوں کی بیمار ہو۔ نیلی جھیل کا وہ طوفان ختم ہو چکا تھا اور گویا ایک لاش کنارے پر آ لگی تھی۔ اب اسے خوف و خطر کا کوئی احساس نہیں رہا تھا۔ باہر ہجوم چلا رہا تھا۔ لیکن وہ یوں نوازش کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ ہجوم سینما کے پردے کا ہجوم ہو۔ نوازش اطمینان سے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ پھر دفعتاً‘‘ وہ چلایا۔ ’’ابے او بنگلے سے باہر نکل جاؤ۔ میں کہتا ہوں، نکل جاؤ۔ کوئی نہیں ہے یہاں۔ جاؤ۔‘‘

ہجوم باہر نکل گیا۔ بنگلے پر موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ نوازش نے ایک نیا سگریٹ سلگایا۔ اور پھر فوضیہ کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ’’تم سے جو کہا ہے بیگم کہ جب تک میں یہاں ہوں، کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا۔ کنڈی لگا لو۔‘‘ اس کی آواز میں تحکم تھا۔ انداز میں استغنا تھا۔ فوضیہ اس کی بات سن کر یوں کنڈی لگانے کے لئے اٹھی جیسے دفعتاً‘‘ بیگم سے باندی بن گئی ہو۔ پھر دیر تک وہ چارپائی پر پڑی رہی جیسے پتوار کے بغیر ناؤ ساکن سمندر پر بہے جا رہی ہو۔

صبح سویرے جب وہ بیدار ہوئی تو اس کے اردگرد ایک عجیب لٹا پٹا جہان بکھرا پڑا تھا۔ نیلی جھیل میں ادھر ادھر گڑیا گھر کے ٹکڑے بہہ رہے تھے۔ اصولوں اور قاعدوں کے بت بے جان پڑے تھے۔ تہذیب وہ تمدن کے دیوتا اوندھے منہ پڑے تھے۔ دیر تک وہ اس ویرانی کو دیکھتی محسوس کرتی رہی۔ پھر دفعتاً‘‘ اسے یاد آیا کہ وہ فوضیہ ہے۔ اور ایک تہذیب یافتہ سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے۔ خوف ناک عزم سے وہ اٹھ بیٹھی۔ ایک شدید کوشش سے اس نے اپنے ذہن سے اس ویرانے کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ اور اس شب کے واقعات کو اپنے ذہن کی گہرائیوں میں دفن کر کے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔ اور معاً‘‘ وہی گڑیا گھر اس کے اردگرد معلق ہو گیا۔ اصولوں کے بت پھر سے قائم ہو گئے۔ تہذیب و تمدن کے دیوتا مسکرانے لگے۔

فرخ کی واپسی پر فوضیہ کو یاد بھی نہ تھا کہ اس شب کیا واقعہ ہوا تھا۔ اس لئے فرخ کو بتانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ باقی رہا نوازش---- لیکن وہ کسی نوازش کو نہیں جانتی تھی۔ البتہ وہ شوفر---- مگر اب اسے موٹر میں بیٹھنے سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ پھر شوفر کون---- کیسا شوفر----؟

چھ ماہ گزر گئے۔ اصول اور قاعدوں کے بت اپنی اپنی جگہوں پر براجمان رہے جیسے کبھی گرے

ہی نہ ہوں۔ تمدن کے دیوتا کی روغنی مسکراہٹیں اور بھی دل آویز ہو گئیں۔ جیسے وہ کبھی دھندلی پڑی ہی نہ ہوں۔ کلدار گڈا دروازے کھولتا رہا، معصوم گڑیا خوب صورت اور ساکن نیلی جھیل میں رنگ دار مچھلی کی طرح تیرتی رہی۔ چھ ماہ گزر گئے۔

پھر ایک روز فرخ نے آ کر فوضیہ سے کہا۔ ’’ہم کراچی جا رہے ہیں۔ تم ساتھ چلو گی ڈارلنگ۔ ہم کل میل میں روانہ ہوں گے۔ شوفر کو ساتھ لے جائیں گے۔‘‘ فرخ کا آخری جملہ فوضیہ نے نہ سنا۔ وہ اسے سننا چاہتی نہ تھی۔

اگلے روز وہ اس میل میں سوار ہو گئے جسے جھمپیر پر اس تباہ کن حادثے سے دوچار ہونا تھا۔ سیکنڈ کلاس کے چھوٹے ڈبے میں سارا دن کلدار گڈے کی نگاہیں گڑیا کے گرد گھومتی رہیں۔ اور روغنی گڑیا کا تبسم چلتا رہا۔ پھر وہ لیٹ گئے۔ سیکنڈ کلاس کے سپرنگ انہیں تھپکنے لگے۔ دفعتاً‘‘ ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ وہ جاگ پڑی۔ سامنے سرخ شعلے لپک رہے تھے۔ ان شعلوں نے فرخ کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کا چہرہ موت کی گرفت میں بھیانک ہو رہا تھا۔ فوضیہ نے کوشش کی کہ وہ چیخ مار کر جاگ پڑے۔ وہ اسے خواب سمجھتی تھی۔ مگر اس کے حلق میں گویا آواز نہ تھی۔ شعلے تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر دفعتاً‘‘ دھڑام سے گاڑی کا دروازہ کھل گیا اور نوازش اس کی طرف لپکا۔ ’’نوازش-------‘‘ اس نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔

چھ ماح بعد وہ پہلا دن تھا جب اس نے نوازش کو دیکھا تھا۔ نوازش نے اسے اٹھا لیا اور دیوانہ وار بھاگا۔ جب اسے ہوش آیا تو نوازش مونچھ مروڑتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔ ’’تم فکر نہ کرو بیگم۔ جب تک میں تمہارے پاس ہوں..........‘‘ وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ دوسری دفعہ جب اسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھی اور نوازش دروازے میں نرس کے پاس کھڑا مونچھ مروڑ رہا تھا۔

ماں، بھائی، بہن اور نرس کی موجودگی کے باوجود اب وہ اکیلی اس سفید بنگلے میں سارا دن بستر پر پڑی رہتی ہے۔ سارا دن وہ گڑیا گھر اس کے گرد قائم رہتا ہے۔ اصولوں اور قاعدوں کے بت بے بسی سے اس کی طرف یوں دیکھتے ہیں، گویا منتیں کر رہے ہوں۔ تہذیب و تمدن کے دیوتا انگلیاں اٹھائے اسے خبردار کرتے رہتے ہیں۔ مگر جب رات پڑتی ہے تو وہ چیخ کر جاگ اٹھتی ہے۔ اس کی نگاہوں تلے ایک لٹا پٹا جہان بکھرا ہوتا ہے۔ گڑیا گھر کے ٹکڑے نیلی جھیل کے خوفناک طوفان میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجتے ہیں۔ اصولوں اور قاعدوں کے بت اوندھے پڑے ہوتے ہیں۔ اور تہذیب و تمدن کے دیوتا شرم سے منہ ڈھانپ لیتے ہیں۔ اور وہ چیخ مار کر پکارتی ہے۔ ’’نوازش----- نوازش۔‘‘ اس کی پکار سن کر بڑی بیگم کا دل ڈوب جاتا ہے اور وہ محسوس کرتی ہے جیسے سفید بنگلہ محل کے محرابوں سے گر کر غلام گردش میں آ پڑا ہو۔ اور آسیہ گھبرا کر آنکھ بند کر لیتی ہے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ جیسے

کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے گڑیا گھر جوں کا توں قائم ہو۔

---

# دودھیا سویرا

شہر سے دور گرینڈ ٹریفک روڈ کے کنارے پر درختوں کے جھنڈے کے نیچے وہ ایک مختصر سا قبرستان تھا۔ اس میں صرف بیس پچیس قبریں تھیں۔ جن میں بیشتر کچی تھیں۔ پختہ قبروں میں صرف دو یا تین نئی معلوم ہوتی تھیں اور ان میں سے ایک سفید ٹائیلوں کی بنی ہوئی تھی۔ اس مختصر قبرستان کے غربی کنارے پر ایک مسجد تھی۔ جس کے باہر چبوترا سا بنا ہوا تھا۔ مشرقی کنارے کے سڑک کے پاس بس سٹینڈ کا بورڈ آویزاں تھا۔ جس کے پاس ایک کچے کمرے میں چائے کا سٹال تھا۔

قبروں پر درختوں کے سوکھے پتے بکھرے پڑے تھے۔ آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ اور قریب ہی پہاڑی نالہ جو جانی کے نام سے مشہور تھا' شور مچاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ان ٹنڈ منڈ درختوں تلے قبرستان میں وہ چاروں اپنے اپنے خیال میں کھوئے ہوئے تھے۔

پتلا دبلا نوجوان منہ میں پائپ دبائے پتلوں کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے اضطراب بھرے انداز سے سوکھے پتوں پر ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ رک جاتا اور ایک نظر غور سے قبروں کی طرف دیکھتا۔ اس کا ہونٹ ڈھلک جاتا۔ پائپ اور کوٹ کی اوپر والی جیب پر جھانکتا۔ پھر وہ آنکھیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا اور ایک لمبی آہ بھر کر پھر سے اضطراب بھرے انداز سے ٹہلنے لگتا۔

مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا شخص درخت سے ٹیک لگائے آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی جاذب نظر آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹ یوں بند تھے جیسے ڈرتا ہو کہ انہیں کھولا تو اس کا راز فاش ہو جائے گا۔ اس کے ماتھے پر کرب بھری تیوری چڑھی ہوئی تھی جیسے بند ہونٹوں کی وجہ سے دل کا تمام تر دکھ سمٹ کر پیشانی پر آگیا ہو۔ ہر چار پانچ منٹ کے بعد شدت جذبات سے جھرجھری سے لیتا اور پھر چونک کر مڑتا اور غور سے قبروں کی طرف حسرت سے دیکھتا اور اس کے گالوں پر ایک آنسوؤں ڈھلک آتا جسے چھپانے کے لئے وہ پھر سے آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔

گھٹے ہوئے جسم کا نوجوان کھدر کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس تھا اور ایک بڑے سے پتھر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ آنکھیں گویا انگاروں کی طرح روشن تھیں۔ چھاتی تنی ہوئی جیسے اسے سانس لینے میں بھی لذت محسوس ہو رہی ہو۔ اس کے انداز میں ایک عجیب بے نیازی تھی۔ ایک بے نام سی انبساط۔ اور چپ چاپ گویا بے تعلقی سے قبروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آجاتی۔ اور اس کے چہرے پر دودھیا سویرا اچھیل جاتا۔

مسجد کے چبوترے پر اچکن میں ملبوس ایک پاکیزہ صورت معمر آدمی دوزانو بیٹھا زیر لب خشوع سے کچھ پڑھ رہا تھا۔

قبرستان کے پیچھے شمال میں دور ٹیلے پر ایک گاؤں کے چند مکانات شام کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے تھے اور اس سے پرے شہر کے مینار اور فلک بوس عمارتوں کا ایک ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔

دفعتاً سارے آسمان پر بدلیاں چھا گئیں اور بوندیں پڑنے لگیں اور وہ چاروں قبرستان سے بس سٹینڈ کے مختصر سے چائے خانے کی طرف بھاگے۔ چائے خانے کا کمرہ بہت چھوٹا تھا۔ جس میں صرف ایک لمبا بینچ' ایک کرسی اور ایک لمبی میز پڑی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ سب دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ مونچھ والے نے کوئی بات کرنے کی غرض سے پتلے دبلے نوجوان سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ کو بہت صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ کتنے مضطرب ہیں آپ بھائی صاحب۔"

"مضطرب۔" پتلے دبلے نوجوان نے دہرایا۔ "نہیں۔ نہیں۔" وہ اضطراب بھرے انداز میں چلایا۔ "میں مضطرب تو نہیں۔ میری روئیداد سن کر کیا کریں گے آپ؟" وہ بولا۔ اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اپنی کتھا سنانے لگا۔

"مجھے اس بات کا دکھ ضرور ہے کہ وہ جوانمرگی کا شکار ہو گئی۔ اور آج اس قبرستان میں مٹی کے ڈھیر تلے بے بس پڑی ہے۔ مگر جہاں تک میرا تعلق ہے' میں خوش ہوں۔ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ میں اس سحر سے نکل آیا ہوں۔ اف کس قیامت کا سحر تھا۔ جیسے کسی نے جادو کر رکھا ہو۔ ہاں وہ جادوگرنی تھی۔" وہ خاموش ہو گیا۔ اور ان جانے میں بجھے ہوئے پائپ کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔

کھدر پوش نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور زیر لب بولا۔ "آپ کو اس سے محبت ہو گی؟"

"محبت۔" پتلا دبلا نوجوان چلایا۔ "مجھے معلوم نہیں لیکن محبت ایسی تو نہیں ہوتی۔ نہیں نہیں۔ وہ تو ایک مثبت جذبہ ہے جو اطمینان اور تسکین کا باعث ہوتا ہے۔" پھر وہ یوں بولنے لگا جیسے دیر سے منتظر تھا کہ کوئی اسے چھیڑے۔ "اور یہ......... تو ایک بیماری تھی۔ ہاں بیماری۔ ایک ایسی بیماری جس کے تحت مریض خود چاہتا ہے کہ وہ شفایاب نہ ہو۔ اور ایسے حالات پیدا کر لیتا ہے کہ

مرض بڑھتا جائے' دوا کرنے کے باوجود بڑھتا جائے۔"

"عجیب بات ہے۔" اچکن پوش بزرگ نے سر اٹھا کر پہلی مرتبہ دبلے پتلے مضطرب نوجوان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بس سٹینڈ کے اس مختصر سے چائے خانے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر ہوا درختوں کے اس جھنڈ میں کراہ رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔

"ہاں۔" وہ دبلا پتلا نوجوان لمبی آہ بھر کر آپ ہی آپ یوں بڑبڑانے لگا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔ جیسے اسے دوسرے اصحاب کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا ہو۔ "ہاں عجیب۔ کتنی عجیب عورت تھی وہ کس قدر جاذبیت تھی اس میں۔ توبہ ہے۔" اس نے جھرجھری لی۔ "اس میں نمائش نہیں تھی۔ نخرا نہیں تھا۔ آج کل کی لڑکیوں کی طرح اس کے ہونٹ بٹوے کی طرح کھلتے ملتے نہیں تھے۔ اس کی آنکھیں ڈولتی نہیں تھیں۔ اس کی بھنویں تنتی سمٹتی نہیں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں متبسم اشارے نہیں جھلکتے تھے۔ اسے دیکھ کر پیار کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ جی چاہتا تھا کہ اس کے قدموں میں گر کر رو پڑیں۔ وہ لڑکی نہیں تھی' مُیار عورت تھی------ مُیار عورت۔ اس پر لڑکی پن کبھی نہیں آیا تھا' کبھی نہیں۔ وہ پیدائشی مُیار تھی۔ اس میں ایک عجیب سی آن تھی۔ عجیب سی تمکنت------ ایک ایسا احساس جیسے کہ وہ تمام کائنات کا محور ہو' مرکز ہو۔ اف------!"

پتلے دبلے نوجوان نے یوں لمبی سانس لی جیسے اس کے اندر شعلے بھڑک رہے ہوں۔ "اس کے روبرو اپنی شخصیت شل ہو جاتی تھی۔ اپنی آرزوئیں گویا مفقود ہو جاتی تھیں۔ جی چاہتا تھا' وہی کریں جو وہ چاہتی ہے۔ جی چاہتا تھا' وہ احکام جاری کرے اور ہم تعمیل کریں۔ عجیب عورت تھی وہ------ عجیب۔" وہ پھر اپنے خیالات میں کھو کر چپ ہو گیا۔

باہر درختوں کی ٹہنیوں میں گرتی ہوئی بوندیاں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی ہچکیاں لے رہا ہو۔ دور جاتی ندی بین کر رہی تھی۔ کمرے میں اچکن پوش سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کھدر پوش غور سے میز کی طرف گھور رہا تھا اور مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا شخص ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کمرے کی دیوار کے پار نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔

"ہاں جادو۔" دبلا پتلا نوجوان بولا۔ "اس نے مجھ پر بچپن سے ہی جادو کر رکھا تھا۔ اور----- اور جب میں نے ہوش سنبھالا' میں اس کے پیچھے پیچھے گود کے کتے کی طرح پھرتا رہتا تھا۔ جہاں بھی وہ جاتی' میں اس کے پیچھے جاتا۔ وہ کسی سے ملنے کے لئے گھر کے اندر چلی جاتی تو میں دہلیز پر بیٹھ جاتا اور انتظار کیا کرتا کہ کب وہ باہر نکلے اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل سکوں۔ وہ چوبارے میں بیٹھ کر سویٹر بنتی تو میں اس کے سامنے چوکی یا پتھر پر بیٹھ رہتا۔ وہ ہنڈیا پکانے میں مصروف ہوتی تو میں دیوار کے

ساتھ لگ کر کھڑا ہو رہتا۔ وہ سکول جاتی تو میں سکول کے دروازے تک اس کے پیچھے پیچھے جاتا۔ پھر سکول میں داخل ہوتے وقت وہ مڑ کر میری طرف دیکھتی اور اس کی آنکھوں میں ایک شریر مسکراہٹ چمکتی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی شرارت میں' میں اس کے ساتھ شریک ہوں۔ سویٹر بنتے ہوئے' تاگا توڑتے وقت یا سلائی پر دھاگے سمیٹتے وقت مجھے وہاں بیٹھے دیکھ کر وہ مسکراتی۔ وہی مسکراہٹ جیسے ہم دونوں کسی پوشیدہ شرارت میں اکٹھے شریک ہوں۔ بس وہی مسکراہٹ مجھے اس بات پر اکساتی تھی کہ میں گود کے کتے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے پھروں۔

گھر کے سب لوگ اسے اس بات پر چھیڑا کرتے تھے۔ میری ماں بھی ہنس کر اس سے پوچھا کرتی تھی۔ "اے ہے تم نے تو لڑکے پر جادو کر رکھا ہے کیا۔" کوئی کہتا۔ "توبہ ہے' اس لڑکے کو کیا ہے۔ پلے کی طرح تمہارے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔" کوئی کہتا۔ "یہ لڑکا تو اپنی ماں کے ہاتھوں سے بھی نکل گیا۔" لیکن ان دنوں میں ابھی بچہ ہی تھا۔ اس لئے لوگ بات کر کے ہنس پڑتے تھے اور بس۔ وہ خود بھی ہنسا کرتی اور کبھی کبھی میرے قریب آ کر میرے منہ پر ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی۔ "کیوں رے تجھے میرے پیچھے پھرنے میں مزہ آتا ہے کیا؟" اور پھر ایک عجیب سی نگاہ میری طرف ڈال کر دہراتی۔ "مزہ آتا ہے؟" اس کے کہنے کا انداز ایسا ہوتا کہ میں ایک مزے بھری جھرجھری محسوس کرتا اور اس کی نگاہ کی شرارت کی چمک کی وجہ سے میں محسوس کرتا جیسے وہ کہہ رہی ہو' اونہوں کسی کو بتانا نہیں کہ اس مزے بھری شرارت میں ہم دونوں برابر کے شریک ہیں۔ برابر کے ----- چپ۔"

دبلے پتلے نوجوان نے ایک شدید جھرجھری لی۔ اور پھر جیبوں کو ٹٹول کر دیا سلائی نکالی اور ماچس جلا کر پائپ کے لمبے لمبے کش لینے شروع کر دیئے۔ اچکن پوش بزرگ اپنا ورد بھول چکے تھے۔ اور منہ کھولے دبلے پتلے نوجوان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا مرد ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ کھدر پوش ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی رکھے گہری سوچ میں پڑا تھا۔ باہر ٹین کی چھت پر بوندیاں گویا یوں جلترنگ بجا رہی تھیں جیسے کوئی مغنی مزے میں آیا ہو۔

"اس مزے کی وجہ سے میں اپنی عمر سے پہلے ہی جوان ہو گیا۔" پتلا دبلا نوجوان بولا۔ "میرا مطلب ہے' بچپن ہی میں جوانی شرارت گویا مجھ پر مسلط ہو گئی۔ اسے بھی اس حقیقت کا احساس تھا اور وہ اس بات پر ہنسا کرتی تھی۔ اس کی ہنسی میں طنز نہیں ہوتی تھی۔ اونہوں۔ جیسے مصور اپنے نقش کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے تقریباً" پانچ سال بڑی تھی۔ لیکن اس کی اس رازدارانہ مسکراہٹ نے گویا مجھ میں بلوغت کا خمیر پیدا کر دیا تھا اور میں اپنے آپ کو اس کا ہم عمر سمجھنے لگا تھا۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا۔ "پھر اس کی مسکراہٹ کا وہ رازدارانہ رنگ گویا اس کی آنکھوں سے رس رس کر بہنے لگا۔ حتیٰ کہ اس کی ہر حرکت اسی رنگ میں شرابور ہو گئی

اور........ اور میری نظر میں اس کے جسم کے پیچ و خم یوں عریاں دکھائی دینے لگے جیسے وہ ہولی کھیل کر آئی ہو اور ہر نگاہ کے ساتھ جو میں اس کے اوپر ڈالتا' میری آنکھوں میں اسی رنگ کی پھوار پڑتی اور میرے جسم میں اک ہوائی سی چل جاتی-----توبہ ہے۔" اس نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے یوں بھیگے بھیگے انداز سے کہا جیسے وہ رنگ میں شرابور ہو گیا ہو۔ پھر دفعتاً" سر اٹھا کر بولا۔ "پھر اس نے وہ شرارت سازش میں بدل دی اور ----- اور ایک معصوم لڑکے کو جس نے عنفوان شباب کے عالم میں ابھی قدم رکھا ہی تھا' گناہ کے احساس سے شناسا کر دیا۔ توبہ ہے۔" وہ پھر چلایا۔ "جو گناہ سے آشنا نہ تھا۔ جس نے گناہ کی آرزو تک نہ کی تھی۔ اسے گناہ کے احساس سے شناسا کر دیا اور شناسا ہی نہیں بلکہ شرابور کر کے بھیگے کبوتر کی طرح اس کی قوت پرواز ختم کر دی اور یہ سب ایک جملے' ایک کنایہ سے ----- "چپ کوئی آ رہا ہے۔" کس قدر معصوم جملہ ہے۔ لیکن ایک خوب صورت بینار کے منہ سے رازدارانہ انداز سے نکلے تو ----- توبہ ہے۔" ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔ "ہم دونوں ایک دوسرے سے دور بیٹھے ہوتے۔ وہ اپنے کام کاج میں منہمک ہوتی۔ اور میں چپ چاپ نگاہوں سے اس کے پاؤں کی انگلیوں سے کھیل رہا ہوتا۔ پاؤں کی چاپ سن کر دفعتاً" وہ میری طرف دیکھتی اور خاموشی سے اشارہ کرتی۔ "چپ۔ کوئی آ رہا ہے۔" اور میرا دل اچھلتا اور میں اپنے آپ کو یوں سنبھالتا جیسے کوئی پکڑا گیا ہو اور پھر میں محسوس کرتا' جیسے آنے والا ہمارے راز سے واقف ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔ "عجیب بات تھی۔ راز کی نوعیت جانے بغیر میں اس کے کھل جانے سے ڈرتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ راز کے کھلنے کا ڈر پیدا کر کے دراصل وہ مجھے راز کی نوعیت کی عملی تحقیق کرنے پر اکسا رہی تھی۔

پھر ایک روز شام کے وقت جب ہم دونوں کمرے میں اکیلے اگرچہ دور دور بیٹھے تھے تو اس کے والد صاحب کی کھنکھار سنائی دی۔ وہ دیوانہ وار اٹھی اور میرا بازو پکڑ کر گھسیٹ کر کمرے کے کونے میں لے گئی اور مجھے الماری کے پیچھے ٹونس دیا۔ وہ پہلا دن تھا جب اس معصوم شرارت پر سازش کی مہر لگ گئی۔" وہ خاموش ہو گیا۔ اور دروازے کے باہر گرتی ہوئی بوندیوں کو غور سے دیکھنے میں کھو گیا۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ اچکن پوش بزرگ پھر سے سر جھکا کر ورد کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا مرد اضطراب بھرے انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیرنے میں مصروف ہو جاتا۔ آخر وہ بے اختیار ہو کر بولا۔ "پھر.......... پھر کیا ہوا؟"

"پھر-----" پتلا دبلا نوجوان چونکا۔ "پھر-----" اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ اپنا قصہ بیان کر رہا تھا۔ "اوہ----- ہاں۔" وہ چلایا۔ "پھر کیا ہونا تھا۔ وہی ہونا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ اور کیا ہو

سکتا تھا اور میں---- میرا عزم تو یوں شل ہو چکا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ پھر اسی روز اس نے مجھ سے کہہ دیا۔ کہنے لگی۔ “اب تم نہ آیا کرو میاں۔ جب تک میں خود نہ بلاؤں۔” پھر دفعتاً” نہ جانے کیا سمجھ کر اس نے میری جانب دیکھا۔ وہی سازشی نگاہ۔ وہی چپ کا سا انداز۔ “میں بلایا کروں گی۔” وہ بولی۔ “ہاں۔” اس ہاں نے وہ منفی احساس جو اس کے منع کرنے کی وجہ سے مجھ پر مسلط ہو گیا تھا، قطعی طور پر رفع کر دیا۔ اور میں نے پہلی مرتبہ اس کی ہاں کا مثبت اثر محسوس کیا۔ اس وقت گویا ساری کائنات سمٹ کر میری جھولی میں آگری۔ آتش دان پر شانت آسن میں بیٹھا ہوا دیوتا میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر اس نے میرے سامنے سر جھکا دیا اور آتش دان پر بچھے ہوئے کپڑے پر کاڑھے ہوئے پھولوں میں سے خوشبو کا ایک ریلا آیا اور سارا کمرہ خوشبو سے بھر گیا۔” وہ ہنسنے لگا۔ “عجیب عمر تھی وہ بھی۔ کاش کہ میں اس جادوگرنی کے سحر میں نہ آتا۔” اس کی ہنسی زہرخند میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور دروازے میں کھڑے ہو کر درختوں کے جھنڈ تلے بکھری ہوئی قبروں کی طرف دیکھنے لگا۔

“عجیب واقعہ ہے۔” اچکن پوش بزرگ نے زیر لب کہہ کر آہ بھری۔ “تو کیا اس نے تمہیں بلایا؟” مونچھوں والے ادھیڑ عمر کے مرد نے پوچھا۔

“ہاں۔” وہ بولا۔ “کئی بار---- لیکن بے کار۔ ہر بار جب بھی بلاتی تو کوئی نہ کوئی آجاتا اور مجھے پردے یا الماری کے پیچھے چھپا دیا جاتا۔ جہاں میرا دل دھک دھک کرتا۔ میرے جسم کا بند بند سمٹتا پھیلتا۔ میرا حلق بند ہو جاتا اور چاروں طرف سے ایک ان جانا بوجھ مجھ پر پڑ جاتا۔ توبہ ہے۔” وہ چلایا۔ “جیسے جیسے ڈر اور خوف مجھے انڈے کی طرح پھینٹ کر رکھ دیتے۔ لیکن اس کے باوجود میں انتظار کرتا رہتا کہ کب وہ بلائے اور میں جاؤں---- پھر۔” وہ آہ بھر کر بولا۔ “پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اور---- اور تعجب کی بات یہ ہے کہ مجھے اس پر دکھ نہ ہوا کہ وہ کسی اور کی ہو رہی ہے۔ بلکہ صرف اس بات پر کہ اس سے چوری چھپے ملنے کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ حالانکہ ہمارے ملنے کی صورت کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ عجیب بات ہے نا۔” وہ پائپ کا کش لیتے ہوئے بولا۔ “اور جب وہ رخصت ہونے لگی تو اکیلے میں مجھ سے کہنے لگی۔ “تم فکر نہ کرنا۔ میں تمہیں بلاؤں گی۔ میں بلاؤں تو آنا ضرور۔ ضرور آنا۔” اس کی اتنی سی بات پر مجھے اطمینان سا ہو گیا اور میری تمام شکایات یوں ختم ہو گئیں جیسے پیدا ہی نہ ہوئی ہوں۔ اور ایک بار پھر میں انتظار کی لذت میں کھو گیا۔”

“چھ مہینے گزر گئے۔” اس نے مختصر سے وقفے کے بعد کہا۔ “لیکن مجھے اس کا بلاوا نہ آیا۔ اس کے رنگین وعدے کا سحر ٹوٹنے لگا اور---- اور----” وہ زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ “ایک روز میں ایک ریل گاڑی میں بیٹھ کر وہاں جا پہنچا جہاں وہ رہتی تھی۔ اور ایک رات جب اس کا

خاوند گھر پر نہ تھا، میں ناگہاں اس کے روبرو جا کھڑا ہوا۔

مجھے دیکھ کر پہلے وہ گھبرا گئی لیکن جلد ہی سنبھل کر بولی۔ “شکر ہے تم آگئے۔ آؤ آؤ لیکن ادھر اس کونے میں۔ کوئی نوکر نہ دیکھ لے۔” اس نے مجھے اسی نگاہ سے دیکھا۔ وہی سازش، وہی شوخی، وہی نیم مدہوشی۔ مجھے وہاں بٹھا کر کام کاج میں مصروف ہو گئی۔ اور رنگین تتلی کی طرح ادھر ادھر گھومنے لگی۔ ہر چند منٹ کے بعد چپکے سے وہ اس کونے میں آجاتی، جہاں میں بیٹھا تھا اور پھر وہی نگاہ، وہی تبسم---- کام کاج سے فارغ ہو کر جب ہم اکٹھے ہوئے تو وہی بات وقوع میں آئی جو ایسے موقعہ پر ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔ بیٹھے بٹھائے آہٹ کی آواز سن کر وہ زیر لب چلائی۔ “وہ---- وہ آ گئے۔” اور پھر اپنی بانہوں میں تھام کر گھسیٹے ہوئے وہ مجھے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں لے گئی۔ اور مجھے وہاں بٹھا دیا۔ “چپ۔” وہ بولی اور دروازے ک پٹ بند کر کے خود باہر نکل گئی۔ اور میں اس تنگ و تاریک کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ توبہ ہے۔ اس رات میرا کیا حال ہوا۔ توبہ ہے۔” پتلے دبلے نوجوان نے لمبی آہ بھر کر کہا۔ “خوف کا آرا تھا جو مجھے کاٹ رہا تھا۔ وہی بوجھ، وہی گھٹن، وہی تناؤ---- توبہ ہے۔

دو گھنٹے وہاں دبک کر بیٹھنے کے بعد میرے لئے وہ تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی اور خطرے سے بے پروا ہو کر میں نے باہر نکل بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب میں دبے پاؤں نکلا تو کیا دیکھتا ہوں۔ توبہ ہے۔” وہ چلایا۔ “توبہ ہے----!”

“کیا----؟” مونچھوں والا بولا۔

“وہ اکیلی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ ایک بازو سر تلے دبایا ہوا تھا۔ اور اس کے چہرے پر اتنی مسرت اور شگفتگی چھائی ہوئی تھی جیسے خوشی سے سرشار ہو اور سارے گھر میں اس کے اور اس کی نوکرانی کے سوا کوئی نہ تھا۔ دفعتاً” مجھے محسوس ہوا کہ اس کی تمام تر خوشی اسی بات پر موقوف تھی کہ کسی کو الماری یا پردے کے پیچھے چھپا دے۔ جہاں وہ تڑپ تڑپ کر اپنا آپ اس کے لئے ہلکان کرتا رہے اور خود اطمینان سے سو جائے۔ غصے سے میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور پھر پیشتر اس کے کہ وہ مجھے پکڑ لیتی، میں ہمیشہ کے لئے اس کے سحر سے نکل آیا۔ بھاگ آیا۔

گھر آتے ہی میں نے اماں سے کہا۔ اماں میری شادی کر دو۔ چاہے کسی سے کر دو۔ اماں کر دو---- اور جب میری شادی ہو گئی اور میری حسین و جمیل بیوی میرے پاس آگئی تو........” وہ رک گیا۔ “توبہ ہے۔” وہ بولا۔ “حد ہو گئی حد----”

“کیا----؟” مونچھوں والے نے بے تابی سے پوچھا۔

“جب میں اپنی نئی دلہن کے پاس بیٹھا تھا تو دفعتاً” میرا جی چاہنے لگا کہ کوئی آجائے اور میری

بیوی مجھے گھسیٹ کر لے جائے اور کہیں چھپاتے ہوئے ---- وہ آ گئے۔ چپ ---- کہے۔ میری اپنی بیوی۔" وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا۔ "اور آج تک۔ آج تک میری یہی حالت ہے۔" وہ بولا۔ "مگر کوئی نہیں آتا اور اگر کوئی آ بھی جائے تو وہ ایسا نہیں کرتی۔ یہ نہیں کہتی' وہ آ گئے ---- وہ ---- توبہ ہے۔ توبہ ہے ----" وہ چلایا۔ "میں کتنا کمینہ ہوں۔ کتنا کمینہ ہوں میں ---- مگر یہ سب کچھ اس کے سحر کا نتیجہ ہے۔ ہاں اسی کا۔ اور آج ابھی جب میں اس کی قبر کے پاس بیٹھا تھا۔ تو خدا کی قسم میں منتظر تھا کہ وہ باہر نکل کر کہے' وہ آ گئے ---- وہ۔" وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا۔

باہر ہوا درختوں کی ٹہنیوں میں رو رہی تھی۔ جانی ندی بین کر رہی تھی۔ بوندیاں چھم چھم کر رہی تھیں اور اس کی دیوانگی بھری ہنسی کس قدر خوفناک تھی۔ پھر دفعتا" اس کی ہنسی ایک کراہ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر میز پر کہنیاں ٹیک کر بیٹھ گیا اور کمرے میں کربناک خاموشی چھا گئی۔

"چائے بابو جی۔" چھوٹا لڑکا ٹرے پر چائے کے چار پیالے رکھے ہوئے داخل ہوا اور ایک ایک پیالہ ان کے سامنے رکھ کر باہر نکل گیا۔

چائے آ جانے سے کمرے کے ماحول میں کچھ تبدیلی سی پیدا ہو گئی۔ "زندگی کس قدر عجیب ہے۔" کھدر پوش نے کہا۔ "ان دکھوں اور غموں کے باوجود جو ہمیں برداشت کرنے پڑتے ہیں۔" اچکن پوش نے لمبی آہ بھری۔ "بجا ہے۔" وہ بولے۔ "لیکن صاحب انجام کار سب نے یہیں آ جانا ہے۔" کھدر پوش نے مونچھوں والے ادھیڑ عمر کی طرف دیکھا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ بڑے دکھی ہیں۔" وہ بولا۔ کوئی عزیز داغ مفارقت دے گئے ہیں کیا؟؟"

"میرے عزیز۔" مونچھوں والے نے سر اٹھایا۔ "نہیں عزیز تو نہیں۔ اس کی مجھ سے رشتہ داری نہ تھی۔" تو ----؟ کھدر پوش مسکرایا۔ "محبت۔" وہ فقرہ مکمل کئے بغیر چپ ہو گیا۔

"محبت ----؟" مونچھوں والے نے آہ بھر کر دہرایا۔ "کاش میں اس کی محبت کی قدر کرتا۔ میں نے قدر نہ کی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "وہ میری محسن تھی۔ صاحب ---- محسن۔"

"محسن تھی؟" اچکن والے بزرگ نے "تھی" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" مونچھوں والا بولا۔ "وہ بھی عورت تھی۔ اب تم سے کیا چھپانا ہے بھائی صاحب۔" اس نے کہا۔ "اس بات کو تو سب ہی جانتے ہیں۔ ہمارے گھر میں اللہ کا فضل رہا ہمیشہ۔ اپنا کاروبار ہے۔ کام کرنے کے لئے کارندے ہیں۔ مجھے صرف دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے اور باقی سارا وقت اپنے شغلوں میں صرف ہو جاتا ہے۔ بے فکری ہے۔ پیسہ عام ہے۔ ساری عمر اپنی کھانے پینے اور عیش کرنے میں صرف ہوئی ہے۔ جو چاہا مل گیا۔ جس کی آرزو کی' وہ حاصل ہو گئی۔ محبت کرنے کی کبھی

ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ کبھی کبھار کسی پر طبیعت آ گئی اور طبیعت اپنی ایسی کم بخت ہے کہ جب کسی پر آ جائے تو........" وہ ہنسنے لگا۔ "میں اندھا ہو جاتا ہوں۔ تمہاری قسم پھر کچھ نہیں سوجھتا۔ جی چاہتا ہے' چاہے ساری دولت ہی کیوں نہ لٹانی پڑے' اسے حاصل کر لوں۔ اور پھر جب حاصل ہو جائے تو چند ایک روز میں چاؤ اتر جاتا ہے اور پھر اپنی توجہ کسی اور طرف لگ جاتی ہے۔ اللہ کا فضل ہے۔ آج تک کبھی ناکامی نہیں ہوئی۔ جو چاہا' ملا۔ جسے چاہا حاصل کر کے چھوڑا۔" وہ ہنسنے لگا۔

"کوئی پانچ سال ہوئے ہوں گے۔ جب اتفاق سے اپنی نظر ایک کالج کی لڑکی پر پڑ گئی تھی۔ اور کیا بتاؤں تمہیں ایسی بری طرح مچل گئی طبیعت کہ میں پاگل ہو گیا۔ بس بھائی صاحب ہر جتن کر کے دیکھ لیا۔ اس کی منتیں کیں۔ لالچ دیا۔ کہلوا بھیجا میں دولت لنڈھا دوں گا۔ صرف ایک بار مجھ سے مل جا۔ بیسیوں کٹنیوں اور دلالوں کو بیچ میں ڈالا۔ مگر اس اللہ کی بندی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر اٹھا لے جانے کی دھمکیاں دیں۔ سب بے کار۔ اور جوں جوں مجھ میں ناکامی کا احساس بڑھتا' توں توں میرا جنون اور بڑھتا۔ حتی کہ یہ حالت ہو گئی کہ مجھے وہ عیش و عشرت کھٹکنے لگا جس کا میں عادی تھا۔

ان دنوں اس محلے میں جہاں وہ رہتی تھی' عین اس کے گھر کے سامنے ایک مکان جو خالی ہوا تو میں نے جھٹ اسے سرے سے خرید ہی لیا۔ اور اس مکان کو اپنی بیٹھک بنا لیا کہ دیکھو ---- شاید داؤ چل ہی جائے۔ لیکن میری کوئی پیش نہ گئی۔ وہ لڑکی نہ جانے کیا نام تھا اس کا' عجیب سا نام تھا لیکن ہم چار یاری میں اسے شہزادی کیا کرتے تھے۔ وہ بالکل قابو میں نہ آئی۔

اسی محلے میں ہمارے ساتھ والے مکان میں یہ عورت رہا کرتی تھی جس کی قبر پر میں آج یہاں آیا ہوں۔

اس نے دو چار بار اپنی نوکرانی کے ہاتھ بلوا بھیجا۔ عجیب عجیب بہانوں سے بلایا کرتی تھی۔ پہلی مرتبہ نوکرانی نے کہا۔ "ذرا ادھر آؤ۔ بی بی بلا رہی ہیں۔ ان سے بات کر لیجئے۔ ڈیوڑھی کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہیں۔" دوسری بار تھوڑی سی برانڈی منگوا بھیجی۔ اسی طرح چار پانچ مرتبہ مجھے ملنے پر اکسایا گیا۔ لیکن اپنی طبیعت تو ان دنوں شہزادی پر مائل تھی۔ اور سچ پوچھو تو بیاہی عورت سے اپنے کو کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ طبیعت ہی ایسی ہے۔

پھر ایک روز جب رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے تو اس کی نوکرانی پرچی لے کر آ گئی۔ لکھا تھا۔ "شہزادی سے ملنا ہو تو رات کے ایک بجے آؤ۔" میں اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ ڈر تھا کہ انتقام لینے کے لئے چال نہ چلی گئی ہو۔ جس عورت کو آپ دھتکاریں۔" وہ کھدر پوش سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "وہ انتقام لینے پر آمادہ ہو جایا کرتی ہے۔ بہر صورت چار یاری میں آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو' ہمیں آزمانا ضرور چاہئے۔ تو بھائی

صاحب ہم نے حفاظتی تدابیر سوچ لیں اور میرے چاروں یار گھر کے چاروں طرف چوکنے بیٹھے رہے کہ کوئی چال ہو تو مکان پر دھاوا بول دیں اور میں مکان کے اندر چلا گیا۔ اس رات پہلی مرتبہ میں نے اسے دیکھا۔ وہ بے حد خوب صورت تھی۔ شہزادی سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ لیکن خوب صورتی کیا چیز ہے بھائی صاحب۔ سارا کھیل تو طبیعت کا ہے۔ وہ صرف دو ایک منٹ میرے پاس ٹھہری اور پھر شہزادی کو میرے حوالے کر کے آپ چلی گئی۔ اور بھائی صاحب اس عورت نے کیا جادو کر دیا تھا اس لڑکی پر۔ وہ تو بالکل رام ہو چکی تھی رام۔ پھر ہم اکثر وہاں ملنے لگے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں ملانے کے بعد وہ اپنا تقاضہ شروع کر دے گی۔ لیکن میرے شک بالکل ختم ہو گئے۔ اس کی نگاہوں اور انداز میں بلا کی آن تھی۔ آن اور بے تعلقی۔ وہ میرے پاس صرف دو ایک منٹ کے لئے ٹھہرتی تھی، لیکن جب میں وہاں جاتا اور جب وہاں سے لوٹتا تو وہ آتی ضرور اور ہنس کر مجھ سے کہتی۔ تم آ گئے---- تم جا رہے ہو۔ پھر کب آؤ گے؟ وہ ہمیشہ مجھے تم کہا کرتی تھی۔ عجیب عورت تھی وہ۔ ہاں بھائی صاحب----!" وہ آہ بھر کر بولا۔ "چار ایک ماہ تک ہم ملتے رہے۔ لیکن پھر اپنی طبیعت اکتا گئی۔ جیسے ہمیشہ اپنا طریقہ ہے۔" وہ ہنسا۔ "اور پھر وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔"

کوئی چھ ماہ کے بعد ایک روز جب اپنی اسی بیٹھک میں، میں ایک نئی لڑکی پھنسا کر لایا ہوا تھا تو نہ جانے کس نے مرا بھید فاش کر دیا۔ اور لڑکی کے رشتہ دار پولیس لے کر وہاں آ گئے۔ اب وہ آدھی رات کے وقت نیچے میرا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں اور اوپر میں سخت گھبرایا ہوا ہوں۔ بدنامی اور رسوائی کے ڈر سے لڑکی کو ادھر ادھر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سارے محلے دار اپنے دشمن تھے۔ کرتا کیا---- عجیب مصیبت میں گرفتار تھا کہ دھم سے وہ کوٹھا پھاند کر میرے گھر میں اتر آئی اور آتے ہی بولی۔ تم چلے جاؤ جی۔ وہاں اس کمرے میں---- میں سنبھال لوں گی۔ اس وقت اس نے عجیب سی پوشاک پہن رکھی تھی۔ ساری اور بنڈی اور نہ جانے کیا کیا۔ حالانکہ وہ ساری نہیں باندھتی تھی۔ بال بھی عجیب سے بنا رکھے تھے۔ پہچانی ہی نہیں جاتی۔ غالباً" وہ جان بوجھ کر بھیس بدل کر آئی تھی۔ "اف----" اس نے آہ بھری۔ "بڑی دلیر عورت تھی وہ دلیری سے اس نے باہر کا صدر دروازہ کھولا اور سب کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "کیا ہے؟" وہ بولی۔ میرے میاں خود گھر پر نہیں ہیں۔ میں ان کی بیگم ہوں۔" اسے یوں کھڑا دیکھ کر پولیس والے اور ان کے ساتھی چوہوں کی طرح دبک کر چلے گئے اور میں صاف بچ گیا---- صاف۔

اسی روز جب وہ مجھ سے اکیلے میں ملی تو اس کے لئے میرے دل میں شدید جذبہ تھا۔ میں نے اس سے کہا، اگر تمہارے خاوند کو معلوم ہو گیا تو---- بڑی دلیری کی ہے تم نے۔ "تم میری فکر نہ کرو۔" وہ بڑی آن سے بولی۔ "اپنی بات کرو تم۔" اس وقت مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے محبت کا ایک طوفان سا چل رہا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ لپک کر اسے بازوؤں سے تھام لیا۔ لیکن وہ تڑپ کر باہر نکل گئی۔ "میرا احسان اتار رہے ہو؟" وہ بولی۔ "اونہوں---- میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ ہماری ملاقات تھی۔"

پھر میں نے اس بیٹھک میں اپنا قیام چھوڑ دیا اور پھر جب میں نے کل ناگاہ سنا کہ وہ انتقال کر گئی ہے تو میں غم سے پاگل ہو گیا۔ اور آج اس کی قبر پر بیٹھے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ میری واحد محبوب تھی۔ اور جیسے وہ قبر سے نکل کر کہے گی۔ "تم---- تم میرا فکر نہ کرو۔ جاؤ گھر جاؤ۔" اس نے ایک لمبی آہ بھری اور اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔

دیر تک کمرے میں طویل خاموشی چھائی رہی۔ پتلا دبلا نوجوان ویسے ہی ٹھوڑی ہاتھوں میں رکھ کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کھدر پوش میز کو انگلی سے بجا رہا تھا۔ اور اچکن پوش معمر آدمی زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ "اور---- اور آپ؟" دبلا پتلا نوجوان چونک کر بولا۔ "آپ کیسے آئے ہیں؟ یہاں آپ کا کون عزیز فوت ہو گیا ہے؟" وہ اچکن پوش اور کھدر پوش دونوں اصحاب میں سے نہ جانے کس سے مخاطب تھا۔

کھدر پوش مسکرایا۔ "میرا گرو۔" وہ بولا۔ "میرا پیر سمجھ لو۔ میرا سبھی کچھ۔ وہ اس قبرستان میں دفن ہے۔ اس نے مجھے وہ دولت بخشی ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اگر میں اس سے نہ ملتا تو آج میں بھی عام نوجوانوں کی طرح سرخ ہونٹوں، سیاہ بالوں، متبسم آنکھوں اور سنہرے بدن کی ان بوتلوں میں کھویا ہوتا جو آج کل سڑکوں اور بازاروں میں آزادی سے گھومتی پھرتی ہیں۔ شاید آپ نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ عورت کا وجود کتنا دبیز پردہ ہے جو ہماری عقل پر پڑا ہے اور آج کی تہذیب اسے اور رنگین اور دبیز بنانے میں شدت سے مصروف کار ہے۔ اس جیتے جاگتے رنگین بھنور کا صرف ایک مقصد ہے کہ وہ مرد کو لے ڈوبے اور اس کی کائناتی نگاہ کو ناکارہ کر دے۔ اسے زندگی سے بے گانہ کر دے۔ اف کتنا عظیم پردہ ہے۔" وہ شان ہلاتے ہوئے بولا۔ "ایسا پردہ جسے ہم بخوشی اپنی عقل پر ڈالنے کے مشتاق ہیں۔ کتنی بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر میری اس سے ملاقات نہ ہوتی تو آج میری حسیات پر بھی وہی پردہ پڑا ہوتا۔ میرے بھی پر کٹے ہوتے تمہاری طرح۔"

اچکن پوش معمر نے سر اٹھا کر غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر مرد حیرانی سے منہ کھولے بیٹھا تھا اور دبلے پتلے نوجوان پر مایوسی سی چھائے جا رہی تھی۔

"ہاں۔" کھدر پوش بولا۔ "یقین کیجئے۔ یہ سب اسی کی دین ہے---- اسی کی۔ حالانکہ مجھے صرف ایک مرتبہ ملی تھی۔ صرف ایک مرتبہ۔"

"ملی تھی۔" اچکن پوش کی دونوں آنکھیں گویا باہر نکل آئیں۔ مونچھوں والے کے کھلے

ہونٹوں پر تبسم دوڑ گیا۔ دبلے پتلے نوجوان نے دفعتاً اضطراب سے پائپ کے کش لینے شروع کر دیئے۔

کھدر پوش مسکرایا۔ ”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”میری گرو بھی ایک عورت تھی بلکہ حسین عورت۔ ایک رنگین ترین بھنور۔ ایک ایسی ناگن جس کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے پر گہری خاموشی چھا گئی۔ باہر درختوں میں گویا بھوتنیاں ناچ رہی تھیں۔ دور جانی ندی سر ٹپک ٹپک کر رو رہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ اور چولہے پر رکھی ہوئی چائے کی کیتلی ایک غم ناک دھن بجا رہی تھی۔

”میں ایک زمیندار کا بیٹا ہوں۔“ کھدر پوش بولا۔ ”ہمارا گاؤں پہاڑ پر واقع ہے۔ سمجھ لو کوئی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر۔ بچپنے سے ہی ہم پہاڑوں پر چڑھنے کے شوقین تھے اور اکثر بہت دور اونچے نکل جایا کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں سے اوپر کوئی چار ہزار فٹ اوپر یا شاید ایک غار ہے جسے قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اس کا منہ تنگ ہے مگر اندر سے کافی وسیع و عریض ہے۔ اس کی چھت بہت اونچی ہے اور فرش بہت صاف۔ جس کے ایک طرف سے چشمہ نکلتا ہے اور وہیں تالاب سا بن جاتا ہے اور اس غار سے منظر اس قدر خوب صورت دکھائی دیتا ہے کہ ہم دیکھ کر دم بخود رہ جایا کرتے تھے۔ پھر موسم سرما میں جب چاروں طرف برف پڑ جاتی تو اس غار سے ایک عجیب نظارہ دکھائی دیتا۔ عجیب-----“ اس نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن موسم سرما میں راستے بند ہو جایا کرتے تھے اور وہاں پہنچنا محال ہو جاتا۔ پھر بھی پہلی بار برف پڑتی تو ہم وہاں ضرور پہنچتے اور وہاں سے عجیب نظارہ نظر آتا جیسے وہ کوئی اور ہی دنیا ہو۔ اور ہی جہان ہو۔

جب میں جوان ہوا تو نہ جانے کیوں میرے دل میں صرف ایک ہی خواہش تھی کہ کوئی نئے فیشن کی حسین عورت ہو اور ہم دونوں موسم سرما میں اکیلے اس غار میں رہیں۔ اکیلے نہ جانے یہ خواہش میرے دل میں کیسے پیدا ہوئی----- مجھے معلوم نہیں لیکن وہ بڑھتے بڑھتے جنون کی صورت اختیار کر گئی۔ ویسے پہاڑ کی عورتیں تھیں۔ مگر مجھے ان سے نفرت تھی۔ میری نگاہ میں وہ عورتیں ہی نہیں تھیں۔

پھر والد کے انتقال کے بعد میں نے اسے عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ بات بڑی مشکل تھی۔ ایسی عورت کو ڈھونڈنا بے حد مشکل تھا۔ تو قصہ مختصر میں اکثر شہر جانے لگا۔ کیونکہ شہر میں بہت سے لوگ میدانوں سے آتے تھے لور ان کے ساتھ وہ بیر بہوٹیاں ہوتی تھیں جن کے ساتھ غار میں رہنے کا مجھے خبط تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے شہر کے دلالوں سے راہ رسم بڑھائی لیکن میری بات سن کر وہ ہنس دیئے۔ ”جی ایک دو دن بات کرو۔ اکٹھا ایک ہفتہ اور وہ بھی برف کے دنوں میں اور پھر جناب----- اتنی دور غار میں جانے کو کون تیار ہو گئی۔“

پھر ایک دن جب میں شہر ہی میں تھا اور ابھی پہلی ہی برف پڑی تھی ایک دلالہ بھاگی بھاگی آئی۔ ”کام بن گیا۔“ وہ بولی۔ ”لیکن پیسہ بہت خرچ ہو گا۔ نہ جانے کون ہے وہ۔ یہاں اکیلی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ برف دیکھنے آئی ہے۔ ساتھ نوکرانی ہے۔ کوئی ایسی ویسی نہیں۔ بڑے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی نوکرانی کی جھولی بھر دو تو وہ کہتی ہے کہ میں منالوں گی اسے۔“

اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔ روپے کی تو مجھے پرواہ ہی نہیں تھی۔ میں نے کہا، غار میں جائے گی؟ ”ہاں۔“ وہ بولی۔ اس کی نوکرانی کہتی ہے۔ میں لے چلوں گی۔ پر یہی دو تین دن کے لئے۔ زیادہ نہیں۔ تو خیر صاحب بات پکی ہو گئی اور ہم وہاں پہنچ گئے۔ غار میں پہنچ کر جب اس نے برقعہ اتارا تو میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کی بھنویں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ اور اس کے ہونٹ بے نیازی سے بھیگے ہوئے تھے۔ جیسے اسے جسم سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ جیسے وہ زمین سے نہیں، آکاش سے اتری ہوئی ہو۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ پتلا دبلا نوجوان منہ کھولے بیٹھا تھا۔ اچکن پوش کی آنکھیں ابلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور مونچھوں والے کا چہرہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس پر ایک سفید لمبی داڑھی اگ آئی ہو۔ ہوٹل کا لڑکا جو برتن اٹھانے آیا تھا، چپ چاپ دروازے کے پٹ کے ساتھ چپکا کھڑا تھا۔ جیسے کھو گیا ہو۔

”تین دن ہم وہاں اکٹھے رہے۔ تین دن“ کھدر پوش نے بات شروع کی۔ ”وہ غار نہیں رہا تھا۔ اس کی آمد کے بعد گویا وہ ایک مندر میں بدل چکا تھا۔ وہ عورت نہیں تھی۔ وہ ایک دیوی تھی اور میں ہوس کار نہیں تھا۔ وہ مجھ سے بہت قریب----- بہت قریب----- لیکن نہیں وہ مجھ سے قریب نہیں تھی۔ دور----- بہت دور۔ میں اس کے پاؤں پر سر رکھے پڑا تھا۔ میرے ہاتھ اس کی پنڈلیوں سے چھو رہے تھے۔ لیکن وہ گوشت پوست کی پنڈلیاں نہیں تھیں۔ وہ نور کی بنی ہوئی تھیں۔ اسی نور کی جو غار سے باہر چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ چاروں طرف اور پھر نیچے سے اوپر تک چوٹیوں سے اوپر۔ بادلوں سے اوپر۔ نیلے آسمان سے اوپر۔“ ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔ ”ان تین دنوں میں، میں نے اس کے جسم کے ایک ایک حصے پر سجدے کئے۔ اس کے بند بند پر آنکھیں ملیں۔ اس کے روبرو بیٹھ کر بھجن گائے۔ سب کچھ کیا۔ لیکن نہ جانے کیوں میری خواہشات میں ہوس کا عنصر نہیں تھا۔ ہمارے جسم گویا فنا ہو چکے تھے۔ ہماری آرزوئیں اس پھیلی ہوئی سفیدی میں گویا ڈھل چکی تھیں۔ اس لطیف فضا میں محبت ور تحیر کے سوا کچھ نہ تھا۔ بے غرض محبت۔ بے نام تحیر لیکن آپ نہیں جانتے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے۔“ وہ بولا۔ ”آپ کبھی دس ہزار فٹ سے اوپر نہیں گئے ہوں گے۔ آپ نہیں جانتے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ کیسے

جان سکتے ہیں آپ؟“ ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو گیا۔

”تیسرے دن جدائی کے خیال سے میری گھگھی بندھ گئی۔ میں اس کی محبت میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ میں ہمیشہ کے لیے اسے دیوی بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے منتیں کیں۔ ہاتھ جوڑے۔ سبھی جتن کئے۔ لیکن جواب میں وہ خاموش رہی۔ بالکل خاموش جیسے گونگی ہو۔

”عمر بھر کے لئے ہونا منظور نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تو صرف ایک بار پھر صرف ایک بار۔ ایک مہینہ۔ ایک ہفتہ۔ ایک دن۔“

آخر میری مسلسل منتوں کا یہ اثر ہوا کہ اس نے ایک بار پھر ملنے کا وعدہ کر لیا۔ ہم نے ایک تاریخ مقرر کر لی۔ اور پھر وہ چلی گئی۔

اب میں آپ کیا بتاؤں کہ وہ ایک سال میں نے کیسا گزارا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ مقررہ دن میرے نزدیک اتنا اہم تھا جتنا کہ قتل کے ملزم کے لئے فیصلے کا دن ہوتا ہے۔ میرے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ آئے گی۔ ضرور آئے گی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ چاہے وہ ایک دن کے لئے آئے یا ایک ہفتہ کے لئے، میں اسے واپس نہیں جانے دوں گا۔ اور ہم موسم سرما وہیں گزاریں گے۔ اسی خیال کے تحت میں نے چار مہینے کی جملہ ضروریات کی چیزیں اس غار میں پہلے ہی سے پہنچا دیں تھیں۔ اور بالآخر وہاں اپنی دیوی کے انتظار میں بیٹھ گیا تھا۔“

مونچھوں والے نے ڈھیلے ہونٹ سے کہا۔ ”پھر؟“

”لیکن وہ نہ آئی۔“ وہ بولا۔ ”نہ آئی حتیٰ کہ راستے مسدود ہو گئے اور میں نے محسوس کیا کہ میں اتنے مہینوں کے لئے اس برف خانے میں دفن کر دیا گیا ہوں۔ پہلے وہ تین دن تو میں غار کے اندر اس خیالی مجسّمے کے سامنے کتے کی طرح پڑا روتا رہا۔ پھر جب دیوانگی دور ہوئی تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی جہاں وہ پچھلے سال کھڑی ہوا کرتی تھی۔ اس کی بھنویں اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں باہر اوپر کی طرف دیکھ رہی تھیں اور وہ مسکرا رہی تھی جیسے مجھے بھی باہر اوپر کی طرف دیکھنے کی ترغیب دے رہی ہو۔ میں نے پہلی مرتبہ اطمینان اور سکون سے باہر دیکھا۔ لیکن آپ۔“ وہ بولا۔ ”آپ اس منظر کو ذہن میں نہیں لا سکتے۔ آپ دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر نہیں گئے کبھی۔“

دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر ----“ اس نے پھر سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا۔ ” فضا اس قدر لطیف ہوتی ہے، اور عالم اس قدر نورانی ہوتا ہے جیسے صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے یہاں دودھیا سویرا پھیلا ہوتا ہے۔ اس بلندی پر یہاں صبح صادق کے دودھیا سویرے کو قیام اور دوام مل جاتا ہے۔ اس دودھیا سویرے میں نگاہیں ہمیشہ اوپر کو اٹھتی ہیں۔ اور انسان محسوس کرتا ہے جیسے وہ

اڑ رہا ہو۔ انسانی کثافت کا بوجھ گویا اس کے پیٹھ سے اتر گیا ہو۔ اس کی آرزوؤں میں شدت کی وہ دھار نہیں رہتی۔ اس کے دکھوں اور حسرتوں میں تکلیف کا عنصر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بغض، دشمنیاں، نفرتیں سب یوں اپنی کثافت کھو بیٹھتی ہیں جیسے مشین سے دبی ہوئی روئی کی گٹھڑی کو دھنک کر صاف کر دیا گیا ہو۔ وہاں روح سے بوجھ اتر جاتا ہے۔ وہاں کوئی ہوس کاری کا شکار نہیں ہو سکتا۔ وہاں کوئی جرم سرزد نہیں ہو سکتا۔ وہاں کوئی گناہ سے آلودہ نہیں ہو سکتا۔ جیسے یہاں صبح صادق کے وقت کوئی جرم نہیں کر سکتا۔ عیش و نشاط کی محفلیں چار بجے سے پہلے ختم ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ اس وقت محبوبہ کے لئے برہا کا راگ بھی گایا نہیں جا سکتا۔ صرف حمد و ثناء، صرف کائناتی جذبہ ہی اس وقت قیام حاصل کر سکتا ہے۔ اس دودھیا سویرے میں وہاں عشق جسم کے بدھن سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اپنی انا اپنی ذات سے نکل کر کائنات کے ذرے ذرے پر بکھر جاتی ہے۔ وہ بلندی اور پھر وہ پاکیزہ نورانی برف، وہ چاروں طرف پھیلا ہوا نور۔ اور وہ سکوت۔ گہرا بے انتھاہ سکوت۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے پر گویا دودھیا سویرا چھا گیا۔

”تین مہینے کی اس نور سے بھیگی ہوئی تنہائی نے مجھے اپنی انا سے نکال کر ساری کائنات پر مسلط کر دیا۔“ اس نے سلسلہ کلام از سر نو جاری کیا۔ ”اور وہ وجدان جو مجھ پر طاری رہا۔ اس کی وجہ سے تین مہینے میں میری کایا پلٹ گئی۔ پھر جب میں نیچے اترا تو ایک مرتبہ پھر مجھ پر وہی جنون طاری ہوا۔ اس کا جنون۔ میں نے جگہ جگہ خاک چھانی کہ اسے ڈھونڈ نکالوں۔ لیکن بے سود۔ وہ نہ ملی۔ اس کا پتہ بھی نہ مل سکا۔“

پھر جب موسم سرما آیا تو مجھ پر ایک نئی وحشت سوار ہو گئی۔ وہ نوارنی غار مجھے اپنی طرف بلانے لگا۔ مجھے ہر وقت اسی منظر کا خیال رہنے لگا۔ وہی نور کی چادر۔ وہی اطمینان، وہی گہری خاموشی۔ یہ وحشت اس حد تک میرے سر پر سوار ہو گئی کہ میں پھر موسم سرما کاٹنے وہاں پہنچا۔ اور اب میں ہر سال موسم وہیں گزارتا ہوں۔“

”اور وہ وہ؟“ دبلا پتلا نوجوان چلایا۔ ”وہ پھر نہ ملی؟“

”وہ ----“ کھدر پوش ہنسنے لگا۔ ”اس نورانی سویرے نے مجھے نکھار نکھار کر بذات خود دیوتا بنا دیا اور دیوی کے نقوش میرے دل سے دھو ڈالے۔ اور چھ سال میں، میں نے اس راز کو پا لیا کہ عورت مرد کی راہ میں محض ایک رکاوٹ ہے۔ ایک پردہ ہے۔ ایک ایسا پردہ ہے جسے ہٹائے بغیر ہم کہیں پہنچ نہیں سکتے۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ زندگی رکاوٹوں کو عبور کرنے کا نام ہے۔ آرزوؤں کا غلام بننے کا نہیں۔ میری طرف دیکھئے۔“ وہ چلایا۔ ”سردی ہو یا گرمی۔ میں صرف اس کھدر کے کرتے میں رہتا ہوں اور یقین جانو میرے بدن میں اس قدر قوت دفاع پیدا ہو چکی ہے کہ

میں سانس لیتا ہوں تو مجھے لذت محسوس ہوتی ہے۔ ایسی لذت جو عورت کے رنگین قرب سے بھی میسر نہیں ہو سکتی۔"

"لیکن وہ ----؟" پتلے دبلے نوجوان نے پھر اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کی کوشش کی۔

وہ مسکرایا۔ "جب میں اس کے سحر سے آزاد ہو چکا تھا تو ایک روز شہر میں اتفاقاً" وہ مجھے مل گئی۔ اس کے ساتھ وہی نوکرانی تھی۔"

"مل گئی۔" مونچھوں والے نے بیٹھے ہوئے گلے سے دہرایا۔ "واقعی ----؟"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "اس نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ دیوی تم پھر نہ آئیں۔ اس نے جھرجھری لی اور بولی اس مندر میں دیوی کی جگہ نہیں ہے۔ میں نے ازراہ شرارت کہا کہ پھر پجاری ہی کو بلا لیا ہوتا۔ وہ پھر ہنسی لیکن جلد ہی گویا کسی اثر سے بھیگ کر کہنے لگی۔ اس مندر کا پجاری کسی کے بلائے سے نہیں آتا۔ میں خود ابھی تک اسی مندر کی پجارن ہوں۔ اس کی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں اور ان میں اس وقت وہی دودھیا اجالا چمک رہا تھا۔" وہ خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد آپ ہی آپ کہنے لگا۔ "ہاں وہ میری گرو تھی۔ میرا پیر تھی۔ میرا بھی کچھ تھی۔ اور جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ وفات پا گئی ہے تو میں یہاں آئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن -----۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "اب کی سردیوں میں وہ وہاں ضرور آئے گی۔ اب وہ پردہ نہیں رہا۔ پردے سے نکل چکی ہے۔ وہ یقیناً" ابھی تک اسی مندر کی پجارن ہے۔ ابھی تک۔" وہ خاموش ہو گیا۔

دفعتاً" ہوٹل کا لڑکا چلایا۔ "بابو جی بادل چھٹ گئے ہیں۔ اور بس آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔"

"اور" اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے مونچھوں والے نے اچکن پوش بزرگ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اور صاحب آپ کا کون عزیز فوت ہوا ہے؟" اور سب کی نگاہیں اچکن پوش کی طرف اٹھ گئیں۔

وہ گھبرا گیا۔ پھر اچکن جھاڑتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں تو کسی عورت کے لئے یہاں نہیں آیا۔ میں تو تقریباً" ہر روز ہی آتا ہوں یہاں۔ جب سے میری بیوی فوت ہوئی ہے۔ روز فاتحہ کے لئے آتا ہوں۔"

"بیوی؟" دبلے پتلے نوجوان نے دہرایا۔

"اتنی وفادار اور خدمت گزار بیوی شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔" وہ بولا۔ "حالانکہ میں بوڑھا تھا اور وہ نوجوان تھی۔ لیکن سبحان اللہ۔ وہ گویا صرف میری خدمت کے لئے جیتی تھی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "جنتی روح تھی ---- جنتی۔" بھرائی ہوئی آواز میں اس نے کہا

اور خاموش ہو گیا اور وہ چاروں ملحقہ قبرستان کی طرف چل پڑے۔

بادل واقعی چھٹ گئے تھے۔ سورج مغرب میں تانبے کی تھال کی طرح ٹنگا ہوا تھا۔ اس کی سنہری شعاعوں میں بدلیاں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"وقت بہت کم ہے۔" کھدر پوش بولا۔ "شہر کے لئے یہ آخری بس ہے۔"

پتلے دبلے نوجوان نے کہا۔ "لیکن قبر پر دیا تو جلانا چاہئے کم از کم۔"

"ہاں۔ ہاں۔" مونچھ والا بولا۔ اور وہ تینوں سفید قبر کی طرف لپکے۔ اور جب تینوں نے بیک وقت ایک تربت کے طاق کی طرف ہاتھ بڑھائے تو تینوں کے سر آپس میں ٹکرائے گئے۔

"ہائیں ----!" وہ تینوں بہ یک وقت چلائے اور انہوں نے ایک نئے مفہوم سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتے۔ اچکن پوش بزرگ کی آواز سنائی تھی۔ "میاں تم کدھر آنکلے ہو؟" وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے اپنی بیوی کے مزار کا دیا تو جلا لینے دو۔"

وہ سب تعجب سے بوڑھے کی طرف دیکھنے لگے۔ پتلے دبلے اضطرابی نوجوان نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کھدر پوش نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر زیر لب کہا۔ "اونہوں ---- دوسروں کو ننگا نہ کرو۔ ہمیں پردہ اپنی عقل سے اٹھانا ہے۔ اپنی عقل سے۔"

"کتنا رنگین پردہ ہے۔" مونچھوں والے نے آہ بھری۔

"کتنی بڑی رکاوٹ ہے۔" کھدر پوش نے کہا۔

اچکن پوش انہماک سے دیا جلانے میں مصروف تھا۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔ سورج کی آخری شعاعوں نے بادلوں سے چھن کر فضا میں نور کی دھاریاں سی بنا دی تھیں۔ جیسے نور کا ایک مینار کھڑا ہو اور چاروں طرف دودھیا سویرا پھیلا تھا۔

# سندر تاکار اکشش

شام دبے پاؤں رینگ رہی تھی۔

ٹیلے پر درختوں کے سائے پھیلتے جا رہے تھے لیکن چوٹی کی جھولی سورج کی تھکی ماندی کرنوں سے ابھی تک بھری ہوئی تھی۔

سوامی جی کی کٹیا کا دروازہ صبح سے بند تھا۔ بالکا اور داس دونوں درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ہرچند ساعت بعد وہ سر اٹھا کر سوامی جی کی کٹیا کے دروازے کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھتے کہ اب دروازہ کھلے اور درشن کے بھاگ جاگیں لیکن دروازہ نہیں کھلا تھا۔

صبح داس نے تھالی میں بھوجن پروس کر سوامی جی کے دروازے پر رکھ دیا لیکن اب تک تھالی جوں کی توں دھری تھی۔ نہ دروازہ کھلا' نہ سوامی جی نے بھوجن اٹھایا۔ اب وہ رات کے بھوجن کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔

پاس ہی بالکا منجھ کے بنے ہوئے جوتے کی مرمت کر رہا تھا۔

دور ٹیلے کے مغربی کونے کے پرے شہر کے مکانات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے ماچس کی روغنی ڈبیاں نیچے اوپر دھری ہوں۔ شہر کے لوبھی بھنورے کی مدھم بھن بھن صاف سنائی دے رہی تھی۔

دفعتاً" اس کے منہ سے اک چیخ سی نکلی۔ "ہے رام۔" اور چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

"ہاتھ کٹ گیا کیا؟" بالکے نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"ناہیں مہاراج۔ وہ دیکھو ---- ادھر۔"

بالکے نے ادھر دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ٹیلے کے مغربی کنارے پر دو لڑکیاں ان کی طرف آ رہی تھیں۔ چست لباس پہنے' بال پھلائے' مکھ سجائے' پرس جھلاتی ہوئی۔

یوں جیسے وہ سوامی جی کا آشرم نہیں بلکہ پکنک سپاٹ ہو۔

"یہ تو کالج کی دکھتی ہیں مہاراج۔" داس نے کہا۔

"آج کل تو سبھی کالج کی دکھتی ہیں۔" بالکے نے جواب دیا۔ "کیا ماتا کیا پتری ----" بالکا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور گھبراہٹ میں ٹہلنے لگا۔

داس چھلے ہوئے آلوؤں کو پھر سے چھیلنے میں لگ گیا۔ ٹیلے پر گھبراہٹ بھری خاموشی کے ڈھیر لگ گئے۔

وقت تھم گیا۔

پھر ایک لوچدار آواز نے تتلی کی طرح پھڑپھڑائے۔ "ہمیں سوامی جی سے ملنا ہے۔"

بالکے نے سر اٹھایا۔

شیلا اور بملا کی کٹورا سی آنکھیں دیکھ کر بالکے نے گھبرا کر سر جھکا لیا اور بولا۔ "سوامی جی کی کٹیا کے دوار کے پٹ کل سے بند ہیں دیوی۔ انہوں نے صبح کا بھوجن بھی نہیں اٹھایا۔"

"تو دوار کے پٹ کھول دو۔" شیلا بولی۔

"ہمیں اس کی آگیا نہیں دیوی۔"

"سوامی جی کو بھی تو دوار بند کرنے کی آگیا نہیں۔" بملا غصے میں چلائی۔ "اگر پرماتما کا دوار بھی بند ہو گیا تو منگتوں کا کیا ہو گا؟"

یہ سن کر بالکے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سدھ بدھ ماری گئی۔ اب کیا جواب دے۔ کوئی ہو تو دے۔ ٹیلے پر خاموشی طاری ہو گئی۔

پھر داس اٹھا۔ اس نے لپک کر چٹائی اٹھائی اور کنیاؤں کے سامنے بچھا کر نیچی نگاہوں سے بولا۔

"بیٹھو شریمتی بیٹھو۔"

"ہمارے پاس بیٹھنے کا ٹائم نہیں۔" شیلا نے کہا۔

"سوامی جی سے کوئی مانگ کرنا ہے یا پوچھنا ہے؟" داس نے پوچھا۔

"مانگ بھی' پوچھنا بھی۔" شیلا نے کہا۔

"ہم تمہارا سندیس پہنچا دیں گے دیوی۔" بالکا بولا۔

"اونہوں۔" شیلا نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "ہم خود سوامی جی سے بات کریں گے۔"

"پر دیوی جی۔ سوامی جی استریوں سے نہیں ملتے۔" بالکے نے کہا۔

"کیا کہا؟" شیلا اور بملا دونوں چلائیں۔

"کیا وہ پرش اور استری کو برابر نہیں جانتے؟" شیلا نے تلخی سے پوچھا۔

باکلے نے سر لٹکالیا اور چپ سادھ لی۔ اب وہ کیا کہے۔ کیا جواب دے۔

ٹیلے پر پھر خاموشی چھاگئی۔ گہری لمبی خاموشی۔

آخر شیلا زیر لب بولی۔ جیسے خود سے کہہ رہی ہو۔ اس کی آواز میں مایوسی کی جھلک تھی۔ "بے کار ہے بملا۔ استری کے لئے پرماتما کا دوار بھی بند ہے۔ یہاں بھی اندھیر نگری ہے۔ یہ دیش بھی پرش کا دیش نکلا۔"

بملا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ چلا کر بولی۔ "سوامی جی پرش سے ملتے ہیں، استری سے نہیں۔ کیا سوامی جی استری سے ڈرتے ہیں۔"

باکلے نے جواب دیا۔ "استری سے سوامی جی نہیں، ان کے اندر کا پرش ڈرتا ہے اور پرش استری سے نہیں، خود سے ڈرتا ہے۔ اس میں اتنی شکتی نہیں دیوی کہ وہ اندر کے مرد کو روک میں رکھ سکے۔"

یہ سن کر دونوں کنیائیں سوچ میں پڑ گئیں۔

اس سمے داس نے دو پیالے چائے کی تھالی میں دھرے اور کنیاؤں کے سامنے رکھ کر بولا۔

"دیوی چاء پیو۔ تم تھک گئی ہو گی۔ بڑی کٹھن چڑھائی ہے اس ٹیلے کی۔"

"بی بی یہ تو ہمارا اندر کا کھوٹ ہے۔" باکلے نے کہا۔ "کہ استری سے بچنے کے لئے ہم اسے دیوی بنا لیتے ہیں۔"

"تمہارے اندر بھی کھوٹ ہے کیا؟ تم جو دن رات رام نام کی دھنکی سے دل کو پوتر کرنے میں وقت گزارتے ہو۔" بملا نے پوچھا۔

"دیوی۔" بالکا بولا۔ "من کا کھوٹ کنویں کے پانی کی طرح ہوتا ہے۔ جتنا نکالو۔ اتنا ہی بھتیر سے رس کر باہر آجاتا ہے۔"

یہ سن کر وہ دونوں چپ ہو گئیں۔ دفعتاً انہوں نے محسوس کیا کہ وہ بہت تھک گئی ہیں۔ اس لئے چٹائی پر بیٹھ کر چائے پینے لگیں۔

"ہاں۔" شیلا سوچ میں گم بڑبڑائی۔ "میرے پتی نے بھی مجھے دیوی بنا رکھا تھا۔ اتنا پیار کرتا تھا کہ وہ پوجا لگی تھی۔ میں کہتی، پر کاش مجھے دیوی نہ بناؤ۔ متر بناؤ۔ ساتھی جانو۔ برابر کا ساتھی----"

"اونہوں۔" بملا نے آہ بھری۔ "وہ برابر کا نہیں جانتے۔ ساتھی نہیں مانتے۔ یا تو دیوی بنا کر پوجا کرتے ہیں اور یا باندی سمجھ کر حکم چلاتے ہیں۔"

"ایسا کیوں ہے بالکا جی؟" بملا نے پوچھا۔

"کیا سوامی جی سے یہی پوچھنے آئی ہو دیوی؟" باکلے نے کہا۔

"ہاں۔" شیلا بولی۔ "جب پرش اور استری ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں تو پھر بڑا چھوٹا کیوں؟"

"سچ کہتی ہو شریمتی---- سچ کہتی ہو۔" باکلے نے آہ بھری۔ "یہ تو استری کی جنم جنم کی پکار ہے۔ اس دن سے استری برابری کی بھیک مانگتی پھرے ہے جس دن رانی وجے ونتی نے راج پاٹ کو تیاگ کر برابری کے کھوج میں راج بھون سے پاؤں باہر دھرا تھا۔" یہ کہہ کر بالکا چپ ہو گیا۔

"وجے ونتی کون تھے پالکے جی؟" بملا نے پوچھا۔

"تمہیں نہیں پتہ کیا؟" بالکا بولا۔ "آج بھی راج گڑھی کی ڈھیری میں آدھی رات کے وقت رانی وجے ونتی کی آواجیں سنائی دیتی ہیں۔"

"آج بھی------؟" بملا نے پوچھا۔

"ہاں آج بھی۔ اس کی ڈھونڈ آج بھی جاری ہے۔"

یہ سن کر شیلا بملا کو چپ لگ گئی۔

سائے اور بھی لمبے ہو گئے۔

درختوں کی ٹہنیاں ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر رونے لگیں۔ سورج کے لہو نے رس رس کر بادلوں کو رنگ دیا۔

وقت رک گیا۔

پھر شیلا کی مدھم آواز آئی۔ "بالکا جی۔ وجے ونتی کون تھی؟"

اور پھر بالکے نے وجے ونتی کی کہانی سنانی شروع کی۔ بالکا بولا۔ "وجے ونتی راج گڑھی کے مہاراج ماتری راج کی رانی تھی۔ مہاراج کا سنگھاسن اس کے چرنوں میں دھرا تھا۔ مہاراج اسے آنکھوں پر بٹھاتے۔ وارے نیارے جاتے---- اس کی کوئی بات نہ ٹالتے۔ الٹا پلے باندھ لیتے۔ انہیں وجے سب رانیوں سے پیاری تھی۔ کیسے نہ ہوتی۔ سندرتا میں وہ سب سے اتم تھی۔ صرف ناک نکسہ ہی نہیں، اسکی چال ڈھال، رنگ روپ سبھاؤ سبھی کچھ سندرتا میں بھیگا ہوا تھا۔ پلکیں اٹھاتی تو دیئے جل جاتے۔ ہونٹ کھولتی تو پھول کھل اٹھتے۔ بانہہ ہلاتی تو ناگ جھولتے۔ بھرپور نجر سے دیکھتی تو رنگ پچکاری بھگو کر رکھ دیتی۔ مہارانی راج بھون میں بڑے آنند سے جیون گجار رہی تھی۔"

بالکا رک گیا۔ پھر کچھ دیر بعد بولا۔ "پھر ایک روز آدھی رات کے سمے مہارانی کا دوار بجا۔ وہ سمجھی، مہاراج آئے ہیں۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو کیا دیکھتی ہے کہ مہاراج نہیں بلکہ ایک بوڑھی کھوسٹ استری کھڑی ہے۔"

"کون ہے تو؟" وہ غصے سے چلائی۔

اس کی آواج سن کر مہارانی کی باندی شوشی جاگ اٹھی اور دوڑ کر دروازے پر آگئی۔ اس کی

اتنی جان کہ آدھی رات کو مہارانی کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ رانی نے شوشی سے کہا۔ ”کون ہے تو؟“ شوشی بڑھیا کی طرف جھپٹی۔

”میں شوبالا ہوں۔“ بڑھیا نے جواب دیا۔ ”میرا دارو کھتم ہو گیا ہے۔ دارو بنا میری رات نہیں کٹے گی۔ میں نے سوچا کہ رانی کے آگے جھولی پھیلاؤں۔ جو کرپا کریں تو میری رات کٹ جائے۔“

”تو استری ہو کے دارو پیتی ہے۔“ رانی نے گھن کھا کر جھرجھری لی۔

”نہ مہارانی۔ جو میں استری ہوتی تو دارو پینے کی کیا جرورت تھی۔ جب میں استری تھی تو دارو پیتی نہیں تھی۔ پلایا کرتی تھی۔ لیکن اب ــــــ اب میں وہ دن بھولنے کے لئے دارو پیتی ہوں۔“

”یہ کیا بول رہی ہے شوشی؟“ وجے نے کہا۔ ”کہتی ہے ’میں استری نہیں۔“

شوبالا بولی۔ ”استری ایک سوگند ہوتی ہے جو کچھ دناں رہتی ہے۔ پھر اڑ جاتی ہے۔ اور پھر پھول کی جگوں ڈنٹھل رہ جاتا ہے۔“

”تو راج بھون کی باندی ہے کیا؟“ شوشی نے پوچھا۔

”نہیں۔“ شوبالا نے کہا۔ ”میں باندی نہیں ہوں۔ آج سے تیس ورش پہلے میں بھی اسی رنگ بھون میں رہتی تھی۔ اسی دلان میں جس میں تو رہتی ہے۔ اسی سیج پر سوتی تھی۔ جب مہاراج ماتری راج کے پتا راج سنگھاسن پر براجمان تھے۔ مہاراج مجھے آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ جیسے تجھے بٹھاتے ہیں۔ بات منہ سے نکلتی تو پورن ہو جاتی۔ یہ سب چونچلے سندرتا کے کارن تھے۔ جیسے آج تیرے چاؤ چونچلے ہیں۔ پھر ایک دن آئے گا جب تو بھی ان دنوں کو بھولنے کے لئے دارو کا سہارا لے گی۔“

یہ سن کر وجے کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”تو کیا یہ ساری چاننی روپ کی ہے؟ میں کچھ بھی نہیں؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ شوبالا نے جواب دیا۔ ”جب تک دکان سجی ہے۔ گاہکوں کی بھیڑ ہے۔ جب دکان لٹ جائے تو استری کو کون جانے ہے مہارانی۔“

”تو بکتی ہے۔ سب جھوٹ ہے۔“ وجے نے چیخ کر کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔“

بالکا رک گیا۔

داس نے چونک کر دیکھا۔ تو پڑا ہوا پھلکا جل کر کالا ہو گیا تھا۔

بملا سر جھکائے چٹائی کو کرید رہی تھی۔

شیلا کی نگاہیں جلتے بادلوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔

”پھر کیا ہوا بالک مہاراج؟“ داس کی آواز سن کر وہ سب چونک پڑے۔ بالکے نے بات چلا دی۔ بولا۔

”شوبالا کے جانے کے بعد وجے رانی بیکل ہو گئی۔ کیا یہ سچ ہے سندرتا ہی سبھی کچھ ہے؟ استری کسی گنتی میں نہیں؟ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ جھوٹ ہے۔ شوشی نے اسے بہت سمجھایا۔ مہارانی سچ کے کھوج کی لگن نہ لگا۔ سچ کوئی میٹھا پھل نہیں۔ وہ جھوٹ جو شانت کر دے‘ اس سچ سے اچھا ہے جو اندر بھٹی سلگاوے ہے۔ پرنتو مہارانی کو سچ کی ڈھونڈ کا تاپ چڑھا تھا۔ بولی۔ ”منش کی رتھ میں دو پہیئے لگے ہیں۔ پرش اور استری۔ رتھ کیسے چل سکتی ہے جد توڑی دونوں پہیئے برابر نہ ہوں۔“

”نہیں رانی۔“ شوشی نے کہا۔ ”دو پہیئے برابر نہیں۔ کارن یہ کہ پرش کا پہیہ چلے ہے۔ استری کھالی سجاوٹ کے لئے ہے۔ چلتا نہیں۔“

باندی نے وجے کو بہت سمجھایا پر وہ نہ مانی۔ بالکا رک گیا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر بملا شیلا کی طرف دیکھا۔ بولا۔ ”کنیاؤ۔ جس کے من میں سچ کی ڈھونڈ کا کیڑا لگ جائے پھر جیون بھر اسے نہ سکھ ملتا ہے نہ شانتی۔“

”یہ کیا کہہ دیا بالک مہاراج؟“ داس بولا۔

دوار کا داس بالکے نے کہا۔ ”سچ بولو۔ سچ کو اپناؤ۔ سچ جیو پرنتو سچ کی ڈھونڈ میں نہ نکلنا۔ سدا چلتے رہو گے۔ چلنے کے بھرم میں آ جاؤ گے۔ نہ رستہ ہو گا۔ نہ ڈنڈی‘ نہ اور ــــــ اور نہ کہیں پہنچو گے۔ صرف چلنا۔ چلتے رہنا۔“ بالکے نے آہ بھری اور کہانی سنانے لگا۔ بولا۔ ”لاکھ سمجھانے پر بھی وجے رانی سچ کی ڈھونڈ میں چل نکلی۔ سب سے پہلے اس نے مہاراج کو پرکھنے کی ٹھانی کہ وہ مجھے برابر کا جانیں ہیں کہ نہیں۔ اس کے من میں چنتا کا کانٹا لگ گیا۔ جوں جوں اس کی چنتا بڑھتی گئی‘ توں توں مہاراج اسے اپنے دھیان کی گود میں جھلاتے گئے۔ اس کے سامنے یوں سیس نواتے گئے جیسے وہ سچ مچ کی دیوی ہو۔ جوں جوں وہ دیوی کو مناتے گئے‘ توں توں رانی کی کلپنا بڑھتی گئی مہاراج مجھے مورتی نہ بنائیے۔ مندر میں نہ بٹھائیے۔ اپنے پاس بٹھائیے۔ اپنے برابر جانئے۔

مہاراج کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ برابر کیسے جانیں۔ جسے دھیان دیا جائے۔ مان دیا جائے۔ اونچا بٹھایا جائے۔ وہ برابری کیوں چاہے۔ جسے سارا دیا جائے وہ آدھا کیوں مانگے؟

وجے رانی جلد ہی پتہ چل گیا کہ مہاراج اسے دیوی کے سمان بنا سکتے ہیں‘ مہارانی بنا سکتے ہیں‘ چہیتی سمجھ سکتے ہیں‘ ساتھی نہیں بنا سکتے۔

یہ جان کر وجے نے ٹھان لی کہ وہ راج بھون کو چھوڑ دے گی۔ رانی نہیں بلکہ استری بن کر

جئے گی۔ سندر تا کے جور پر نہیں، جیئو کے جور پر۔ بھبھوت مل کر سندر تا چھپائے رکھے گی اور کسی کے ساتھ بیاہ نہ کرے گی جب تک وہ اسے برابر کی نہ سمجھے۔ ساتھی نہ جانے۔

پھر ایک رات جب گرج چمک جوروں پر تھی اور راج بھون کے چوکیدار کونوں میں سہمے بیٹھے تھے تو وجے نے بھیس بدلا اور شوشی کو ساتھ لے کر چور دروازے سے باہر نکل گئی۔

چلتے چلتے وہ راج نگری سے دور ایک شہر میں رکیں۔ وجے گجارے کے لئے پھلکاریاں بناتی۔ شوشی انہیں باجار جا کر بیچ دیتی۔

کچھ دنوں میں وجے کی پھکاریوں کی مانگ بڑھ گئی۔ ”اتنی صاف ستھری پھلکاریاں کون بناوے ہے؟“ منڈی میں باتیں ہونے لگیں۔ پھر بدیش سے ایک گھبرو بیوپاری آنند آنکلا۔ پھلکاریاں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اس نے شوشی کو ڈھونڈ نکالا۔ بولا۔ ”یہ پھلکاریاں کون کاڑھتی ہے؟ مجھے اس کے پاس لے چل۔“ شوشی اسے گھر لے آئی۔ وجے کو دیکھ کر وہ پھلکاریاں بھول گیا۔ وجے پھلکاریاں دکھاتی رہی۔ آنند وجے کو دیکھتا رہا۔ وجے سمجھتی تھی کہ بھبھوت سندر تا کو ڈھانپ لیتی ہے۔ آنند سوچتا رہا کہ جس گن کو استری اچھالتی ہے، یہ شرمیتی اسے چھپا رہی ہے۔ اوش کوئی بھید ہے۔

آنند بہت سیانا تھا۔ اس نے شہر شہر کا پانی پی رکھا تھا۔ اس نے سوچا، پاؤں دھیرے دھیرے دھرو۔ بڑی پھسلن ہے اور جو گرا تو یہاں سہارا دے کر اٹھانے والا کوئی نہیں۔ پہلے تیل دیکھ، تیل کی دھار دیکھ۔ پھر پاؤں دھرنا۔ تو وہ تیل کی دھار جانچنے کے لئے پھلکاریوں کے بہانے وجے کے گھر آنے جانے لگا۔

دو چار پھیروں میں اسے پتہ چل گیا کہ سندر تا کی بات نہیں چلے گی۔ پریم کی بات نہیں چلے گی۔ ملائم بات نہیں چلے گی۔ لگاؤ کی نہیں، بے لاگ، کھردری، گنوار۔

وہ بولا۔ ”بی کاڑھن۔ تو تو چیونٹی کی چال چلے ہے۔ پر مجھے تو بہت سی پھلکاریاں چاہیں تاکہ انہیں بیچ کر اپنا پیٹ پال سکوں۔“

پھر چار ایک دن کے بعد آنند وجے سے بہت بگڑا۔ سب جھوٹ موٹ۔ بولا۔ ”تو کام چور ہے ری۔ میں تیرے سر پر بیٹھ کر کام کراؤں گا۔“ اس بہانے وہ سارا سارا دن وجے کے گھر رہنے لگا۔ جوں جوں وہ اس کے نیڑے ہوتا گیا۔ اس کا من ہاتھوں سے نکلتا گیا۔

پھر ایک دن آنند نے اس کی بانہہ پکڑ لی۔ بولا۔ ”بی کاڑھن میرا دھندا نہیں چلتا۔ اتنی کمائی بھی نہیں ہوتی کہ سوکھا گجارہ کر سکوں۔ جو تو مجھ سے بیاہ کر لے تو جیون سکھی ہو جائے۔ تو پھلکاریاں کاڑھے، میں انہیں بیچوں۔ کام تیرا، دوڑ دھوپ میری۔“

وجے اس کی چال میں آ گئی۔ اس کی ممتا جاگ اٹھی۔ بولی۔ ”میں تو اس سے بیاہ کروں گی جو

پتنی کو برابر کا سمجھے۔ نہ اسے دیوی بنائے نہ باندی۔ اپنا جیون ساتھ جانے۔ دکھ سکھ کا ساتھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ آنند بولا۔ ”تو میری ساتھن ہے۔ ساتھن رہے گی۔“

جب وجے دلہن بنی تو بھبھوت کا پردہ بھی اٹھ گیا۔ اندر سے رانی نکل آئی۔ آنند دھک سے رہ گیا۔ پر بھو ایسی مورتی------!“ بالکا رک گیا۔

داس منہ کھولے بیٹھا تھا۔ چولہا جل رہا تھا۔ توا جو کھالی پڑا تھا تپ تپ کر کالا ہو گیا تھا۔ بیڑا ہاتھ میں یوں دھرا تھا جیسے بالک کے ہاتھ کا کھدو ہو۔

شیلا کی نگاہیں گھاس پر بچھی ہوئی تھیں جیسے ڈھونڈ میں لگی ہوں۔ بلا کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ اب روئی کہ اب روئی۔

ٹیلے پر سائے منڈلا رہے تھے۔ بادلوں میں آگ جل رہی تھی۔

شام دبے پاؤں جا رہی تھی۔ رات اپنے پر پھڑپھڑا رہی تھی۔

”پھر کیا ہوا بالک جی؟“ داس نے جیسے ہچکی لی۔

بالک بولا۔ ”آنند بہت بڑا سوداگر تھا۔ حویلیاں تھیں۔ نوکر چاکر تھے۔ دھن دولت تھی۔ کس بات کی کمی تھی اسے۔ وہ تو وجے کو رام کرنے کے لئے اس نے نردھن کا سوانگ رچایا تھا۔ بس ایک بات سچ تھی۔ وہ تن من دھن سے وجے کا ہو چکا تھا۔“

اس کا باہر جانے کو جی نہیں چاہتا پر کیا کرتا۔ اتنا بڑا بیوپار تھا۔ اس کی دیکھ بھال تو کرنی ہی تھی۔ اسے جانا ہی پڑتا۔ پھلکاریاں بیچنے کے بہانے چلا جاتا۔ دنوں باہر رہتا۔ چلا جاتا تو جیسے گھر کا دھیان ہی نہ ہو۔ آجاتا تو جیسے جانے سے ہول کھاتا ہو۔

پھر یہ بھی تھا کہ اس نے وجے کو پھلکاریاں کاڑھنے سے روک دیا تھا۔ بولا۔ ”پتنی تو سال میں ایک ٹھاٹھ کی پھلکاری بنا دیا کر۔ ایسی جو راجا رانی جوگی ہو۔ ایسی جو ایک بیچ لی تو گھر میں لہر بہر ہو گئی۔“

اس پر وجے سوچ میں پڑ گئی۔ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ جب وہ آیا تو اسے کہنے لگی۔ ”رے تو مجھ سے اپنے بیوپار کی بات کیوں نہیں کرتا؟“

آنند نے جواب دیا۔ ”ساتھن بیوپار میں اونچ نیچ ہوتی ہے۔ پھن پھریب ہوتا ہے۔ چھل بٹے ہوتے ہیں۔ بیوپار کی بات سن کر کیا کرے گی؟“

وجے بولی۔ ”دیکھ میں تیری ساتھن ہوں۔ برابر کی ساتھن۔ اور ساتھی کھالی سکھ کا نہیں ہوتا۔ دکھ کا بھی ہوتا ہے۔ اونچ کا نہیں نیچ کا بھی ہوتا ہے۔ تو مجھے اپنے بیوپار کی ساری بات بتا۔ اپنے دکھ گنوا۔“

اس پر آنند نے اسے ایک لمبی چوڑی طوطا مینا کہانی سنا دی کہ کس طرح نگر نگر پھرا۔ راجاؤں

رانیوں سے ملا۔ انہیں پھلکاری دکھائی اور انت میں اک راج نرتکی پھلکاری کو دیکھ کر اس پر لٹو ہو گئی۔ بولی۔ “بول بیوپاری منہ مانگے دام دوں گی۔”

اس رات وجے کو یوں لگا جیسے آنند اس کا جی بہلانے کے لئے کہانی سنا رہا ہو۔ سلانے کے لئے لوری دے رہا ہو۔ اس پر وہ سوچ میں کھو گئی۔ من میں گھنڈی پڑ گئی۔ بولی۔ “شوشو یہ تو وہ نہیں جو یہ کہے ہے۔ جو بھید ہی نہ دے' وہ ساتھی کیا بنے گا۔”

“دیکھ رانی۔” شوشی بولی۔ “وہ اوش بھید رکھے ہے پر اس کے من میں دوج نہیں' کھوٹ نہیں۔ پرش پتنی کو اپنے بیوپار کا بھید کبھی نہیں دیتا۔ وہ اسے ساری بات کبھی نہیں بتاتا۔ جرور ڈنڈی مارے ہے۔ یہی جگ کی ریت ہے۔”

“تو کیا وہ استری کو اس جوگا نہیں جانتا کہ ساری بات جانے۔ یہ تو ساتھ نہ ہوا برابری نہ ہوئی۔ جا شوشی منڈی میں جا کر پوچھ گچھ کر۔ اس کے بھید کا پتہ لگا۔”

شوشی نے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ آنند تو ایک راج بیوپاری ہے۔ اس نے بیجانگری کی مہارانی کے لئے شیش بھون بنوانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔

جب وجے نے یہ سنا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ “تو پھلکاریاں بیچ کر گجارہ کرنے کی بات اک بہانہ تھی۔ کیوں شوشی۔۔۔۔ تو کیا کہتی ہے؟؟”

شوشی نے وجے کو بہت سمجھایا بجھایا کہ دیکھ دیئا اس سے اچھا جیون ساتھی تجھے نہیں ملے گا۔ اس سے جیادہ برابری کوئی نہ دے گا لیکن وجے نہ مانی۔ شوشو اتنے پردے اوپر کچھ۔ بھیتر کچھ۔ نہ شوشی جہاں پردے ہوں' جھوٹ ہو' دکھاوا ہو' برابری کیسی۔ چل شوشی کسی ایسی جگھوں چلیں جہاں پردہ نہ ہو' جھوٹ نہ ہو۔ اب یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔” بالکا رک گیا۔

“تو کیا وجے آنند کو چھوڑ کر چلی گئی؟” شیلا نے پوچھا۔

“ہاں۔ چلی گئی۔” بالکا بولا۔

بملا نے ایک لمبی آہ بھری۔

“پھر وے کہاں گئی؟” داس نے پوچھا۔

“پہلے وہ ایک بچاری کے پھندے پھنس گئی۔ پجاری نے اسے داسی بنا لیا۔ پر بھو کی داسی۔ پھر آپ پر بھو بن بیٹھا۔

وہاں سے بھاگی تو ایک نرتکی کے جال میں جا پھنسی۔ اس نے اسے اپنے چوبارے میں سجا لیا۔ چوبارے سے اسے ایک راج گائیک لے اڑا۔ وہاں سے بھی اسے برابری نہ ملی۔ گائیک سارا دن ستار سینے سے لگائے رکھتا۔ پھر تھک کر ماندگی اتارنے کے لئے وہ وجے سے دل بہلاتا۔

“چل شوشی۔” ایک دن وجے نے کہا۔ “یہاں تو راگ ودھیا کا راج ہے۔” شوشی بولی۔ “دیئا جو چاہے ہے' وہ ادھر نہیں ملے گا۔ جہاں دھنوان بستے ہیں۔ وہ ادھر ملے گا جہاں نردھن بستے ہیں۔ کامی بستے ہیں۔ جہاں پرش پتنی کے سہارا لئے بغیر کچھ کر نہیں سکتا۔ جہاں پتنی نہ موہ ہوتی ہے نہ مایا۔ بس اک باجو ہوتی ہے۔ پہلے سہارا ہوتی ہے' پھر کچھ اور۔ جہاں دوجے کے بنا گجارا نہیں ہوتا۔ وہاں استری کو برابری مل جائے تو مل جائے۔”

“وہ کون سی جگھوں ہے؟ کہاں ہے شوشی؟” وجے نے پوچھا۔

“وہ جگہ وہاں ہے جہاں دھن کا جور نہیں ہوتا۔ کام کا ہوتا ہے۔ دیکھو دیئا تو مان نہ مان۔ پرنتو استری جیو کی دھرتی ہے۔ جس کے دم سے جیو کونپل ہری رہتی ہے۔ استری کی سار وہی جانے ہے۔ جو دھرتی کی سار جانے ہے۔ جو بوٹا لگانا جانے ہے۔ جو کھیتی اگائے ہے۔ جس کا گجارا دھرتی کی پیدا پر ہے۔ بس وہی استری کو باجو سمجھے ہے۔ اپنے سا جانے ہے۔”

وجے کے دل میں بات اتر گئی۔

اک بار پھر وہ گھر چھوڑ کر نکل گئیں۔ شہر سے دور گاؤں کی اور۔

شوشی نے وجے کو موٹے کپڑے پہنا دیئے۔ منہ پر ہلدی' کالک کا ابٹن مل دیا۔ بولی۔ “یہاں استری استری ہوتی ہے۔ گن کے جور پر نہیں۔ جیو کے جور پر۔ یہاں سندرتا شوبھا نہیں رستے کی روک ہے۔ تو اپنی سندرتا کو چھپا رکھنا۔ جو نجر آ گئی تو گڑبڑ ہو گی۔”

“شوشی۔” وجے بولی۔ “میں اس سندرتا کے کارن بڑا دکھی ہوں۔ کوئی بس بھری بوٹی ڈھونڈ لا کہ میں مکھ پر مل لوں جو سندرتا کی کاٹ کر دے۔”

“شوشی ہنسی۔” بولی۔ “بھولی رانی۔ سندرتا مکھ پر نہیں ہوتا۔ سارے پنڈے میں ہوتی ہے۔ انگ انگ سے پھوٹی ہے۔ بات ہلانے میں ہوتی ہے۔ پگ دھرنے میں ہوتی ہے۔ آنکھ اٹھانے میں ہوتی ہے۔ ہونٹ کھولنے میں ہوتی ہے۔ تو اسے اپنے سبھاؤ سے کیسے نچوڑ پھینکے گی؟؟”

گاؤں میں پہنچ کر انہوں نے ایک جھگی میں ڈیرا کر لیا اور کھیت میں کپاہ کے پھول چننے لگیں۔

ایک دن لاکھا کسان نے وجے سے کہا۔ “تو کیسی جنانی ہے ری۔ تیری انگلیاں تو قینچی سی چلتی ہیں۔” اس نے وجے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انگلیاں دیکھیں تو سٹپٹا گیا۔ “ری یہ کیسی انگلیاں ہیں؟ انگلیاں ہیں کہ رس بھری پھلیاں۔ اتنی لمبی اتنی پتلی۔”

پھر وہ روز اس کی چلتی چنتی انگلیاں دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے ایک دن انگلیاں پکڑ کر بولا۔ “ری تو میرے گھر کیوں نہیں بیٹھ جاتی۔ میں اکیلا ہوں۔ پتا جی پرماتما کو پیارے ہو گئے۔ ماتا بہت بوڑھی ہے۔ میرا ہاتھ نہیں بٹا سکتی۔ بھائی بہن ہیں نہیں۔ اکیلا ہوں۔ تو میرا باجو بن جا ری۔ میں ہل چلاؤں گا تو بیج

ڈال۔ میں پانی دوں تو کھیت کی بوٹی چن۔ میں گیہوں کاٹوں تو دانے نکال۔ پھر ہم کسی سے ہیٹے نہیں رہیں گے۔ میں جو آدھا ہوں، پورن ہو جاؤں گا۔" اس کی بات میں نہ موہ تھی نہ کامنا۔ نہ لوبھ۔

وجے کو اپنی شرط بھی بھول گئی۔ اس نے ہاں کر دی۔ پھر وہ دونوں کھیت پر کام میں جت گئے۔ لاکھا نہ اسے نرمل سمجھتا نہ ماڑی۔ نہ سندر نہ دیوی۔ وہ تو اس کا باجو تھی۔ پھر کوئی بات اس سے چھپاتا بھی تو نہ تھا۔ کیسے چھپاتا۔ ہر سمے وہ دونوں اکٹھے رہتے۔ کھیت میں۔ گھر میں۔ ہر بات میں اس کی مرضی پوچھتا۔ کام میں اسے ذرا چھوٹ نہ دیتا۔

وجے نہال ہو گئی۔ سمجھی جیسے جل ککڑی جوہڑ میں آ گئی ہو۔

لاکھے کسان کو وجے کی ایک بات پر بڑی چڑ تھی۔ کہتا۔ "ری تو گندی کیوں رہتی ہے۔ نہاتی دھوتی کیوں نہیں؟ منہ پر جردی چھائے رہتی ہے۔ الیاں بلیاں لگی رہتی ہیں۔ بال چکٹ۔ آنکھوں میں کیچ۔" وجے یہ سن کر گردن لٹکا لیتی۔

ایک دن جب وہ دونوں ندی کے کنارے کھڑے تھے تو لاکھا نے تاؤ کھا کر بالٹی اٹھائی اور وجے پر انڈیل دی۔ پھر بالٹی پر بالٹی گرانے لگا۔ وجے بھاگی تو اس نے اسے پکڑ کر ندی میں چھلانگ لگا دی اور اسے یوں دھونے اور مانجھنے لگا جیسے وہ رسوئی کی گڈوی ہو۔

پھر جب وہ اسے کھینچ کر پانی سے باہر لایا تو اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ سنہرے لانبے بال۔ مور سی گردن۔ کٹورہ سی آنکھیں۔ دھار سی ناک۔ پھول سے ہونٹ۔ چھوئی موئی سا بدن ------ "تو کون ہے ری؟" وہ گھگھیا کر بولا۔ "تو استری نہیں۔ تو تو پری ہے ری پری۔"

بالکا کچھ دیر کے لئے چپ رہا۔ پھر بولا۔ "بس اس دن سے لاکھے کے من میں جھجھک بیٹھ گئی اور وہ وجے سے دور ہٹتا گیا۔ وجے نے بار بار اسے سمجھایا۔ "دیکھ لاکھے میں پری نہیں، استری ہوں۔ استری۔"

پر اس کی جھجک نہ گئی۔ بولا۔ "تو پری نہیں تو استری بھی نہیں۔ تو مور ہے میں کاگ ہوں۔ تیرا میرا کیا سمبندھ؟ کارن یہ کہ تو کامیوں میں سے ناہیں۔"

کچھ دنا وجے اس کا منہ تکتی رہی۔ پھر نراش ہو گئی۔ پھر ایک دن وہ شوشی سے بولی۔ "چل شوشی۔ یہاں ہمارا دانا پانی ختم ہو گیا۔"

شوشی نے سر جھکا لیا۔ اور جوں کی توں بیٹھی رہی۔ جیسے بات سنی ہی نہ ہو۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتی رہی۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ شوشی اب لاکھے کی ہو چکی تھی۔

وجے کا دل دھک سے رہ گیا۔ اور وہ چپ چاپ اکیلی باہر نکل گئی۔"

بالکا چپ ہو گیا۔ سبھی چپ ہو گئے تھے۔

کسی کو، "پھر کیا ہوا" پوچھنے کا دھیان نہ رہا تھا۔

پھر بالکے نے کہا۔

"پھر پتہ نہیں ------ کہتے ہیں۔ وہ آج تک برابری کی ڈھونڈ میں بھٹکتی پھرتی ہے۔

"آج بھی آدھی رات کے سمے راج گڑھی سے آواجیں آتی ہیں ------ پربھو باہر کی سندرتا کو بھیتر میں رچا دے کہ استری، استری بن جائے ------ پرش کی کامنا کے ہاتھ کا کھلونا نہ رہے۔"

بالکا چپ ہو گیا۔ ٹیلے پر خاموشی چھا گئی۔

پھر کوئی دور سے بولا۔ وجے رانی نے سچ کو پا لیا۔ جو اپنی سندرتا کو اچھالتی ہیں۔ بناؤ سنگھار کا راکشش کھڑا کر لیتی ہیں، انہیں برابری مانگنے کا کوئی ادھیکار نہیں۔

انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ سوامی جی دوار کے باہر کھڑے تھے۔

# باجوؤں کی ڈھونڈ

پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ کچھ ہو گیا ہے۔ نجر دھندلا گئی ہے۔ جاگتے ماں سپنے دکھیں ہیں۔ دل کو دھڑکن لگ گئی ہے۔ ڈاکدار کہے ہے' دل ماں کانٹا لگ گیا ہے۔ لو اس عمر ماں بھلا کیسے لگے گا کانٹا اور پھر اس گھر ماں۔ یہاں تو آرام ہی آرام ہے۔ یوں پڑا ہوں جیسے سونے کی مکھمل کی ڈبی ماں پڑی ہووے ہے۔

یہ کمرا جہاں رہتا ہوں' ماں انڈے کی طرحیوں چمکے ہے۔ نیچے گلیچہ بچھا ہے۔ اتنی صفائی ہے کہ کھلتی ہے۔ ایمان سے۔ کھانساماں وخت پر روٹی لاوے ہے۔ وخت پر نشتہ' وخت پر چاہ' وخت پر دودھ۔ نہ ڈیننگ روم ماں جانا پڑے ہے۔

شیدے نے پہلے روج ہی کھانساماں سے بول دیا تھا۔ دیکھو کھانساماں بڑے چوہدری صیب کا نشتہ لنچ ادھر لگے گا۔ بڑے صیب کے کمرے ماں اور ڈیننگ روم میں لگنے سے ادھ گھنٹہ پہلے لگے گا۔ بعد ماں نہیں۔ ساتھ نہیں۔ سمجھے-----؟

شیدا بڑا کھیال رکھے ہے۔ روج آوے ہے اک وار اس کمرے ماں۔ پچھن کے لئے۔ بہوری کدی کدی آ جاوے ہے نجر آتے جاتے۔ بڑی اچھی ہے۔ سلام کرے۔ پچھے ہے بابا اچھے ہیں۔ آپ مسکا کے بات کرے ہے پر چلتے چلتے۔

آج کل رواج ہی ایسا ہے۔ بہویں رکتی نہیں' بچاری کیا کریں۔ رکنے کا ٹیم نہیں ہوتا۔ اندر اتنی جان ہوتی ہے کہ رکنے نہیں دیتی۔ ہمارے جمانے ماں بھی جان ہوا کرے تھی۔ گھر والی ماں بڑی بڑی جان ہوتی تھی۔ پر وہ ٹھنڈی جان ہووے تھی۔ اب تو تتی ہووے ہے۔ بڑی تتی۔ اتنی کہ بھڑاس نکلے ہے۔ پہلے بھی بھڑاس ہووے تھی۔ پردے نکلے نہیں تھی۔ جلی پاتھی کی طرحیوں اوپر سے کالی سوا۔ نیچے لال انگارہ۔ اب تو لال انگارہ اوپر ہووے ہے۔ وخت وخت کی بات ہے بھائی۔ کدی مال بھیتر چھپا کر رکھیں ہیں۔ کدی باہر سجا کر رکھیں ہیں۔

سارا دن ماں اپنے بنے سجے کمرے میں ماں ارام سے پڑا رہوں ہوں۔ بس ایک تخلیف ہے۔ اسمان نہیں دکھتا۔ بچپنے سے اک عادی پڑی وی ہے کہ اسمان دکھتا رہے۔ جو اسمان دکھتا رہے تو حوصلہ رہے ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ ایک تو دل تنگ نہیں ہووے ہے۔ دوجے جندگانی بند بند نہیں لگے ہے۔ پھر یہ بھی کہ اسمان دکھے ہے تو اسمان والا بھی دور نہیں لگے ہے۔ جیسے نیڑے نیڑے ہو۔ پاس ہو۔ ساتھ ہو۔ اک تسلی سی رہے ہے۔ جندگی میں کیا چاہئے۔ بس اک تسلی۔ اور کیا۔

اس کمرے ماں اسمان نہیں دکھے ہے۔ بس یہی ایک تخلیف ہے۔ بڑی تخلیف ہے۔ پھر دروجے ہیں۔ ساری عمر کھلے دروجوں ماں بتائی۔ پر اس کمرے کے دروجے بند ہی رہیں ہیں۔ کھلتے تو ہیں پر کھل کے نہیں دیتے۔ پھٹ سے بند ہو جاویں ہیں آپ ہی آپ۔ پھر دروجوں پر پردے پڑے رہیں ہیں۔ یہ سیسے کا ہے۔ یہ جالی کا' یہ گرل کا' یہ کپڑے کا۔ پردے ہی پردے' پردے ہی پردے۔ بھلا اسمان کیسے نجر آئے۔ بس جمین ہی جمین دکھے ہے۔ وہ بھی بنی سجی گلیچے والی۔ مٹی والی دھرتی نہیں دکھتی۔ بوٹے نہیں دکھتے۔ ویسے بوٹے تو بہت ہیں بنگلے ماں۔ وہ بھی طرحاں طرحاں کے۔ پر بھی بناوٹی گملوں والے۔ دھرتی والے نہیں۔

چلو اسمان نہیں دکھتا تو نہ سہی۔ اتنی سی بات سے کانٹا تو نہیں لگتا نا دل ماں۔ پھر ڈاکدار کیوں کہے ہے کانٹا لگ گیا ہے۔ بھیا۔ کانٹا تو دکھ میں لگے ہے سکھ ماں تو نہیں لگے۔ ماں تو یہاں سکھ میں پڑا ہوں۔ سمجھ کر لو جس طرحیوں گری بدام میں پڑی ہووے ہے۔ پھر کانٹا کیسا۔

ہاں ایک بات جرور ہے۔ نجر دھندلا گئی ہے۔ منے یہ ڈاکدار کو نہیں بتائی جو بتا دیتا تو وہ پچھتا----- پتہ نہیں کیا کیا پچھتا۔ ویسے بھی ماں باجوؤں کی بات جو بتا بھی دیتا تو کیا وہ سمجھ لیتا۔ ماں تو کھد نہیں سمجھ پایا جاجوؤں کی بات کو۔ پھر بھلا وسے کیسے سمجھاتا۔ منے تو اپنے پتر شیدے سے نہیں کری یہ بات۔ بھلا بتاؤ جس بات کا نہ سر ہو نہ پیر' وسے کون سمجھائے۔ کون سمجھے۔

اور کوئی سمجھے بھی کیسے باجوؤں کی بات۔ باجوؤں کا تو جمانہ ہی نہ رہا۔ وہ تو کد سے کھتم ہو گیا۔ اب تو باجوؤں نے روپ ہی بدل لیا ہے۔ وہ تو گلے کا ہار بنے وے ہیں۔ اب وہ پرانے جمانے کے باجو کہاں۔ اب تو کھالی جسم رہ گیا ہے۔ تیکھا۔ بنڑاوا۔ یوں جیسے تیر کمان پہ چڑھا ہو۔ اب چھوٹا کہ اب چھوٹا۔

یہ جب اور اب کا جھگڑا سدا کا ہے بھائی۔ ہمیش جب جب رہا اور اب اب۔ نہ کدی جب اب ہوا' نہ اب جب۔ دونوں ماں پھاصلا ای رہا۔ اب تو یہ پھاصلا روج بروج بڑھتا ہی جاوے ہے۔ دنا ماں صدیاں کا پھرق پڑتا جاوے ہے۔

ہاں تو نجر کی بات کر رہا تھا ماں۔ اپنی نجر دھندلائے کچھ جیادہ دیر بھی نہیں ہوئی۔ یہی چار ایک

ہیجتے ہوئے ہوں گے۔ نہیں بھئی دیکھنے ماں میں تو پھرق نہیں آیا۔ سب کچھ دکھے ہے۔ ٹھیک ٹھاک دکھے ہے۔ کمرے کی تانکیاں دکھیں ہیں۔ دروجے دکھے ہیں۔ پردے دکھیں ہیں۔ کونچ دکھے ہے۔ میج دکھے ہیں۔ سب چیجیں دکھیں ہیں۔ صاف دکھیں ہیں۔ کوئی چیج نہیں دھندلائی۔ صرپھ نظر دھندلائی ہے۔ یوں کہ کھوامکھواہ کہ چیجیں دکھنے لگی ہیں۔ وہ بھی بہتی نہیں' صرپھ دو باجو۔

دو باجو میرے کمرے ماں گھس آئے ہیں۔ وہ میرے آسے پاسے یوں گھومیں پھریں ہیں جیسے سریت کی بوتل کے گرد مکھیاں۔

پہلے دنا جد مسے باجوؤں کو دیکھا تو ماں گھبرا گیا۔ ایمان سے رات کا وخت تھا۔ بشیرا کھانساماں آیا۔ وسنے روٹی میج پر رکھ دی۔ اس وخت کھانے کو جی نہیں چاہے تھا۔ منے سوچا' چلو کھا لو۔ چودھری فضلے دو برکیاں۔ پھر ارام سے حقہ پیوں گا۔

حقہ مجھے بہت پیارا ہے۔ سمجھ لو یہی اک ساتھی رہ گیا ہے پرانے دناں کا۔ میرے پاس بیٹھ کر رات گئے توڑی مجھ سے باتاں کرتا رہے۔ اپنی کہے ہے۔ میری سنے ہے۔ گھرماں کسی کو میرا حقہ پسند نہیں۔ کھانساماں اسے ہاتھ نہیں لگائے ہے۔ ماں کھد ہی تاجا کروں ہوں' کھد ہی چلم پھروں ہوں۔ بہو تو کہے ہے۔ ہئے۔ بو' بو' بو۔ لے جاؤ اسے یہناں سے۔ مجھے نجر نہ آئے شیدے نے منہ کھول کر کدی نہیں کہا کچھ۔ آنے بہانے بہت کچھ کہا۔ کہنے لگا۔ بابا سگریٹ کا بڑا ڈبہ منگوا دوں۔ کدی حقہ نہ بھرا' سگریٹ پی لیا۔ اک روج وہ لے بھی آیا بڑا ڈبہ جس ماں ڈبیاں تھیں۔ میرے کمرے میں چھوڑ گیا وسے۔ مہینہ بھر پڑا رہا یہاں جوں کا توں بند کا بند۔ منے منہ نہ لگایا۔ کیسے لگاتا۔ بھائی کہاں گونگا چرٹ کہاں باتاں کرنے والا حقہ۔ ماں اپنے دکھ سکھ کے ساتھ کو کیسے چھوڑ دیتا بھلا۔ ایک ہی تو ساتھی ہے اپنا اس بھرے گھر میں۔

ہاں تو میں اس روج کی بات کر رہا تھا۔ منے سوچا' چودھری فضلے کھالے دو برکیاں۔ پھر ارام سے بیٹھ کر حقہ پئیں گے۔ او جی ماں میج پر جا بیٹھا۔ روٹی والا رومال کھولیا۔ پتہ نہیں دو باجو کہاں سے تیرتے وے آئے۔ اک باجو کا ہتھ کھلا اور وس نے پلیٹاں سے روٹی اٹھا کر میرے ہتھ تھما دی۔ ماں دیکھتا ہی رہ گیا۔ حریان۔ پھر وہ باجو میرے آسے پاسے ہی رہے۔ بوٹی کھانے لگا تو دو انگلیوں نے پکڑ کر سامنے رکھ دی۔ پانی پینے لگا تو گلاس ہتھ ماں پکڑا دیا۔ ماں تو حریان۔ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

بس اس روج سے آج توڑی یہی ہو رہا ہے۔ دن رات' اندھیرے سویرے' سر بھارا بھارا ہو تو انگلیاں پڑپڑیاں سہلاویں ہیں۔ تھکاوٹ ہو تو ہاتھ پنڈلیاں دباویں ہیں۔ اٹھتا ہوں تو باجو سہارا دیویں ہیں۔ کھاٹ سے اٹھوں تو جوتا سامنے رکھ دیویں ہیں۔ دروج کھولیں ہیں۔ قدم قدم پر سنبھالا دیویں ہیں۔

پہلے تو ماں سمجھا سٹھیا گیا ہوں۔ جہن گڈمڈ ہو گیا ہے۔ نجر تماسے کھیل رہی ہے۔ پھر سوچ سوچ کر ماں نے کہا۔ چودھری فضلے یو بات نہیں۔ نہ تو جہن دھندلایا ہے' نہ نجر۔ یہ کجھ اور ہی بات ہے سوچتا رہا' دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ باجو چٹے نہیں' گورے نہیں' بدامی ہیں۔ بھرے بھرے۔ سوکھے نہیں۔ بنے سجے نہیں جیسے آج کل ہوویں ہیں۔ نہ رنگ دار نہ ریمیں نہ ملیم۔ پر ہیں صاف ستھرے۔ درسنی نہیں کامی ہیں۔ انگلیاں یہ موٹی موٹی ہیں۔ بھنڈیوں کی طرحیوں۔ نہ کولیاں' نہ پتلی پتنگ نخون بڑھے وے نہیں چھریوں کی طرحیوں کٹے وے ہیں۔ رنگ دار نہیں ساد مراوے ہیں۔ یو باجو آج کل کے باجو نہیں چھیڑتے نہیں سنبھالتے ہیں۔ ڈولتے نہیں' سہارا دیویں ہیں۔ دکھنے والے نہیں کامی ہیں۔ تو بھائی ماں دیکھتا رہا' دیکھتا رہا۔

کدی کدی لگتا جیسے جانے پچھانے ہوں۔ دیکھن ماں نئے پر درتن ماں جانے پچھانے۔ میرے آسے پاس ہوا ماں تیریں ہیں توان جانے دکھیں ہیں۔ سر دباویں ہیں سہارا دیویں ہیں تو جانے لگیں ہیں۔

پھر اک دنا بھید کھل گیا۔

میری نجر باجو کی کنی پر جا پڑی۔ پھوڑے کا اتنا بڑا نسان۔ ارے یو تو سگو کے باجو ہیں۔

پھر ماں سوچن لگا۔ چودھری فضلے یہ جو تجھے دن رات سگو کے باجو دکھنے لگے ہیں۔ کیا تجھے وس سے موجوبت تو نہیں ہو گئی۔۔۔۔ پھر ماں کھد ہی ہنس پڑا۔ یہ موجوبت کی بات بھی ایک رہی۔ چودھری فضلے جندگی کے تیہہ ورے تو نے سگو کے ساتھ گجار دیئے۔ تیہہ ورے۔ پر تجھے وس سے موجوبت نہ ہوئی اور اب جد اسے مرے وے پنج ورے ہو گئے ہیں' اب کیا تجھ وس سے موجوبت ہو گئی ہے۔ اس پر ماں اتنا ہنسا' اتنا ہنسا کہ آنکھوں ماں' آنسو آ گئے۔

اور پھر سگو سے موجوبت۔ سگو سے کیسے موجوبت ہو سکے ہے بھلا۔ سگو تو باجو ہی باجو تھی۔ خالی باجوؤں سے کون موجوبت کر سکے ہے بھلا۔ اس اللہ کی بندی نے نہ کدی منہ کی ٹکڑی سجائی' نہ لشکائی' نہ ہی سامنے دھری۔ منے بھی کدی منہ کی طرپھ دھیان نہ دیا۔

ویسے سگو کا منہ بھی تھا' متھا بھی تھا اور جوبنا تو بڑے جور کا تھا۔ تیکھا۔ کانٹے کی طرحیوں چبھنے والا۔ چھیل دیوے تھا۔ پر وسنے اسے موٹی چدر ماں ہی لپیٹے رکھا۔ ہمیش یوں جیسے چور کی چیج ہو۔ وسنے تو سب کچھ ہی لپیٹے رکھا۔ سب اک باجو ہی کھلے چھوڑ رکھے تھے۔

سارا دن وسکے باجوؤں سے بھرا رہتا تھا۔ ادھر وہ کپڑے دھو رہے ہیں۔ ادھر بھانڈے مانج رہے ہیں۔ پھر دیکھو تو جلتے تنور میں لٹکے وے ہیں۔ چاٹی کے گرد گھوم رہے ہیں۔ آٹا گھوندھ رہے ہیں۔ بلوہنی سے چمٹے وے ہیں۔ مجھ دوھ رہے ہیں۔ گتاوا کر رہے ہیں۔ سیجی بنا رہے ہیں۔ ماں کھیت

ماں بیٹھا روٹی کھا ریا ہوں' وے پنکھا کر رہے ہیں۔ ماں حقہ پی ریا ہوں' وے ٹوپی ماں تاجہ انگارے رکھ رہے ہیں۔ ماں تھک گیا ہوں' وے مٹھیاں بھر رہے ہیں۔

تیہہ ورے میرا گھر ان باجوؤں سے بھرا رہا۔ اور صربہ گھر ہی نہیں' میرے کھیت ماں بھی وہ بوٹوں کی طرحیوں لہلہاتے رہے۔

سگو ماں جنانی بھی تھی یو نہیں کہ کھالی باہاں ای باہاں تھیں۔ یوں سمجھ لو کہ وہ آلو کا بوٹا تھی۔ جنانی بھیتر تھی۔ باہر باہیں لہلہائیں تھیں۔ آج کل کی جنانی تو دھنیا ہووے ہے۔ سب باہر ہی باہر۔ اور پھر دور دور تک مشک مارے ہے۔ وخت وخت کی بات ہے بھائی۔ کدی مشک لکونے کا جمانہ' کدی مشک مارنے کا۔

کدی کدی سگو کی جنانی بولا بھی کرے تھی۔ اکھ سے اکھ ملا کر نہیں' جھکی نجر سے چلتے چلتے۔ کہتی رے تو بہت بھارا ہو گیا ہے۔ میرا پنڈا۔ اسے ہولا کر دے۔

کدی کدے کہت تھے یو بات۔ دو چار مہینوں ماں اک ادھ واری۔ کدی ماں کہہ دیتا ہنس کر۔ ری تو بھاری ہو رہی دکھے ہے اور وہ مسکا کر نجر نیچی کر لیتی۔

ہمارے وہ پہلے پہل کے دن بڑے کٹھن تھے۔ ماں بھی لٹا پٹا اکیلا پلاں والے پہنچا تھا۔ وہ بھی روئی رلی وی بے سہارا پتہ نہیں کہاں سے آئی تھی۔ تقدیر نے جوڑ ملا دیا۔ گاؤں کے چودھری نے تھوڑی سی جمین دے دی۔ اک ٹوٹا پھوٹا گھر دے دیا۔ پھر ماں ہل پر جت گیا۔ وس نے باجو نکال لئے۔ جتنی ویڑے کی دھریک نے ٹہنیاں نکالیں' وتنی سگو نے باہیں نکالیں۔ دھریک نے وہڑے پر چھاؤں کر دی۔ گھر میں سگو کے باجوؤں نے لہر بہر کر دی۔ کھیت ماں پیدا بڑھی تو مجھ لے لی۔ گھر ماں دودھ دہی کی دھاراں چلنے لگیں۔ وسنے صرپہ ایک پتر دیا شیدا۔ وہ ابھی اتنالیق فتی کہ جس مدرسے ماں گیا' وجیفہ لیا۔ ماشٹر نے کہا' چودھری تیرا پتر بڑا صیب بنے گا۔ سو بن گیا۔

پھر تبھی وہ پہلے پہل کے دن بڑے کٹھن تھے۔ جو سگو کے باجو پتوار نہ بنتے تو ناؤ ڈولتی ہی رہتی' پار نہ لگتی۔ بڑی اونچ نیچ دیکھی ان دناں۔ بڑی جورا جوری کرنی پڑی۔ پر اب ماں سوچوں ہوں کہ مسکل کے دن ارام کی دناں سے اچھے ہوویں ہیں۔ اونچ نیچ کی لہریں چلتی رہیں تو جندگی ماں حرکت برکت رہے ہے۔ کھالی ارام تو لوہے کو بھی جنگ لگاوے ہے۔

ان دناں جد ماں سام کے وخت اسماں تلے بیٹھ کر حقہ پیتے وے کھیت کو دیکھتا تو جی کھش ہو جاتا۔ گھر کو تو سگو کے باجوؤں نے میرے لئے تخت بنا رکھا تھا۔ اور میری پگڑی پر طرہ لہرا رکھا تا۔ اتنی عجت تھی گاؤں ماں۔

کدی کدی اسمان تلے بیٹھے دے اوپر سے اک اواج سی آتی۔ چودھری فضلے کچھ اور چہے تو مانگ لے اور ماں ہنستا۔ کیوں مکھول کر ہے رے۔ باجوؤں کے تخت پر بٹھا دیا۔ پگ پر طرہ لہرا دیا۔ پتر کو بڑا صیب بنا دیا۔ اب اور کیا مانگوں۔

پھر ایک دنا بیٹھے بٹھائے سگو پھوٹ ہو گئی۔ کلیجے ماں پیڑ اٹھی۔ باہیں اٹھا کر بولی۔ رے پکڑ لے رے مجھے۔ پہلی بار دونوں باجو میرے گلے میں ڈال دیئے کھلے بندوں۔ پھر اک ہچکی لی اور ٹھنڈی ہو گئی۔

پھر شیدا گاؤں آیا۔ ماں کو وہیں پلاں والے ماں دفنا دیا اور مجھے جبر دستی ادھر لے آیا۔ اپنے بنگلے ماں۔

ہائیں یہ دروجہ کیوں بجا۔ کون ہے رے دروجے پر۔

”میں ہوں بڑے چودھری جی بشیرا۔“ خانساماں نے جواب دیا۔

”تو اندر آجانا---- بول کی بات ہے؟“

”صاحب کا فون آیا ہے جی دفتر سے۔“ بشیر نے جواب دیا۔

”کیا کہے ہے وہ تیرا صیب؟“

”صاحب کہتے ہیں بڑے چودھری صاحب سے بولو کہ تیار ہو جائیں۔ بستر باندھ لیں۔ سوٹ کیس میں کپڑے رکھ لیں۔ ابھی ابھی صاحب کے ساتھ گاڑی میں جان ہے۔“

”کہاں جانا ہے رے؟“ چودھری فضلے نے پوچھا۔

”جی پلاں والے جانا ہے۔“

”پلاں والے----؟“

”جی صاحب بولتے ہیں۔ شاید وہاں ایک دو مہینے رہنا پڑے۔ اس لئے مالی رحیماں ساتھ جائے گا۔“

”پر کس لئے----؟ یو بھی تو بتا۔“

”پلاں والے سے خبر آئی ہے کہ وہاں سیلاب آیا تھا۔ چودھرانی کی قبر بہہ گئی ہے۔ میت باہر نکل آئی ہے۔“

”ہائیں میت باہر نکل آئی ہے۔“

”میت کے دونوں بازو کٹ کر بہہ گئے ہیں۔ ان کی ڈھونڈ کرنی ہو گی۔ قبر پھر سے بنوانی پڑے گی۔“

”باجوؤں کی ڈھونڈ کرنی ہو گی----!“ چودھری نے دہرایا۔ ”پر باجو تو..........“ چودھری نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ پھر دفعتاً“ وہ یوں چپ ہو گیا جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

# کھل بندھنا

مندر کے احاطے سے گزرتے ہوئے سیوا کارن' بانورے کو بڑ کے درخت تلے بیٹھا دیکھ کر رک گئی۔ بولی "ارے تجھے کیا ہوا جو یوں ہانپ رہا ہے تو؟"

بانورے نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ بولا۔ "سیوا کارن سامان اٹھاتے اٹھاتے ہار گیا۔" "کیسا سامان رے؟" سیوا کارن نے پوچھا۔

"اب پورن مشی میں اتنی چاتریاں آئی ہیں کہ حد نہیں۔" "چالیس سے اوپر ہوں گی۔ ان کا سامان..........."

"چالیس سے اوپر----؟" سیوا کارن نے حیرانی سے دہرایا۔

"ہاں دیوی۔" وہ بولا۔ "سب کچی عمر کی ہیں۔ لڑکیاں ہی لڑکیاں۔ پکی عمر کی بس چار ایک ہوں گی۔ پر وہ بھی لڑکی سمان دکھتی ہیں۔ مجھے تو یوں لگے ہے جیسے سارا کالج ہی ادھر آ گیا ہو۔"

یہ سن کر سیوا کارن سوچ میں پڑ گئی۔ جیسے چپ لگ گئی ہو پھر بولی۔ "تپسنی مہامان کا کہنا سچ ہو رہا ہے۔ وہ کہا کرتی تھی۔ سیوا کارن کلجگ میں نہ استری رہے گی نہ ناری۔ صرف لڑکیاں رہ جائیں گی۔ ابلائیں۔ پھر ممتا کا دھارا سوکھ جائے گا۔ ناتے ٹوٹ جائیں گے۔ پرش اور ناری کا فرق مٹ جائے گا۔ ایک کو دوسرے سے پرکھنا مشکل ہو جائے گا۔"

"ہاں یہ تو ہو رہا ہے۔" بانورے نے دبی زبان سے کہا۔ "پر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آوے ہے۔" "وہ کیا؟" سیوا کارن نے پوچھا۔

"وہ یہ کہ ایک دم سے دیوی کھل بندھنا کی لگن کیسے لگ گئی۔ یہ کالج والیوں کو کیا ہوا کہ دیوی کے چرن چھونے آ گئیں۔ انہیں نہ تو دیوی پر وشواش ہے نہ دیوتا پر۔

پورن ماشی پر بس پانچ چھ آ جایا کرتی تھیں۔ اب کے چالیس کیسے آ گئیں؟ ہے بھگوان کیا بھید ہے----!"

سیوا کارن مسکرائی۔ "بھگوان کے بھیدوں کو کس نے جانا ہے بانورے۔"

سیوا کارن جانے لگی تو مائی بھاگی دوڑی آئی۔ بولی "دیوی کے چاتری بہتے ہیں اور مندر کی کوٹھڑیاں کم۔ انہیں کیسی ٹھکانہ دوں؟"

"جیسے کیسے پورن کر دے بھاگی۔" سیوا کارن نے جواب دیا۔ "بس ایک بات کا دھیان رکھیو کہ مندر میں کوئی نہ سوئے اور تپسنی مہامان کی کوٹھڑی میں کوئی پاؤں نہ دھرے۔"

"وہاں کون پاؤں دھر سکتا ہے بھلا؟" بانورا بولا۔ "مہامان کی کوٹھڑی تو سدا بند رہتی ہے۔ اندر سے کنڈی لگی رہتی ہے۔"

سیوا کارن پھر سوچ میں پڑ گئی۔ اسے چپ لگ گئی۔ دیر تک مائی بھاگی اس کا منہ تکتی رہی۔ پھر سیوا کارن گویا اپنے آپ سے بولی۔ "ہاں کنڈی کا بھید نہ جانے کب تک رہے گا۔ جیون بھر تپسنی مہامان نے اندر سے کنڈی لگائے رکھی۔ پھر جب مرن بعد اس کی ارتھی اٹھانے گئے تو دیکھا کہ پھر اندر سے کنڈی لگی ہوئی ہے۔"

"کیا کہا۔ مرن کے بعد اندر سے کنڈی کس نے لگائی؟" بانورہ بولا۔

"کون جانے۔" سیوا کارن نے مدھم آواز میں خود سے کہا۔ "گرو دیو کا کہنا ہے کہ تپسنی مہامان کے مرن جیون کا بھید آج تک نہیں کھلا۔"

"ہے بھگوان۔" بھاگی نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لئے۔

سیوا کارن نے کہا۔ "پرنتو جوتش والوں کو کہا ہے کہ کلجگ میں کسی پورن ماشی کو یہ بھید ضرور ملے گا۔ کھل کر رہے گا۔ گرو دیو کہتے ہیں۔ ہاں مہامان کے ابھاگ کا چکر اک دن ضرور ٹوٹے گا۔ پھر اسے شانتی مل جائے گی۔"

"سچ ہے سیوا کارن جی۔" بھاگی بولی۔ "اب بھی کئی بار آدھی رات کے سمے مندر سے مہامان کے بھجن کی آواز آتی ہے۔"

"کھل بندھنا۔ بندھ دے۔ کھل بندھنا----"

"ہائیں یہ کیسے بول ہیں؟" بانورہ بولا۔ "جو دیوی بندھن کھولے ہے۔ اس کے چرنوں میں بیٹھ کر بندھ دے کی پرارتھنا کرنا۔ ہرے رام' ہرے رام' ہرے رام۔

سیوا کارن کو پھر چپ لگ گئی۔

اس وقت سورج مغرب میں یوں غروب ہو رہا تھا جیسے مندر پر رنگ پچکاریاں چلا رہا ہو۔ مندر کے پرلے سرے پر گھنے بوھڑ کے درخت کے لمبے سائے میں بیٹھا شام مراری بانسری پر کلیان بجا رہا تھا۔ بادلوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ دور ان پورنا کے گاؤں میں کوئی چکی کراہ کراہ تال

دے رہی تھی۔

وہ سب چونک اٹھے۔ ”ہائیں یہ کیا؟“

”یہ کیسی آواز ہے؟“ سیوا کارن نے پوچھا۔

”یہ چاتری ہیں۔“ دیوی بھاگی بولی۔ ”دیوی کھل بندھنا کے چرنوں میں بیٹھ کر گیان دھیان کی بجائے ہنس بول رہی ہیں۔“

بانورہ ہنسا۔ کہنے لگا۔ ”ان آج کل کی چھوکریوں کو کیا پتہ کہ دیوی کیا ہووے ہے۔ بندھن کیا ہووے۔ جیون کیا ہووے ہے۔“

مندر سے ہنسی کا ایک اور ریلا اٹھا۔

کانتا کا منہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ بولی۔ ”یہ ہنسنے کی بات نہیں، رونے کی ہے۔ یہ سارے شبد دیوی، رانی، استری، شریمتی، عورت، دومن سب چھوٹے ہیں۔“

”تو پھر سچا لفظ کون سا ہے؟“ کوشلیا نے پوچھا۔

کانتا بولی۔ ”میری طرف دیکھو۔ میں نہ دیوی ہوں، نہ شریمتی ہوں، نہ دومن ہوں۔ میں اک باندی ہوں باندی۔ اے سیلو صرف میں ہی نہیں، تم ہم سب۔ وی آر آل سیلوز ---- سیلوز۔“

”سچ کہتی ہے۔“ کنول بولی۔ ”ہم سب اپنے ماسٹر کا دل خوش کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ ہم اپنے مالکوں کی خوش وقتی دیتی ہیں۔ اے مومنٹ آف جائے۔ اے مومنٹ آف اکسائٹ منٹ۔ ایک لذت کا لمحہ۔ وقتی چٹخارہ اور بس۔“

”نہ ابلا ایسا نہ کہو۔“ دیہاتن بولی۔ ”اناری داسی نہیں، مالکن ہوتی ہے۔“

”کھی کھی کھی۔“ کنول تمسخر سے ہنسی۔

”مجھے بتا تو وہ کون عورت ہے جو داسی نہیں بلکہ مالکن ہے؟“ کانتا نے پوچھا۔

”میں ہوں --- میں۔“ دیہاتن نے فخر سے سر اٹھا کر کہا۔ ”میں اپنے پتی کے من پر راج کرتی ہوں۔ مسکا کر دیکھوں تو وہ لہلہا اٹھے ہے۔ گھوری دکھاؤں تو مرجھا کر گر پڑے ہے۔ سوکھ جائے ہے۔“

”جو ایسا ہے ----“ کانتا نے غصے میں کہا۔ ”تو تو کھل بندھنا دیوی کی پوری ماشی میں جھک مارنے آئی ہے کیا؟“

”یہاں تو بندھن کھلوانے آتے ہیں۔“ کوشلیا نے وضاحت کی۔ ”تو کون سا بندھن کھلوانے آئی ہے۔“

”سچ کہو ابلا۔“ سچ کہو دیہاتن نے جواب دیا۔ ”میرے بھاگیہ کی گانٹھ پتی کے من میں نہیں

پڑی۔ ساس کے من میں پڑی ہے۔ وہ ہمیں دیکھ نہیں سکھاوے ہے۔ جتنا پتی چاہے ہے، اتنا ہی ساس جلے ہے۔ بس گھولے ہے۔ اپنے پتر کو مجھے راسن کر کے دیوے ہے۔

ادھر وہ تڑپے ہے ادھر میں تڑپوں ہوں۔ بیچ میں ساس دیوار بن کر کھڑی رہے ہے۔ بس یہی میرے نصیبے کا بندھن ہے۔ کیا پتہ اس پورن ماشی میں دیوی کھل بندھنا میرا یہ بندھن کھول دے۔“ وہ ہاتھ باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”جے ہو دیوی کھل بندھنا کی۔“

”کھی کھی کھی کھی۔“ کنول ہنسی۔ ”بھولی عورت یہ جو ساس نند ہیں، یہ تو پتی کے ویہڑے کے چاند ہیں۔ ان کی اپنی روشنی نہیں۔ مانگے کی ہے۔ پتی مہاراج کی دین ہے۔ سارا چمتکار سورج مہاراج کا ہے۔ چاہے تو ساس کا چاند چمکا کر بہو سر پر لٹکا دے۔ چاہے تو نند کا ہانڈا چلا کر بھاوج کی آنکھیں چندھیا دے۔“

”سچ کہتی ہو۔“ سندری بولی۔ ”سب کھیل مداری کا ہے۔ چاہے تو بندریا نچا دے۔ چاہے تو مینا سے ٹیں ٹیں کرا دے۔“

کانتا سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”پگلی ساس نند تو پتلیاں ہیں۔ پتی دیو کے ہاتھ میں ڈوری ہے۔ جسے چاہے نچا دے۔ بچارے مات پتا کا کیا دوش۔“

”مات پتا ----“ سینے ماتھے پر گھوری تن گئی۔ ”سکھیو عورت کا کوئی بھی اپنا نہیں۔ نہ بھائی بہن نہ مات پتا۔ یہ وہ ناؤ ہے جس کا کوئی پتوار نہیں۔ بس ڈولن ہی ڈولن ہے۔ جیون بھر کا ڈولن۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر ایک ہچکی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تیری بپتا کیا ہے ری؟“ سندری نے پوچھا۔

”مت پوچھ۔ شکتلے چیخی۔ ”دکھیا کو نہ چھیڑ۔ پھوڑے کو ہاتھ نہ لگا۔“

”میری بپتا۔ سیسے گنگنائی۔ میں اک بکاؤ مال ہوں۔ مات پتا مجھے دو بار بیچ چکے۔ اب تیجی بار کے داؤ میں بیٹھے ہیں۔ پہلے بیچتے ہیں، پھر بسنے نہیں دیتے کہ پھر سے بیچ سکیں۔“

سیسے اٹھ بیٹھی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر مورتی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بولی۔ ”ہے کھل بندھنا دیوی ---- بتا۔ کیا میرے بھاگیہ میں بکنا ہی لکھا ہے۔ بول جو ایسا ہی ہے تو بتا کہ میں خود اپنے کو بیچوں۔ کھلے بندوں بیچوں۔ روج کے روج بیچوں۔ مجھے یہ دکھ تو نہ رہے کہ مات پتا اپنی پیٹ جائی کو بکاؤ مال بنائے بیٹھے ہیں۔“

کنول اٹھی۔ اس نے سیسے کو کلاوے میں بھر لیا۔ بولی۔ ”جی برا نہ کر بہنا۔ اک تو ہی نہیں۔ ہم سب بکاؤ مال ہیں۔ کوئی خود کو اک ہی مرد کے ہاتھ روز کے روز بیچتی ہے۔ کوئی رنگ رنگ کے پرش کے ہاتھ بکتی ہے۔“

"کیا فرق پڑتا ہے؟" کانتا نے کہا۔ "ایک کے ہاتھ بار بار بکو یا ہر رات نئے گاہک کے ہاتھ بکو۔ بکنا ہمارا بھاگیہ ہے۔ کتنا بڑا بندھن ہے۔"

"صرف ایک نہیں۔ بندھن ہی بندھن ہیں۔" کنول غصے سے چلائی۔

"اٹھو بہنا سب بندھن توڑ دو۔ اپنی ہمت سے توڑ دو۔" شکتلے چلائی۔

"ایک بھی باقی نہ رہے۔ یہ پتھر کی دیوی کھل بندھنا بے چاری کیا کرے گی۔"

"ہوش کرو لڑکیو۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" مائی بھاگی بات کئے بغیر نہ رہ سکی۔ "مندر میں کھل بندھنا کے چرنوں میں بیٹھ کر تم پورن ماشی سے ایک رات پہلے دیوی کے خلاف اپنے من میں بس گھول رہی ہو۔"

"کیوں نہ بس گھولیں۔" کانتا بولی۔ "ہم تو دیوی کے پاس صرف اس لئے آئی ہیں کہ پروٹسٹ کریں۔ کیا دیوی کو نظر نہیں آتا کہ بندھنوں نے عورت کا بند بند لہولہان کر رکھا ہے۔ کیا عورت سارے بندھنوں سے کبھی آزاد نہ ہو گی۔"

"نہ نہ نہ نہ۔" بھاگی کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلیں۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ خوف کے مارے آنکھیں باہر نکل آئیں۔ "نہ نہ نہ نہ۔" وہ بولی۔ "دیوی سے ایک بندھن کھولنے کی منت کرو۔ کوئی ایک بندھن۔ پر نتو وہ باہر کا بندھن ہو' بھیتر کا نہیں۔ جو تم نے سارے بندھن کھولنے کی پرارتھنا کی تو----- نہ نہ نہ نہ۔ ایسا نہ کرو۔ جو دیوی نے تمہاری سن لی تو---- تو کیا ہو گا؟"

ایک ساعت کے لئے سب ڈر گئیں۔

"کیا مطلب ہے؟" کنول نے ہمت کر کے پوچھا۔

"جو باہر بھیتر کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تو........." بھاگی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

"ٹوٹ گئے تو---؟" سبھی بوکھلا سی گئیں۔ تو کہا۔

"تو تم بھی مہامان کے سمان ہو جاؤ گی۔" بھاگی رک گئی۔ جیسے اس کے گلے میں آواز نہ رہی ہو۔

"مہان کے سمان۔" سب نے دہرایا۔

عین اس وقت سیوا کارن کی آواز سنائی دی---- "بھاگی----"

آواز سن کر بھاگی جیسے جاگ اٹھی۔ طلسم ٹوٹ گیا۔ شرمندہ سی ہو گئی۔ دانتوں میں زبان دیئے بھاگی۔

اس کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر کنول بولی۔ "یہ کون تھی؟"

"کوئی مندر کی ہے۔"

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"پتہ نہیں کیا کہہ رہی تھی۔"

دیہاتن بولی۔ "کہہ رہی تھی اگر دیوی نے تمہاری مانگ پوری کر دی۔ سارے بندھن کھول دیئے تو پھر کیا کرو گی۔"

"نان سنس۔" کانتا نے ناک چڑھائی۔

"مجھے یہ مندر وندر' دیوی دیوی۔ سب پاکھنڈ معلوم ہوتا ہے۔" پیلی ساڑھی والی پہلی مرتبہ بولی۔

"جو ایسا ہے تو یہاں کیوں آئی ہو؟" کنول نے پوچھا۔

"چاندی کے رسے کو کھلتے دیکھنے آئی ہوں۔" پیلی ساڑھی والی نے کہا۔

"کیا واقعی رسہ کھلتا ہے؟"

"کہتے ہیں۔ یوں تار تار ہو جاتا ہے جیسے دھو کر سوکھنے کے بعد بال کھلتے ہیں۔"

پیلی ساڑھی والی اٹھی۔ بولی۔ "سب پاکھنڈ ہے۔ نہ پرارتھنا سے کچھ ہو گا' نہ ماتھا ٹیکنے سے۔ نہ منتوں ترلوں سے۔ اگر اس سدا کی غلامی سے نجات پانا ہے تو اٹھو جدوجہد کرو۔ جان لڑا دو ورنہ اس مرد کی دنیا میں عورت کا کوئی مقام نہیں۔"

"بالکل بالکل۔" چاروں طرف سے شور مچ گیا۔

شہر سے دور' شاہراہ سے دور' شوالک پہاڑیوں میں بجھی ہوئی پگڈنڈیوں کے بیچ درختوں سے گھرا ہوا ایک گاؤں ہے۔ ان پورنا---- اس گاؤں سے ایک میل جنوب کی طرف ایک کھلا میدان ہے جس کے درمیان میں ایک بہت پرانا مندر ہے جسے کھل بندھنا کا مندر کہتے ہیں۔ یہ مندر اتنا پرانا ہے کہ کسی کو پتہ نہیں کہ کب تعمیر ہوا۔ اس کی بناوٹ بھی مندر کی سی نہیں۔ نہ مندر کا مخروطی گنبد نہ کلس۔

صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک بہت بڑا ہال کمرہ ہے جس کی چھت نیچی ہے۔ ہال کمرے درمیان میں ایک چبوترے پر پتھر سے بنا ہوا قد آدم دیوی کا مجسمہ ہے جس کے خدوخال وقت کی خرد برد کی وجہ سے گھسے پٹے ہوئے ہیں۔ صرف آنکھیں واضح ہیں جو لمبی اور ترچھی ہونے کی وجہ سے یوں ڈولتی محسوس ہوتی ہیں جیسے کشتیاں ہوں۔ دیوی کے قریب ہی ایک موٹا سا چاندی کا رسہ چھت سے لٹک رہا ہے جو چاندی کی پتلی پتلی تاروں کو بٹ کر بنایا گیا ہے۔

ہال کمرے کے اردگرد تینوں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں جن کے اردگرد ایک

چھوٹا سا برآمدہ چاروں طرف گھومتا ہے۔ دیکھنے میں ایسا لگتا ہے جیسے وہ مندر نہیں، بدھ مت کے پجاریوں کا پاٹ شالہ ہو۔

"پرانے زمانے سے یہ پتھر کی بنی ہوئی عمارت دیوی کھل بندھنا کے مندر کے نام سے مشہور ہے۔ کسی کو علم نہیں کہ دیوی کا اصل نام کیا ہے۔ سارے علاقے میں مشہور ہے کہ وہ بندھن کھول دیتی ہے۔

ہر سال بیساکھ کی پورن ماشی کے دن ارد گرد کے علاقے سے عورتیں دیوی کے آگے سیس نوانے کے لئے آتی ہیں۔ کوئی پتی کے من میں پڑی ہوئی گرہ کھولنے کے لئے پرارتھنا کرتی ہے۔ کوئی بیٹے کے دل میں پریم بندھن کے خلاف ہاہا کار مچاتی ہے۔ کوئی ساس بہو کے کرودھ کھولنے کی بنتی کرتی ہے۔ کوئی اولاد کی روک کا رونا روتی ہے۔

پورن ماشی کی رات شام ہی سے دیوی کا بھجن شروع ہو جاتا ہے۔ جوں جوں رات بھیگتی ہے، مجمعے پر ایک کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ پھر آدھی رات کے قریب بارہ ماتری ورت لے شروع ہوتی ہے۔

"دیوی---- کھل بندھنا۔"

اس پر سارے یاتری اٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان پر وجدان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ دل پر وجدان طاری ہو جائے تو سارے اعضاء رقص کرنے لگتے ہیں۔ کوئی برمال، کوئی گیت۔ جب یہ رقص اپنی انتہا پر پہنچتا ہے تو مندر میں ایک عجیب سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یوں جیسے آکاش سے گھنگھرو گرے ہوں۔

اس پر پجاری ساکت ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ٹھمک ٹھمک گھنگھرو بندھے پاؤں قدم قدم قریب آتے ہیں اور دیوی کے پاس آکر رک جاتے ہیں۔

عین اس وقت مندر کا مہامنتری سنکھ بجاتا ہے۔ سنکھ کی آواز سن کر پھر سے کھل بندھنا کا بھجن شروع ہو جاتا ہے۔ سنکھ روتا ہے ڈھولک سر پیٹتی ہے۔ اور لوگ بھجن کے پردے میں آہ زاری کرتے ہیں۔

عین اس وقت سیوا کارن جوگیا دھوتی میں ملبوس موتے کے ہار لپیٹے دیوی کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ تیز---- تیز---- اور تیز۔ ساتھ ہی چھت سے لٹکا ہوا چاندی کا رسہ جھومنے لگتا ہے۔ اس جھولن جھومن میں رسے کے بل کھولنے لگتے ہیں۔ کھلتے جاتے ہیں حتیٰ کہ چاندی کی تاریں یوں ایک ایک ہو کر لٹکنے لگتی ہیں جیسے کسی مٹیار نے سکھانے کے لئے بال کھول رکھے ہوں۔

یہی دیوی کا معجزہ ہے۔ اسی لئے دیوی کا نام کھل بندھنا مشہور ہے۔

ساری یاتریاں ایک ایک کر کے مندر سے جا چکی تھیں۔ صرف کانتا، کنول اور سیسے عورت کے بندھنوں کی شکایت کی زنجیر میں بندھی بیٹھی تھیں کہ مندر کی گھنٹی بجی۔ وہ تینوں چونکیں۔ ان کے سامنے سیوا کارن کھڑی تھی۔ بولی۔ "مندر کے دوار بند کرنے کا سمے ہو گیا۔ اب تم اپنا ٹھکانہ کر لو۔"

"کہاں ہے ہمارا ٹھکانہ؟" کنول نے پوچھا۔

"جس کوٹھڑی میں بھی جگہ ملے۔"

"اور جو کوٹھڑیوں کے دروازے بند ہوئے تو-----" کانتا نے پوچھا۔

"تو کھٹکھٹاؤ۔ مندر میں کوئی رات بھر نہیں رہ سکتا۔ دیوی کی یہی آگیا ہے۔"

"جب وہ مندر سے باہر نکلیں اور ایک نظر لمبے برآمدے پر ڈالی تو سیسے بولی۔ "سب کوٹھڑیوں کے کواڑ بند ہیں۔ کسے کھٹکھٹائیں؟"

"باری باری سب کو بجا دو۔" کنول نے کہا۔

عین اس وقت برآمدے کے درمیان کی کوٹھڑی کا دروازہ چوں کر کے آپ ہی آپ کھل گیا۔ اندر سے دیئے کی مدھم روشنی باہر آنے لگی۔

انہوں نے کھلے کواڑ سے اندر جھانکا۔ کوٹھڑی خالی پڑی تھی۔ فرش پر سوکھی گھاس بچھی ہوئی تھی۔ دیوار کے آلے میں اک دیا ٹمٹما رہا تھا۔

جب وہ لیٹنے لگیں تو سیسے نے ڈر سے چیخ سی مار دی۔ "وہ دیکھو وہ-----"

"محراب کے پیچھے کوٹھڑی کے پچھلے حصے میں ایک کھاٹ بچھی ہوئی تھی جس پر کوئی کالی چادر لپیٹے سو رہا تھا۔

"کون ہے یہ؟" سیسے نے پوچھا۔

"کوئی ہو گی۔" کانتا نے بے پرواہی سے کہا۔

"آج تو ساری کوٹھڑیاں بھری ہوئی ہیں۔" کنول بولی۔

"کنول-----" کانتا نے کہا۔ "یہ مہامان کون تھی جس کا ذکر مندر والے کر رہے تھے۔"

"وہی جس کے سارے بندھن کھل گئے تھے۔"

"یہ طوطا مینا کہانی تم مان گئیں کیا؟" سیسے نے کہا۔ "سب جھوٹ ہے---- جھوٹ۔"

"اوں ہوں۔ جھوٹ نہیں۔" کوٹھڑی کے پچھلے حصے سے بھاری بھر کم آواز آئی۔

وہ تینوں چونک اٹھیں۔

"تو کون ہے؟" سیسے نے بلند آواز سے پوچھا۔

"میں ہی ہوں۔"

"اس کی آواز کو کیا ہے؟" کنول نے زیر لب پوچھا۔ "عورت کی سی نہیں۔"

"رو رو کے میرا گلا رندھ گیا ہے۔" کالی چادر والی نے کہا۔

"تو مہامان کو جانتی ہے کیا؟" کانتے نے پوچھا۔

"جانتی ہوں۔ میں اس کی بالکی ہوں۔" کالی چادر والی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ کوٹھڑی کی طرف پیٹھ کئے ہوئے تھی۔

"مہامان کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے کیا؟"

"مہامان کون تھی؟"

"اس پر کیا بیتی؟"

کوئی کچھ نہ کچھ پوچھ رہی تھی۔

پھر کوٹھڑی میں خاموشی چھا گئی۔

دفعتاً" کالی چادر والی بولی۔

"مہامان کے مات پتا نذر کوٹ کی ریاست میں رہتے تھے۔ گھر کھانے کو سوکھی روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب مہامان ان کے گھر پیدا ہوئی تو ماں باپ کے دل میں امید کا دیا ٹمٹمایا کہ پتری بڑی ہو گئی تو ریاست کے مہاراجہ کی بھینٹ کریں گے۔ چھوٹی موٹی جاگیر مل جائے گی۔ جیون سکھی ہو جاوے گا۔"

"مہاراجہ کی بھینٹ۔۔۔؟" کنول نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں مہاراجہ کی بھینٹ۔" ان دنوں یہ رواج تھا۔

ماں باپ سندر پتریاں مہاراجہ کی بھینٹ کر دیتے تھے۔ مہاراج چار ایک روج کلی کا رس چوستے۔ پھر اسے پرانے محل میں پھینک دیتے جہاں مہاراج کے نوکر چاکر پھول کی پنکھڑیاں نوچتے اور پھر جب وہ ڈنٹھل بن جاتی تو کال کوٹھڑی میں دھکیل دیتے۔ یہی ان دنوں کی ریت تھی۔

پتری سندر تھی۔ مات پتا نے اس کا نام شوبھا رکھ دیا۔" کالی چادر والی نے آہ بھر کر کہا۔

"شوبھا کون؟" سیسے گنگنائی۔

"وہی۔۔۔۔" کالی چادر والی نے آہ بھر کر کہا۔ "جو مندر میں آ کر تپسیا کرتے کرتے مہامان بن گئی۔" وہ تینوں چپ چاپ بت بنے بیٹھی تھیں۔

"مات پتا نے شوبھا کے پیٹ اور گالوں پر حلوہ باندھ باندھ کر پتری کو بڑا کیا کہ پیٹ ملائم رہے۔ گال چکنے ہو جائیں۔ رانوں پر گھی کی ماشیں کیں کہ لچک بڑھے۔ کمر پر کمربند کس دیا کہ ربٹ کے

گیند کی طرح یوں ابھر ابھر کر جھٹکے۔!"

"توبہ ہے۔" سیسے نے آہ بھری۔

"جب شوبھا بڑی ہوئی تو اس میں وہ سب کچھ تھا جو مات پتا نے چاہا تھا۔ جسم تیار تھا پر من میں اڑان تھی۔"

"اڑان کیوں؟" کنول نے پوچھا۔

"جب شوبھا کو پتہ چلا کہ اسے بھینٹ بنایا جا رہا ہے تو اس کے من نے کہا۔ میں سب کچھ بنوں گی پر بھینٹ نہ بنوں گی۔ مجھے تھالی میں پروس کر دوجے کے سامنے نہ دھرا جائے۔ میں کنیا ہوں۔ کھا جا نہیں ہوں۔

جب وہ اسے راجہ کے محل میں لے کر گئے تو حواریوں نے اسے اچھی طرح دیکھا کہ راجہ کے لائق ہے بھی یا نہیں۔ پھر وہ اسے مہاراج کی سیج پر بٹھا کر چلے گئے کہ مہاراج ابھی آتے ہیں۔

وہ وہاں سے اٹھ بھاگی۔ کھڑکی سے باہر نکلی۔ پر نصیبے کا لکھا کون مٹا سکے ہے۔ باہر کے کواڑ کی بجائے بھیتر کے کواڑ میں سے ہو کر پرانے محل میں جا پہنچی جہاں مہاراج کے نوکر تاک میں بیٹھے تھے۔

پتہ نہیں کتنے روج بھیڑیئے اسے جھنجھوڑتے رہے۔ پر ایک دن وہ وہاں سے بھی نکل بھاگی۔ پریم کا گریا جگہ جگہ سے ترخ چکی تھی۔ اب اس میں دودھ بھرنے کی بات نہ رہی تھی۔ اس لیے وہ سیدھی شارجا نائیکہ کے پاس پہنچی۔ بولی۔ لے تا کہ مجھے بیچ اور کھا۔ اپنی جھولی بھر۔ اب میں کسی اور کام کی نہیں رہی۔" کالی چادر والی کاموش ہو گئی۔

دیر تک کوٹھڑی گم صم رہی جیسے اوپر چپ کا تنبو تنا ہو۔ صرف دل دھک دھک کر رہے تھے۔ کروٹیں باہر نکل ہوئی تھیں۔ سینوں کی نوکیں ابھر کر کانٹے بن گئی تھیں۔

پھر کالی چادر والی نے ایک لمبی آہ بھری۔ بولی۔ <پھر شوبھا کا وہ چرچا ہوا' وہ چرچا ہوا کہ مہاراج کے درباری بھی اس کے دوار پر کھڑے ہو کر انتجار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اک دن مہاراج خود چوبارے پر آ پہنچے۔

شوبھا کے پاس گیا نہ تھا۔ پوشاکیں' جیور' ہیرے جواہرات اور دھن۔ دھن ہی دھن۔ اوپر سے وہ پھول سمان کھلی کھلی تھی پر بھیتر میں ایک کانٹا لگا تھا۔ سوچتی کتنی اپرادھن ہوں میں کہ جگہ جگہ بوٹیاں ٹروائیں۔ بکی پر مات پتا کو جاگیر نہ لینے دی۔ ان کا کہنا سودا کھونا کر دیا۔ پتہ نہیں اب کس حال میں ہیں۔ اس کانٹے نے اس کے بھیتر کو لہولہان کر دیا۔ خود اپرادھن جاننے لگی تو پھر رہا نہ گیا۔ گہنے پاتے کی گٹھڑی باندھی اور چوری چوری چوبارے سے نکل گئی۔

مات پتا کو اپنی قیمت چکانے کے لئے گاؤں پہنچی تو پتہ چلا کہ وہ بھوک کے مارے ایڑیاں رگڑ

رگڑ کر مر گئے۔" کالی چادر والی پھر رک گئی۔

تینوں چھوکریاں یوں بیٹھی تھیں جیسے مایا اتر گئی ہو۔ استری ٹوٹ گئی ہو۔ جیسے پاپڑ سے کڑاکا نکل گیا ہو۔

"شوبھا کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔" کالی چادر والی یوں بولی جیسے آواز بھیگ گئی۔ "دو سریں اور گر گئی ہو۔" کالی چادر والی پھر رک گئی۔

"پھر----؟" ستے گھگیائی۔

"پھر----" کالی چادر والی نے دہرایا۔ "پھر شوبھا کی نظر میں جیسے سب کچھ' کچھ بھی نہیں ہو گیا۔ دھن دولت بانٹ دی اور کھل بندھنا کے دوار اپر آ بیٹھی۔ دیوی باہر کے بندھن پر ٹوٹ گئے۔ بھیتر کے بھی کھول دے۔" کالی چادر والی آہ بھر کر بولی۔

"بھیتر کے دو بندھن اسے جکڑے ہوئے تھے۔ اک یہ کہ اس نے مات پتا کا ابمان کیا تھا۔"

"اور دوجا----؟" کانتا کے ہونٹ ہلے پر کالی چادر والی چپ رہی۔

"پھر----؟" کنول کی آواز سنائی دی۔ پر وہ بت بنی بیٹھی رہی۔ بیٹھی رہی۔

پھر دور کوئی بالک رویا تو کالی چادر والی چونکی۔ بولی۔ "سنو سنو۔ دوجا بندھن آپ ہی بول پڑا۔ اس کے من میں اک بالک روتا تھا۔ ممتا سر پیٹتی تھی۔ چھاتیاں سر اٹھا کر بین کرتی تھیں۔ وہ تھیلی تڑپتی تھی جہاں بالک آنا چاہے تھا۔ من لہو کے آنسو روتا تھا۔ جوں جوں بالک روتا' توں توں شوبھا کے چرنوں میں تڑپ تڑپ کر بنتی کرتی۔ آدھی آدھی رات کے سمے دیوی کے بھجن گاتا۔ دیوی---- کھل بندھنا۔

اس نے اتنی تپسیا کی۔ اتنی تپسیا کی کہ مہامان بن گئی۔

پھر ایک رات وہ دیوی کے چرنوں میں سیس نوائے بیٹھی تھی تو مندر میں اک ہلکی آواز ابھری۔ "چپ۔" اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو دیوی نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھی ہوئی تھی اور سارا مندر "چپ' چپ گنگنا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے الٹا اپنی مانگ کر دہرانا شروع کر دیا۔ پھر ایک کرودھ بھری آواز ابھری۔ اندھی منگتی اپنی مانگ کو جان۔ اس پر بھی وہ نہ سمجھی۔ تو دیوی بولی۔ "استری بندھن ہی بندھن ہوتی ہے۔ جو بھیتر کے بندھن بھی کھل گئے تو استری' استری نہ رہے گی۔" یہ سن کر وہ ڈر گئی پر سمجھی پھر بھی نہیں۔

دیوی بولی۔ "استری لیروں کے کھدو سمان ہوتی ہے۔ لیریں نکال دو تو کھدو کہاں رہے گا؟"

وہ پھر بھی نہ سمجھی۔ الٹی پھر سے بھجن رٹنے لگی---- "دیوی کھل بندھنا۔" ناچ نچان کر دیوی کو منانے لگی۔

پھر دیوی جیسے کرودھ میں بولی۔ "جا تیری بھیتر کے بندھن کھل گئے۔" اس پر مندر ڈولنے لگا جیسے بھونچال آ گیا ہو اور مہامان گر پڑی۔" کالی چادر والی نے چادر لپیٹی اور اٹھ بیٹھی اور قدم قدم ان کی طرف چل پڑی۔

جب وہ محراب کے نیچے پہنچی تو سیسے بولی۔ پھر کیا ہوا؟"

وہ رک گئی۔ "پھر کیا ہوا؟"

"ہاں ہاں---- پھر کیا ہوا؟"

"پھر----" کالی چادر والی نے اپنے منہ سے چادر اٹھا دی---- "پھر یہ ہوا---- یہ----"

انہوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ دہشت سے ان کی چیخیں نکل گئیں۔ ان کے سامنے پتہ نہیں کون سی مخلوق کھڑی تھی۔ نہ وہ عورت تھی نہ مرد۔

تینوں نے سیوا کارن کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا۔ "سن رہی ہو سیوا کارن۔ سن رہی ہو؟ وہ دیوری کے چرنوں میں بھجن بھینٹ کر رہی ہے۔"

سیوا کارن بھاگی بھاتی باہر نکلی۔ دونوں مندر کے بڑے دروازے کی طرف دوڑیں۔ مہامان کی کوٹھڑی کی کنڈی کھل گئی۔ "مجھے پتہ تھا کہ اک دن ابھاگنی کا چکر ٹوٹ جائے گا۔" سیوا کارن سن تو سہی۔ بھاگی چلائی۔

وہ سب سننے لگیں۔

"کھل بندھنا---- بندھ دے۔"

"سنا تو نے۔" بھاگی چیختی۔ "مہامان نے بول بدل دیئے۔" "ہاں----!" سیوا کارن بولی۔ "مہاجوگی کہتے تھے 'ایک دن آسئے گا جد چاندی کا رسہ نہیں کھلے گا۔"

"اے دیوی تیری جے ہو۔"

سیوا کارن نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لیئے۔ اندر کوئی گائے جا رہی تھی۔

"کھل بدھنا---- بندھ دے۔ کھل بدھنا.........."

# روغنی پتلے

شہر کا الیٹ شاپنگ سنٹر---- جس کی دیواریں ' شلف ' الماریاں بلور کی بنی ہوئی ہیں۔ جس کا بنا سجا فیکیڈ جلتے بجھتے رنگ دار سائز سے مزین ہے۔ جس کے کاؤنٹرز مختلف رنگوں کے گلو کلاز پینٹس کی دھاریوں سجے ہوئے ہیں اور شلف دیدہ زیب سامان سے لدے ہیں جس کے کاؤنٹروں پر سمارٹ متبسم لڑکیاں اور لڑکے یوں ایستادہ ہیں جیسے وہ بھی پلاسٹک کے پتلے ہوں۔ جو ان کی ارد گرد یہاں وہاں سارے ہال میں جگہ جگہ رنگا رنگ لباس پہنے کھڑے ہیں---- ہاں فیشن آرکیڈ سے کون واقف نہیں۔

چاہے انہیں کچھ نہ خریدنا ہو' لوگ کسی نہ کسی بہانے فیشن آرکیڈ کا پھیرا ضرور لگاتے ہیں۔ وہاں گھومتے پھرتے نظر آنا ایک حیثیت پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ پاش چیزوں اور نئے ڈیزائنوں کو دیکھنے آتے ہیں تاکہ محفلوں میں لیٹسٹ فیشن کی بات کر کے اپ ٹو ڈیٹ ہونے کا رعب جما سکیں۔ نوجوان آرکیڈ میں گھومنے پھرنے والیوں کو نگاہوں سے ٹٹولنے آتے ہیں۔ غنڈے سیل گرلز سے اٹا سٹا لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی نمائش کے لیے آتی ہیں۔ بوڑھے خالی آنکھیں سینکتے ہیں۔ گھاگ بیگمات گرین یوتھ کی ٹوہ میں آتی ہیں۔ وہ صرف فیشن آرکیڈ ہی نہیں' رومان آرکیڈ بھی ہے کیوں نہ ہو۔ آج محبت بھی تو فیشن ہی ہے۔

کون سی چیز ہے جو فیشن آرکیڈ مہیا نہیں کرتا۔ زر بفت سے گاڑھے تک۔ موسٹ ماڈرن کیجٹس سے سوئی سلائی تک سی تھرو سے رنگین مالاؤں تک۔ سب کچھ وہاں موجود ہے۔ لوگ گھوم گھام کر تھک جاتے ہیں تو آرکیڈ کے ریستوران میں کافی کا پیالہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔

فیشن آرکیڈ کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ فارن ڈگنیٹریز نے خرید و فروخت کرنی ہو تو انہیں خاص انتظامات کے تحت آرکیڈ میں لایا جاتا ہے۔

آرکیڈ ہال میں جگہ جگہ روغنی پتلے طرح طرح کا باس پہنے کھڑے ہیں۔ چہروں پر جوانی کی سرخی جھلملا رہی ہے۔ آنکھوں میں دعوت بھری چمک ہے۔ ہونٹوں پر رضامندی بھرا تبسم کھدا ہے۔ جسم کے پیچ و خم ہر لحظہ یوں ابھرتے سمٹتے محسوس ہوتے ہیں جیسے سپردگی کے لیے بے تاب ہوں۔

اگرچہ ڈمی پتلے پلاسٹک کے جمود میں مقید ہیں مگر صناع نے انہیں ایسی کاریگری سے بنایا ہے کہ ان کے بند بند میں حرکت کی الیوژن لہریں لے رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ رواں دواں ہوں۔

سی تھرو لباس والی پتلی کو دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے وہ ابھی اپنی برہنہ ٹانگ اٹھا کر کہے گی۔ "ہئے مجھے سنبھالو۔ میں گری جا رہی ہوں۔" اور جیکٹ والا اپنی عینک اتار کر مونچھوں کو لٹکاتے ہوئے چل پڑے گا۔ "ہولڈ آن ڈارلنگ۔ میری گود میں گرنا۔"

آرکیڈ میں بہت سی پتلیاں پوز بنائے کھڑی ہیں۔ منی سکرٹ والی' ساڑھی والی' بیدنگ کاسٹیوم والی' میکسی والی' سی تھرو لباس والی' لٹکتے بالوں والی' پتلون والی ننگے پاؤں والی' ہپن' ٹوکرا بالوں والی' انگلی سے لگے بچے والی۔

ان کے ساتھ ساتھ پتلے کھڑے ہیں۔ شکاری جیکٹ والا' دانشور' موٹر سائیکل والا' بلیک سوٹ' اچکن' ہپی' کرتے پاجامے والا' سٹوڈنٹ' ڈینڈی' مصور

آرکیڈ ہال کے اوپر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک گیلری چل گئی ہے۔ جہاں نظروں سے اوجھل دکان کا کاٹھ کباڑ پڑا ہے۔ پرانی میزیں کرسیاں' شلف اور پتلے جن کا رنگ و روغن اکھڑ چکا ہے۔

رات کا وقت ہے۔ آرکیڈ بند ہو چکا ہے۔ ہال میں ساتھ آٹھ بتیاں روشن ہیں شیشے کی دیواروں کی وجہ سے ہال جگمگ کر رہا ہے۔

گھڑی نے دو بجائے۔ سارے ہال میں حرکت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پتلیوں نے آنکھیں کھول دیں۔ پتلیوں کی لمبی لمبی پلکیں یوں چلنے لگیں جیسے پنکھیاں چل رہی ہوں۔

سی تھرو نے انگڑائی لی۔

منی سکرٹ والی نے اپنی ٹانگ اٹھائی۔

جیکٹ والے دانشور نے اپنا قلم جیب میں ٹانکا۔ عینک صاف کی اور سی تھرو کی طرف بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔

موٹر سائیکل والے نے پیچھے بیٹھی لٹکتے بالوں والی پر گلیڈ آئی چمکائی۔ لٹکتے بالوں والی سے چھینٹے اڑنے لگے۔

"مائی گاڈ۔" سی تھرو چلائی۔ "یہ دیکھو۔ اس نے اپنی ٹانگ لہرائی۔ میری ٹانگ پر نیلی رگیں ابھر آئی ہیں کھڑے کھڑے۔"

"کیوں نہ ہو، بلیو بلڈ ہے۔" بلیک سوٹ مسکرایا۔

دور سے ایک آواز آئی۔ "ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلی میں۔" سب لوگ بکس کے پاس کھڑی پتلون والی کی طرف دیکھنے لگے۔

"تیرے ہاتھ تو خالی ہیں۔ کہاں ہے ساغر؟" کرتے پاجامے والے نے پوچھا۔

"اندھے وہ تو خود ساغر ہے۔ دکھتا نہیں تجھے۔" جین والا ہنسا۔

"میں تو بور ہو گئی ہوں۔" منی سکرٹ والی نے آنکھیں گھما کر کہا۔

"کیوں مذاق کرتی ہو؟" موٹر سائیکل والے نے گلیڈ آئی چمکائی۔

"تم تو سراپا حرکت ہو۔ تمہاری تو بوٹی بوٹی تھرکتی ہے۔ تم کیسے بور ہو سکتی ہو؟"

"کیوں بناتے ہو اسے۔ اس کے جسم پر بوٹی ہی نہیں، تھرکے گی کہاں سے۔" دور کونے میں کھڑے اچکن والے نے کہا۔

"ہاں۔" پہلوان نما کرتے والے نے سر اثبات میں ہلایا۔ "وہ تو مٹیار کا زمانہ تھا جب بوٹی بوٹی تھرکا کرتی تھی۔ اب تو کاٹھ ہی کاٹھ رہ گیا ہے۔"

"شٹ اپ۔" جین والے نے آنکھیں دکھائیں۔ "اپنے دقیانوسی رجعت پسند خیالات سے فیشن آرکیڈ کی فضا کو متعفن نہ کرو۔"

"اب مسٹر اچکن۔" سٹوڈنٹ چلایا۔ "ذرا آئینہ دیکھو۔ یوں لگتے ہو جیسے سارنگی پر غلاف چڑھا ہو۔"

"یہ مسٹر اچکن تو خالص ہسٹری ہے، ہسٹری۔ اسے تو میوزیم میں ہونا چاہیے۔"

"اینٹیکس میوزیم میں۔" جیکٹ والے نے قہقہہ لگایا۔

"بالکل۔ ان روایتی لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں۔"

"یہ لوگ زندگی کو کیا جانیں۔"

"ہپو کریٹس۔" ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

"اگنور ہم، ہٹاؤ---- کوئی اور بات کرو۔" سی تھرو آنکھیں گھما کر بولی۔

"ہاؤ کین دی اگنور ہم؟ یہ لوگ ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔"

"نان سنس۔ ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ وی آر آل فار پروگرس موومنٹ۔" جیکٹ والا چلا کر بولا۔

"ہیئر ہیئر۔" تالیوں سے ہال گونجنے لگا۔

"ہا ہا ہا ہا۔" اوپر گیلری میں کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ اس کی آواز کھرج تھی۔ انداز والہانہ تھا۔

تالیاں رک گئیں۔ ہال میں خاموشی چھا گئی۔ پھر سرگوشیاں ابھریں۔

"کون ہے یہ؟"

"کون ہنس رہا ہے؟"

"پتا نہیں۔ اوپر سے آواز آ رہی ہے۔"

"ہئے میں تو ڈر گئی۔ کتنی ہورس آواز ہے۔"

قہقہہ رک گیا۔ پھر قدموں کی آواز سنائی دی---- ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک۔

"کوئی چل رہا ہے اوپر۔"

"ہئے میری تو جان نکلی جا رہی ہے۔"

"پتا نہیں کون ہے۔ منی اسکرٹ والی بولی۔

"ڈونٹ فیئر ڈارلنگ۔ آئی ایم ہیئر بائی یور سائیڈ۔"

"وہ دیکھو---- وہ۔ ٹوکرا بالوں والی نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

اوپر---- گیلری کے جنگلے پر۔" ساڑھی والی ڈر کر بولی۔

سب کی نگاہیں اوپر جنگلے کی طرف اٹھ گئیں۔

گیلری کی ریلنگ سے ایک بڑا سا بھیانک چہرہ جھانک رہا تھا۔

"توبہ ہے۔ اف---- ہائے----" پتلیوں نے شور مچا دیا۔

"کون ہے تو؟" موٹر سائیکل والا اپنا سائیلنسر نکال کر غرایا۔

"میں وہ ہوں جو ایک رومشہدی لنگی باندھے وہاں کھڑا تھا۔ جہاں آج تو کھڑا ہے۔"

"اس کی آواز اتنی بھدی کیوں ہے؟" سی تھرو نے سینہ سنبھالا۔

"کہاں سے بول رہا ہے یہ؟" پتلون والی نے پوچھا۔

"میں وہاں سے بول رہا ہوں جہاں بہت جلد تم پھینکی جانے والی ہو۔ لنگی والا کہنے لگا۔

پتلیوں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ان کے منہ سے چیخیں سی نکلیں۔ "نو نو---- نو نو۔ نیور۔ مائی گاڈ۔ ہئے اللہ۔" وہ سب سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔

"ڈونٹ مائنڈ ہم ڈارلنگ۔" جین والا بولا۔ "یہ تو پٹا ہوا مہرہ ہے۔ پٹے ہوئے مہرے سے کیا ڈرنا۔"

"ویٹس اٹ ویٹس اٹ دے بلانگ ٹو دی پاسٹ۔"

"یہ اب بھی ماضی میں رہتے ہیں اور ہم کو ماضی کی طرف گھسیٹنا چاہتے ہیں۔" جیکٹ والا حقارت سے بولا۔

"بڑے میاں سلام۔" جیکٹ والے نے ماتھے پر ہاتھ مار کر طنزیہ سلام کیا۔ "ماضی پرستی کا دور ختم ہوا۔ خصت اب جدیدیت کا زمانہ ہے۔"

گیلری میں اوندھا پڑا ہوا رومی ٹوپی والا لنگڑا سوٹی پکڑ کر اٹھ بیٹھا۔

"احمق ہیں یہ جدجدیت کے دیوانے۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اس دنیا میں نہ قدیم ہے، نہ جدید۔ جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا۔"

"یہ ظاہر کے دیوانے کیا سمجھیں گے۔" مشہدی لنگی والے نے قہقہہ لگایا۔ "کہ دور ایک گھومتا ہوا چکر ہے جو آج اوپر ہے، کل نیچے چلا جائے گا۔ جو آج نیچے ہے، کل اوپر آ جائے گا۔"

جین والے نے اپنی پتلون جھاڑی۔ "ان کباڑ خانوں والوں کی باتیں نہ سنو۔ یہ بے چارے کیا جانیں جدیدیت کو۔"

"جدجدیت کے دیوانے۔ آج تیری پتلون کے پائنچے کھلے ہیں۔ کل تنگ ہو جائیں گے۔ پرسوں پھر کھل جائیں گے۔ یہی ہے نا تیری جدجدیت۔" رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔

"ذرا اس کی جین کی طرف دیکھو۔" لنگی والا بولا۔ نیلی پتلون پر سرخ ٹلی لگی ہوئی ہے۔---- ہاہا۔ ہاہا۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

"احمق۔ یہ ٹلی نہیں۔ پچ ہے پچ۔ پچ فیشن ہے۔ پچھ لگی جین کی قیمت عام پتلون سے دگنی ہوتی ہے۔ تجھے کچھ پتا بھی ہو۔"

"پیوند کبھی غربت کا نشان تھا۔ پیوند لگے کپڑوں والے سے لوگ یوں گھن کھاتے تھے جیسے کوڑی ہو۔ آج تم اس پیوند کی نمائش پر فخر محسوس کر رہے ہو۔" مشہدی لنگی والا ہنسنے لگا۔ "تم عجیب تماشا ہو۔"

رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔ "دور جدید کے تخیل کا فقدان ملاحظہ ہو۔ پیوند کو فیشن بنا بیٹھے ہیں۔ ہی ہی ہی ہی----"

"سارا کریڈیٹ ہمیں جاتا ہے۔" ہپن نے سر اٹھا کر کہا۔

"ہائیں---- یہ کیا کہہ رہی ہے؟" پتلون والی نے پوچھا۔

"لوسی تھرو زیر لب گنگنائی۔" چھلنی بی بولی۔

"ہاں۔" ہپی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "سارا کریڈیٹ ہمیں جاتا ہے۔"

"تعفن کا کریڈیٹ غلاظت کا کریڈٹ اور کون سا۔" بیدنگ کاسٹیوم والی بولی۔ ساڑھی والی نے ناک چڑھائی۔

ہپی نے قہقہہ لگایا۔ "جدجدیت کے ذہنی تعفن کر دور کرنے کا کریڈٹ۔ جدجدیت کے بت توڑنے کا کریڈیٹ۔ جھوٹی قدروں کو پاؤں تلے روندنے کے لیے ہمیں غلاظت کو اپنانا پڑا۔"

سپورٹس گرل نے بیڈ مشن ریکٹ کو گھما کر دانت نکالے۔

"ڈینٹل کریم کا اشتہار کسے دکھا رہی ہو؟" ہپی ہنسا۔ "ہم نے دور حاضرہ کے سب سے بڑے بت دولت کو پاش پاش کر دیا۔ ہم نے جھوٹے رکھ رکھاؤ کا بت ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ہم نے ماڈرن ایج کے واحد دل بہلاوے سمال کمفرٹس کی نفی کر دی۔ ہم نے مغربی تہذیب کا جنازہ نکال دیا۔"

"یہ بے چارے کیا جانیں۔" ہپن بولی۔ "ظاہریت کے متوالے ____ جب کوئی تہذیب متعفن ہو جاتی ہے تو اسے مسمار کرنے کے لئے مجاہد بھیج دیئے جاتے ہیں۔ ہم وہ مجاہد ہیں۔"

"تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی۔" رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔

"بالکل درست۔" لنگی والا چلایا۔ "یہ ٹرانزیشنل دور ہے۔ جب ایک شو ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے شو کے واسطے ہال صاف کرنے کے لئے جمعدار آ جاتے ہیں۔ یہ جمعداروں کا دور ہے۔"

"سلی فول۔" سی تھرو ہنسی۔ "یہ تو رومانس کا دور ہے۔"

"رومانس۔" گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک مجنوں صفت دیوانہ لپک کر ریلنگ پر آ کھڑا ہوا۔ "تم کیا جانو، رومان کیا ہوتا ہے---- تمہارے دور نے تو عشق کا گلا گھونٹ دیا۔ عاشق کو ٹھنڈا کر کے رکھ دیا۔ محبوب سے محبوبیت چھین کر اسے رنڈی بنا دیا۔ عریانی کو رومان نہیں کہتے بی بی۔"

"ہالڈر ڈیش۔"

"نان سینس۔"

رومی ٹوپی والے نے ایک لمبی آہ بھری۔ "دوستو ہمارے زمانے میں عورت کا نقاب سرک جاتا تھا تو گال دیکھ کر مرد میں تحریک پیدا ہوتی تھی لیکن اب ننگے پنڈوں کی یلغار نے مردانہ حس کو کند کر دیا ہے۔ تمہارے دور نے مرد کو نامرد اور عورت کو بانجھ کر کے رکھ دیا ہے۔"

جیکٹ والا آگے بڑھا۔ اس نے قلم جیب میں ڈالا۔ عینک اتاری۔ "ہم جنس کے متوالے نہیں۔ ہم جنس کی دلیل میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں۔ دور حاضر میں سب سے اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا ہے۔ تم حالات حاضرہ سے چشم پوشی کرتے ہو۔ ہم تمہاری طرح حالات حاضرہ سے آنکھیں نہیں چراتے۔ ہم ترقی پسند لوگ ہیں۔"

"حالات حاضرہ۔" رومی ٹوپی والے نے قہقہہ لگایا۔ "تمہارے نزدیک حالات حاضرہ روٹی، کپڑا اور مکان ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ انا کا ہے۔ سلف کا---- "میں" کا۔"

"روٹی کپڑے والو ہماری طرف دیکھو۔" ہپن چلائی۔ "جو ملتا ہے، کھا لیتے ہیں۔ جہاں بیٹھ

جاتے ہیں، وہی ٹھکانہ بن جاتا ہے۔ جو میسر آتا ہے، پہن لیتے ہیں۔ کہاں ہیں وہ منسلے جنہیں تم اہرام مصر بنائے بیٹھے ہو۔“

”اونہوں انہیں کچھ نہ کہو۔ یہ تو فارن خیالات کی ایڈ کے بل بوتے پر کھڑے ہیں۔ انہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکا۔“ رومی ٹوپی والا بولا۔

”کل جب روٹی، کپڑا اور مکان کا مسئلہ حل ہو جائے گا، پھر تمہارے ہاتھ پلے کیا رہ جائے گا۔ بتاؤ۔“ ہپن بولی۔

”یہ تو حرکت کے متوالے ہیں، منزل کے نہیں، انہیں صرف چلنے کا شوق ہے، پہنچنے کا نہیں۔“ مشہدی لنگی والے نے منہ بنایا۔

”بکو نہیں۔ ہمارے راستے میں جو شخص روڑے اٹکائے گا، اس پر رجعت پسندی کا لیبل لگا دیا جائے گا۔“

ہپی قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”سو واٹ---- ہم ہپیوں پر رجعت پسندی کا لیبل لگاؤ۔ بے شک لگاؤ۔ ہم نے کیپٹل ازم کی بنیادی کھوکھلی کر دی ہیں۔ ہم نے اقتدار پسندی کا تمسخر اڑایا ہے۔ ہم میں اور ان گوریلوں میں کیا فرق ہے جو سرمایہ داری کے خلاف جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔“

”صرف یہی کہ طریق کار مختلف ہے۔“ ہپن نے لقمہ دیا۔

ہال پر سناٹا چھا گیا۔

سی تھرو اپنے جسم کے پیچ و خم کا جائزہ لے رہی تھی۔ ساڑھی والی اپنا پلو سنبھال رہی تھی۔ لٹکے بالوں والی منہ میں انگلی ڈالے کھڑی تھی۔ پتلون والی کا چہرہ حقارت سے چقندر بنا ہوا تھا۔ ”کتابوں میں تو یہ بات کہیں نظر سے نہیں گزری۔“

مجنوں نما نے قہقہہ لگایا۔ ”خود کو زندگی کے متوالے گرداننے والے کتابوں کی بیساکھیوں کے سہارے کے بغیر چل نہیں سکتے۔ زندگی کتابوں سے اخذ نہیں کی جاتی مسٹر۔ زندگی حال ہے---- کسی صاحب حال سے پوچھو۔“

”جو قیل و قال کے دیوانے ہیں، انہیں حال کا کیا پتہ؟“ لنگی والا بولا۔

”انہیں اتنا نہیں پتا کہ حال پر قیل و قال نہیں ہو سکتا۔ حال کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ حال سب سے بڑی حقیقت ہے۔“

ہال پر خاموشی چھا گئی۔

پھر دور سے ایک سرگوشی ابھری--- ”میں کہاں آ پھنسی ہوں۔“ بچے کو انگلی لگائے کھڑی ماں گنگنا رہی تھی۔ ”یہ دور ماں کا دور نہیں۔ یہ تو عورت کا دور ہے۔ میں کہاں آ پھنسی ہوں۔“

”عورت کا نہیں بی بی۔“ پہلوان کرتے والے نے سر ہلا کر کہا۔ ”یہ تو لڑکی کا دور ہے۔ انہیں کیا پتہ کہ عورت کسے کہتے ہیں۔ بال سفید ہو جاتے ہیں، پھر بھی یہ لڑکیاں ہی بنی رہتی ہیں۔“

”خاموش۔“ آرکیڈ کی فرنٹ رو میں کھڑی ٹوکرا بالوں والی بولی۔ ”سنو سنو۔ یہ کیسی آواز ہے؟“

”کون سی آواز؟“

”کدھر ہے آواز؟“

”چپ“ موٹر سائیکل والا چلایا۔ ”یہ تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔“

”یہ آواز تو باہر سے آ رہی ہے۔“ منی سکرٹ والی نے کہا۔

جیکٹ والے نے عینک صاف کی اور باہر دیکھنے لگا۔

”ہائے اللہ۔“ سی تھرو بولی۔ ”یہ آواز تو ایمر جنسی فون بوتھ سے آ رہی ہے۔ وہ جو باہر پورٹیکو میں ہے۔“

”خاموش۔“ شکاری ڈانٹ کر بولا۔ ”سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاؤ---- وہ آ رہا ہے۔“

”کون آ رہا ہے؟“ سی تھرو نے زیر لب پوچھا۔

”چوکیدار۔“

”چوکیدار۔“ پتلیاں سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔ پتلے باہر جھانکنے لگے۔

سامنے ایک اونچا لمبا جہلمی جوان خاکی وردی پہنے سر پر پگڑی لپیٹے ہاتھ میں سوٹا اٹھائے بوتھ کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔

”بالکل اجڈ نظر آتا ہے۔“ پتلون والی نے حقارت سے ہونٹ نکالے۔

”گاکی، کروڈ، ان کوتھ۔“ ٹوکرا بالوں والی دانت بھینچ کر بولی۔

”میرے بدن پر تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اسے دیکھ کر۔“ سی تھرو نے کہا۔

چوکیدار نے سوٹا باہر کھڑا کیا اور خود جلدی سے بوتھ میں داخل ہو گیا۔ اس نے ٹیلی فون کا چونگا اٹھایا اور فون پر باتیں کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چند ایک منٹ کے بعد وہ بوتھ سے باہر نکلا اور حسب معمول ہال کا چکر لگانے کے بجائے ہال کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

”ضرور کوئی ایمر جنسی ہے۔“ شکاری نے چھائے ہوئے سکوت کو توڑا۔

گیلری میں رومی ٹوپی والا ہنسا۔ ”ایمر جنسی........ یہ دور تو بذات خود ایک سٹیٹ آف ایمر جنسی ہے۔“

"ایک ابال ہے۔ بے مقصد ابال۔" لنگی والے نے قہقہہ لگایا۔

منی سکرٹ نے لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر اوپر دیکھا۔

"اگنور ہم مائی ڈیئر۔" موٹر سائیکل نے سائیلینسر فٹ کر کے کہا۔

"میں کہتا ہوں، ضرور یہ کسی کے انتظار میں کھڑا ہے۔ ضرور کوئی آنے والا ہے۔" سٹوڈنٹ زیر لب بولا۔

"چوکیدار کو دیکھ کر میری روح خشک ہو جاتی ہے۔" سی تھرو نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

لنگی والے نے مسکرا کر پوچھا۔ "بی بی کیا تیرے اندر روح بھی ہے۔ ہوتی تو تو سی تھرو نہ ہوتی۔"

"کتنی ڈروائونی شکل ہے چوکیدار کی۔" پتلون والی، لنگی والے کے سوال کو دبانے کے لئے بولی۔

رومی ٹوپی والا ہنسنے لگا۔ "کتنی عجیب بات ہے اپنوں کو دیکھ کر ڈر کر سہم جاتی ہیں۔ بیگانوں کو دیکھ کر ایٹ ہوم محسوس کرتی ہیں۔"

"شٹ اپ۔" پتلون والی ڈانٹ کر بولی---- "یو---- ان کلچرڈ---- ان کو تھ---- سیوج۔"

"ول سیڈ۔" بلیک سوٹ نے کہا۔ "ہیر ہیر---- جنٹلمین چیئرز۔"

سارا ہال تالیوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ "ہمارے دور میں ان سویلائیزڈ۔ ان ایجو کیٹڈ لوگوں کو لب ہلانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" جیکٹ والا منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے بولا۔

"تمہارا دور۔" مجنوں نما ہنسا۔ "نقالوں کا دور۔ چربہ دور۔ یہ دور مغربی تہذیب کی کاپی ہے کاپی۔ بیگانوں کی طرز زندگی کی نقل کرو۔ ان کے خیال کو اپناؤ۔ اپنوں سے گھنوں سے نفرت کرو۔ یہی نا۔"

"مغربی تہذیب مغرب میں خود کشی کر چکی ہے۔ چاند غروب ہو چکا ہے۔ اس کی آخری شعاعیں یہاں سرابی رنگ کھا رہی ہیں۔" ہپی مسکرایا۔ "اور....."

"میں کہتی ہوں۔" ہپن نے اس کی بات کاٹی۔ "اگر نقل ہی کرنی ہے تو کسی ایسی قوم کی کرو جس میں جان ہے۔ زندگی ہے۔ چربہ بننا ہے تو کسی ایسی تہذیب کا بنو جو ابھر رہی ہے۔ کیوں ڈوبتے سورج کو پوج رہے ہو۔"

جیکٹ والے نے اپنا قلم جیب میں اٹکایا۔ عینک کو سنبھالا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ہال کے درمیان آ کر بولا۔ "کون نہیں جانتا کہ کون سی قومیں ابھر رہی ہیں۔"

مشہدی لنگی قہقہہ مار کر ہنسا۔ "ذرا اس فیشن آرکیڈ پر نظر دوڑاؤ۔ کیا یہ رنگ ان قوموں کا ہے جن کا تم حوالہ دے رہے ہو؟"

"کیا یہ منی سکرٹ، یہ سی تھرو بی بی اس آئیڈیل کے مظہر ہیں جس کے تم دعوے دار ہو؟ کیا تمہارے دور جس پر تم اتنے نازاں ہو، تمہارے مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے؟" رومی ٹوپی والا جوش میں بولا۔

"ابھی ہم جدوجہد کے عالم میں ہیں۔" سٹوڈنٹ نے اپنے ٹوکرا بالوں کو جھٹک کر سنوارتے ہوئے کہا۔

مجنون نما ہنسا۔ "ذرا آئینہ دیکھو میاں۔ کیا جدوجہد کرنے والوں کی شکلیں ایسی ہوتی ہیں جیسی تمہاری ہیں؟ کیا ان کی قلمیں سارنگی ہوتی ہیں؟ کیا ان کے سروں پر بالوں کے ٹوکرے دھرے ہوتے ہیں؟ کیا ان کی آنکھوں میں سرمے کی دھار ہوتی ہے؟ کیا وہ ایسے بنے ٹھنے ہوتے ہیں جیسے تم ہو؟ تم نے تو لڑکیوں کو بھی مات کر دیا۔ ایمان سے.........."

ہال پر خاموشی طاری ہو گئی۔

سب چپ ہو گئے۔ رومی ٹوپی ہنسنے لگا۔

کسی نے رومی ٹوپی کو جواب نہ دیا۔

"وہ دن کب آئے گا؟" دور سے یوں آواز سنائی دی جیسے کوئی آہیں بھر رہا ہو۔ "کون سا دن بی بی؟" کرتے پاجامے نے پوچھا۔

"جب مجھے مامتا کے جذبے پر شرمندگی نہ ہو گی۔" بچے کی انگلی لگائے کھڑی ماں بولی۔ "جب اس آرکیڈ میں اٹھا کر کھڑی ہو سکوں گی۔"

"سچ کہتی ہو بی بی۔ آج کے دور میں مائیں اپنے بچوں کو اپناتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہیں۔" رومی ٹوپی نے کہا۔

"وہ ماں کہلوانا نہیں چاہتیں۔" کرتے پاجامے والا بولا۔ "بچوں سے کہتی ہیں، مجھے باجی بلاؤ۔"

"آج کی عورت، عورت بن کر جینا چاہتی ہے، ماں بن کر نہیں۔" لنگی والا بولا۔

"میں پوچھتا ہوں کیا عورت کو عورت بن کر جینے کا حق نہیں۔ تم نے اسے ماں بنا کر قربانی کا بکرا بنا دیا تھا۔ ہم نے اسے عورت کی حیثیت سے جینے کا حق دیا ہے۔" بلیک سوٹ نے کہا۔

"تمہیں کچھ پتا بھی ہو۔" رومی ٹوپی ہنس کر بولا۔ "وہ سب تہذیبیں تباہ کر دی گئیں جنہوں نے مامتا کو رد کر دیا تھا اور عورت کو عورت بن کر جینے کا حق دیا تھا۔ اس دنیا میں صرف وہی تہذیب پنپ سکتی ہے جو بچے کو زندگی کا مقصد مانے۔"

“پاگل ہیں یہ ماضی کے دیوانے۔” جیکٹ والے نے عینک اتار کر صاف کی۔ “اتنا نہیں جانتے کہ آج سب سے بڑا معاشی مطالبہ یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش کو روکا جائے۔”

“بالکل بالکل۔” بلیک سوٹ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

“بچے کم خوش حال گھرانا۔” موٹر سائیکل گنگنانے لگا۔

“سبحان اللہ۔” مشہدی لنگی والا بولا۔ “سوشل ازم کے نام لیوا سرمایہ داروں کے حربے کا پرچار کر رہے ہیں۔”

“بھائی صاحب بچے تو غربت کی پیداوار ہیں۔ قدرت کا اصول ہے جس گھر میں پیسے کی ریل پیل ہو گی، بچے پیدا کرنے کی قوت کم ہو جائے گی۔ اگر غریبوں کی یہ صلاحیت ختم کردی گئی تو تخلیق کا عمل مدھم پڑ جائے۔ شاید ختم ہو جائے۔” رومی ٹوپی نے کہا۔

“مین پاور کی عظمت کو ماننے والے بچوں کی پیدائش کو معاشی رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔” مجنوں نما قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

“پتلیاں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔”

“کیا کہہ رہا ہے یہ؟”

“گاڈ نوز----!”

“ہئے۔ چلڈرن آر اے نوے سنس۔”

“سیانوں نے کہا تھا۔” کرتا پاجامہ کہنے لگا۔ “کہ.........”

“کون سیانے؟” جیکٹ والے نے پوچھا۔

“ہمارے لگتے لوگ۔” کرتا پاجامہ نے وضاحت کی کوشش کی۔

“تم اپنے لگتوں کی بات کر رہے ہو۔” لنگی والے نے اسے ٹوکا۔ “انہیں سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ان کے لگتے تو مغرب میں رہتے ہیں۔ یہ تو مغربی ت؟ہذیب کے دیوانے ہیں۔”

“وہ دن دور نہیں۔” اچکن والے نے کہا۔ “جب انہیں اپنے لگتوں کو اپنانا پڑے گا۔”

“بھول جاؤ وہ دن۔” جیکٹ والا جلال میں بولا۔ “وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔”

“ہم ترقی کی جانب قدم اٹھا رہے ہیں۔ ہم آگے بڑھنے کے قائل ہیں۔ ہم کبھی واپس ماضی کی طرف نہیں جائیں گے۔”

“موٹر سائیکل نے لٹکے بالوں والی کی طرف دیکھا۔ “کیوں ڈارلنگ۔”

“فارگٹ دیٹ ڈے۔ اٹ ول نیور کم۔” لٹکے بالوں والی نے بال جھٹک کر کہا۔

گیلری کے کاٹھ کباڑ سے ایک پتلا اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ سر پر کلاہ

تھا۔ “کون نہیں مانتا اس دن کو۔ کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔”

“اچھا بدل رہا ہے کیا۔” شکاری نے طنزاً کہا۔

سب پتلے ہنسنے لگے۔

“دنیا کے سارے مذہب، سارے نجومی، سارے سیرز آنے والے گولڈن ایج کو مانتے ہیں۔” چغے والا چلایا۔

“عیسائی، مسلمان، یہودی، ہندو سبھی مانتے ہیں۔ اسٹرالوجرز اس کی شہادت دیتے ہیں۔” رومی ٹوپی نے کہا۔

“وہ گولڈن ایج۔” چغے والے نے انگلی اٹھا کر کہا۔ “جب ترقی کا رخ مادی سہولتوں سے ہٹ کر روحانی مقاصد کی طرف مڑ جائے گا۔ جب ہماری توجہ باہر کے آدمی کی جگہ اندر کے آدمی پر مرکوز ہو جائے گی۔ جب امن ہو گا۔ اطمینان کا دور دورہ ہو گا۔”

موٹر سائیکل نے طنز بھر قہقہہ مارا۔

جیکٹ والے نے چلا کر کہا۔ “ضیعف الاعتقادی نہیں، خوش فہمی ہے یہ۔”

“اچھا۔” ماں بولی۔ “کیسا گولڈن ایج ہو گا وہ؟”

“نشاۃ ثانیہ۔” چغے والا چلا کر بولا۔

“نشاۃ ثانیہ۔” ہال کی دیواریں گونجنے لگیں۔

“دنیا پر مبارک ترین ستاروں کا اکٹھ ہو رہا ہے۔ ایسا اکٹھ جو کبھی آج تک نہیں ہوا تھا۔” چغے والا بولا۔

“اس کے اثرات 1980ء کے لگ بھگ ظہور میں آئیں گے۔”

ٹوکرا بالوں والی نے منہ میں انگلی ڈال لی۔ “سچ؟”

ساڑھی والی نے سینہ سنبھالا۔

خاموش لٹکے بالوں والی چلائی۔ “وہ دیکھو----وہ۔” اس نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ سب انگلی کی سیدھ میں پورٹیکو کی طرف دیکھنے لگے۔

“کیا ہوا؟” دور سے پولکا بکس کے قریب کھڑی پتلون والی نے پوچھا۔

“کیا بات ہے؟”

“پتہ نہیں۔”

“کون ہے؟”

دور کھڑی پتلیاں سرگوشیاں کرنے لگی۔

موٹر سائیکل نے اپنا سائیلینسر فٹ کر کے کہا۔ ”وہ آ رہے ہیں۔ خاموش۔“ اس نے دور کھڑے پتلون کو خبردار کیا۔ ”وہ آ رہے ہیں۔ ادھر آ رہے ہیں۔“

”ہاں۔ ہاں۔“ لٹکے بالوں والی بولی۔ ”انتظامیہ کے لوگ آ رہے ہیں۔“

”بالکل۔“ ساڑھی والی نے کہا۔ ”وہ ضرور اندر آئیں گے۔“

جیکٹ والے نے اپنی عینک صاف کی۔ اسے پھر سے لگایا اور پھر تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”سب اپنے اپنے مقام پر اپنا مخصوص پوز بنا کر کھڑے ہو جاؤ۔ یقیناً“ کوئی ایمرجنسی ہے۔“ موٹر سائیکل والا بولا۔ ”ورنہ اس وقت ناظم کا یہاں آنا..........“

سارے پتلے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہونے کے لئے دوڑے۔

گیلری میں کھڑے پتلے کونوں میں جا کر ڈھیر ہو گئے۔

ہال پر سناٹا طاری ہو گیا۔

آرکیڈ کا صدر دروازہ کھلا۔ ناظم اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے نائب تھا۔ نائب کے پیچھے دس بارہ کاریگر تھے۔ انہوں نے پینٹ کے بڑے بڑے ڈبے اور برش اٹھائے ہوئے تھے۔

ناظم کرسی پر بیٹھ گیا۔ نائب اور کاریگر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ”دیکھو اس وقت تین بجے ہیں۔“ ناظم نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہمارے پاس صرف چھ گھنٹے ہیں۔ حکومت کے معزز مہمان جو دنیائے اسلام کے بہت بڑے سربراہ ہیں، ٹھیک ساڑھے نو بجے آرکیڈ دیکھنے کے لئے آ رہے ہیں۔ ان کے آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے سارا کام مکمل ہو جانا چاہئے۔ سمجھے۔“ ناظم نے نائب سے مخاطب ہو کر کہا۔

”یس سر۔“ نائب نے جواب دیا۔ ”اٹ شیل بی ڈن۔“

”ہوں۔“ ناظم نے کہا۔ ”ہمارے پرائم منسٹر کا کہنا ہے کہ معزز مہمان توقع رکھتے ہیں کہ پاکستان کا سب سے بڑا شاپنگ سینٹر پاکستانی رنگ میں رنگا ہو گا اور پاکستانی زندگی، دستکاری اور فن کا مظہر ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آرکیڈ کی ہر تفصیل پاکستانی ہو۔ سمجھے۔“

”آپ فکر نہ کریں سر۔“ نائب نے کہا۔

پھر وہ کاریگروں سے مخاطب ہوا۔ ”دیکھو بھئی اتنے تھوڑے وقت میں، اتنے شارٹ نوٹس پر ہم نیا سامان مہیا نہیں کر سکتے۔ اس لئے اسی سامان کو رنگ و روغن کر کے گزارہ کرنا ہو گا۔“

”جی صاحب۔“ کاریگروں نے جواب دیا۔

اگلے روز ساڑھے نو بجے جب معزز مہمان آرکیڈ میں داخل ہوئے تو صدر دروازے کے اوپر فیشن آرکیڈ کی جگہ پاکستان آرکیڈ کا بورڈ لگا تھا۔ اندر دروازے کے عین سامنے اچکن والا بڑے طمطراق سے کھڑا تھا۔ اس کے پاس ہی دائیں طرف رومی ٹوپی والا اپنا پھندنا جھلا رہا تھا۔ بائیں ہاتھ طرہ باز مونچھ کو تاؤ دے رہا تھا۔ قریب ہی بچے کو انگلی لگائے چادر میں لپٹی ہوئی خاتون بچے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے پرے کرتے پاجامے والا چھاتی پھلائے استادہ تھا۔

ساڑھی والی لمبا چغہ لٹکائے نگاہیں جھکائے لجا رہی تھی۔

سی تھرو چھینٹ کا گھگرا پہنے سر پر پانی کی گاگر رکھے قدم اٹھائے کھڑی تھی۔

سکرٹ والی چست پاجامہ پہنے بازو پر جدید لمبا کوٹ اٹھائے مسکرا رہی تھی۔

# ایلئینز

یہ ایک انوکھے سفر کی کہانی ہے۔

آپ نے عجیب و غریب سفروں کی کہانیاں سنی ہیں۔ سند باد کے سفر' الف لیلوی سفر' گلیور کے سفر---- بالشتیوں میں' دیو قامتوں میں۔

لیکن صائم کی ماں کا یہ سفر بالکل انوکھا تھا۔ وہ کبھی عازم سفر نہ ہوئی تھی۔ نہ ہی رخت سفر باندھا تھا۔ نہ ہاتھ میں لگام تھامی تھی نہ پاؤں رکاب پر رکھا تھا۔

نہ وہ کبھی جہاز پر سوار ہوئی تھی۔ نہ جہاز طوفان سے ٹکرایا تھا۔ نہ وہ بہہ کر کسی انجانے جزیرے کے ساحل پر جا لگی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیسے---- اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک ان جانی بیگانی مخلوق اس کے گرد بھیڑ لگائے کھڑی اسے یوں دیکھ رہی ہے جیسے وہ عجوبہ مخلوق ہو۔

یہ سفر اس لحاظ سے انوکھا تھا کہ اماں نے خود حرکت نہ کی تھی۔ بلکہ ایک ایلین ماحول خود بخود چل کر اس کے اردگرد آ کھڑا ہوا تھا۔

وہ سوچنے لگی۔ "یااللہ یہ میں کہاں آ گئی ہوں۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ لوگ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

ان ا-یلینز میں بہت سے چہرے مانوس دکھتے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ انہیں جانتی ہو۔ جیسے وہ اس کے ہم سفر رہے تھے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں ایک نظر میں وہ مانوس دکھتے' دوسری نظر میں ایسے لگتا جیسے بیگانہ ہوں۔ ا-یلینز۔

پھر اماں کو اپنے پر شک پڑنے لگا---- میں کون ہوں---- کہاں ہوں---- میرا مصرف کیا ہے---- کس لئے ہوں---- کیوں ہوں----؟

اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ سوچتی رہی۔ محسوس کرتی رہی۔ سوچتی رہی حتی کہ بیمار پڑ گئی۔ ڈاکٹر نے ٹوٹیاں لگا کر اسے دیکھا۔

ڈاکٹر تو صرف ڈائی گنوسز کرتے ہیں۔ انہیں بیماری سے دلچسپی ہے' انسان سے نہیں۔ انہیں ابھی تک شعور نہیں ہوا کہ بیماری روح سے پھوٹتی ہے۔ ڈاکٹر بھلا کیا کہتا۔ بولا۔ مریضہ کو کوئی بیماری نہیں۔ صرف کمزوری ہے۔ بڑھاپا ہے۔

جس کا فکر جسم تک محدود ہو' وہ کیسے سمجھے گا کہ بڑھاپا عمر سے نہیں ہوتا بلکہ جینے کی امنگ نہ رہے تو اعضا بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

جینے کی امنگ تبھی قائم رہتی ہے جب کوئی خواہش' کوئی خیال' کوئی امید' کوئی فرد' کوئی مطمح نظر' کوئی سراب آپ کو انگلی پکڑ کر چلائے۔ جینے کی امنگ تبھی قائم رہتی ہے جب آپ کی اپنی حیثیت ہو۔ اہمیت ہو۔ آپ کو احساس ہو کہ آپ کا کوئی مصرف ہے۔

کئی ایک سال سے اماں محسوس کر رہی تھی کہ اس کا کوئی مصرف نہیں رہا۔ وہ ایک فالتو ہستی ہے۔

رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ میں جنبش ہوئی۔ ہڈیوں کے ایک ڈھانچے نے سر نکالا۔ بے نور آنکھوں نے صائم کی طرف دیکھا۔ نگاہیں صائم سے پار ہو گئیں۔ اگر اماں کے لئے صائم میں کوئی مفہوم ہوتا تو یقیناً صائم پر رک جاتیں۔ آنکھوں میں لگاؤ کی چمک لہراتی لیکن صائم تو عرصہ دراز سے اس کے لئے ایلین بن چکا تھا۔

صائم آسیہ کا اکلوتا بیٹا تھا جو اس وقت ماں کی چارپائی کی پائنتی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت کمرے میں ماں اور بیٹے کے سوا کوئی نہ تھا۔

آٹھ دن سے وہ اس کی پائنتی پر بیٹھا تھا۔ آٹھ دن سے آسیہ مر رہی تھی۔

دفعتاً" اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں تڑپ پیدا ہوئی۔ آسیہ کی مضطرب لیکن کراکری آواز گونجی۔ "اب کیا دیر ہے۔ اب کس کا انتظار ہے۔ تم مجھے لے جاتے کیوں نہیں؟؟" اس نے اردگرد کی فضا کو مخاطب کر کے کہا۔ آسیہ کے بات کرنے کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کمرے میں صائم کے علاوہ اور لوگ موجود تھے۔ شاید روح ہوں۔ ہیولے ہوں۔ فرشتے ہوں۔

آٹھ دن سے وہ آسیہ کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ آٹھ دن سے وہ انہیں ڈانٹ رہی تھی۔ "میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ مجھے لے جاتے کیوں نہیں؟ اب کیا دیر ہے؟؟" اس نے گھر کے باقی لوگوں سے بات کرنی چھوڑ رکھی تھی۔

گھر میں صرف چند ایک لوگ ہی تو تھے۔ صائم' اس کی دو نوجوان بیٹیاں سلمیٰ' ستارہ' ایک بیٹا سمیع' بہو اسماء اور صائم کی بیوی ثمینہ۔

عرصہ دراز سے آسیہ ان سب افراد کی زندگیوں سے خارج ہو چکی تھی۔

اگرچہ ان سب کے دلوں میں بوڑھی اماں کی بڑی عزت تھی۔ لیکن عزت تو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عزت تو کوئی جذبہ نہیں۔ عزت تو تہذیب کی ایک مصنوع ہے جس طرح پلاسٹک پھول ہوتے ہیں۔ اماں وہ شہد کی مکھی تھی جس کے ارد گرد پلاسٹک کے پھولوں کا باغ سجا ہوا تھا۔

صرف ایک گھرانے کو اماں سے قلبی تعلق تھا۔ وہ ڈاکٹر صولت کا گھر تھا۔ ڈاکٹر صولت اماں کے بھائی کا بیٹا تھا۔ اس کا گھر ایک جزیرہ تھا جہاں جدید دور کی آندھی اثر انداز نہ ہوئی تھی۔ جہاں ماضی ابھی تک حال کا بہروپ دھارے آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر صولت کا گھر واحد گھر تھا جہاں اماں کے لئے ایلینز نہیں بستے تھے۔ جہاں وقت کو دوام مل گیا تھا۔ جہاں ابھی تک انیسویں صدی چل رہی تھی۔ جہاں بڑی اماں کو محسوس ہوتا کہ وہ اصلی پھولوں پر بیٹھی ہے۔

لیکن صائم کے لئے ڈاکٹر صولت کا گھر ایک دقیانوسی مقام تھا۔ اسے صولت سے شکایت تھی کہ اس نے گھر کو حنوط کر رکھا ہے۔ اور اس حنوط شدہ گھر نے آسیہ کو اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ کہیں اور رہ سکے۔ صولت کی نسبت صائم کا تعلق آسیہ سے کہیں زیادہ پرانا اور گہرا تھا۔

آسیہ اور صائم نے سال ہا سال اکٹھے مل کر دکھ سہے تھے۔ اکٹھے مل کر دکھ سہنا گہرا تعلق پیدا کر دیتا ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب گردو پیش ایلین نہ تھا۔ جب آسیہ اپنے دور میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ جب لوگ اس کی بات سمجھتے تھے۔ اسے اہمیت دیتے تھے۔ جب زندگی میں اس کا ایک مقام تھا۔ مفہوم تھا۔

ان کے دکھوں کی وجہ صرف حالات کی ناسازگاری تھی۔ اس ناسازگاری کی بنیاد ایک عام سا حادثہ تھا کہ خاوند نے دوسری شادی کر لی تھی اور آسیہ کو ہمیشہ کے لئے گھر کی نوکرانی کی حیثیت دے دی گئی تھی۔

جس باورچی خانے میں اسے رات دن کام کرنا پڑتا تھا' وہاں سے اسے اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے طعام نہیں ملتا تھا۔ اس لئے مالک اور مالکن کو کھانا کھلانے کے بعد اسے اپنا چولہا جھونکنا پڑتا تھا۔

مالک کے باورچی خانے کا ایک فائدہ ضرور تھا کہ جب وہاں بھنڈی پکتی تو آسیہ بھنڈیوں سے اتاری ہوئی ٹوپیاں لے آتی اور ان سے اپنی ہانڈی پکاتی۔ جب وہاں کریلے پکتے تو کریلوں سے چھیلا ہوا بور پکانے کو مل جاتا۔ نوکرانی کے بیٹے کے لئے بور کریلے تھا۔ ٹوپیاں بھنڈیاں تھیں۔ چھلکے سبزیاں تھیں۔

مالک رات گئے گھر آتا تھا اور نوکرانی کو انہیں کھانا کھلانے سے پہلے چھٹی نہیں ملتی تھی۔ کھانا

کھلا کر جب وہ آؤٹ ہاؤس میں پہنچتی تو بیٹا سو چکا ہوتا۔ پھر وہ چولہا جھونکتی۔ چھلکے پکاتی اور جب ہانڈی تیار ہو جاتی تو بیٹے کو جگاتی۔ اسے کھانا کھلاتی۔

بیٹا کھا تو لیتا تھا مگر جاگتا نہ تھا۔ اس لئے اسے یاد نہیں تھا کہ بچپن میں اس نے کبھی رات کا کھانا کھایا ہو۔

پھر مالک کا سٹیٹس اونچا ہو جانے پر ایک ٹرینڈ باوردی نوکر رکھنا لازم ہو گیا۔ اس لئے آسیہ کو نکال دیا گیا اور ماں بیٹا آزاد ہو گئے۔

آزادی نے انہیں نئے مسائل سے دوچار کر دیا۔ الاؤنس بہت قلیل تھا۔ ضروریات بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔

بڑھتی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ماں بیٹے کو محنت مزدوری کرنی پڑتی۔ انہوں نے مل کر چارپائیاں بنیں۔ کتابوں پر جلدیں باندھیں۔ کاغذ کے پھول بنائے۔ پتنگ بنائے۔ دھاگا خرید کر اس پر مانجھا لگایا تاکہ ڈور بیچ سکیں۔ بچوں کے کھلونے بنائے۔ آسیہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا محنت مزدوری کرے۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک سلائی مشین خرید لے اور اکیلی سلائی کا کام کرے لیکن اتنے پیسے نہ تھے۔ پھر کسی مخیر نے قرض کے طور پر پرانی گھسی پٹی سلائی مشین خرید دی اور وہ کپڑے سینے لگی۔

آسیہ ہر فن مولا عورت تھی۔ وہ ہر کام کر سکتی تھی۔ وہ ہر عام سے عام کام میں بھی انفرادیت کی کلیاں ٹانک دیا کرتی تھی۔ انوکھے کام سوچا کرتی۔ انوکھی چیزیں بنایا کرتی لیکن یہ اس دور کی بات ہے جب ہاتھ کے کام کی قدر نہ تھی۔ قیمت نہ تھی۔

ان کا باہمی تعلق بہت گہرا تھا۔ اس تعلق کے کئی رخ تھے۔ ماں بیٹے کا تعلق۔ مظلومیت کا تعلق۔ غربت کا تعلق۔ مزدوری کا تعلق۔ دکھ کا تعلق۔

اگر صائم علم حاصل نہ کرتا اور وہ دونوں ہمیشہ کے لئے مزدور رہتے۔ محنت اور مشقت بھری زندگی بسر کرتے تو یہ تعلق جوں کا توں قائم رہتا لیکن علم قینچی بن کر آیا اور اس نے اس عظیم تعلق کے پرزے اڑا دیئے۔

شاید علم دوست اس پر احتجاج کریں اور اپنی جواز پسندی کے تحت تاویل پیش کریں کہ جو خلوص بھرے تعلق کے پرزے اڑا دے' وہ علم دوست نہیں ہو سکتا۔ مجھے کسی حتمی علم کا پتہ نہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جو رائج الوقت ہو' وہی علم ہوتا ہے۔ ہر دور میں رائج الوقت علم کا خصوصی رخ ہوتا ہے۔

آسیہ کے دور میں ایمان لانا تھا۔ صائم کے دور میں شک کرنا۔ تاریخ شاہد ہے کہ علم کا رخ ہمیشہ

گرگٹ کی طرح بدلتا رہا ہے۔ صائم کے زمانے میں عقل و خرد کا دور تھا۔ جوں جوں وہ علم حاصل کرتا گیا، جوں جوں عقل و خرد کی آنکھیں کھلتی گئیں، توں توں مضحکہ خیز ہوتا گیا۔ تعلقات کٹتے گئے۔

صائم کو آسیہ کے خلاف کئی ایک شکایات پیدا ہو گئیں۔ اماں ایسے مرد سے شادی کرنے پر کیوں رضامند ہوئی جو کسی ایک عورت کا ہو کر نہیں رہ سکتا تھا بلکہ جسے عورت ذات سے دلچسپی تھی۔ اماں نے اپنے ہی گھر میں نوکرانی بن کر رہنے کو کیوں منظور کیا۔ اماں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کیوں نہ کی۔ اماں نے اندھی وفاشعاری کو کیوں اپنائے رکھا۔ شاید اماں غم خور ہو۔ شاید اماں ایذا پسند ہو۔

آہستہ آہستہ صائم کی نگاہ میں مظلوم اماں تسکین پسند نظر آنے لگی۔ دکھی اماں ایذا پسندی کی لذت سے سرشار دکھائی دینے لگی۔ یوں باہمی مظلومیت کا تعلق ٹوٹتا گیا۔ دکھ کا تعلق ٹوٹتا گیا۔ مزدوری کا تعلق بڑھتا گیا۔ ایذا پسند کے لئے محنت جدوجہد نہیں ہوتا۔ دکھ دکھ نہیں ہوتا۔ بلکہ انا کی تسکین ہوتی ہے۔ بلغ کے لئے جوہڑ ہوتا ہے۔

اس عقل و دانش بھری سوچ بچار کی توجہ سے ایک ایسا دن آیا جب دونوں کے درمیان صرف ایک تعلق باقی رہ گیا۔ بیٹے اور ماں کا تعلق۔ لیکن بیٹے اور ماں کا تعلق تو ایک عارضی تعلق ہے جو صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک بیٹا ماں کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ تو ماں کا بیٹے سے تعلق ہے جو واحد دائمی تعلق ہے۔

چونکہ صائم ماں کا محتاج نہیں رہا تھا اس لئے وہ تعلق بھی ٹوٹ چکا تھا۔ صرف برائے نام باقی تھا۔ اس برائے نام تعلق کو ہم رسمی طور پر احترام بھی کہتے ہیں۔

احتراماً صائم آٹھ روز سے اماں کی پائنتی پہ بیٹھا تھا۔ اور آٹھ روز سے اماں مسلسل مر رہی تھی۔

دیر تک وہ رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ کوئی جنبش نہ ہوئی دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ "شاید......" اس نے پھر غور سے اماں کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ میں ڈر نہیں بلکہ امید کی جھلک تھی۔ جیسے اس شاید نے آنکھوں میں دیا روشن کر دیا ہو۔

چونکہ اماں نے منہ رضائی میں ڈھانپ رکھا تھا۔ صائم نے بیٹھے بیٹھے اندازہ لگایا کہ اماں کا دل کہاں ہو گا۔ پھر وہ اس مقام کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا کہ حرکت ہے یا نہیں۔

وہ مقام بالکل ساکت تھا۔

اس کے دل سے ایک ہلکی سی آواز آئی جیسے کسی نے اطمینان کا سانس لیا ہو۔ پھر ایک سرگوشی سی اٹھی۔ اچھا ہوا۔ بے چاری اس عذاب سے مخلصی پا گئی۔

اس کے اندر رچی بسی ہوئی عقل بول رہی تھی۔

پتہ نہیں کبھی کبھی وہ سرگوشیوں میں کیوں بولتی تھی۔ ایسے کیوں بولتی تھی جیسے وہ احساس گناہ سے بھیگی بھیگی ہو۔

اس کے اندر رچی بسی عقل تو گھر کی ملکہ تھی۔ عرصہ دراز سے گھر پر اس کا راج تھا۔ پھر وہ سرگوشیوں میں بات کیوں کرتی تھی۔ کس سے ڈرتی تھی۔ صائم کے دل میں وہ کون تھا جس کے ڈر سے سہم جاتی۔ شرمسار ہو جاتی۔ ندامت سے بھیگ جاتی۔ اس کی آواز زیر لبی ہو کر رہ جاتی۔

صائم کو تو اپنی عقل پر ناز تھا۔ وہ اپنے آپ کو دانشور سمجھتا تھا۔ محفلوں میں جان بوجھ کر بلند آواز میں ایسے ادراکی نکتے بیان کرنے کا عادی تھا جو دوسروں کو چونکا دیں۔

محفلوں کی بات چھوڑیئے۔ اس نے کئی بار اپنی عقل و دانش کے بل بوتے پر ماں سے کہہ دیا تھا۔ "اماں جب تم مرو گی تو میں دیگیں چڑھا دوں گا۔ غریبوں کو کھانا باٹنوں گا۔ شکرانے کے نفل پڑھوں گا کہ یااللہ تیرا احسان ہے کہ تو نے میری ماں کو اتنی لمبی عمر دی اور مجھے ماں کے ساتھ اتنی دیر اکٹھے رہنے کا موقع عطا کیا۔ اور ماں میں گھر والوں سے کہہ دوں گا کہ میری ماں کے مرنے پر کوئی نہ روئے۔ کوئی بین نہ کرے۔ رونا اور بین کرنا تو ناشکری کے مترادف ہے۔"

آسیہ کی عمر 95 سال تھی۔ صائم سمجھتا تھا کہ ساٹھ ستر سال کے بعد موت زحمت بن جاتی ہے۔

صائم خود ستر سال کا ہو چکا تھا۔ خود اس کے اپنے اردگرد ایلین قائم ہو چکا تھا۔ اس کی اپنی بیٹیاں سلمیٰ اور ستارہ اس کے خیالات اور احساسات سے بیگانہ تھیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ خود ماضی میں اماں سے بیگانہ ہوا تھا۔

اماں کے ایلین بننے کی بات تو سمجھ میں آتی تھی۔ اماں جدید تعلیم سے آراستہ نہیں تھی۔

لیکن سلمیٰ ستارہ کے ایلین بننے کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ صائم کا ماں سے تعلق تو علم نے کاٹا تھا۔ لیکن اولاد سے کٹنے کی ذمہ داری کس پر تھی۔

اس ڈر کے مارے کہ اس کے بچے اس سے کٹ نہ جائیں، وہ مسلسل علم حاصل کرتا رہا۔ رائج الوقت علم زمانے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا تاکہ پیچھے نہ رہ جائے.......... پھر بھی۔ وہ پیچھے رہ گیا۔ کیوں؟

اس مسئلہ پر وہ سوچتا رہا تھا۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ وہ بے علمی کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ دانش کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ نئے فکر سے ناواقفیت کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ صائم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ شاید وہ علم ہی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ جذبہ تو راستہ ہوتا ہے،

منزل نہیں۔ منزل کیسی ---- ان کے جذبے کا تو کوئی رخ ہی نہ تھا۔ صرف شدت ہی شدت تھی۔ ہانڈی آگ پر چڑھی تھی مگر ہانڈی میں تھا کیا؟

سوچ سوچ کر وہ ہار گیا مگر سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

مثلا” سلمی کو فلم اس لئے پسند آتی کہ اس میں کوئی خاص اداکار ہوتا۔ اگر وہ اداکار ہوتا تو سب کچھ آپ ہی آپ ہو جاتا۔ فلم کی کہانی عمدہ ہو جاتی۔ فوٹوگرافی شاندار ہو جاتی۔ مکالمے چست ہو جاتے۔

ستارہ کو ٹی وی سیریز اس لئے ناپسند ہوتی کہ اس میں کام کرنے والی کسی ایکسٹرا عورت کی شکل و صورت ایسی ہوتی کہ دیکھ کر اسے گھن آتی۔

سلمی سمجھتی کہ کالج کی فلاں پروفیسر اس قدر عمدہ پڑھاتی ہے کہ ایک ایک لفظ دلنشین ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بڑی پیاری ہے۔ کتنی پیاری ہے وہ----! سلمی یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ کوئی بدشکل پروفیسر اچھا پڑھا سکتی ہے۔

ستارہ سمجھتی تھی کہ فلاں مضمون اس لئے اچھا ہے کہ فیشن ایبل سر میں اس کا ذکر رہتا ہے۔ اور فلاں فلاں مضمون اس لئے برا ہے کہ اس میں دقیانوسی سوچیں بھری پڑی ہیں۔

اتفاقا” صائم نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں سلمی کھڑی تھی۔ بال لٹک رہے تھے چہرے ستا ہوا تھا۔ سر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکا ہوا تھا۔ وہ آسیہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سلمی حزن و ملال کی تصویر بنی کھڑی تھی۔

گھر کے سارے افراد حزن و ملال سے بھرے ہوئے تھے۔ سارا ماحول حزن و ملال سے بوجھل ہو رہا تھا۔

اس لئے نہیں کہ ماں یا دادی اماں مر رہی تھی۔

بلکہ اس لئے کہ گھر میں موت گھس آئی تھی۔ چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی۔ سارا گھر موت سے یوں لبالب بھرا ہوا تھا جیسے انار دانوں سے بھرا ہوتا ہے۔

ان جانے میں گھر کا ہر فرد آرزو مند تھا کہ بوجھ اٹھائے۔ بوجھل بورڈم دور ہو جائے۔ گھر کا موڈ بحال ہو جائے۔ چاہے بوڑھی اماں پر کچھ بیت جائے۔

سلمی نے اشارے سے پوچھا کہ بڑی اماں کا کیا حال ہے؟

صائم نے مایوسی میں سر ہلا دیا۔

سلمی کی اداسی اور گہری ہو گئی۔ سر ڈھلک گیا۔ بال لٹکنے لگے اور ساتھ ہی آنکھوں میں امید کی کرن ناچنے لگی۔

سلمی ایک جذباتی لڑکی تھی۔ اسے آسیہ سے بڑی محبت تھی لیکن کیا کرتی، اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے مجبور تھی۔ اس کی چہیتی سہیلی شافی کے بیاہ کو آٹھ دن باقی رہ گئے تھے۔ اس نے شافی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اس کے بیاہ پر ملتان آئے گی۔

وہ چاہتی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے، لیکن اس کے ملتان جانے میں رخنہ نہ پڑے۔ اور اگر اماں یونہی پڑی رہی تو وہ ملتان نہ جا سکے گی۔

پہلے ہی اماں کی بیماری کی وجہ سے سلمی کی ساری روٹین تباہ ہو چکی تھی۔ مثلا” فون ہی لیجئے۔ فون برآمدے میں لگا ہوا تھا جو اماں کے کمرے سے ملحق تھا۔ اماں کی وجہ سے سلمی فون کو آزادانہ طور پر استعمال نہیں کر سکتی تھی۔

پہلے تو عادی طور پر وہ ہر آنے والی کال کو بڑے شوق سے موصول کیا کرتی تھی۔ ان کالوں میں زیادہ تر رانگ نمبر ہوتے تھے۔ وہ ان رانگ نمبروں کو بڑے نخرے سے جھاڑ پلا دیا کرتی۔ یا بڑے تہذیب یافتہ انداز سے مذاق اڑا دیتی۔

خاص سہیلیوں کے علاوہ سلمی کو کسی خاص رائٹ یا رانگ نمبر سے دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن رانگ نمبر کو کاٹنے میں کتنا مزا آتا تھا۔ واٹ فن.......... اظہار لگاؤ کے جواب میں اظہار بے نیازی میں کتنی لذت ہوتی ہے۔

اماں کی بیماری کی وجہ سے وہ سہیلیوں سے بھی بات نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے تو وہ فون پر گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی۔ پتہ نہیں کیا باتیں کرتی تھی۔ پاس کھڑے شخص کے کچھ پلے نہیں پڑتا تھا۔

فون پر وہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد ایک ایک لفظ بولتی رہتی۔ “اچھا---- کیوں---- بور---- موڈ نہیں۔ وہ کیسے۔” ایسے الفاظ یا پھر خالی ہنس دیتی۔ چھوٹی ہنسی۔ لمبی ہنسی۔ مہذب ہنسی۔ جس میں ہنسی نہ ہوتی، البتہ آواز کے زیر و بم میں جاذبیت ضرور ہوتی۔

سلمی کے لئے اماں کی صحت یا بیماری اہم نہ تھے۔ اہم بات تو یہ تھی کہ اس کی روز مرہ بحال ہو جائے۔

ستارہ کو بھی اماں سے بڑا لگاؤ تھا لیکن وہ بھی مجبور تھی۔

ستارہ نے اپنی تمام تر اہمیت کا انحصار ہر امتحان میں کلاس میں فرسٹ آنے پر رکھا ہوا تھا۔ اماں کی بیماری کی وجہ سے سارے گھر پر جو بوجھ پڑا ہوا تھا، وہ اس کی پڑھائی میں مخل ہو رہا تھا۔ اسے فکر لگ گیا تھا کہ کہیں رابعہ اس کی پوزیشن نہ ہتھیا لے۔

رابعہ وہ بدصورت بھدی لڑکی تھی جو رٹا لگا لگا کر ہر امتحان میں اس کے پیچھے پیچھے چڑیل کی طرح لگی ہوئی تھی اور ہر بار سیکنڈ آتی تھی۔ کہیں وہ چڑیل میری جگہ نہ لے لے۔ ستارہ کو صرف یہی

ایک فکر لگا رہتا تھا۔ ہئے اللہ۔ اماں کی بیماری کیا مصیبت ہے۔ اس مصیبت سے کب جان چھٹے گی۔ اسے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ اماں ڈاکٹر کا علاج کیوں نہیں کراتی۔

ستارہ کی بات سچی تھی۔ عرصہ دراز سے اماں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ علاج نہیں کرائے گی۔ اسے ڈاکٹروں پر اعتماد نہیں تھا۔

"اب کیا حال ہے؟" صائم کی بیوی سکینہ ثمینہ نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔

صائم نے مایوسی میں سر ہلا دیا۔

ثمینہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ حزن و ملال سے نچڑ رہی تھی۔

ثمینہ اور آسیہ کے مابین خدا ترسی کے سوا کوئی تعلق نہ تھا۔ ثمینہ ایک مذہبی عورت تھی۔ مذہب اس کے لئے صرف خوف خدا تھا۔ وہ بے چاری خود اس گھر میں اکیلی تھی۔ وہ خود ایلیمنز میں گھری ہوئی تھی۔ وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔

اگرچہ آسیہ اور ثمینہ کے مابین ساس بہو کا رشتہ تھا لیکن وہ رشتہ ہمیشہ برائے نام رہا تھا۔ سارا قصور آسیہ کا تھا۔ اگر وہ حکم چلانا جانتی تو ساس کا مرتبہ حاصل کر لیتی۔ لیکن وہ تو ازل سے حکم بجالانا جانتی تھی۔ چوکی پر بیٹھ کر حکم چلانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے بیٹے کے گھر میں اس کی کوئی حیثیت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ کیسے ہوتی۔ خود بیٹے نے اسے قائم نہ ہونے دیا تھا۔ جب بھی اماں دل کی بات کرتی، تو صائم عقل و دانش کی قینچی سے اسے کاٹ دیتا۔ "اماں تم نہیں سمجھتیں......"

بیٹے کے گھر سے ماں کا صرف ایک تعلق تھا۔

آسیہ میں خدمت اور کام کا جذبہ اس قدر گھر کر چکا تھا کہ جس گھر میں بھی وہ جا کر ٹھہرتی۔ اس گھر کے چھوٹے چھوٹے کام شروع کر دیتی۔ ٹوٹی ہوئی چیزیں جوڑ دیتی۔ صوفوں کے کپڑے دھو کر پھر سے چڑھا دیتی۔ پردے رنگ کر نئے بنا دیتی۔ ٹوٹے ہوئے سوٹ کیس مرمت کر دیتی۔ پرانے کپڑوں کو جوڑ کر ٹی کوزیاں بناتی۔ رضائی کے ابرے تیار کرتی۔ میز پوش کے تکئے کے غلاف اور کیا کیا۔

آسیہ کی اس عادت کی وجہ سے لوگ اس کی قدر کرتے تھے۔

بیٹے کے گھر سے ماں کا بس یہی ایک تعلق تھا۔ اسی واسطے ثمینہ اسے عزیز رکھتی تھی۔

کسی نے کبھی نہ سوچا تھا کہ یہ تعلق تو نہیں۔ یہ تو مفاد ہے۔ بہرطور ثمینہ کا حزن و ملال دلی تھا کیونکہ وہ خدا ترس عورت تھی۔

"کیوں ابا۔" سمیع نے داخل ہو کر پوچھا۔ "کیا حال ہے اماں کا؟"

"ویسا ہی ہے۔" صائم نے کہا۔

"اوہ.........!" سمیع خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔

"اماں کو ضرور دوا کھانی چاہئے۔" سمیع بولا۔

"ہاں۔" صائم نے کہا۔ "لیکن اماں مانے بھی۔"

"ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اماں کے لئے کچھ نہیں کر رہے۔" سمیع نے کہا۔

"ایک فیلنگ آف گلٹ ہے۔" سمیع گویا اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

سمیع ازلی طور پر مشنری کارکن تھا۔ اس کے لئے دفتر دفتر نہ تھا بلکہ مقصد حیات تھا۔ کام اس کی زندگی کا مرکز تھا اور یہ مرکز پھیل کر سارے دائرے پر محیط ہو چکا تھا۔ باقی تمام رشتے اور تعلق، لگاؤ سمٹ کر دائرے کی لکیر پر یوں کھڑے تھے جیسے اوور لوڈڈ بس میں مسافر پائیدان پر لٹکے ہوتے ہیں۔

"اوہ۔" سمیع چونکا۔ "مجھے تو جانا ہے۔ دفتر میں فنکشن شروع ہو چکا ہو گا۔ ابو میں واپسی پر ڈاکٹر کو لے آؤں؟" اس نے یوں کہا جیسے صرف ڈاکٹر لے آنے سے اماں سے تعلق استوار ہو جائے گا۔ سینس آف گلٹ دور ہو جائے گا۔

"اماں سے پوچھ لو۔" صائم نے کہا۔

"اماں۔ اماں جی۔" سمیع نے آواز دی۔

اماں نے کوئی جواب نہ دیا۔

پھر سمیع گھوم کر اماں کے سرہانے کی طرف جا کھڑا ہوا۔ اس نے اماں کے منہ سے رضائی اتار دی۔

"اوہ............" وہ زیر لب چلایا۔ "اماں تو............ اماں تو......."

"کیا کہا۔" کئی ایک چیخیں گونجیں۔

"اماں گزر گئیں کیا؟"

"ہائے اللہ ---- اماں چلی گئیں ----!"

پڑوس والے کہتے ہیں کہ صائم کے گھر سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں۔ "نہیں۔ چیخیں نہیں۔ وہ تو بگڑے ہوئے قہقہوں کی آوازیں تھیں۔"

میں نے وہ آوازیں نہیں سنیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں جیسے صائم کی ماں مری نہیں بلکہ صائم کے گھر سے منتقل ہو کر میری ماں بن کر میرے گھر آ بیٹھی ہے۔ جیسے یہ کہانی صائم کی ماں کی نہیں بلکہ میری ماں کی ہے۔ شاید تمہاری ماں کی ہو۔ ہم سب کی ماؤں کی ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ گھر گھر بیٹھی ہے۔ اور اس کے اردگرد ایلیمنز یوں ناچ رہے ہیں جیسے وحشی قربانی کرنے سے پہلے بلی کے اردگرد ناچتے ہیں۔

# وقار محل کا سایہ

وقار محل کی چھتیں گر چکی ہیں لیکن دیواریں جوں کی توں کھڑی ہیں۔ جنہیں توڑنے کے لئے بیسیوں جوان مزدور کئی ایک سال سے کدال چلانے میں مصروف ہیں۔

وقار محل نیو کالونی کے مرکز میں واقع ہے نیو کالونی کے کسی حصے سے دیکھئے۔ کھڑکی سے سر نکالئے۔ روشن دان سے جھانکئے۔ ٹیرس سے نظر دوڑائیے۔ ہر صورت میں وقار محل سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ مضبوط، ویران، بوجھل، رعب دار، ڈراؤنا سربلند، کھوکھلا، عظیم۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری نیو کالونی آسیب زدہ ہو اور وقار محل آسیب ہو۔

نوجوان دیکھتے ہیں تو دلوں میں غصہ ابھرتا ہے۔ نیو کالونی کے چہرے کا پھوڑا۔ رستی بستی کالونی میں آثار قدیمہ۔ چہرے نفرت سے بگڑ جاتے ہیں۔ ہٹاؤ اسے۔ لیکن وہ محل سے اپنی نگاہیں ہٹا نہیں سکتے۔

بچے دیکھتے ہیں تو حیرت سے پوچھتے ہیں۔ "ڈیڈی! یہ کیسی بلڈنگ ہے؟ بھدی، بے ڈھب، موٹی موٹی دیواریں، اونچی اونچی چھتیں، تنگ تنگ کھڑکیاں اور ڈیڈی کیا لوہے کی بنی ہوئی ہے۔ اتنے سارے مزدوروں سے بھی نہیں ٹوٹ رہی۔"

بڑے بوڑھے محل کی طرف دیکھتے ہیں تو---- لیکن بڑے بوڑھے تو اس طرف دیکھتے ہی نہیں۔ انہیں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو رہتے ہی محل میں ہیں چوری چھپے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کسی پر بھید کھل نہ جائے۔

کالج کے لڑکے جو اس کھوکھلے محل کے زیر سایہ پل کر جوان ہوئے ہیں، وقار محل کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اب تو خالی دیواریں رہ گئی ہیں۔ کچھ دنوں کی بات اور ہے۔ لیکن ان کے دلوں سے آواز ابھرتی ہے اور وہ تالیاں پیٹنے لگتے ہیں۔ قہقہے لگانے لگتے ہیں تاکہ وہ آواز ان میں دب کر رہ جائے۔ بہرحال نیو کالونی کا ہر نوجوان وقار محل سے ایک پراسرار لگاؤ محسوس کرتا ہے۔ اگرچہ وہ

سمجھتا ہے کہ یہ لگاؤ نہیں لاگ ہے۔ لیکن اسے پتہ نہیں ہے کہ لاگ کا ایک روپ ہے۔ ڈھکا چھپا، شدت سے بھرا لگاؤ۔

وقار محل صدیوں سے وہاں کھڑا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب تعمیر ہوا تھا۔ جب سے لوگوں نے ہوش سنبھالا تھا، اسے وہیں کھڑے دیکھا تھا۔

پہلے تو لوگ وقار محل پر فخر کیا کرتے تھے، پھر نئی پود نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ پھر کسی منچلے نے بات اڑا دی کہ محل کی دیواروں میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ چھتیں بیٹھ رہی ہیں۔ وہ نیو کالونی کے لئے خطرہ ہے۔ اس پر کمیٹی والے آ گئے۔ انہوں نے چاروں طرف سے محل کی ناکہ بندی کر دی۔ اور جگہ جگہ بورڈ لگا دیئے۔ "خبردار------- دور رہئے۔ عمارت گرنے کا خطرہ ہے۔" پھر بیسیوں مزدور کدال پکڑے آ پہنچے اور محل چھتوں اور دیواروں کو توڑ توڑ کر گرانے لگے۔

پتہ نہیں بات کیا ہے کہ سالہا سال سے اتنے سارے لوگ کدال چلا رہے ہیں۔ اسے توڑنے میں لگے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی محل کا کچھ نہیں بگڑا۔ وہ جوں کا توں کھڑا ہے۔ پتہ نہیں وہ کس مصالحے سے بنا ہے کہ اسے منہدم کرنا آسان نہیں۔

بہرحال۔ سارا دن مزدور کدال چلاتے رہتے ہیں۔ نیو کالونی میں آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ ٹھکا ٹھک ٹھک، ٹھکا ٹھک ٹھک۔

یہ ٹھک ٹھک جفی کی رانوں میں گونجتی ہے۔ اس کی لرزش سے کوئی پوشیدہ سپرنگ کھلتا ہے۔ کوئی پر اسرار گھڑی چلنے لگتی ہے۔ اس کی ٹک ٹک دل میں پہنچتی ہے۔ دل میں لگا ہوا ایمپلی فائر اسے سارے جسم میں اچھال دیتا ہے۔ ایک بھونچال آ جاتا ہے۔ چھاتیوں سے کچا دودھ رسنے لگتا ہے۔ ہونٹ لمس کی آرزو سے بوجھل ہو کر لٹک جاتے ہیں۔ نسیں تن جاتی ہیں اور سارا جسم یوں بجنے لگتا ہے جیسے سارنگی ہو۔

اس پر جفی دیوانہ وار کھڑکی کی طرف بھاگتی ہے اور وقار محل کی طرف یوں دیکھنے لگتی ہے جیسے اس سے پوچھ رہی ہو، اب میں کیا کروں؟

والدین نے جفی کا نام یاسمین رکھا تھا۔ بچپن میں سب اسے یاسمین کہتے تھے پھر جب وہ ہائی سکول میں پہنچی تو اس نے محسوس کیا کہ یاسمین دقیانوسی نام ہے۔ اس سے پرانے نام کی بو آتی ہے۔ یہ نام ہے بھی تو سلو ٹمپو۔ ڈھیلا ڈھیلا جیسے چولیں ڈھیلی ہوں۔ لہٰذا اس نے یاسمین کی چولیں ٹھونک کر اسے جس من کر دیا۔ پھر جب وہ کالج میں پہنچی تو اسے پھر سے اپنے نام پر غصہ

آنے لگا۔ لو میں کیا پھول ہوں کہ جس من کہلاؤں۔ میں کیا آرائش کی چیز ہوں۔ میں تو ایک ماڈرن گرل ہوں اور ماڈرن گرل پھول نہیں ہوتی، آرائش نہیں ہوتی، خوشبو نہیں ہوتی۔ یہ سب تو دقیانوسی چیزیں ہیں۔ ماڈرن گرل تو ایکٹیو ہوتی ہے، سمارٹ ہوتی ہے۔ جیتی جاگتی، چلتی پھرتی۔ جس پر زندگی بیتتی نہیں بلکہ جو خود زندگی بیتتی ہے۔ لہٰذا اس نے اپنا نام جس من سے جفی کر لیا۔ جفی، فٹ، فٹافٹ فوراً"۔ یہ نام کتنا فعال تھا۔ کتنا سمارٹ۔ اس میں زندگی کی تڑپ تھی۔ پھر اس نام کے زیر اثر جلد ہی اس میں یہ خواہش ابھری کہ کچھ ہو جائے۔ ابھی ہو جائے۔ ابھی ہو جائے فوراً" تو ابتدا تھی۔ بالآخر جفی چاہنے لگی کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جو ہونے سے رہ جائے۔

لیکن اس روز جب کہ کچھ بلکہ بہت کچھ ہو گیا تھا۔ یہاں تک ہو گیا تھا جس کی اسے توقع نہ تھی۔ لیکن وہ خوشی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ الٹا وہ تو ہاتھ مل رہی تھی کہ یہ کیا ہو گیا۔ پتہ نہیں اس روز جفی کو کیا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پرنم تھیں۔ وہ حسرت آلودہ نگاہوں سے وقار محل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر وقار محل میں جا پناہ لے۔ اس روز جیسے جفی پھر سے یاسمین بن گئی تھی۔

اگرچہ شعوری طور پر جفی کو وقار محل سے سخت چڑ تھی، اور وہ اسے اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتی تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں وقار محل اس کے بنیادی جذبات پر مسلط تھا۔ ان جانے میں وہ اس کی زندگی پر یوں سایہ کئے ہوئے تھا جیسے بڑکا بوڑھا درخت کسی گلاب کی جھاڑی پر سایہ کئے ہوئے ہو۔

جفی وقار محل کے زیر سایہ پیدا ہوئی تھی۔ وہیں کھیل کھیل کر جوان ہوئی تھی۔ اس کی کوٹھی ایور گرین وقار محل کے عقب میں تھی۔ اس کی تمام کھڑکیاں محل کی طرف کھلتی تھیں۔ دونوں ٹیرسیں ادھر کو نکلی ہوئی تھیں۔ بچپن میں جب وہ یاسمین تھی تو وقار محل اس کے لئے جاذب نظر اور قابل فخر چیز تھی۔ پھر جوں جوں وہ جوان ہوتی گئی، وقار محل اسے بوسیدہ عمارت نظر آنے لگی جو نیو کالونی کے راستے کی رکاوٹ تھی۔ اس کے دل میں یہ گمان بڑھتا گیا کہ وقار محل نوجوانوں کی آزادی کچلنے کے لئے تعمیر ہوا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ گرتے ہوئے وقار محل کا سایہ اس کے دل کی گہرائیوں پر چھایا ہوا ہے اور اس کی زندگی کے ہر اہم واقعے میں وقار محل کا حصہ تھا۔

مثلاً" جب اس میں جوانی کی اولیں بیداری جاگی تھی تو گرتے ہوئے وقار محل کی ٹھک ٹھک نے ہی تو اسے جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ ابھی جس من تھی، جفی نہیں بنی تھی۔ اگرچہ اس کی باجی عفت مدت سے عفت سے اف اور پھر اف سے افعی بن چکی تھی، چونکہ اف بٹ کا امکان خارج ہو چکا تھا۔

ان دنوں باجی سارا سارا دن اپنے بیڈ پر اوندھے منہ پڑی رہتی تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔ افعی باجی تو بیڈ پر ڈھیر ہونے والی نہ تھی۔ اس کی تو بوٹی بوٹی تھرکتی تھی۔ ابھی یہاں کھڑی ہے۔ ابھی باغیچے میں جا پہنچی۔ لو وہ ٹیرس پر ٹہل رہی ہے۔ ہائیں وہ تو چلی بھی گئی۔ کسی گٹ ٹو گیدر میں۔ کسی فنکشن میں۔ کسی پارٹی میں۔ ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا افعی باجی کا شیوہ نہ تھا۔ پھر پتہ نہیں، ان دنوں اسے کیا ہو گیا تھا کہ پلنگ پر گٹھڑی بن کر پڑی رہتی تھی۔ جس من سمجھتی تھی کہ افعی باجی میں واسکوڈے گاما کی روح ہے۔ اسے خبر نہ تھی کہ واسکوڈی گاما نے امریکہ دریافت کر لی ہے اور اب تھک ہار کر پڑ گئی ہے۔

ان دنون ممی بار بار افعی کے بیڈ کے دروازے سے چھپ چھپ کر جھانکتی اور حیرت سے باجی کی طرف دیکھتی رہتی۔ وہ باجی سے پوچھ نہیں سکتی تھی۔ پوچھنا الگ رہا، ممی تو باجی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ کیسے کرتی بات، بات کرتی تو باجی تنک کر کہتی۔ "ممی ڈارلنگ۔ آپ نہیں سمجھتیں۔ آپ نہ بولیں۔" واقعی ممی نہیں سمجھتی تھی۔ کیسے سمجھتی وہ تو بے چاری سیدھی سادی امی تھی۔ جسے حالات نے زبردستی ممی بنا دیا تھا۔

جب فاطمہ بیگم کی شادی محمد عثمان سے ہوئی تھی تو وہ اسٹنٹ تھے، پھر حالات نے سرعت سے پلٹا کھایا اور وہ مینجر ہو گئے اور اب جنرل مینجر تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ محمد عثمان سے ایم اوثمان ہو گئے تھے۔ لیکن فاطمہ بیگم ہی رہی تھی۔ وہ فاطمہ زیادہ تھی اور بیگم کم کم۔ تعلیم سرسری تھی۔ سوشل سٹیٹس کی بھاری بھرکم گٹھڑی سر پر آ پڑی۔ پھر بھی جوں توں کر کے اس نے رہن سہن میں تبدیلی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا تھا۔ لیکن وہ اپنی شخصیت کو بیگم کا رنگ نہ دے سکی تھی۔

اس پر ایم اوثمان اگر بیگم سے مایوس ہو گئے تھے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ پھر جو انہوں نے گھر سے ناطہ توڑ لیا اور کلب میں وقت بسر کرنے لگے تو یہ ایک قدرتی امر تھا۔ اس کے علاوہ کلب میں بہت سی بیگمات آتی تھیں۔ جن پر چوکھا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس کے بعد فاطمہ بیگم گھر میں یوں کونے سے لگ گئی جیسے نیو کالونی کا رابنس کروسو ہو۔ پھر لڑکیاں جوان ہوئیں تو انہوں نے اسے بالکل ہی بے زبان کر دیا۔

لڑکیوں نے زبردستی اسے ممی بنا لیا۔ ممی کے لفظ سے فاطمہ کو بڑی چڑ تھی۔ کتنا ننگا لفظ

تھا۔ اس لفظ سے ننگے پنڈے کی بھڑاس آتی تھی لیکن وہ احتجاج نہیں کر سکتی تھی۔ جب اپنی جائیاں بار بار کہیں۔ ”ممی ڈارلنگ۔ آپ کو پتہ نہیں۔ آپ نہ بولیں۔ پلیز۔“ تو ماں کی زبان پر مہر نہ لگے تو کیا ہو۔ پہلے تو فاطمہ کو شک پڑنے لگا کہ شاید واقعی اسے پتہ نہیں۔ پھر اسے یقین آ گیا کہ اسے پتہ نہیں۔ وہ جانتی۔ کبھی کبھار اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ جانے سمجھے۔ بولے یا نہ بولے پر کم از کم جان تو لے۔

ان دنوں اسی خواہش کے زیر اثر فاطمہ افعی کے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر کھڑی رہتی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے افعی اوندھے منہ بستر پر پڑی رہے۔ یوں پڑی رہے جیسے مصالحے کے بنے ہوئے منے کے اعضاء کو جوڑنے والا دھاگا ٹوٹ گیا ہو۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ شاید فاطمہ کو بات سمجھ میں آ گئی۔ وہ دیوانہ وار بھاگی۔ غیر از معمول وہ سیدھی افعی کے ڈیڈی کے پاس پہنچی۔ پھر غیر از معمول میاں بیوی آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے۔ ان سرگوشیوں کے دوران میں میاں اہم اہم کرتے سنے گئے۔ اتنا اہم اہم کرنا تو انہوں نے مدت سے چھوڑ رکھا تھا۔ ان کے اہم اہم کرنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے گھر میں پھر سے محمد عثمان آ گیا ہو۔

کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ محمد عثمان باہر نکلے۔ ان کے سر پر ٹوپی تھی اور ہاتھ میں چھڑی۔ پیچھے پیچھے فاطمہ تھی۔ وہ بڑے وقار سے قدم اٹھاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ افعی کے بیڈ روم میں داخل ہو کر انہوں نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

جس من یہ سب تفصیلات کانی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ڈیڈی اور اہم اہم کر کے بات کریں۔ پھر انہوں نے ٹوپی کیوں پہن رکھی تھی اور ان کے ہاتھ میں چھڑی کیوں تھی۔

پھر باجی کے کمرے سے محمد عثمان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان کی آواز میں بڑا تحکم تھا یا شاید منت تھی، یا شاید دونوں ملے جلے تھے۔ منت بھرا تحکم یا تحکم بھری منت۔

پھر باجی کی غصے بھری آواز سارے گھر میں گونجی۔ ”بچہ میرا ہے۔ میں اسے اپناؤں گی۔ دیکھوں گی مجھے کون روکتا ہے۔“

جس من سوچنے لگی۔ ”یااللہ باجی کس بچے کی بات کر رہی ہے۔ کمرے میں تو صرف باجی، ممی اور ڈیڈی تھے۔ بچہ کہاں تھا۔“

پھر اوپر کوئی کسی کو زدو کوب کر رہا تھا۔ چھڑی چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ساتھ ہی باجی چیخ رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ کراہ رہی تھی۔

ہئے بچاری باجی۔ جس من کے دل میں ڈیڈی کے خلاف غصہ کھولنے لگا۔

پھر پٹاخ سے دروازہ کھلا اور ڈیڈی اور امی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ لیکن وہ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں تھے------ افوہ---- ڈیڈی کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ ارے ڈیڈی نے ٹک سے پیٹا تو باجی کو تھا پھر ڈیڈی کا اپنا چہرہ کیوں سوجا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سے خون کیوں رس رہا لا اور وہ اس قدر کھوئے ہوئے کیوں تھے کہ کمرے میں داخل ہونے کی بجائے سیدھے کوٹھی سے باہر نکل گئے تھے۔ جس من ان کے پیچھے پیچھے گئی تھی۔

دھڑا دڑا ڑام............

ایک زبردست دھماکہ ہوا۔

چاروں طرف سے شور اٹھا۔

”وقار محل کی چھت گر گئی۔ وقار محل کی چھت گر گئی۔“

گرد و غبار کا ایک بادل اٹھا اور اس نے نیو کالونی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اسی شام کو باجی ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

ہاں جس من کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔

اس حادثہ کے بعد وہ روز کھڑکی میں کھڑی ہو کر سوچتی رہی کہ باجی گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی۔ اور اس روز وہ کس بچے کی بات کر رہی تھی۔ اور ڈیڈی کا منہ لہولہان کیوں تھا اور وقار محل کی چھت کیوں گری تھی۔ وہ وقار محل کی طرف دیکھتی رہتی اور سوچتی رہتی۔ دیکھتی اور سوچتی رہتی۔ غالباً“ وہ محسوس کرتی تھی کہ وقار محل اس راز سے واقف تھا۔

پھر ایک روز جب وہ کھڑکی میں کھڑی تھی تو کسی نے چلا کر کہا۔ ”ہائی۔“ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

اگلے دن پھر ”ہائی“ کی آواز آئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ پھر چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔

تیسرے دن وہ ہائی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ دو چھوٹی چھوٹی مونچھیں نیچے کو لٹک رہی تھیں جس میں سے چٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔ اوپر دو چندھیائی سی آنکھوں میں سے گلیڈ آئی چاند ماری کر رہی تھی۔ اور اس کے اوپر بال ہی بال۔ بال ہی بال۔

پہلی مرتبہ ہائی کو دیکھ کر وہ سخت گھبرا گئی۔ اس کا جی چاہا کہ شرما کر منہ موڑ لے۔ جس طرح وہ ماہ رو شرما کر منہ موڑ لیا کرتی تھی۔

ماہ رو گوری چٹی پٹھانی تھی جو اپنے باپ کے ساتھ وقار محل سے ملحقہ آؤٹ ہاؤس میں

رہتی تھی۔ اس کا باپ وقار محل کا چوکیدار تھا اور اب محل کے ملبے کی روٹی ہانڈی کیا کرتا تھا۔ ماں مرچکی تھی۔ صرف ایک چھوٹا بھائی تھا۔ سارادن ماہ رو اتنی گوری تھی۔ اتنی گوری تھی کہ ہر راہرو اسے دیکھ کر رک جاتا۔ جب وہ محسوس کرتی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو اس کا سارا چہرہ اس قدر گلابی ہو جاتا۔ جیسے کسی نے رنگ کی پچکاری چلا دی ہو۔ پتہ نہیں، حیا اس قدر گلابی کیوں ہوتی ہے۔ جس من نے کئی مرتبہ ماہ رو کو شرماتے دیکھا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی حیا کے غازے کو اپنا لے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ ماہ رو کی طرح گنوار نہ تھی۔ اور ماڈرن گرل کو یہ زیب نہیں دیتا کہ شرما کر منہ موڑ لے۔ الٹا اسے تو ہائی کے جواب میں ہائی کہنا چاہئے۔

جب پہلی مرتبہ ہائی جس من کے سامنے آئی تو اس نے بڑی جرات سے کام لیا اور شرما کر منہ ملوڑا۔ لیکن اس میں اتنی جرات پیدا نہ ہو سکی کہ جواب میں ہائی کہتی۔

دراصل جس من بڑی مخلص، سچی اور شرمیلی لڑکی تھی۔ جس طرح ساری ماڈرن گرلز ہوتی ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس کے دل میں کئی ایک خوش فہمیاں رچی بسی ہوئی تھیں۔ جس طرح ماڈرن گرلز کے دلوں میں خوش فہمی رچی بسی ہوتی ہیں۔ مثلاً” اسے کچھ پتہ نہ تھا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ اسے سب پتہ ہے۔ چونکہ ماڈرن گرل کو سب پتہ ہونا چاہئے۔ چاہنے اور ہے میں جو فرق ہے اسے اس کا احساس نہ تھا۔ شعور نہ تھا۔

اس کا دل بہت سے بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا۔ مگر وہ سمجھتی تھی کہ وہ آزاد ہے۔ چونکہ ماڈرن گرل پر لازم ہے کہ وہ آزاد ہو۔ عضوں سے آزاد۔ لگاؤ سے آزاد۔ رسمی قید و بند سے آزاد۔

اگرچہ ذہنی طور پر اسے رجعت پسندوں کے خلاف زبردست چڑ تھی جیسے کہ ماڈرن گرل کو ہونی چاہئے لیکن دلی طور پر اسے اپنے ماں باپ سے لگاؤ تھا۔ اگرچہ اسے اس کا شعور نہ تھا۔ شعور کیسے ہوتا۔ جب بھی ایسی صورت حال پیدا ہوتی کہ شعور ہونے کا خطرہ لاحق ہو تو وہ اپنی توجہ کسی دوسری بات پر مبذول کر دیتی۔ چونکہ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسے یہ شبہ نہ پڑ جائے کہ اس کے برتاؤ کی کوئی تفصیل ایسی بھی ہے جو ماڈرن گرل کے شایان شان نہیں۔

ان دنوں اسے یہی فکر دامن گیر تھا کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کرے جو ماڈرن گرل کی شان کے منافی ہو۔ اس ہائی نے اسے خاصا درہم برہم کر دیا تھا۔ لیکن وہ یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ وہ درہم برہم ہے۔ اتنی چھوٹی سی بات ماڈرن گرل کو بھلا کیسے درہم برہم کر سکتی ہے۔ لہٰذا وہ درہم برہم نہیں تھی، بالکل نہیں تھی۔

پہلی مرتبہ تو اس ہائی نے وقار محل سے سر نکالا تھا۔ پھر وہ جگہ جگہ سے سر نکالنے لگی۔ جب وہ کالج بس میں سوار ہوتی تو وہ بس سٹینڈ سے سر نکالتی۔ جب جس من کالج کی گراؤنڈ میں ٹہل لگاتی تو وہ پردہ دیوار سے جھانکتی۔ جب وہ مارکیٹ جاتی تو وہ اس کا پیچھا کرتی۔

ہاں صورت حال بہت ہی خراب ہوئی جا رہی تھی۔ پھر اس کے اپنے جسم نے بغاوت کر دی۔

ان دنوں وقار محل میں مزدوروں نے دیواریں توڑنے کا کام شروع کر رکھا تھا۔ ان کی ٹھک ٹھک ساری نیو کالونی میں گونجتی رہتی تھی۔

ایک دن جب جس من کی طبیعت ناساز تھی اور وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی اس ہائی کے متعلق سوچ رہی تھی تو دفعتاً” وہ حادثہ عمل میں آگیا۔

ساری شرارت مزدوروں کی اس ٹھک ٹھک کی تھی۔ روز تو وہ ٹھک ٹھک جس من کے کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجتی تھی، اس روز نہ جانے کیا ہوا۔ وہ ٹھک ٹھک سیدھی جس من کی رانوں سے آ ٹکرائی۔ اور اس کے جسم میں گونجنے لگی۔

جس من کے جسم میں ایک عجیب سی لرزش جاگی۔ کسی پوشیدہ سپرنگ میں حرکت ہوئی۔ ایک تناؤ سا اٹھا اس نے دل پر دباؤ ڈالا۔ دل کے ایمپلی فائر نے اسے اچھالا۔ سارے جسم میں ایک بھونچال سا آگیا۔ نسیں تن گئیں۔ چھاتیوں سے کچا دودھ رسنے لگا۔ ہونٹ لمس کی آرزو سے بے حال ہو کر لٹک گئے۔ سارا جسم سارنگی کی طرح بجنے لگا۔

اس لمحے میں اسے سب پتہ چل گیا۔ سب کچھ کہ باجی گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی کہ وہ کس بچے کی بات کر رہی تھی کہ بچہ کہاں تھا۔ سب کچھ۔ اس روز وہ جس من سے جنی بن گئی تھی۔ اس کے دل میں شدت سے آرزو پیدا ہوئی۔ ابھی اسی وقت۔ فٹافٹ۔ جلدی کچھ ہو جائے اور واقعی کچھ ہو گیا۔

اسی رات جنی کے بیڈ روم کا وہ دروازہ آہستہ سے کھلا جو کوٹھی کے احاطے میں کھلتا تھا اور زیر لبی آواز آئی.......... “ہائی۔”

جنی تڑپ کر مڑی۔

دو لٹکتی ہوئی مونچھوں میں چٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔

اگلے روز گینی لٹکتی ہوئی مونچھوں میں جٹے سفید دانت نکالے۔ چندھیائی ہوئی مگر چڑھ جانے والی سرخ چیونٹیوں جیسی آنکھیں لئے سر پر کالے بالوں کا ٹوکرا اٹھائے صدر دروازے کے راستے سے ایور گرین میں آ داخل ہوا۔

جب گینی پیدا ہوا تو وہ لڑکا تھا۔ اس کی پیدائش پر ماں باپ نے بڑی خوشیاں منائی تھیں۔

انہوں نے اس کا نام غنی رکھا تھا۔ لیکن جب وہ نوجوانی اور دور جدید میں داخل ہوا تو بہت سے تبدیلیاں عمل میں آ گئیں۔ بال بڑھ کر ٹوکرا بن گئے۔ مونچھیں لٹک گئیں۔ منہ پر پاؤڈر سرخی کی تہہ چڑھ گئی۔ رنگ دار قمیض، چمکیلی صدریاں، منکوں کی مالائیں اور جانے کیا کیا۔ یوں وہ غنی سے گینی بن گیا تھا۔

ایور گرین میں گینی کی آمد سے کوئی ہلچل پیدا نہ ہوئی۔ پہلے ہی اس سلسلے میں افعی نے بڑی کارکردگی دکھائی تھی۔ اس کے بوائے فرینڈز ایور گرین میں اکثر آیا کرتے تھے اور وہ بڑے شوق سے ان کا ڈیڈی سے تعارف کراتی تھی۔ ممی سے نہیں چونکہ ممی ڈارلنگ تو سمجھتی نہیں تھی۔ اور اسے سمجھانا بہت مشکل تھا۔

فاطمہ نے گینی کو دیکھا تو سینہ تھام کر رہ گئی۔ افعی کے متعلقہ پرانے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ اس کے دل میں از سر نو خدشات نے سر اٹھایا۔ لیکن وہ بولی نہیں۔ کیسے بولتی۔ رہے ڈیڈی۔ ڈیڈی کی سب سے مشکل یہ تھی کہ وہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ انہیں ایم اوتھان بن کر جینا ہے یا محمد عثمان بن کر۔

ان کی تعلیم، سٹیٹس اور پوزیشن اس بات کے مقتضی تھے کہ وہ ایم اوتھان بن کر زندگی گزاریں۔ اسی وجہ سے خاصی محنت کر کے وہ ایم اوتھان بنے تھے لیکن کئی بار بیٹھے بٹھائے محمد عثمان ان کے دل میں یوں گھس آتا جیسے ہاتھی چینی کی دکان میں آ گھسا ہو۔

محمد عثمان بڑا ضدی تھا۔ غصیل تھا۔ منہ پھٹ تھا۔ کٹڑ تھا۔ ایم اوتھان اسے سمجھاتے۔ دلیلیں دیتے۔ بھئی زمانہ دیکھو۔ زمانے کا رنگ دیکھو۔ آج کے تقاضوں پر غور کرو۔ اب یہ پرانی باتیں نہیں چلیں گی لیکن محمد عثمان اپنی بات پر اڑا رہتا۔ اس لحاظ سے ایم اوتھان بھی گویا ماڈرن گرل تھے۔ ان کی شخصیت کی اوپر لی سطح پر ایم اوتھان کی جھال تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں محمد عثمان براجمان تھا۔

جب گینی کا تعارف ایم اوتھان سے کرایا گیا تو محمد عثمان نے ان کے کان میں کہا۔ ”دھیان کرنا۔ کہیں پھر سے تمہیں سر پر ٹوپی رکھ، ہاتھ میں چھڑی پکڑ بیٹی کے کمرے میں جانا نہ پڑے۔“

ایم اوتھان کو اس بات پر غصہ آیا۔ ”ہٹ جاؤ۔“ اس نے چلا کر کہا۔ ”میرا دل پراگندہ نہ کرو۔“

پھر وہ گینی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آیا کرو۔ مسٹر گینی جب بھی فرصت ملے۔ آ جایا کرو۔“

گینی ایور گرین میں کبھی صدر دروازے سے داخل نہ ہوتا۔ اس کے لئے تو صرف عقبی دروازہ ہی موزوں تھا۔ لیکن جفی کو یہ گوارا نہیں تھا۔ وہ ایک ماڈرن گرل تھی اور ماڈرن گرل ”سلائی“ تعلق رکھنے سے نفرت کرتی ہے۔ اس سے اس کی آزاد طبیعت پر حرف آتا ہے۔ اس کی انا مجروح ہوتی ہے۔ ڈھکے چھپے تعلق تو وہ پیدا کرتی ہیں جن پر بندشیں عائد کی جاتیں ہیں۔ جو پابندیوں میں جیتی ہیں۔ جفی کو اپنا جیون ساتھی بھی تو تلاش کرنا تھا۔ جفی کو اس بات کا علم نہ تھا کہ گینی نے جیون ساتھی بننے یا تلاش کرنے کے متعلق نہیں سوچا۔

گینی تو گڈ ٹائم اور اڈونچر کا متلاشی تھیا۔ جب وہ جفی کے مجبور کرنے پر ایور گرین کے صدر دروازے سے داخل ہوا تو ایڈونچر کا عنصر ہی ختم ہو گیا۔ ایڈونچر تو ہمیشہ عقبی دروازے سے متعلق ہوتا ہے۔ باقی رہا گڈ ٹائم۔ تو آپ جانتے ہیں۔ گڈ ٹائم میں تنوع کا ہونا ضروری ہے۔ ایک ہی سر دبائے رکھنے سے نغمہ نہیں بنتا۔

اس لئے جوں جوں دن گزرتے گئے۔ ٹائم میں گڈ کا عنصر بتدریج کم ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ صرف ٹائم ہی ٹائم رہ گیا اور اس خالی خولی ٹائم سے اکتا کر گینی ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا۔

گینی کی روپوشی پر جفی ساری کی ساری الٹ پلٹ ہو کر رہ گئی۔ چونکہ وہ گڈ ٹائم کی قائل نہ تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔ اسے پتہ نہ تھا کہ ان حالات میں ماڈرن گرل کو کیا کرنا چاہئے۔ لہٰذا وہ بکی بکی اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔

پھر وقار محل کی ٹھکا ٹھک نے اسے گھر لیا۔ وہ ٹھک ٹھک اس کے جسم میں دھنس گئی۔ اندر جا کر تالیاں بجانے لگی۔ اسے اکسانے لگی۔ اٹھو۔ کچھ کرو۔ اٹھو کچھ کرو۔ اٹھو کرو۔ ٹھک ٹھک۔ اٹھو کرو۔ ٹھک ٹھک۔

ماڈرن گرل ہونے کے باوجود جفی کو جسم کے تقاضوں کے متعلق کچھ پتہ نہ تھا۔ جب وہ گینی سے ملا کرتی تھی تو اسے یہ احساس نہ تھا کہ جسم کا تقاضا پورا کر رہی ہے۔ اس نے تو ان جانے میں گینی کو جیون ساتھی بنا لیا تھا۔ اسے گینی سے محبت ہو چکی تھی۔

جب گینی چلا گیا تو بات ہی ختم ہو گئی۔ پھر محل کی کھٹ کھٹ اس کی رانوں میں کیوں گونجتی تھی۔ گھڑی کیوں چلتی تھی۔ جبھی تو وہ پریشان تھی۔ کئی ایک دن وہ پریشان رہی۔

پھر ان کے گھر میں حسنی آ گیا اور مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔

حسنی ان کا نیا بوائے سرونٹ تھا۔ چھٹپنے ہی سے وہ کوٹھیوں میں کام کرتا رہا تھا۔ وہیں جوان ہوا تھا۔ ماڈرن بیگمان کے اندر دیکھ دیکھ کر وہ وقت سے پہلے جوان ہو گیا تھا۔ حسنی خاصا اپ ٹو ڈیٹ تھا۔ کلین شیو۔ سمارٹ لک۔ لمبے بال۔

جفی نے حسنی کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

نوکر تو گھر میں آتے جاتے ہی رہتے تھے۔ کبھی خانساماں چلا گیا۔ کبھی بوائے سرونٹ آ گیا۔ گینی کی روپوشی کے بعد ان دنوں جفی کی طبیعت ناساز رہتی تھی۔ اس روز اس نے چائے اپنے کمرے میں منگوالی۔

حسنی پیالی بنا کر کمرے میں لے گیا۔ جب وہ جفی کو پیالی دینے کے لئے جھکا تو اتفاقاً" جفی نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ حسنی کے کلین چہرے پر دو مونچھیں ابھر آئیں۔ وہ لٹکنے لگیں۔ گھبراہٹ میں جفی کے منہ سے نہ جانے کیا نکلا۔ حسنی اسے سمجھ نہ سکا۔ "جی؟" جفی کو ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے "ہائی" کہا ہو۔ اس کا سر سرہانے پر گر پڑا۔ حسنی کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی۔ لیکن چائے تو بستر پر گری تھی۔ جفی کیوں شرابور ہو گئی تھی۔

پھر یہ مشکل روز کی مشکل بن گئی۔

جب بھی حسنی جفی کے کمرے کا دروازہ کھول کر آہستہ سے کہتا۔ "جی" تو اسے محسوس ہوتا جیسے کسی نے "ہائی" کہا ہو۔ وہ چونک کر مڑ کر دیکھتی۔ اس وقت حسنی کے کلین شیو چہرے پر مونچھیں لٹک جاتیں اور چٹے سفید دانت چمکتے۔ صورت حال یہاں تک آ پہنچی کہ جفی حسنی سے ڈرنے لگی۔

اول تو جفی اپنے آپ سے بھی تسلیم نہیں کرتی تھی کہ وہ حسنی سے ڈرتی ہے۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ خود سے ڈر رہی ہے۔ حسنی کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ ڈرتی ہے۔ حسنی کوٹھیوں میں کام کرتے کرتے جوان ہوا تھا۔ وہ ماڈرن گرل سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ انہیں سمجھتا نہیں تھا لیکن جانتا تھا اور سمجھے بغیر جاننا۔ جانے بغیر سمجھنے سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ بہر حال حسنی کو پتہ تھا کہ جب مس صاحبہ ڈرنے لگے تو وہ صرف سٹیٹس کا ڈر ہوتا ہے۔ اور سٹیٹس کا ڈر ایسی بیل ہوتی ہے جس کی جڑ نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ انتظار کرتا رہا۔ حسنی بار بار بہانے بہانے جفی کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولتا اور پھر مدھم مگر پرلے آواز میں کہتا "جی۔۔۔۔ آپ نے بلایا مس صاحبہ"

ایک روز جب جفی آئینے کے سامنے کھڑی تھی تو حسنی نے وہی حرکت دہرائی۔ جفی گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ اس کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ گری۔ دو مضبوط بانہوں نے اسے سنبھال لیا۔ جفی نے اوپر کی طرف دیکھا۔ دو لٹکی ہوئی مونچھیں میں چٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔ جفی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس ڈر کے مارے کہ کہیں مونچھیں اڑ نہ جائیں۔ نیچے سے کلین شیو چہرہ نہ نکل آئے۔ پھر۔۔۔۔۔ پھر اسے یاد نہیں۔

ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک۔۔۔۔۔ وقار محل کی دیواریں ٹوٹ رہی تھیں۔ سنہرا گرد و غبار اڑ رہا تھا۔

اگرچہ جفی نے اپنی عزت کا تحفظ کرنے کے لئے کلین شیو چہرے پر مونچھیں لگالی تھیں۔ اور یوں اپنے ذہن کو مطمئن کر لیا تھا لیکن جسم کو کیسے سمجھاتی۔ جسم تو ایک بے سمجھ کہہ دینے والا دہقان ہے۔ وہ ذہن کی سیاست دانیوں کو نہیں سمجھتا۔ جھوٹے رکھ رکھاؤ کی ہیرا پھیریوں کو نہیں جانتا۔ عذاب اور ثواب کے فلسفے کو نہیں مانتا۔ وہ قدیم اور جدید کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتا۔ جسم غلیظ سہی لیکن مکار نہیں۔ وہ صاف بات کرتا ہے۔ دو ٹوک بات۔ سیدھی بات۔

جسم نے جفی کے کان میں بات کہہ دی کہ تھرل صرف گینی سے وابستہ نہیں۔ مونچھیں لگانے کی تکلف کے بغیر بھی تھرل حاصل ہو سکتی ہے۔ جسم کی یہ زیر لبی جفی کو بہت ناگوار گزری۔

اگلی صبح جب دھندلکا دور ہوا اور اسٹیٹس کی دنیا پھر سے آباد ہوئی تو جفی کی انا کو بڑا صدمہ ہوا۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ یہ کیسے ہو گیا۔ ایک معمولی نوکر۔

سارا دن وہ اپنی نظر میں گرتی رہی۔ گرتی ہی چلی گئی۔ سارا دن وہ کوشش کرتی رہی کہ اپنے آپ کو سنبھالے۔ لیکن اس روز گویا یاسمین اس کے دل میں آ گھسی تھی۔ جفی اور یاسمین بر سر تکرار تھیں۔

جفی بار بار کہتی۔ "چلو ہو گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ اتنی چھوٹی سے بات پلے نہ باندھو۔"

یاسمین کہتی۔ "اونہوں۔ بات پلے باندھی نہیں جاتی' وہ تو بن پوچھے' بن سوچے سمجھے آپ ہی آپ پلے بندھ جاتی ہے۔"

جفی کہتی۔ "دل میلا نہ کرو۔ تم تو ایک ماڈرن گرل ہو۔ جنس تو ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اسے روگ نہ بناؤ۔"

یاسمین کہتی۔ "تم ماڈرن گرل نہیں ہو۔ کوئی بھی ماڈرن گرل نہیں ہے۔ سبھی ماڈرن گرل بننا چاہتی ہیں۔ چاہنے اور ہونے میں بڑا فرق ہے۔"

اس روز سارا دن جفی اور یاسمین میں کشمکش ہوتی رہی۔ سارا دن اس کے دل کی ہنڈیا میں جفی اور یاسمین کی کھچڑی پکتی رہی۔

جفی اور یاسمین کے جھگڑے کو سن سن کر اس کے کان پک گئے۔ وہ محسوس کرتی تھی جیسے وہ ان دونوں سے الگ تھلگ ہو۔

دفعتاً" اس کے ذہن میں خیال ابھرا۔ پھر میں کون ہوں؟ کیا میں یاسمین ہوں؟ نہیں میں

یاسمین نہیں۔ کیا میں جفی ہوں؟ نہیں میں جفی بھی نہیں۔ تو پھر میں کون ہوں؟

صرف میں ہی نہیں ڈیڈی بھی تو ہیں۔ کیا ڈیڈی محمد عثمان نہیں۔ کیا وہ ایم اوثمان ہیں؟ نہیں تو پھر ڈیڈی کون ہیں؟

اس گھر میں صرف ایک فرد ممی تھیں جو فاطمہ بیگم تھیں۔ خالی فاطمہ بیگم جنہیں سب ممی کہتے تھے۔ نہ جانے کب سے کہہ رہے تھے۔ جنہیں برسوں سے ممی بنانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ لیکن وہ امی تھیں اور امی ہی رہی تھیں۔ گھر میں صرف وہی تھیں جنہیں علم تھا کہ وہ کون ہیں۔

میں کون ہوں۔ یہ ایک ٹیڑھا سوال تھا۔ پندرہ برس تک وہ سمجھتی رہی تھی کہ وہ یاسمین ہے۔ دو سال تک وہ سمجھتی رہی تھی کہ جس من ہے اور گزشتہ چار سال سے وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ جفی ہے لیکن آج وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ میں کون ہوں۔ آج اس کے دل میں جفی اور یاسمین کی کھچڑی پک رہی تھی۔

کیا میں جفی اور یاسمین کی کھچڑی ہوں۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں کھچڑی نہیں ہوں۔ میں کبھی کھچڑی نہیں بنوں گی۔ میری ایک شخصیت ہے۔ میرا ایک سلف ہے۔ میں یاسمین بن سکتی ہوں۔ جفی بن سکتی ہوں لیکن کھچڑی نہیں۔ کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔

اس کے سامنے افعی آ کھڑی ہوئی۔ میں افعی ہوں۔ وہ سینہ ابھار کر بولی۔ خالص افعی۔ نہیں یہ جھوٹ بولتی ہے۔ یاسمین نے کہا۔ اگر یہ افعی ہوتی تو کبھی گھر چھوڑ کر نہ جاتی۔

اس چخ چخ سے گھبرا کر جفی اٹھ بیٹھی اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ سامنے وقار محل کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ حسرت آلودہ تھی۔

جفی نے محسوس کیا جیسے محل سب کچھ جانتا ہو۔ ٹھک ٹھک کھچ۔ ڑی ٹھک ٹھک۔ کھچ ڑی محل کی دیوایں چلا رہی تھیں۔

"نہیں نہیں۔" یاسمین بول۔ "بھولنا کافی نہیں۔ تمہیں اس داغ کو اپنے دامن سے دھونا ہو گا۔"

ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک------ ٹوٹتے ہوئے محل کی آوازیں جفی کے کمرے میں گونج رہی تھیں۔ ٹک ٹک ٹک ٹک--- ایک لرزش اس کے اندر رینگ رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔" جفی گھبرا کر بولی۔ "تم ایک ماڈرن گرل ہو۔ "نہیں نہیں۔" یاسمین چلائی۔ "تم وقار محل کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہو۔"

ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک----- ٹوٹتا ہوا محل کراہ رہا تھا۔ دفعتاً" اس کا منہ سرخ ہو گیا۔

"جنی----!" اس نے یوں آواز دی جیسے ڈوبتی ہوئی کشتی میں سے کوئی مدد کے لئے چلا رہا ہو۔

"جنی----!"

جفی اور یاسمین دونوں ششدر رہ گئیں۔ "یہ آواز کس نے دی؟ کس نے؟"

"جنی----!" وہ پھر چلائی۔

وہ آواز منہ سے نہیں بلکہ جسم سے نکل رہی تھی۔

# سمے کا بندھن

آپی کہا کرتی تھی: "سنہرے سمے کی بات ہوتی ہے۔ ہر سمے کا اپنا رنگ ہوتا ہے، اپنا اثر ہوتا ہے۔ اپنا سمے پہچان۔ سنہرے اپنے سمے سے باہر نہ نکل۔ جو نکلی تو بھٹک جائے گی۔"

اب سمجھ میں آئی آپی کی بات۔ جب سمجھ لیتی تو رستے سے نہ بھٹکتی۔ آلنے سے نہ گرتی۔ سمجھ تو گئی پر کتنی قیمت دینی پڑی سمجھنے کی۔ آپ مجھے سنہرے کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ کہتی تھی "تیرے پنڈے کی جھال سنہری ہے۔ جب رس آئے گا تو سونا بن جائے گی۔ کٹھالی میں پڑے رہنا۔ پھر یہ جھال کپڑوں سے نکل نکل کر جھانکے گی۔"

پتا نہیں میرا نام کیا تھا۔ پتا نہیں میں کس کی تھی۔ کہاں سے آئی تھی۔ کوئی لایا تھا۔ بال پن ہی میں آپی کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ اسی کو گود میں پلی۔ اسی کی سرتال بھری بیٹھک کے جھولنے میں جھول جھول کر جوان ہوئی۔ پھر سنہرا اللہ اللہ آیا چھپائے نہ چھپتا۔ آپی بولی "نہ دسے۔ چھپانہ۔ جو چھپائے نہ چھپے اسے کیا چھپانا۔"

کبھی کھڑکی سے جھانکتی تو آپی ٹوکتی "یہ کیا کر رہی ہے بیٹی؟ سیانے کہتے ہیں جس کا کام اسی کو ساجھے۔ تیرا کام دیکھنا ہے۔ تو نظر نہ بن، منظر بن اور جو دیکھے بھی تو، تو دکھنے کا گھونگھٹ نکال کر اس کی اوٹ سے دیکھ۔ پھر سے دیکھ۔ سنہرے ابھی تو شام ہے۔ یہ سمے تو اداسی کا سمے ہے۔ دکھ کا سمے ہے۔ شام بھئی گھنشام نہ آئے۔" آپی گنگنانے لگی۔ "یاد ہے نا یہ بول؟ شام تو نہ آنے کا سمے ہے۔ تیرا آنے کا سمے ہے۔ پگلی ذرا رک جا۔ اندھیرا گاڑھا ہونے دے۔ پھر تیرا ہی سمے ہو گا پچھلے پہر تک۔"

ایک دن آپی کا جی اچھا نہ تھا۔ مجھے بلایا۔ گئی۔ لیٹی ہوئی تھی۔ سرہانے تپائی پر سوڈے کی بوتل دھری تھی۔ ساتھ نمک دانی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سوڈے کی بوتل کے گلے میں شیشے کا گولا پھنسا ہوتا تھا۔ ٹھا کر کے کھلتا تھا۔

بولی۔ "سنہرے۔ بوتل کھول۔ گلاس میں ڈال چٹکی بھر نمک گھول کر مجھے پلا دے۔" میں نے نمک ڈالا تو جھاگ اٹھا۔ بلبلے ہی بلبلے۔ آپی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی "دیکھ لڑکی۔ یہ ہمارا سمے ہے۔ ہمارا سمے وہ ہے جب جھاگ اٹھے۔ ہم میں نہیں، دوجے میں اٹھے۔ دوجے میں جھاگ اٹھانا، یہی ہمارا کام ہے۔ خود شانت، دوجا بلبلے ہی بلبلے۔ جب تک جھاگ اٹھتا رہے، ہمارا سمے۔ جب کہ دوجا شانت ہو جائے، لے۔ ہمارا سمے بیت گیا اور جب سمے بیت جائے تو دھیرج پاؤں ٹھمک نہ کرنا۔ ٹھمک کا سمے گیا۔ چمک نہ مارنا۔ چمک کا سمے گیا۔ پائل نہ جھنکارنا۔ پائل جھنکار بیرن بھئی۔"

پھر وہ لیٹ گئی۔ بولی "سنہرے۔ میری باتیں پھینک نہ دینا۔ دل میں رکھنا۔ یہ بھیتر کی باتیں ہیں۔ اوپر کی نہیں۔ سنی سنائی نہیں۔ پڑھی پڑھائی نہیں۔ وہ سب چھلکے ہوتی ہیں۔ بادام نہیں ہوتیں۔ جان لے بیٹی بات وہ جو بھیتر کی ہو۔ گرمی ہو۔ چھلکا نہ ہو۔ جو بیتی ہو، جگ بیتی نہیں۔ آپ بیتی ہو۔ ہڈ بیتی نہیں۔ باقی سب جھوٹ۔ دکھلاوا۔ بہلاوا۔"

آج مجھے باتیں یاد آ رہی ہیں۔ بیتی باتیں۔ بسری باتیں۔ سانپ گزر گئے۔ لکیریں رہ گئیں۔ لکیریں ہی لکیریں۔ سانپ تو صرف ڈراتے ہیں۔ پھنکارتے ہیں۔ لکیریں کاٹتی ہیں۔ ڈستی ہیں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لکیروں نے مجھے چھلنی کر رکھا ہے۔ چلتی ہیں، چلے جاتی ہیں۔ جیسے دھار چلتی ہے۔ ایک ختم ہوتی ہے، دوجی شروع ہو جاتی ہے۔

آپی کی بیٹھک میں ہم تین تھیں۔ پیلی، روپی اور میں۔ پیلی بڑی، روپہ منجھلی اور میں چھوٹی۔ پیلی میں بڑی آن تھی پر مان نہ تھا۔ اس آن میں چھب تھی۔ سندرتا بھرا ٹھہراؤ تھا۔ یوں رعب سے بھری رہتی جیسے ٹمیار رس سے بھری رہتی ہے۔ گردن اٹھی رہتی مورتی سمان۔

روپہ سر ہی سر تھی۔ شدھ سرتاروں سے بنی تھی۔ اس کے بند بند میں تار لگے تھے۔ سمرتیاں سمرتیاں اور وہ گونجتے مدھم میں گونجتے اور پھر سننے والوں کے دلوں کو جھلا دیتے۔ تبھی میں تھی۔ آپی کہتی تھی۔ "سنہرے۔ تجھ میں دکھ کی بھیگ ہے۔ تو بھگو دیتی ہے۔ خود بھی ڈوب جاتی ہے۔ دوجے کو بھی ڈو لو دیتی ہے۔ پگلی دوجے کو ڈبویا کر۔ خود نہ ڈوبا کر۔ مجھے تجھ سے ڈر آتا ہے سنہرے۔ کسی دن تو ہم سب کو نہ لے ڈوبے۔"

آپی کی بیٹھک کوئی عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا، منہ اٹھایا چلا آیا۔ بیٹھک پر دھن دولت کا زور تو چلتا ہی ہے۔ وہ تو چلے گا ہی ہر بیٹھک پر۔ پر آپی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چلا رکھا تھا کہ خالی دھن دولت کا زور نہ چلتا تھا۔ نو دولتے آتے تھے پر ایسے بدمزا ہو کر جاتے کہ پھر رخ نہ کرتے۔ آپی کی بیٹھک میں نگاہیں نہیں چلتی تھیں۔ اس نے ہمیں سمجھا رکھا تھا کہ لوگ نگاہوں

پر اچھالیں گے تو پڑے اچھالیں۔ لڑکیو نہ اچھلنا۔ جو نگاہوں پر اچھل جاتی ہیں، وہ منہ کے بل گرتی ہیں اور جو گر گئی۔ وہ سمجھ لو، نظروں سے گر گئی۔ پھر نہ اپنے جوگی رہی نہ دوسروں جوگی۔”

آپی کی بیٹھک میں جسم نہیں چلتے تھے، آواز چلتی تھی۔ دل دھڑکتے تھے۔ وہاں ملاپ کا رنگ نہ ہوتا تھا۔ رنگ رلیاں نہیں ہوتی تھی۔ نہ تماشا ہوتا نہ تماش بین۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب وہاں ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تھی۔ دو مہینے میں ایک بار ضرور لگتی تھی۔ ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تو کوئی دوجا نہیں آ سکتا تھا۔ صرف ٹھاکر کے سنگی ساتھی۔

ٹھاکر بھی تو عجیب تھا۔ اوپر سے دیکھو تو ریچھ۔ طاقت سے بھرا ہوا اور جھانکو تو بچہ۔ نرم، گرم گرم۔ ویسے تھا آن بھرا۔ مان بھرا۔ سنگیت کا رسیا۔ یوں لگتا جیسے بھیتر کوئی لگن لگی ہو۔ دھونی رمی ہو۔ آرتی بجی ہو۔

ٹھاکر کی ہمارے ہاں بڑی قدر تھی۔ آپی عزت کرتی تھی۔ بھروسا کرتی تھی۔ ٹھاکر نے بھی کبھی نظر اچھالی نہ تھی۔ جھکائے رکھی۔ پیتا ضرور تھا۔ پر ایسی کہ جوں جوں پیتا جاتا، الٹا مدھم پڑتا جاتا۔ آنکھ کی چمک گل ہو جاتا۔ آواز کی کڑک بھیگ جاتی۔ اس کا نشہ ہی انوکھا تھا۔ جیسے بوتل کا منہ ہو، بھیتر کا ہو۔ بوتل اک بہانہ ہو۔ بوتل چابی ہو بھیتر کے پٹ کھولنے کی۔

“ڈرو سکھیو ڈرو۔ بھیتر کے نشے سے ڈرو۔ بھیتر کے نشے کے سامنے بوتل کا نشہ ہاتھ جوڑے کھڑا ہے جیسے راجا کے روبرو نیچ کھڑا ہو۔ بوتل کا تو خالی سر چکراتا ہے۔ بھیتر کا من کا جھولنا جھلا دیتا ہے۔ بھیتر کا کسی جوگا نہیں چھوڑتا۔ خود جوگا بھی نہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ٹھاکر کے نشے کا ریلا مجھے بھی لے ڈوبے گا۔”

ہاں تو اس روز ٹھاکر کی بیٹھک ہو رہی تھی۔ بول تھے۔ “گانٹھری میں کون جتن کر کھولوں۔ مورے پیا کے جیا میں پڑی رہی۔” گیت نے کچھ ایسا سماں باندھ رکھا تھا کہ ٹھاکر جھوم جھوم جا رہا تھا۔ “پھر کہو۔ پھر بولو۔” کا جاپ کیئے جا رہا تھا۔ نہ جانے کس گرہ کو کھولن کی آرزو جاگی تھی۔ اپنے من یا محبوب کے من کے سمے بیتا جا رہا تھا۔ سمے کی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ سمے جیون سے نکل جاتا ہے کہ کون ہیں، کہاں ہیں کیا کر رہے ہیں۔ کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ اسی روز وہ سمے ایسا ہی سمے تھا۔

دفعتا” گھڑی نے تین بجائے۔ آپی ہاتھ جوڑے اٹھ بیٹھی۔ بولی۔ “شما کرو ٹھاکر جی۔ معافی مانگتی ہوں۔ ہمارا سمے بیت گیا۔ اب بیٹھک ختم کرو۔”

ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر مسکایا۔ “نہ آپی۔” وہ بولا۔ “ابھی تو رات بھیگی ہے۔” آپی بولی۔ “

ٹھاکر ہم سوکھے پروں والے پنچھی ہے۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو ہمارا سمے بیت جاتا ہے۔ جو ہمارے پر بھیگ گئے، تو اڈاری نہ رہے گی۔ فن کار میں اڈاری نہ رہے تو باقی کیا رہا؟” ٹھاکر نے بڑی منتیں کیں۔ آپی نہ مانی۔

محفل ٹوٹ گئی تو ہم تینوں آپی کے گرد ہو گئیں۔ “آپی یہ سمے کا گورکھ دھندہ کیا ہے؟”

آپی بولی۔ “لڑکیوں سمے بڑی چیز ہے۔ ہر کام کا الگ سمے بنا ہے۔ رات کو گاؤ بجاؤ۔ پیو پلاؤ۔ ملو ملاؤ۔ موج اڑاؤ۔ تین بجے تک پھر بھور سمے اس کا سمے ہے۔ اس کا نام جپو۔ اسے پکارو۔ فریاد کرو۔ دعائیں مانگو۔ سجدے کرو۔ اس سمے میں تم عیش نہیں کر سکتے۔ گناہ نہیں کر سکتے۔ قتل نہیں کر سکتے۔ یہ دھندا جو ہمارا ہے، اس کے سمے میں نہیں چل سکتا۔ اس کے سمے میں پاؤں نہ دھرنا۔ اس نے برا مانا تو ماری جاؤ گی۔ جو اچھا مانا تو بھی ماری جاؤ گی اور دیکھو۔ اس کے سمے کے نیڑے نیڑے بھی ایسا گیت نہ گانا جو اسے پکارے۔ بھجن نہ چھیڑنا۔ ڈرتے رہنا۔ کہیں وہ تمہاری پکار سن کر ہنکارا نہ بھر دے۔”

پھر وہ دن آ گیا جب میں نے ان جانے میں سمے کا بندھن توڑ دیا۔ اس روز ٹھاکر آئے۔ آپی سے بولے۔ “بائی کل خواجہ کا دن ہے۔ خواجہ کی نیاز سارے گاؤں کو کھلاؤں گا۔ اج رات خواجہ کی محفل ہو گی۔ ادھر حویلی میں صرف اپنے ہوں گے گھر کے لوگ۔ تجھے لینے آیا ہوں۔ چل میرے ساتھ میرے گاؤں۔”

آپی سوچ میں پڑ گئی۔ “روپہ ماندی ہے، وہ تو نہیں جا سکے گی۔ کسی اور دن رکھ لینا نذر نیاز۔”

“خواجہ کا دن میں کیسے بدلوں؟” وہ بولا۔

“تو کسی اور کی منڈلی کو لے جا۔”

“اونہوں۔” ٹھاکر نے منہ بنا لیا۔ “خواجہ کی بات نہ ہوتی تو لے جاتا۔ ان کا نام لینے کے لائق مکھ تو ہو۔”

“میں کس لائق ہوں جو ان کا منہ پر لاؤ۔”

“بس اک تیری بیٹھک ہے جہاں پوتر تا ہے۔ جسم کا نہیں، من کا ٹھکانا ہے۔”

آپی مجبور ہو گئی۔ اس نے روپہ کا دھیان رکھنے کے لئے پیلی کو وہاں چھوڑا اور مجھے لے کر ٹھاکر کے گاؤں چلی گئی۔

رات بھر حویلی میں خواجہ کی محفل لگی۔ وہ تو گھریلو محفل تھی۔ ٹھاکر کی بہنیں، بہویں، بیٹیاں، ٹھاکرانی سب بیٹھے تھے۔ وہ تو سمجھ لو، بھجن منڈلی تھی۔ “خواجہ میں تو آن کھڑی تورے

دوار” سے شروع ہوئی تھی۔

آدھی رات کے سمے محفل اتنی بھیگی کہ سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل ڈولے۔ آپی کا ڈوب ہی گیا۔ ٹھاکر اسے محفل سے اٹھا کر اندر لے گیا۔ شربت شیرا پلانے کو۔ پھر وہیں لٹا دیا۔

پھر خواجہ کے گیت چلے تو میں بھی بھیگ گئی۔ آنکھیں پھر بھر آئیں۔ میں حیران۔ میں تو کچھ مانگ نہیں رہی۔ میں تو التجا نہیں کر رہی۔ میں تو اک تاجر ہوں۔ پیسہ کمانے کے لئے آئی ہوں۔ میری آنکھیں بھر بھر آتی رہیں۔ دل کو کچھ کچھ ہوتا رہا۔ پر میں بھیگ بھیگ کر گاتی گئی۔ سمے بیت گیا اور مجھے دھیان ہی نہ آیا کہ میں اس کے سمے میں پاؤں دھر چکی ہوں۔ آپی تھی نہیں جو مجھے ٹوکتی۔

اور پھر مجھے کیا پتہ کہ خواجہ کون ہے۔ میں نے تو صرف نام سن رکھا تھا۔ اس کے گیت یاد کر رکھے تھے۔ میں تو صرف یہ جانتی تھی کہ وہ غریب نواز ہے۔ میں تو غریب نہ تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ مجھے بھی نواز دے گا۔ خواہ مخواہ۔ زبردستی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس میں اتنی بھی سدھ بدھ نہیں کہ کون پکار رہا ہے۔ کون گا رہا ہے۔ کون منگتا ہے۔ کون خالی جھولی پھیلا رہا ہے۔ کون بھری جھولی سمیٹ رہا ہے۔ میں تو یہی سنتی آئی تھی کہ دکھی لوگ پکار پکار کر ہار جاتے ہیں۔ پر کوئی سنتا نہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اتنا دیالو ہے۔ اتنا نیڑے ہے۔ اتنے کان کھڑے رکھتا ہے۔

پھر ٹھاکر بولا۔ “سنہرے بائی۔ بس اک آخری فرمائش۔ خواجہ پیا موری رنگ دے چنریا۔ ایسی بھی رنگ دے رنگ نہ چھوٹے۔ دھوبیا دھوئے جائے ساری عمریا۔”

پھر مجھے سدھ بدھ نہ رہی۔ ایس رنگ پچکاری چلی کہ میں بھیگ بھیگ گئی اور میں ہی نہیں، محفل رنگ رنگ ہو گئی۔ انگ انگ بھیگا۔ خواجہ نے رنگ کھاٹ بنا دیا۔

گھر پہنچی تو گویا میں میں نہ تھی۔ دل رویا رویا۔ دھیان کھویا کھویا۔ کسی بات میں چت نہ لگتا۔ بے گانہ دکھتی۔ ساز میں طرب نہ رہا۔ سارنگی روئے جاتی۔ استاد نکو خان بجاتے پر وہ روئے جاتی۔ طبلہ پیٹتا۔ گھنگھرو کہتے پاؤں میں ڈال اور بن کو نکل جا۔ وہاں اس کا جھومر ناچ جو پتے ڈال ڈال سے جھانک رہا ہے۔

روز دن میں تین چار بار ایسی رقت طاری ہوتی کہ کہہ ہیں ہیں کر کے روتی۔ پھر حال کھیلنے لگتی۔ پہلی حیران، روپہ کا منہ کھلا۔ آپی چپ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب آٹھ دن یہی حالت رہی بلکہ اور بگڑ گئی تو آپی بولی۔ “بس پتر۔ تیرا اس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا۔ دانا پانی ختم ہو گیا۔ تو نے اس کے سمے میں پاؤں دھر دیا۔ اس نے تجھے رنگ دیا۔ اب تو اس دھندے جوگی نہیں رہی۔”

“پر کہاں جاؤں آپی؟ اس بیٹھک سے باہر پاؤں دھرنے کی کوئی جگہ بھی ہو میرے لئے۔”

“جس نے بلایا ہے اس کے دربار میں جا۔” روپہ بولی۔

“اس بھیڑ میں جائے۔” آپی بولی۔ “یہ لڑکی جائے جس کا سنہری پنڈا کپڑوں سے باہر جھانکتا ہے۔ نہیں۔ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ اسی کوٹھڑی میں رہے گی۔ بیٹھک میں پاؤں نہیں دھرے گی۔”

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ رقت ختم ہو گئی۔ دل میں ایک جنون اٹھا کہ کسی کی ہو جاؤں۔ کسی ایک کی تن من دھن سے اسی کی ہو جاؤں۔ ہو رہوں۔ وہ آئے تو اس کے جوتے اتاروں۔ پنکھا کروں۔ پاؤں دابوں۔ سر میں تل مالش کروں۔ اس کے لئے پکاؤں۔ میز لگاؤں۔ برتن رکھوں۔ اس کی بنیانیں دھوؤں۔ کپڑے استری کروں۔ آرسی کا کول بناؤں۔ پھر سرہانے کھڑی رہوں کہ کب جاگے۔ کب پانی مانگے۔

ایک دن آپی بولی “اب کیا حال ہے دھیئے؟” میں رو رو کے ساری بات کہہ دی کہ کہتے ہیں کسی ایک کی ہو جا۔

بولی۔ “وہ کون ہے؟ کوئی نظر میں ہے کیا؟”

“انہوں۔ کوئی نظر میں نہیں۔”

“ناک نقشہ دکھتا ہے کبھی؟”

“نہیں آپی”

“کوئی بات نہیں۔” وہ بولی۔ “جو کھونٹی پر لٹکانا مقصود ہے تو آپ کھونٹی بھیجے گا۔”

دس ایک دن کے بعد جب بیٹھک راگ رنگ سے بھری ہوئی تھی تو میری کوٹھڑی کا دروازہ بجا۔ آپی داخل ہوئی۔ بولی۔ “خواجہ نے کھونٹی بھیج دی۔ اب بول کیا کہتی ہے؟”

“کون ہے؟”

“کوئی زمیندار ہے۔ ادھیڑ عمر کا ہے۔ کہتا ہے بس ایک بار بیٹھک میں آیا تھا۔ سنہری بائی کو سنا تھا۔ جب سے اب تک اس کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ توجہ ہٹانے کے بہت جتن کیے۔ کوئی پیش نہیں گئی۔ اب ہار کے تیرے در پر آیا ہوں۔ بول کیا کہتی ہے۔ منہ مانگا دوں گا۔ چاہے ایک مہینے کے لئے دے دے۔ ایک سال کے لئے یا ہمیشہ کے لئے بخش دے۔ جیسے تیری مرضی۔” آپی ہنسنے لگی۔ بولی۔ “چل بیٹھک میں اسے دیکھ لے ایک نظر۔”

“اونہوں۔” میں نے سر ہلا دیا۔ “نہیں آپی انہوں نے بھیجا ہے تو ٹھیک ہے۔ دیکھنے کا مطلب؟”

"کتنی دیر کے لئے مانوں؟"

"جیون بھر کے لئے۔"

"سوچ لے۔ جو اوباش نکلا تو؟"

"پڑا نکلے۔ کیسا بھی ہے، جیسا بھی نکلے۔"

اگلے دن بیٹھک میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ زمیندار نے پیسے کا ڈھیر لگا دیا۔ آپی نے رد کر دیا۔ بولی۔ "سودا نہیں کر رہی۔ دھی وداع کر رہی ہوں اور یاد رکھ یہ خواجہ کی امانت ہے۔ سنبھالکر رکھیو۔"

حویلی یوں اجڑی تھی جیسے دیو پھر گیا ہو۔

ویسے تو سبھی کچھ تھا۔ ساز و سامان تھا۔ آرائش تھی۔ قالین بچھے ہوئے تھے۔ صوفے لگے ہوئے تھے۔ قد آدم آئینے، جھاڑ فانوس۔ سبھی کچھ۔ پھر بھی حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

برآمدے میں آرام کرسی پر چھوٹی چودھرانی بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے تپائی پر چائے کے برتن پڑے تھے مگر اسے خبر ہی نہ تھی کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اسے تو خود کی سدھ بدھ نہ تھی کہ کون ہے۔ کہاں ہے۔ کیوں ہے۔

اوپر سے شام آ رہی تھی۔ سمے کو سمے سے ٹکراتی۔ اداسیوں کے جھنڈے گاڑتی۔ یادوں کے دیئے جلاتی۔ بیتی باتوں کے الاپ گنگناتی۔ دبے پاؤں۔ مدھم یوں جیسے پائل کی جھنکار بیرنیا ہو۔

دور اس کوارٹر کے باہر کھاٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کی نظریں چھوٹی چودھرانی پر جمی ہوئی تھیں۔ حقے کا سوٹا لگاتا اور پھر سے چھوٹی چودھرانی کو دیکھنے لگتا یوں جیسے اسے دیکھ دیکھ کر دکھی ہوا جا رہا ہو۔

دوسری جانب گھاس کے پلاٹ کے کونے پر بوڑھا مالی پودوں کی تراش خراش میں لگا ہوا تھا۔ ہر دو گھڑی کے بعد سر اٹھاتا اور چھوٹی چودھرانی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا پھر چونک کر لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر سے کاٹ چھانٹ میں لگ جاتا۔

جنت بی بی، چودھرانی کا کھانا پکاتی تھی، دو تین بار برآمدے کے پرے کنارے پر کھڑی ہو کر اسے دیکھ گئی تھی۔ جب دیکھتی تو اس کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔ پلو سے پونچھتی پھر لوٹ جاتی۔

سارے نوکر کمیں چھوٹی چودھرانی پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس پر سخت ناراض بھی تھے۔ اس نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی کیوں ماری تھی؟ کیوں خود کو دوجوں کا محتاج بنا لیا تھا؟ اپنی اولاد ہوتی تو پھر بھی سہارا ہوتا۔ اپنی اولاد تو تھی نہیں۔

جب چودھری مرنے سے پہلے بقائمی ہوش و حواس اپنی آدھی غیر منقولہ جائیداد چھوٹی چودھرانی کے نام گفٹ کر گیا تھا تو اسے کیا حق تھا کہ اپنا تمام تر حصہ بڑی چودھرانی کے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دے۔ اگر ایک دن بڑی چودھرانی نے اسے حویلی سے نکال باہر کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کس کا در دیکھے گی۔

ایک طرف تو اتنی بے نیازی کہ اتنی جائیداد اپنے ہاتھ سے بانٹ دی۔ اور دوسری طرف یوں سوچوں میں گم تصویر بن کر بیٹھی رہتی ہے۔ سارے ہی نوکر حیران تھے کہ چھوٹی چودھرانی کس سوچ میں کھوئی رہتی ہے۔ چودھری کو مرے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ جب سے یونہی حواس گم قیاس گم بیٹھی رہتی ہے۔ اور پھر ٹوٹتی رات سمے اس کے کمرے سے گنگنانے کی آواز کیوں آتی ہے؟ کس خواجہ پیا کو بلاتی ہے؟ خواجہ پیا موری لیجو خبریا۔ کون خبر لے؟ کیسی خبر لے؟ چھوٹی چودھرانی پر انہیں پیار ضرور آتا تھا۔ پر اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس سوچ میں پڑی رہتی ہے۔

چھوٹی چودھرانی کو صرف ایک سوچ لگی تھی۔ اندر سے ایک آواز اٹھتی۔ بول تیرا جیون کس کام آیا؟ وہ سوچ سوچ ہار جاتی۔ پر اس سوال کا جواب ذہن میں نہ آتا۔ الجھے الجھے خیال الجھاتے۔ مجھے چمن سے اکھیڑا۔ بیل بنا کر اک درخت کے گرد گھما دیا اور اس درخت کو اکھیڑ پھینکا۔ بیل مٹی میں مل گئی۔ اب یہ کس کے گرد گھومے؟ بول میرا جیون کس کام آیا؟

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے روبرو کھڑا ہے۔ سر اٹھایا سامنے گاؤں کا پٹواری کھڑا تھا۔

"کیا ہے؟" وہ بولا۔

"میں ہوں، پٹواری۔ چودھرانی جی۔"

"تو جا--- جا کر بڑی چودھرانی سے مل۔ مجھ سے تیرا کیا کام؟"

"آپ ہی سے کام ہے۔" وہ بولا۔

"تو بول۔ کیا کہتا ہے؟"

"گاؤں میں دو درویش آئے ہیں۔ گاؤں والے چاہتے ہیں انہیں چند دن یہاں روکا جائے۔ جو آپ اجازت دیں تو آپ کے مہمان خانے پر ٹھہرا دیں۔"

"ٹھہرا دو۔" وہ بولی۔

"نوکر چاکر بندوبست......." وہ رک گیا۔

"سب ہو جائے گا۔"

پٹواری سلام کرکے جانے لگا تو پتا نہیں کیوں اس نے سرسری طور پر پوچھا۔ "کہاں سے آئے ہیں؟"

پٹواری بولا۔ "اجمیر شریف سے آئے ہیں۔ خواجہ غریب نواز کے فقیر ہیں۔" اک دھماکا ہوا۔ چھوٹی چودھرانی کی بوٹیا ہوا میں اچھلیں۔

اگلی شام چھوٹی چودھرانی نے جنت بی بی سے پوچھا۔ "جنت۔ یہ جو درویش ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہاں ان کے پاس گاؤں والے آتے ہیں کیا؟"

جنت بولی۔ "لو چھوٹی چودھرانی۔ وہاں تو سارا دن لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ جو منہ سے کہتے ہیں' ہو جاتا ہے۔"

"تو تیار ہو جنت۔ ہم بھی جائیں گے۔ تو اور میں۔"

"چودھرانی جی وہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔"

"تو چل تو سہی۔" چودھرانی نے خود کو چادر میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ "اور دیکھ وہاں مجھے چودھرانی کہہ کر نہ بلانا۔ خبردار......!"

جب وہ مہمان خانے پہنچیں تو دروازہ بند تھا۔ جنت نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔ جنت نے پھر دستک دی۔ سفید ریش بوڑھے خادم نے دروازہ کھولا۔ جنت زبردستی اندر داخل ہو گئی۔ پیچھے پیچھے چودھرانی تھی۔ سفید ریش گھبرا گیا۔ بولا "سائیں بادشاہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔ وہ اس کمرے میں مشغول ہیں۔"

"ہم سائیں بادشاہ سے ملنے نہیں آئے۔" چھوٹی چودھرانی بولی۔

"تو پھر؟" سفید ریش گھبرا گیا۔

"ایک سوال پوچھنا ہے۔" چودھرانی نے کہا۔

"سائیں بابا اس سمے سوال کا جواب نہیں دیں گے۔"

"سائیں بابا نے جواب نہیں دینا' انہوں نے پوچھنا ہے۔" وہ بولی۔

"کس سے پوچھنا ہے؟" خادم بولا۔

"اس سے پوچھنا ہے جس کے وہ بالکے ہیں۔" یہ سن کر سفید ریش خادم سن کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"ان سے پوچھو۔" چھوٹی چودھرانی نے کہا۔ "ایک عورت تیرے دوار پر کھڑی پوچھ رہی ہے۔ اے غریب نواز بتا کہ میرا جیون کس کام آیا؟"

کمرے پر منوں بوجھل خاموشی طاری ہو گئی۔

چھوٹی چودھرانی بولی۔ "کہو وہ عورت پوچھتی ہے: تو نے بیٹھک کے گملے سے اک بوٹا اکھیڑا۔ اسے بیل بنا کر درخت کے گرد لپیٹ دیا کہ جا اس پر نثار ہوتی رہ۔" وہ رک گئی۔ کمرے کی خاموشی اور گہری ہو گئی۔ "اب تو نے اس درخت کو اکھیڑ پھینکا ہے۔ بیل مٹی میں رل گئی۔ وہ بیل پوچھتی ہے۔ بول میرا جیون کس کام آیا؟" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔

"تیرا جیون کس کام آیا۔ تیرا جیون کس کام آیا۔" سفید ریش خادم کے ہونٹ لرزنے لگے۔ "تو پوچھتی ہے تیرا جیون کس کام آیا؟" وہ رک گیا۔ کمرے کی خاموشی اتنی بوجھل ہو گئی کہ سہاری نہیں جاتی تھی۔

"میری طرف دیکھ۔" سفید خادم نے کہا "سنہری بائی۔ میری طرف دیکھ کہ تیرا جیون کس کام آیا۔ مجھے نہیں پہچانتی؟ میں تیرا سارنگی نواز تھا۔ میں کیا تھا' کیا ہو گیا۔"

چھوٹی چودھرانی کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ "استاد جی۔ آپ......؟" وہ استاد کے چرن چھونے کے لئے آگے بڑھی۔

عین اس وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک بھاری بھرکم نورانی چہرہ برآمد ہوا۔

"سنہری بی بی۔" وہ بولا۔ "مجھ سے پوچھ' تیرا جیون کس کام آیا۔"

چھوٹی چودھرانی نے مڑ کر دیکھا۔ "ٹھاکر............" وہ چلائی۔

ٹھاکر بولا۔ "اب ہمیں پتہ چلا کہ سرکار نے ہمیں ادھر آنے کا حکم کیوں دیا تھا۔" اس نے سنہری بی بی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ بولا۔ "بی بی۔ ہمیں آشیرباد دے۔"

# چکٹ گاڑی، ہونکتا ہوٹر اور موم بتی

لاحول ولا قوۃ۔ کتنی بے معنی خبر ہے۔ میں نے غصے میں اقبار اٹھا کر پرے پھینک دیا۔ بھلا ماننے کی بات ہے کیا کہ کہانی اس قدر پر اثر ہو کہ سننے والوں کو فساد پر آمادہ کر دے۔ میں نہیں مانتا۔ میں نے چلا کر کہا۔

ایسے ہی من گھڑت خبریں چھاپ دیتے ہیں۔ بھئی میں خود کہانیاں لکھتا ہوں۔ ساری زندگی اسی دھندے میں گزری ہے۔ ادبی انجمنیں شاہد ہیں کہ میری کوئی کہانی کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکی ایمان سے۔ لوگ سنتے ہیں، اوئے اوئے کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھار انجانے میں واہ بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن جلد ہی ہوش میں آکر تنقید کی چمٹیاں، قینچیاں، چھریاں نکال لیتے ہیں اور پھر چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ کہانی کو کم، لکھنے والے کو زیادہ۔

اس روز صبح سویرے سے میں اخبار لئے بیٹھا تھا۔ سب سے پہلے یہی خبر نظر آئی تھی کہ مزدور شٹل میں کسی بڑے میاں نے ایک کہانی سنائی جسے سن کر سبھی مشتعل ہو گئے۔ فساد برپا ہو گیا۔ دو مارے گئے۔ پانچ زخمی ہو گئے۔ آپ کہیں گے اتنی غیر اہم خبر میری نگاہ پر کیسے چڑھی۔ آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میں صرف غیر اہم خبریں پڑھا کرتا ہوں۔ اخبار پڑھنا بھی " مفتی۔ سچی اور عوامی خبریں پڑھنا چاہتے ہو تو غیر اہم خبریں پڑھو۔ اس لئے اخبار کو الٹی طرف سے کھولو۔ جہاں غیر اہم خبریں ہوتی ہیں۔ اہم خبریں کبھی سچی نہیں ہوتیں۔ جن مسائل سے بڑوں کی غرض و غایت وابستہ ہو، نہ سچی ہو سکتی ہیں نہ عوامی۔ لہٰذا عوام سے متعلق خبریں پڑھو جو اخبار میں غیر اہم صفحات پر ڈھیر کر دی جاتی ہیں۔ مثلاً" فلاں خاتون کے گھر دو سروں والا بچہ پیدا ہوا۔ فلاں گھر میں جنات کی خشت باری ابھی تک جاری ہے۔ راہ چلتے نوجوان نے خاتون کو آنکھ ماری اور پکڑا گیا۔ ایسی خبریں۔"

اس روز اخبار میں پڑھ کر میں سوچ میں پڑھ گیا۔ ممکن ہے یہ درست ہو۔ بھلا غیر سیاسی

خبر میں جھوٹ ملانے کی کیا ضرورت تھی۔ جوں جوں میں سوچتا گیا، توں توں شکوک پیدا ہوتے گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کہانی اس قدر پر اثر ہو کہ فساد پر آمادہ کر دے۔

پھر خیال آتا۔ آخر ادبی محفل میں بھی تو کہانی سننے والے آستین چڑھا کر بات کرتے ہیں اور میز پر مکے مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے تو خبر درست ہو سکتی ہے۔ پھر خیال آتا۔ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ادبی محفل میں تو پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں۔ ہر کسی نے تنقید پر کوئی نہ کوئی کتاب پڑھ رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنے علم کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور علم کا مظاہرہ دوسرے کی بات رد کرنے میں ہی ہوتا ہے، سپورٹ کرنے میں نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ ادبی محفل کا ہال واحد جگہ ہے جہاں ادیب کو کھل کر بات کرنے کا موقع ملتا ہے۔ باہر سیاستئے بولنے نہیں دیتے۔ گھر میں بیوی اور پھر یہ بھی تو ہے کہ معترض کا مقصد کہانی پر بات کرنا نہیں ہوتا بلکہ اپنی ادبی صلاحتیں چھانٹنا ہوتا ہے۔ مزدور نقاد تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ وہ ایک معصوم سی کہانی پر کیسے مشتعل ہو سکتے ہیں۔

"خبر من گھڑت ہے۔" میں نے چیخ کر کہا اور غصے میں اخبار کو پھینک دیا۔ عین اس وقت سجاد آ گیا۔ سجاد میرا دوست ہے۔ یقیناً" آپ اسے جانتے ہوں گے۔ بھئی مشہور جرنلسٹ ہے۔ وہ آتے ہی بولا۔ "کون سی خبر من گھڑت ہے؟"

"خبر ہے کہ چلتی گاڑی میں ایک مزدور نے ایک کہانی سنائی جسے سن کر لوگ اس قدر مشتعل ہو گئے کہ فساد برپا ہو گیا۔ دو مارے گئے۔ پانچ زخمی ہو گئے۔ لیکن میں نہیں مانتا کہ کوئی کہانی اس قدر پر اثر ہو سکتی ہے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟" وہ بولا۔

"بھئی۔ میں خود افسانہ نویس ہوں میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" سجاد تن کر کھڑا ہو گیا۔

"بھئی ایک کہانی کی وجہ سے اتنا بڑا فساد ہو جائے۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ ایک صورت ہے۔ اگر کہانی ذاتی نوعیت کی ہو تو پھر ہو سکتا ہے کہ سننے والے کو غصہ آ گیا ہو۔"

"بھئی ایک کہانی کی وجہ سے اتنا بڑا فساد ہو جائے۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ ایک صورت ہے۔ اگر کہانی ذاتی نوعی تکی ہو تو پھر ہو سکتا ہے کہ سننے والے کو غصہ آ گیا ہو۔"

سجاد نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بولا۔ "یہ کہانی ذاتی نوعیت کی نہیں تھی۔"

"تمہیں پتا ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ پتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

“کیسی کہانی تھی وہ؟” میں نے اسے کریدا۔

“عام سی تھی جیسے فیبلز ہوتی ہیں۔ مثلاً” چڑی کاں کی کہانی۔”

“نہیں یار۔ مذاق نہ کر۔” میں ہنس پڑا۔ “اول تو کہانی میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ فساد برپا کر سکے۔ پھر چڑی کال جیسی کہانی۔ اونہوں۔ یہ خبر سرے سے ہی غلط معلوم پڑتی ہے۔”

“خبر تو بھئی سولہ آنے مصدقہ ہے۔” سجاد نے تن کر کہا۔

“تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ مصدقہ..........؟” میں نے پوچھا۔

“بھئی میں خود وہاں موجود تھا۔” سجاد نے جواب دیا۔

“موقع پر؟”

“ہاں۔ موقع پر۔”

“تم نے وہ کہانی خود سنی تھی کیا۔؟”

“بالکل بھئی۔ میں کہانی سنانے والے کے قریب کھڑا تھا۔”

“تو یار۔ مجھے سناؤ وہ کہانی۔” میں نے پینترا بدلا۔

“بھئی۔ وہ ایک عام سی کہانی تھی۔ جیسے ہوتی ہیں پرانی کہانیاں۔ اور سنانے والا ایک عام سا آدمی تھا۔ ایک معمر مزدور اور کہانی سنانے سے اس کا کوئی خاص مقصد نہ تھا۔”

“تو پھر اس نے کہانی سنائی کیوں؟” میں نے پوچھا۔

“یار بڑے بوڑھوں کی عادت ہوتی ہے کہ جہاں بیٹھے ہیں‘ کوئی اصلاحی بات یا نصیحت چھیڑ دیتے ہیں۔ اور پھر اس کی سپورٹ میں کوئی فوک وزڈم کی کہانی سنا دیتے ہیں یا سعدی کی یا مولانا روم کی کوئی حکایت۔ بہرحال وہ اپنی نوعیت کی کہانی تھی۔” سجاد نے کہا۔

“تم سناؤ تو سہی۔” میں نے سجاد کی منت کی۔

سجاد کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکالا‘ سلگایا۔ ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑا۔ پھر جیسے کہانی سنانے کے لئے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ لیکن جلد ہی پھر ہچکچا کر بولا۔ “اس وقت کہانی شاید‘ پھسپھسی لگے۔ دراصل کہانی کا ماحول سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔”

“تو ماحول بھی بیان کر دو۔ اس میں کیا مشکل ہے؟” میں نے کہا۔

کچھ دیر کے لیے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ “تم فیکٹری شٹل کو جانتے ہو کیا؟ جس میں یہ حادثہ وقوع پذیر ہوا؟”

“بھئی ظاہر ہے‘ وہ کوئی گاڑی ہو گی۔” میں نے جواب دیا۔

“گاڑی تو ہے۔” سجاد بولا۔ “لیکن ایک خصوصی گاڑی ہے۔ یہ گاڑی روز صبح شہر سے

مزدوروں کو لاد کر تارپین آئل فیکٹری تک پہنچاتی ہے اور شام کو فیکٹری سے انہیں لاد کر شہر لے آتی ہے۔ یہ فاصلہ تقریباً” چالیس میل کا ہے۔ اس لائن پر کوئی سٹیشن نہیں۔ صرف فلیگ سٹاپ ہیں۔ جب یہ شٹل شہر پہنچتی ہے تو اسے باقاعدہ پلیٹ فارم پر نہیں لاتے بلکہ سٹیشن سے باہر سائیڈنگ پر کھڑا کر دیتے ہیں۔”

“وہ کیوں؟” میں نے پوچھا۔

“بھئی اس لئے کہ یہ گاڑی اس قابل نہیں کہ اسے منظر عام پر لایا جائے۔” سجاد نے کہا “دراصل یہ گاڑی نہیں‘ تیلی کی دکان ہے۔ کل کوئی چھ بوگیاں ہوں گی۔ سب تیل سے چکٹ۔ سیٹیں‘ فرش‘ پہیے‘ پائیدان سب کالے دھت۔ نہ تو بوگیوں میں دروازوں کے پٹ ہیں۔ نہ کھڑکیوں کے شٹر۔ سامان رکھنے کے تختے بھی اکھاڑ لئے گئے ہیں۔ کھڑکیوں کو بند کرنے والے شیشے اور تختے ٹوٹ چکے ہیں۔ باتھ روم کے دروازے بھی غائب ہیں۔ ان بوگیوں میں نہ بتیاں ہیں‘ نہ پنکھے۔ صرف یہی نہیں‘ بوگیوں کا ہر پیچ ڈھیلا ہے۔ پہیے چلنے کے ساتھ جھولتے جھومتے بھی ہیں۔ ایک گاڑی کو دوسری گاڑی سے جوڑنے والے کنڈے تو ہیں مگر بفرز کے شاک آبزاربرز کب کے دم توڑ چکے ہیں۔ چلتے ہوئے دھکے لگتے ہیں اور ساتھ عجیب و غریب قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ یوں جیسے پر اسرار فلم میں بیک گراؤنڈ میوزک چل رہی ہو۔” سجاد ہنسنے لگا۔ “وہ گاڑی نہیں‘ اونٹ ہے۔ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ البتہ ایک ہوٹر ہے جو بہت جاندار ہے۔ نہایت بھدی اور ڈراؤنی آواز میں گونجتا ہے۔ اور تقریباً” سارا رستہ بجتا ہی رہتا ہے۔” کچھ دیر کے لئے وہ رک گیا۔

“ہوا یوں کہ چار دن پہلے تارپین آئل فیکٹری کے متعلق ایک خبر چھپی تھی کہ بیروزہ کے پھوک سے ہم ایک ایسی چیز بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو عوام کی زندگی پر گہرا اثر مرتب کرے گی۔” وہ پھر رک گیا۔

“اخبار کے ایڈیٹر نے مجھ سے کہا۔ بھئی یہ کیا چیز ہے جو عوام کی زندگی پر گہرا اثر مرتب کرے گی؟ اس کی تفصیلات کا پتہ لگاؤ۔ اور اگر واقعی یہ چیز اہم ہے تو اس پر ایک فیچر لکھ دو۔ اس پر میں نے فیکٹری کے پی آر کو فون کر کے پوچھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ وہ بولا۔ وہ چیز بتانے کی نہیں‘ دیکھنے کی ہے۔ یہاں آ جاؤ۔ اسی وجہ سے مجھے کل تارپین آئل فیکٹری جانا پڑا۔ وہاں دن بھر ریسرچ میں مصروف رہا۔ پھر شام کو اسی گاڑی سے لوٹا جس میں یہ حادثہ پیش آیا۔” سجاد خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔ “چائے پلاؤ گے؟”

میں نے چڑ کر کہا۔ “پہلے ساری بات بتا مجھے‘ پھر پلاؤ گا۔

وہ ہنسنے لگا۔ سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا۔ بولا۔ “واپسی پر جب سٹاپ پر پہنچا تو گاڑی حرکت میں آ چکی تھی، خیر۔ میں دوڑ کر سوار ہو گیا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ گاڑی مزدوروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ دراصل اس روز ان کا پے ڈے تھا۔ اس لئے حاضری فل تھی۔ گاڑی میں تیل، پسینے اور فکر مندی کی بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ وہ سب گردنیں جھکائے بیٹھے تھے۔ ہر کوئی اپنی ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ ایک دوسرے سے کوسوں دور، نہ جانے کہاں۔”

“تو تو کہتا ہے۔ وہ پے ڈے تھا۔” میں نے اسے ٹوکا۔

“بالکل پے ڈے تھا۔” سجاد نے جواب دیا۔

“مزدور تو پے ڈے پر خوش ہوتے ہیں۔” میں نے کہا۔

“یہ غلط فہمی ہے۔” سجاد بولا۔ “مہینے بھر مزدور لوگ پے حاصل کرنے کی امید رچائے رکھتے ہیں۔ خواب دیکھتے ہیں۔ پے ڈے کو انہیں احساس ہوتا ہے کہ حصول کتنا عبث ہے۔ کتنا بے معنی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے۔” سجاد مسکرایا۔ “کہ زندگی کا المیہ حاصل نہ ہونے میں نہیں بلکہ حاصل ہو جانے کے بعد اس احساس میں ہے کہ کیا اسی کے لئے اتنی شورا شوری تھی۔ نطشے کہتا ہے کہ ہماری زندگی کا عظیم ترین لمحہ وہ ہے جب ہماری بڑی سے بڑی آرزو، بڑی سے بڑی کامیابی ہماری نگاہ میں ہیچ نظر آتی ہے۔”

“ہٹا یار۔” میں نے چڑ کر کہا۔ “نطشے بازی چھوڑ۔ مجھے وہ کہانی سنا۔”

وہ میری بے قراری پر ہنسنے لگا۔ “ایک معمولی سی کہانی کے لئے تم خود کو رسی کی طرح بل دے رہے ہو۔” یہ کہہ کر اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور بات شروع کی، بولا۔ “اتفاق سے مجھے کھڑے ہونے کے لئے وہیں جگہ ملی جہاں وہ بڈھا مزدور داستان گو بیٹھا تھا۔ ایک دبلا پتلا مزدور میرے پاس کھڑا تھا۔ بولا: میاں جی۔ آپ کہانی سنانے لگے تھے۔ ہاں۔ ہاں۔ وہ بڈھا بولا۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب غلام رکھنے کی رسم عام تھی۔ بازار میں ہر اٹھوارے منڈی لگا کرتی تھی جس میں غلام کھلم کھلا بکتے تھے۔ سوداگر بکنے والے کو تھڑے پر کھڑا کر کے اس کی خوبیاں گنواتے کہ دیکھ لو۔ مضبوط آدمی ہے۔ جوان ہے۔ طاقت ور ہے۔ کام کر سکتا ہے۔ بے داغ ہے۔ جس طرح گھوڑے کو بیچتے وقت اس کے دانت دکھاتے ہیں۔ پھر بولی شروع ہو جاتی۔ جو سب سے اونچی بولی دیتا، غلام ہمیشہ کے لئے اس کی ملکیت ہو جاتا اور مالک اس سے زندگی بھر جو کام چاہتا، لیتا۔

گاڑی چیختی، چلاتی، کراہتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ گرد و پیش کا ویران علاقہ دھندلا ہو چکا

تھا۔ رات کا اندھیرا ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ گاڑی کے اندر فکر مندی اور اداسی کے انبار لگے ہوئے تھے۔ مزدوروں کی شکلیں دھندلائے جا رہی تھیں۔ ہوٹر اپنی بھدی آواز میں کراہ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد میاں جی بولے: پھر جو بندے کو غلام بنانے کے خلاف آوازے لگنے لگے تو ملک کے قانون میں بدلی کر دی گئی۔ ملک میں ڈھنڈورا پیٹ کر اعلان کر دیا گیا کہ جس طرح مالک کو حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے، اپنے غلام کو منڈی میں لا کر بیچ سکتا ہے۔ اس طرح آئندہ سے غلام کو بھی حق حاصل ہو گا۔ وہ جب چاہے، خود کو بکنے کے لئے پیش کر دے۔ مطلب یہ کہ جس غلام کو اپنا آقا پسند نہ ہو، وہ شہر کے قاضی کے پاس جائے۔ اگر قاضی اسے بکنے کی اجازت دے دے تو منڈی میں خود کو بکنے کے لئے پیش کر دے۔ بولی میں جو قیمت ملے، وہ اپنے پہلے مالک کو دے دے اور خود کو نئے مالک کے حوالے کر دے۔ میاں جی پھر خاموش ہو گئے۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے مزدور جوں کے توں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کہانی سن نہیں رہا تھا۔ ہر کوئی اپنی ہی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ صرف وہی دبلا پتلا مزدور ہنکارا بھر رہا تھا۔ جی میاں جی پھر---؟

میاں جی نے سر اٹھایا۔ ایک لمبی آہ بھری۔ اور بولے: شہر میں ایک غلام تھا زبیر۔ نوجوانی کا عالم تھا۔ مسیں بھیگ رہی تھیں۔ جسم میں جان تھی۔ ناک نقشے میں جاذبیت تھی۔ وہ ہر چوتھے دن شور مچا دیتا۔ میں بکوں گا۔ میں اس مالک کے پاس نہیں رہوں گا۔ اس مالک میں کیا عیب ہے جو تو اس کے پاس نہیں رہے گا؟ قاضی نے پوچھا۔ زبیر بولا: یہ مالک مجھ سے اچھا برتاؤ نہیں کرتا۔ میں سارا دن اس کے کاموں میں جتا رہتا ہوں لیکن یہ خود تو تازی روٹی کھاتا ہے، اور مجھے کھانے کو باسی دیتا ہے۔ قاضی نے زبیر کو بہت سمجھایا بجھایا کہ اتنی سی بات کو دل پر نہیں لگاتے لیکن زبیر نہ مانا۔ قاضی نے اسے بکنے کی اجازت دے دی اور وہ پھر سے بک گیا۔

اپنے نئے مالک کے گھر چند ہی روز رہنے کے بعد زبیر نے پھر شور مچا دیا۔ میں بکوں گا۔ میں بکوں گا۔ میں اس مالک کے پاس نہیں رہوں گا۔ اس لئے کہ یہ خود گیہوں کی کھاتا ہے اور مجھے جو کی دیتا ہے۔ قاضی نے پھر اسے بہت سمجھایا بجھایا مگر وہ نہ مانا اور پھر بک گیا۔

تیسرے مالک کے گھر پہنچتے ہی زبیر نے پھر چیخ پکار شروع کر دی۔ اس سے بہتر تو میرا پہلا مالک ہی تھا جو اگرچہ جو کی دیتا تھا لیکن دو وقت دیتا تھا۔ یہ تو صرف ایک وقت روٹی دیتا ہے اور وہ بھی روٹی نہیں بلکہ پانی میں بھگوئے ہوئے سوکھے ٹکڑے۔ یہ مجھے انسان نہیں، جانور سمجھتا ہے۔ میں اس کے پاس نہیں رہوں گا۔ قاضی بولا: زبیر میں نے تجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ مالک

ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب میں تجھے کیا سمجھاؤں۔

گاڑی کے ہوٹر نے زور سے لمبی چیخ ماری۔ بوڑھا رک گیا۔

گاڑی ہونک رہی تھی۔ یوں جیسے سسکیاں بھر رہی ہو۔ کل پرزے کڑکڑا رہے تھے۔ انجن یوں چیخ رہا تھا جیسے چلا چلا کر کہہ رہا ہو۔ بکوں گا۔ میں بکوں گا۔ گاڑی کے اندر خاموشی کا تنبو تنا ہوا تھا۔ گھپ اندھیرے میں سے دبی دبی آہوں کراہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

پھر میاں جی؟ دبلے پتلے واحد سامع کی آواز سنائی دی۔ پھر کیا ہوا؟ میاں جی بولے۔ زبیر کی آوازیں آتی رہیں۔ آتی رہیں۔ میں بکوں گا۔ میں بکوں گا۔ پہلے ان آوازوں میں غصے کا رنگ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ان میں دکھ کا پہلو ابھرتا گیا۔ پکاریں کراہوں میں بدلتی گئیں اور وہ بکتا گیا۔ بکتا گیا۔ پھر دفعتاً“ اس کی آواز خاموش ہو گی۔ زبیر چپ ہو گیا۔ زبیر کو یوں چپ دیکھ کر لوگ چونکے۔ یہ کیا ہوا؟ زبیر چپ کیوں ہو گیا؟

سارے مزدوروں اور غلاموں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک بولا۔ زبیر کو آخر کار آقا مل گیا ہے۔ وہ خوشی کی وجہ سے چپ ہو گیا ہے۔ دوسرے نے کہا۔ چلو مان لیا کہ وہ خوش ہے۔ پھر وہ خوش دکھتا کیوں نہیں؟ پہلے اس کا چہرہ کتنا صاف تھا۔ اس پر بشاشت کی جھلک تھی۔ مگر اب ماتھے پر تیوری چڑھ بیٹھی ہے۔ آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں۔

ایک بوڑھے غلام سے کہا: وہ اس لئے چپ ہو گیا ہے کہ اب وہ جان گیا ہے۔

اس کے بعد جب بھی زبیر بازار میں نکلتا تو لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں۔ دیکھو دیکھو۔ وہ قاضی کی طرف جا رہا ہے۔ ضرور وہ بکنا چاہتا ہے‘ لیکن جب وہ دیکھتے کہ اس کا رخ کسی اور طرف ہے تو وہ مایوس ہو جاتے۔ پھر وہ آوازے کستے۔ زبیر تو قاضی کے پاس کیوں نہیں جاتا؟ کیا تو بکنا نہیں چاہتا؟ کیا تو خوش ہے؟ لیکن زبیر ان آوازوں کو ان سنی کر کے گردن جھکائے چلا جاتا۔

لوگوں کی آپس میں شرطیں بندھ گئیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ زبیر خوش ہے۔ کچھ کہتے تھے‘ وہ خوش نہیں۔ شرط پر فیصلہ سننے کے لئے لوگوں نے اپنے آوازے تیز تر کر دیئے۔ آخر ایک روز ان آوازوں سے اکتا کر زبیر رک گیا۔ اس نے منہ موڑ کر آواز لگانے والے کی طرف دیکھا اور چلا کر کہا۔ میں نہیں بکوں گا۔ میں نہیں بکوں گا۔ میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔ آوازے لگانے والوں پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ابھی زبیر نے جانے کے لئے رخ بدلا ہی تھا کہ مجمعے سے ایک آواز آئی۔ تو کیوں نہیں بکے گا۔۔۔ وجہ؟

زبیر پھر رک گیا۔ بولا: میرا آقا علم کا رسیا ہے۔ مطالعے کا شوقین ہے مگر اتنا کنجوس ہے کہ

چراغ دان نہیں خریدتا۔ رات کو جب وہ مطالعہ کرتا ہے تو چراغ میری ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے۔ یوں میں آدھی آدھی رات تک چراغ اٹھائے رہتا ہوں۔ نہیں۔ میں نہیں بکوں گا۔ وہ چیخ کر بولا۔ میں ڈرتا ہوں کہ میرا اگلا مالک مجھے تیل پلا دے گا اور میرے منہ سے بتی نکال کر مجھے دیا بنا لے گا۔ نہیں۔ میں نہیں بکوں گا۔ میں نہیں بکوں گا۔

بڈھا خاموش ہو گیا۔ گاڑی پر سکوت طاری ہو گیا۔ اندھیرا اس قدر گاڑھا تھا کہ محسوس ہوا جیسے کسی نے ہمیں کنوئیں میں دھکا دے دیا ہو۔ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ یونہی صدیاں بیت گئیں۔ پھر دفعتاً“ گاڑی کا ہوٹر کراہنے لگا۔ میں نہیں بکوں گا۔ میں نہیں بکوں گا۔ اس پر گاڑی میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ ایک آواز آئی۔ میاں جی۔ تو مجھے طعنہ دے رہا ہے۔ عبداللہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ ایک مزدور کھڑا ہو گیا۔ بولا: یہ تجھے طعنے نہیں دے رہا۔ عبداللہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ مجھے پتا ہے۔“ اس کی آواز میں تشدد تھا۔

نہیں۔ نہیں۔ دبلا پتلا مزدور بولا۔ میاں جی تو کہانی سنا رہے تھے۔ ٹھہر جا تو۔ تشدد بھری آواز پھر آئی۔ اس بڈھے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں اس سمجھ لوں گا۔

پھر اس ہنگامے سے ایک دھونس سنائی دی اور ایک اونچا لمبا آدمی چھلانگ لگا کر کونے سے باہر نکل آیا۔ تو رہنے دے۔ لمبا تڑنگا بولا۔ اس بڈھے نے تجھے نہیں‘ مجھے چھیڑا ہے۔ مجھے۔ میرا نام زبیر ہے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ میں کیوں بکنا نہیں چاہتا۔ ہٹ جاؤ۔ جس نے اس کی حمایت کی‘ اس سے میں سمجھ لوں گا۔

پھر بوگی میں چاروں طرف سے تشدد بھری آوازیں آنے لگیں۔“ سجاد نے کہا۔ ”یہ عالم دیکھ کر میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا اور وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ گاڑی کے پہیئے ہونک رہے تھے۔ بفر ٹکرا ٹکرا کر دھکے دے رہے تھے۔ ہوٹر چلا رہا تھا۔ میں نہیں بکوں گا۔ میں نہیں بکوں گا۔“

سجاد خاموش ہو گیا۔۔۔ دیر تک خاموش بیٹھا رہا جیسے گہری سوچ میں پڑا ہو۔ پھر اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ ”سچی بات یہ ہے مفتی۔“ وہ بولا۔ ”میرا جی چاہتا تھا کہ بڑھ کر اس بڈھے کی ناک پر گھونسا مار دوں۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ سجاد ہنسا۔ ”مجھے ایسا لگا جیسے اس بڈھے نے میرا راز مجھ پر کھول دیا ہو۔ پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا جیسے میرے ایڈیٹر نے مجھے موم بتی بنا کر دونوں سروں پر جلا رکھا ہو تاکہ اس کا اپنا نام روشن رہے۔“

# عینی اور عفریت

زندگی کا عظیم ترین واقعہ چھوٹے چھوٹے معمولی واقعات کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

ایک چھوٹا سا چشمہ پھوٹتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شوریدہ سر دریا بن کر آپ کی شخصیت کو خش و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔

وہ اچانک نمودار ہوتا۔ ایسے وقت جب کہ نہ خواہش ہوتی ہے نہ آرزو۔ نہ امید نہ توقع۔ آپ دروازے بند کر چکے ہوتے ہیں۔ اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا۔ جب آپ بھرپور زندگی بتا چکے ہوتے ہیں، خود سے مطمئن، تکمیل کے احساس سے سرشار۔

اس وقت وہ اچانک نمودار ہوتا ہے اور آپ کی شخصیت کے اس شاندار ایوان کو جسے آپ نے سال ہا سال ایک ایک اینٹ رکھ کر تعمیر کیا تھا، ایک جھٹکے میں مسمار کر دیتا ہے۔

اور پھر جو آپ دیکھتے ہیں تو............ کیا دیکھتے ہیں کہ آپ ملبے کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

میں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری تھی۔ جوانی میں جذبات کی ایک بھیڑ لگائے رکھی۔ میلہ لگائے رکھا۔ پٹاخے چھوڑے۔ پھلجھڑیاں چلائیں۔ ہولیاں کھیلیں۔ رنگ پچکاریں چلائیں۔ ابیر گلال کے تھال بھرے۔

میں جذباتی تھا۔ شدت پسند تھا۔ جذبات اور شدت میری دانست میں خلوص کے مظہر تھے۔ میرا رخ مثبت تھا۔ خلوص بھرا۔ ہمدردی بھرا۔ حقارت اور نفرت سے پاک۔ میں کہہ دینے والا تھا۔ گونگے اور ٹھنڈے خون والے مجھے پسند نہ تھے۔

میں نے علم حاصل کیا تھا۔ نفسیات میں مجھے دسترس تھی۔ تحلیل نفسی میں خاصی اہلیت تھی۔ دوست مانتے تھے۔ اچھا جانتے تھے۔ قدر کرتے تھے۔

اپنے ماضی پر مجھے پشیمانی نہ تھی۔ نہ احساس گناہ، نہ کمتری۔

میں نے عشق کئے۔ محبتیں کیں۔ افیرز نہیں۔ یارانے نہیں۔ توجہ کا مرکز بنا رہا۔ ذلتیں اور رسوائیاں جھیلیں۔ فراق و وصال سبھی کچھ۔ جبھی تو اب خود مطمئن تھا۔ احساس تکمیل سے سرشار۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے: بول کیا مانگتا ہے؟ جو مانگے گا، ملے گا۔ تو یقیناً" میں سوچ میں پڑ جاؤں گا۔ کیا مانگوں؟ میں مانگ کی دنیا سے دور نکل آیا ہوں۔ سکون اور اطمینان کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔

شور شرابا پیچھے رہ گیا ہے۔ بہت پیچھے۔

جس راستے پر میں گامزن ہوں، وہ اطمینان سے لبریز ہے۔

سڑک خاموش ہے۔

راستہ ہموار ہے۔ نہ اوچان نہ نچان۔ سیدھا، صاف۔ دونوں جانب پیڑ اگے ہوئے ہیں۔ سرسبز نہیں، پیلے پیلے اونچے لمبے نہیں، بیٹھے بیٹھے، جھکے جھکے، گرد آلود۔

پتے مسلسل جھڑ رہے ہیں۔ کھڑ کھڑ کر رہے ہیں۔

شام گہری ہوتی جا رہی ہے۔

دور دور لگے کھمبوں پر بتیاں ٹمٹما رہی ہیں۔

ان کی زرد ٹم زمین تک نہیں پہنچ پاتی۔

شام کا گھسمسہ بڑھتا جا رہا ہے۔

سڑک پر اکا دکا راہ گیر چل رہے ہیں۔

چپ چپ تھکے ہارے۔ گرد سے اٹے ہوئے۔

ایک دوسرے سے دور دور۔ اکیلے اکیلے تنہا تنہا۔

منظر پر سکون کا ایک خیمہ تنا ہوا ہے۔ بے چینی کی مدھانی مدت سے زنگ آلود ہو چکی ہے۔ میرے دل میں کوئی مدوجزر نہیں۔ ذہن سوچ و بچار کی گھاٹیوں سے نکل چکا ہے۔ کیوں؟ کیسے؟ کس لئے کے بھڑ بھن بھن کرنا بھول چکے ہیں۔

میرے سامنے آسمان پر چاند ٹنگا ہوا ہے۔ چاندنی والا چاند نہیں۔ چاندنی تو چھیڑ دیتی ہے۔ ایک بڑا سا مدھم مدھم چاند۔ جیسے تانبے کا ایک تھال لٹک رہا ہو۔ میں چلے جا رہا ہوں۔

دفعتاً" پاؤں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ قریب۔ اور قریب۔ یہ کون ہے جو میرے ساتھ چل رہا ہے؟

میں مڑ کر دیکھتا ہوں: کون ہو تم؟

وہ سر اٹھاتی ہے۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹکتی ہے۔ رکتی ہے۔ پھر سر جھکا لیتی ہے۔ جواب نہیں دیتی۔

اس کے جسم میں چمک ہے۔ تازگی ہے۔ شگفتگی ہے۔ لیکن منہ لٹکا ہوا ہے۔ خدوخال پر بے تعلقی کی دھول جمی ہے۔ تھکا ہارا مردہ چہرہ۔ گردن جھکی ہوئی۔ نگاہیں ہیں اکتائی ہوئیں۔ جیسے بہت کچھ دیکھا ہو۔ دیکھ دیکھ کر تھک گئی ہوں۔ جھک گئی ہوں۔ نہ دیکھنے کی چاہ نہ دکھانے کا شوق۔

“تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟ کون ہو تم؟”

“میں بھی ہوں۔” وہ سر اٹھائے بغیر جواب دیتی ہے۔

جواب میں تلخی ہے، لیکن آواز مدھم، پھٹی پھٹی، تھکی تھکی۔ اس میں چمک نہیں، تان نہیں، لے نہیں، لوچ نہیں۔ جیسے ریوڑی بھیگ گئی ہو۔ کڑاکا نہ رہا ہو۔

“لیکن یہ سڑک تو تمہارے لئے نہیں ہے۔ تمہیں تو شاہراہ پر چلنا چاہئے جہاں رونق ہے، زندگی ہے۔”

“وہیں سے آئی ہوں۔” وہ جواب دیتی ہے۔

“لیکن کیوں؟” ناگاہ میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔

وہ سر اٹھاتی ہے۔ تن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ “میری مرضی۔”

میں چپ ہو جاتا ہوں۔ چلنے لگتا ہوں۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ لیکن دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔ پتا نہیں غصہ ہے یا کیا۔

پاؤں کی چاپ پھر قریب آجاتی ہے۔ اور قریب۔

“تم میرے ساتھ ساتھ کیوں چل رہی ہو؟” ان جانے میں میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔

“ساتھ نہیں۔ میں چل رہی ہوں۔” وہ با آواز بلند کہتی ہے۔ پھر زیر لبی سنائی دیتی ہے۔

“کوئی کسی کے ساتھ نہیں چلتا۔” اس کی آواز میں حسرت نہیں، آرزو نہیں، بے تعلقی ہی بے تعلقی ہے۔

میں رک جاتا ہوں۔ “دیکھو پاؤں دھیرے دھرو۔ ہم ساتھ ساتھ نہ رہیں۔”

“ہاں۔” وہ کہتی ہے۔ “دھیرے دھرے تھے۔ لیکن.............”

“لیکن کیا؟” میں پوچھتا ہوں۔

“پھر تم بھی پاؤں دھیرے دھرنے لگے۔ رک گئے۔”

“میں رک گیا تھا؟” مجھے غصہ آنے لگا۔

“ہاں۔ تم۔” وہ جواب دیتی ہے۔ اس کی آواز برف کی سل کی طرح گرتی ہے۔

“تمہیں اپنے متعلق خوش فہمی ہے کیا؟”

“تمہیں ہے، مجھے نہیں۔ میں خوش فہمیوں کی دنیا سے نکل آئی ہوں۔”

میں رک جاتا ہوں۔ “میں تمہارے ساتھ نہیں چلوں گا۔”

“تھینک یو---” وہ جواب دیتی ہے اور تیز چلنے لگتی ہے۔

“تھینک یو--- کس بات پر؟” میں چلاتا ہوں۔

“میں تمہارے ساتھ چلنا پسند نہیں کرتی۔” وہ پیچھے مڑے بغیر جواب دیتی ہے۔

غصے سے میری کنپٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ میں اس کے پیچھے بھاگتا ہوں۔ “میرے ساتھ چلنے میں کیا ہے؟ بولو۔”

“تم ساتھی نہیں ہو۔”

“لیکن کیوں؟” میں اسے کندھوں سے پکڑ لیتا ہوں۔

“تم اپنی میں سے بھرے ہوئے ہو۔ اتنے بھرے ہوئے ہو کہ دوسرے کی گنجائش نہیں۔ تم توجہ دے نہیں سکتے۔ خود توجہ طلب ہو۔”

“تم مجھے جانتی ہو کیا؟”

“جانتی نہیں۔” وہ جواب دیتی ہے۔ “تمہارے ماتھے پر لکھا ہوا ہے۔”

“تم اسے پڑھ سکتی ہو کیا؟” میں طنزاً پوچھتا ہوں۔

“ہاں۔” وہ سر اٹھا کر جواب دیتی ہے۔ “میں عورت جو ہوں۔”

مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے سن کر دیا ہو۔ میں اپنے ہاتھ اس کے کندھوں سے اٹھا لیتا ہوں۔ میری گردن لٹک جاتی ہے۔

مجھے دیکھ کر اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ کہتی ہے۔ “میں تمہیں دکھانا نہیں چاہتی۔ دل میلا نہ کرو۔ سچ سننے کی ہمت پیدا کرو۔”

اس نے پہلی بار نگاہیں اٹھائی ہیں۔ مجھ پر بھرپور نظر ڈالی ہے اور مسکرا دی ہے۔

دفعتاً نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ کچھ ہو گیا ہے۔ رنگ پچکاری چل گئی ہے۔ پیڑ تن گئے ہیں۔ پتے ہرے ہو گئے ہیں۔ بتیاں روشن ہو گئی ہیں۔

چاند کی چاندنی نے سارے منظر کو بھگو دیا ہے۔

میرے اردگرد اک بھیڑ لگ گئی ہے۔

وہ چل پڑتی ہے۔

"رک جاؤ۔ رک جاؤ۔" میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا ہوں۔

پیچھے پیچھے چلنے کا میرا یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ زندگی میں، میں بار بار پیچھے پیچھے چلا ہوں۔ مجھ میں یہ صلاحیت نہیں کہ کسی کو پیچھے لگا سکوں۔ دراصل میں ازلی طور پر پیچھے چلنے والوں میں سے ہوں۔

میرا عشق پیچھے چلنا ہے۔

جو میرے پیچھے چلتی ہے، وہ دل سے اتر جاتی ہے۔

جب تک میں پیچھے پیچھے چلتا ہوں، جنون قائم رہتا ہے۔

جب ساتھ ساتھ چلنے کا موقع آتا ہے، قدم اکھڑ جاتے ہیں۔

سالہا سال پہلے یہی بات مجھے اماں نے بتائی تھی۔ لیکن اماں کی بات میں نے کبھی نہ سنی تھی۔ اماں کی بات پر میں کیسے سوچتا۔ میں تو بات بات پر اماں سے کہا کرتا تھا۔ "اماں تم نہیں سمجھتیں۔" جو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اس کی بات پر سوچنا کیسا۔ اماں کی بات کو میں نے کبھی نہ جانا تھا۔ اور جانا ہی نہیں تھا تو ماننا کیسا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ بدلتے موسم کی ہوا چل رہی تھی۔ گرتے پتے کھڑ کھڑ کر رہے تھے۔ اداسی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اس چھوٹے سے گھر میں ہم تین رہتے تھے۔ ننھا منیر دیوار سے لگا۔ بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ میں ٹین کی کرسی پر بیٹھا دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے، فضا کو گھور رہا تھا۔ بوڑھی اماں دیوار سے ٹیک لگائے آلو چھیل رہی تھی۔

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

دفعتاً" اماں بولی - "ایسے کیسے چلے گا بیٹے؟"

میں نے سر اٹھایا۔ "ایسے کیسے کیا اماں؟"

"کب تک وہ دیوار سے لگا کھڑا رہے گا؟" اس نے منیر کی طرف اشارہ کیا۔ "تو دونوں ہاتھوں میں سر تھامے زمین کو گھورتا رہے گا۔ اور اس میں......" وہ رک گئی۔ "مجھ سے اب یہ کچھ نہیں ہوتا بیٹے۔"

"کیا کریں اماں؟"

"کوئی گھر والی لے آنا۔"

"کیسے لے آؤں؟ ملے تو لاؤں؟ ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"نہ نہ نہ۔" وہ بولی۔ اس کا چہرہ یوں پھوٹ گیا جیسے شیشہ تڑخ جاتا ہے۔ آواز میں منت

بھری ٹوٹ جھلکی۔ "نہ بیٹے نہ۔ اللہ کے واسطے ڈھونڈ میں نہ پڑنا۔"

"کیوں اماں؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی پسند آ گئی تو تو اس کے پیچھے بھاگے گا۔" وہ رک گئی۔ انگلی سے آنسو پونچھا۔ "پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ سولہ سال تو اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا تھا۔ پھر جب وہ مل گئی تو ساتھ ساتھ نہ چل سکا۔" وہ رک گئی۔

"جو پیچھے بھاگنے والے ہوتے ہیں بیٹا، وہ ڈرتے ہیں کہ مل نہ جائے۔ پیچھے بھاگنے کی لذت ختم نہ ہو جائے۔" وہ چپ ہو گئی۔ میں سوچنے لگا۔ بات سامنے دھری تھی پر میرے پلے نہ پڑی تھی۔

اب میں نے جانا ہے کہ سامنے دھری نہیں دکھتی۔ جو ڈھونڈ کا رسیا ہو، اسے سامنے دھری کیسے دکھے۔

دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے۔

پھر اماں اٹھی۔ میرے پاس آئی۔ ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔ تھپک کر بولی۔ "بیٹے تو سب کچھ جانتا ہے۔ پر خود کو نہیں جانتا۔ میں تجھے جانتی ہوں۔ مجھے پتا ہے۔"

"تو مجھے کیسے جانتی ہے اماں؟"

"تو اپنے ابا پر گیا ہے نا۔ ہو بہو وہی ہے اور میں نے ساری زندگی اس کے ساتھ گزاری ہے۔ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ پیچھے بھاگنا محبت ہے۔ بس وہ بھاگتا ہی رہا زندگی بھر۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ دیر تک کھڑی میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی رہی۔ اور میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"اماں۔" میں نے خاموشی توڑی۔ "محبت کیا ہوتی ہے؟"

کچھ دیر کے لئے وہ خاموش رہی۔ پھر بولی۔ "بیٹے محبت دوڑ بھاگ نہیں ہوتی۔ طوفان نہیں ہوتی۔ سکون ہوتی ہے۔ دریا نہیں ہوتی۔ جھیل ہوتی ہے۔ دوپہر نہیں ہوتی۔ بھور سے ہوتی ہے۔ آگ نہیں ہوتی۔ اجالا ہوتی ہے۔ اب میں تجھے کیا بتاؤں کہ کیا ہوتی ہے۔ وہ بتانے کی چیز نہیں، بیتنے کی چیز ہے۔ سمجھنے کی چیز نہیں، جاننے کی چیز ہے۔"

اماں کی بات میرا راستہ روک لیتی ہے۔ میں رک جاتا ہوں۔ لیکن تڑپ بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہتا ہوں۔ دیکھتا رہتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید وہ مڑ کر دیکھے۔ پھر مسکرائے۔ پھر پھلجھڑی چل جائے۔ پھر کن کہہ دیا جائے۔

لیکن وہ چلے جاتی ہے۔ یوں چلے جاتی ہے جیسے کسی نے اس کا راستہ کاٹا ہی نہ ہو۔ جیسے

کسی کو پیچھے چھوڑ کر نہ جا رہی ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ اگرچہ میرے پاؤں رک گئے ہیں لیکن میں نہیں رکا ہوں۔ میں اس کے پیچھے چل رہا ہو۔ چلے جا رہا ہوں۔ اس کے پیچھے پیچھے چلے جا رہا ہوں۔

پتا نہیں۔ میں اس کے پیچھے کیوں چلے جا رہا ہوں۔

کوئی خواہش نہیں۔ آرزو نہیں جو پیچھے چلنے پر اکسائے۔ حصول کی خواہش نہیں۔ مطلب نہیں۔ مانگ نہیں۔

اسے دینے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

پوجا کے پھول سوکھ کر کانٹے بن چکے ہیں۔

بھینٹ چڑھانے کے لئے کچھ بھی تو نہیں ہے۔

پھر بھی میں چلے جا رہا ہوں۔

نہ مقصد نہ منزل۔

چلتے چلتے ایک دن وہ پھر نظر آ جاتی ہے۔

مجھے یقین نہیں آتا۔ آنکھیں ملتا ہوں۔

نظر تو وہ مجھے مسلسل آتی رہتی ہے۔ وہ مسکراہٹ، وہ رنگ پچکاری جیسے کسی نے کن کہہ دیا ہو۔ نہیں نہیں۔ فریب نگاہ نہیں۔ واقعی وہ پارک کے ایک کونے میں، درخت کے مقابل، زمین پر اکڑوں بیٹھی ہے۔ ہاتھ میں برش ہے۔ پہلو میں بہت سے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ روبرو ایک بڑی سی کینوس فریم پر لگی ہوئی، درخت کے سہارے کھڑی ہے۔

میں دبے پاؤں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوتا ہوں۔

ارے۔ یہ کینوس پر کیا بنا ہوا ہے؟ اس قدر خوف ناک چہرہ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ کوئی عفریت ہے۔ یہ کیا بنا رہی ہے؟ میں دل ہی دل میں سوچتا ہوں۔

دیر تک وہاں کھڑا رہتا ہوں۔ کھڑا رہتا ہوں۔

وہ مڑ کر دیکھتی ہے۔ ایک نظر غلط انداز--- سرسری--- اور پھر سے رنگ بھرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ جیسے پیچھے کوئی کھڑا ہی نہ ہو۔ انداز میں نہ تعجب ہے نہ لگاؤ۔ نہ لاگ۔

”یہ کیا بنا رہی ہو؟“ میں پوچھتا ہوں۔

”پورٹریٹ۔“ وہ منہ موڑے بغیر جواب دیتی ہے۔

”کس کی ہے؟“

”ہے کسی کی۔“

”کوئی عفریت ہے کیا؟“

”نہیں۔ عفریت نہیں۔“

”کس کے لئے بنا رہی ہو؟“

”میری اسائنمنٹ ہے۔“ وہ پیچھے دیکھے بغیر جواب دیئے جا رہی ہے۔

”کانٹوں سے بھری شبیہ ہے۔“

”ہاں تناؤ ہے۔ تلخی ہے۔ شدت ہے۔ مٹھاس نہیں۔ محبت نہیں۔“

”محبت تو شدت کے بغیر ممکن نہیں۔“ میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔

”نہیں۔ محبت شدت کی نفی ہے۔“ وہ پہلی بار مڑ کر میری طرف دیکھتی ہے۔ مسکراتی ہے۔ وہی رنگ پچکاری۔ فرحت سے بھری ایک پھوار سی اڑتی ہے۔ پورٹریٹ کی ساری تلخی دھل جاتی ہے۔

”تم شدت کو برا جانتی ہو؟“ میں پوچھتا ہوں۔

وہ میری طرف منہ موڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ کہتی ہے ”محبت ایک پرسکون کیفیت ہے۔ وجدان نہیں۔“ وہ زیر لب گویا خود سے کہتی ہے۔ ”بتائی نہیں جا سکتی۔ صرف بیتی جا سکتی ہے۔“

دفعتاً وہ میری طرف دیکھ کر چونکتی ہے۔ ”رک جاؤ۔ رک جاؤ۔“ وہ اٹھ کر میری طرف آتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے میری ٹھوڑی تھام لیتی ہے۔ پھر ٹھوڑی پر بائیں طرف انگلی رکھ کر پوچھتی ہے۔ ”یہ کیا ہے؟ سکار ہے یا تل ہے؟“

”تل ہے۔“ میں جواب دیتا ہوں۔

وہ پورٹریٹ کی طرف مڑتی ہے۔ برش اٹھاتی ہے اور شبیہ کی ٹھوڑی کے بائیں طرف کالا نقطہ لگا دیتی ہے۔

غصے سے میرا منہ سرخ ہو جاتا ہے۔ ”کیا مطلب۔ تمہارا مطلب ہے یہ میری........؟“ میں پورٹریٹ کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں۔ لیکن میرا گلا خشک ہو جاتا ہے۔

وہ میری طرف منت بھری نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ”سچ جاننے کا حوصلہ پیدا کرو۔“

دفعتاً پارک کے پھول انگاروں میں بدل جاتے ہیں۔ شعلے اٹھتے ہیں۔ پودے دھڑ دھڑ جلنے لگتے ہیں۔ منظر دھواں دھواں ہو جاتا ہے۔ میں اٹھ کر بھاگتا ہوں۔ بھاگتا رہتا ہوں۔ پتا نہیں کب تک بھاگتا رہتا ہوں۔

شام کو جب تھکا ہارا گھر پہنچتا ہوں تو دفعتاً لیٹے لیٹے میرے اندر کوئی کہتا ہے۔ ”تم خود

سے بھاگ رہے ہو۔" میں چوکنا ہو جاتا ہوں۔ یہ کیا ہوا؟ کیا میری "میں" کا ایک حصہ باغی ہو گیا ہے؟ ضرور اس لڑکی نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ میں خود کو اس کی نظر سے دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔

نہیں۔ میں خود سے نہیں بھاگ رہا۔ یہ جھوٹ ہے۔ غصے میں میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔ میری بیوی یہ سن کر گھبرا گئی ہے۔ پوچھتی ہے: "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" "اسے کیا جواب دوں؟"

اگلے روز صبح باتھ روم میں میری نگاہ آئینے پر پڑتی ہے تو میں چونک پڑتا ہوں۔ ارے یہ کیا؟ آئینے میں عفریت مجھے گھور رہا ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ میں نہیں۔ میں تو روز آئینہ دیکھتا ہوں۔

ہنسی کی آواز سن کر میں چونک جاتا ہوں۔

آئینے میں عفریت کے پیچھے ہاتھ میں برش پکڑے وہ ہنس رہی ہے۔ کہتی ہے: "تم روز آئینے میں وہ دیکھتے ہو جو تم دیکھنا چاہتے ہو۔ وہ نہیں جو تم ہو۔ وہ، جو تم سمجھتے ہو کہ ہو۔"

میں آئینے پر پتھر مارتا ہوں۔ تڑاخ کی آواز آتی ہے اور پھر باہر نکل جاتا ہوں۔

شام کو جب میں گھر پہنچتا ہوں تو میری بیوی ایک بڑا سا پیکٹ میرے ہاتھوں میں تھما دیتی ہے۔ کہتی ہے۔ "ایک خاتون دے گئی ہے۔" پیکٹ کاغذ میں لپٹا ہوا ہے۔

میں کاغذ پھاڑتا ہوں--- ارے۔ وہی پورٹریٹ۔ پورٹریٹ کے کونے میں "عینی" لکھا ہوا ہے۔

تصویر کو دیکھ میری بیوی ہونٹوں پر انگلی رکھ لیتی ہے۔ "ہئے یہ تو کوئی بھوت ہے۔"

میں اس کی بات کا جواب نہیں دیتا۔ تصویر کو الٹا کر کے دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہوں۔

کچھ دیر کے بعد اچانک جو میں ادھر دیکھتا ہوں تو سن ہو کر رہ جاتا ہوں۔ تصویر کینوس کی پشت پر ابھر آتی ہے۔

دیوانہ وار لپک کر میں تصویر کو اٹھا لیتا ہوں اور باہر نکل جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں۔ میں اسے ایسی جگہ پھینک آؤں گا جہاں کسی کی نظر نہ پڑے۔

سڑک پر اکا دکا موٹریں چل رہی ہیں۔ ایک ویگن آ کر رک گئی ہے۔ میری نگاہ اس کی پشت پر پڑتی ہے --- ارے---! یہ کیا---؟ ویگن کی پشت پر وہی تصویر بنی ہوئی ہے۔ گھبرا کر میں منہ موڑ لیتا ہوں۔ سامنے دیوار پر بھی وہی تصویر--- ارے---؟ میں بھاگ لیتا ہوں۔

جگہ جگہ ٹریفک سائنز پر وہی عفریت مجھے گھور رہا ہے۔

میں گھر کی طرف بھاگنا شروع کر دیتا ہوں۔

ڈرائنگ روم میں میرا دوست راجا شفیع میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں تصویر کو کمرے کی دیوار سے لگا کر راجا سے ہاتھ ملاتا ہوں۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی ہے۔

ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔

راجا بوڑھے ساتھی سے کہتا ہے۔ "حاجی صاحب میرا دوست آج کل بہت پریشان رہتا ہے۔ اس کے لئے دعا کریں۔"

"کیا پریشانی ہے؟" حاجی پوچھتا ہے۔

"میں ایک الجھن میں پھنسا ہوں۔" میں جواب دیتا ہوں۔ "وہ یہ کہ میں کون ہوں؟"

حاجی مسکرا دیتا ہے۔

میں اپنی بات کی وضاحت کرتا ہوں۔ کہتا ہوں۔ "میرا مطلب ہے۔ کیا میں وہ ہوں جو خود کو سمجھتا ہوں۔ یا وہ ہوں جو لوگ سمجھتے ہیں؟"

حاجی پھر مسکراتا ہے۔ کہتا ہے۔ "چاہے آپ یہ ہیں یا وہ ہیں۔ آپ جھنجھٹ میں کیوں پڑتے ہیں کہ آپ کیا ہیں؟ اپنی "میں" کا بوجھ اپنے کندھوں پر کیوں اٹھائے پھرتے ہیں۔ خواہ مخواہ۔"

دفعتاً" میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے کندھوں کا بوجھ گر گیا ہے۔ عین اس وقت شفیع چلا کر کہتا ہے۔ "ارے--- یہ کینوس تو خالی ہے۔"

میں پورٹریٹ کی طرف دیکھتا ہوں۔ کینوس واقعی خالی ہے۔

# دو مونہی

سوچتی ہوں کہ میں تیاگ کلینک میں گئی ہی کیوں؟ کیا فائدہ ہوا بھلا؟ اپنی بیماری دور کرانے کے لئے گئی تھی، ساری مخلوق کو بیمار کر کے آ گئی۔ وہی بات ہوئی نا۔ بڑھیا بڑھیا تیرا کبڑ دور ہو جائے یا ساری دنیا کبڑی ہو جائے۔

لیکن تیاگ بیتی سنانے سے پہلے میں اپنا تعارف تو کرا لوں۔ میں سانوری ہوں۔ تیس سال کی۔ سلمان سے میرج ہوئے دو سال ہوئے ہیں۔ لو میرج تھی۔ میرے خدوخال عام سے ہیں یعنی ایورج سے کچھ بہتر۔ ہاں ذہن کی تیکھی ہوں۔ کاٹھی مضبوط ہے جسم تنا تنا...... لیکن نہیں۔ میں غلط بیانی کر رہی ہوں۔ کسر نفسی سے کام لے رہی ہوں۔ میرے خدوخال ایورج سہی لیکن مجھ میں بڑا چارم ہے۔ راہ چلتے سر اٹھا اٹھا کر، گردن موڑ موڑ کر دیکھتے ہیں تو یوں دکھتے ہیں جیسے سر سے پاؤں تک الو کے پٹھے بن گئے ہوں۔ بس میں نہیں رہتے۔ کنٹرولز ہاتھ سے چھوٹ جاتے ہیں۔ ڈولتے ہیں۔ پتوار چھوٹ جائے تو کشتی ڈولتی ہے نا۔

میں لڑکی پن سے نکل آئی ہوں۔ لیکن ابھی لڑکی ہی ہوں۔ عورت نہیں بنی۔ اللہ نہ کرے کہ بنوں۔

عجیب سا عالم ہے۔ جیسے شام کو ڈسک ہوتی ہے، رات نہیں پڑی۔ دن بھی نہیں رہا لیکن دن دن سا لگتا ہے۔

اور ایک بات تو میں بھول ہی گئی۔ مجھ میں ایک عجیب سی بات ہے۔ جیتی ہوں۔ بھرپور جیتی ہوں۔ تھری ڈائمنشنل زندگی سے عشق ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خود کو جیتے ہوئے دیکھتی بھی ہوں۔ پرکھتی رہتی ہوں۔ سیانے کہتے ہیں، دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں ہوتیں۔ نہیں ہو سکتیں۔ یا تو جیو یا خود کو جیتے رکھو۔ وہی ایٹ دی کیک اینڈ ہیو اٹ والی بات ہے۔ پتا نہیں میری بات کیوں الگ ہے۔ کیک کھاتی بھی ہوں، پاس بھی رکھے رہتا ہے۔

ہئے۔ مصیبت ہے۔ بڑی مصیبت ہے۔ اپنے برتاؤ کی تفصیلات پر نظر رکھنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مثلاً" میں جھوٹ بولتی ہوں۔ ساری دنیا بولتی ہے۔ میں کس شمار قطار میں ہوں بھلا۔ لوگوں کے لئے جھوٹ ایک معصوم سی چمکیلی سی آرام دہ بات ہے۔ ہئے ایسا ہے مجھے تو پتا نہ تھا۔۔۔ لو میں نے خط لکھا تھا۔ پتہ نہیں کیوں نہیں ملا۔ نہیں نہیں۔ مجھے تو اس لڑکے سے جذباتی لگاؤ نہیں۔ ایسے ایسے آرام دہ جھوٹ۔ لیکن ایسے جھوٹ میرے لئے آرام دہ نہیں ہوتے۔ کانفلکٹ کا باعث بن جاتے ہیں۔ ادھر جھوٹ بولا، ادھر اندر سے آوازے اٹھے۔ جھوٹ۔ جھوٹ۔ جھوٹ۔

نہیں۔ یہ مثال غلط ہے۔ مجھے یہ مثال نہیں دینی چاہئے تھی۔ میں نے تو کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں۔ کیوں بولوں؟ جھوٹ وہ بولتے ہیں جنہیں ڈر ہوتا ہے کہ سننے والے کو سچ کڑوا لگے گا اور وہ تھو تھو کرے گا۔ میں تو ان لڑکیوں میں سے ہوں جن کے منہ سے کڑوا سچ سن کر بھی سننے والا بدمزہ نہیں ہوتا۔ پھر جھوٹ بولنے کا فائدہ؟ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ مجھ میں بڑا چارم ہے۔ راہ چلتے کوئی بانکا اچھا لگے تو ایسی چھلکی چھلکی بھرپور نگاہ ڈالتی ہوں کہ اس کا سارا کلف اتر جاتا ہے۔ "گویا" ہو کر گر پڑتا ہے۔ پھر میرے اندر سے آواز آتی ہے۔ "تت تت۔ بے چارہ۔ اپنے آپ سے بھی گیا۔"

مجھے پتہ ہے کہ میں بڑی طاقت ور نگاہ رکھتی ہوں۔ اتنی سادگی سے نخرہ کرتی ہوں کہ کوئی اسے نخرہ مان ہی نہیں سکتا۔ سمجھتا ہے انوسنس ہی انوسنس ہوں۔ میک اپ کرتی ہوں لیکن کیا مجال کوئی سمجھے کہ میڈ اپ ہے۔ سمجھتے ہیں، میک اپ سے بے نیاز ہوں۔ لو۔ وہ میک اپ ہی کیا جو میک اپ نظر آئے۔ پھٹے منہ ایسے میک اپ کا۔

بس میری طرح ایک ہی مشکل ہے۔ میرے اندر کچھ ہے۔ پتہ نہیں کیا ہے۔ پر ہے۔ جس طرح مدفون خزانے پر سانپ ہوتا ہے۔ جس طرح اہرام مصر کے اندر جادو ٹونا کیلا ہوا ہے۔ ویسا ہی کچھ ہے۔

اونہہ۔ غلط کہہ گئی۔ میرے اندر ایک نہیں، دو ہیں۔ دو روحیں ہیں۔ کبھی ایک کنٹرول پر بیٹھ جاتی ہے کبھی دوسری۔ میں دو مونہی سانپ کی طرح ہوں۔ کبھی دو مونہی دیکھی ہے؟ اس کے دو سر ہوتے ہیں۔ ایک سر کی جانب، دوسرا دم کی جانب۔ سر اٹھایا، چل پڑی۔ پھر رک گئی۔ سر زمین پر رکھ دیا۔ پھر دم والا سر اٹھایا اور اس جانب چلنے لگی۔ اس جانب، کبھی اس جانب۔ پتہ نہیں چلتا کہ کب کس جانب چلنے لگوں گی۔ پیش خبری سے عاری ہوں۔ مطلب کہ Unpredictable ہوں۔ بس یہی میری مشکل ہے۔ یہی میری بیماری ہے۔

لیکن ٹھہریئے۔ شروع شروع میں مجھے پتہ نہ تھا کہ Unpredictability بری چیز ہے۔ الٹا میں تو سمجھتی تھی کہ یہ بڑی پیاری خصوصیت ہے۔ آپ کو کیا پتا' جوان لڑکی ہو۔ چھیڑ دینے والی نگاہ ہو۔ بے نیازی سے مخمور ہو۔ اوپر سے برتاؤ Unpredictable ہو۔ پھر تو وہ تلوار بن جاتی ہے۔

بچپن سے ہی دو دلی تھی۔ کبھی تو اپنی مس اتنی اچھی لگتی۔ اتنی اچھی لگتی کہ میں اس کے وارے نیارے جاتی۔ کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھتی تو ایسے دکھتی جیسے اکتائی تھکی ہاری بے جان عورت ہو۔ کبھی ماں باپ بڑے پیارے لگتے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے قصائی ہوں۔

دو ایک محبتیں بھی ہوئیں۔ کبھی محبت کے جذبات سے چھلکتی' چھلکے جاتی۔ کبھی سوکھی کاٹھ ہو کر رہ جاتی۔

یہ دو دھاری پن بچپن ہی سے موجود تھا۔ دو سوادی تھی۔ کھٹ میٹھی۔ گنگا جمنی۔ گرم ٹھنڈی۔ الٹی سیدھی۔ سبھی کچھ تھی لیکن ان دنوں میں اس بات کو اہمیت نہ دیتی تھی۔ جوان ہوئی تو دو موہنی ابھرتی آئی۔ ابھرتی آئی--- چھا گئی۔ پھر دفعتا" مجھے احساس ہوا۔ ڈر گئی۔ بری طرح سے ڈر گئی۔

ان دنوں میں سلمان کی محبت میں چور تھی۔ اتنی لت پت تھی کہ دوسرا سر اٹھانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس دیوانگی میں ڈیڑھ سال گزر گیا۔ پھر ایک روز میں نے جو سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے سلمان نہ تھا۔ پتا نہیں کون تھا۔ نہ وہ رنگ۔ نہ وہ روپ۔ بے جان۔ جس سے مشک کافور کی بو آتی تھی۔ میں ڈر گئی۔ اپنی دنیا تباہ ہونے کے خوف سے ڈر گئی۔ خود کو بچانے کے لئے میں نے جھٹ پٹ سلمان سے شادی کر لی۔ شادی کی ہماہمی میں بات پھر چل نکلی۔

بہرحال مجھے احساس ہو گیا کہ یہ ایک بیماری ہے۔ میں مینٹل ہوں۔ میں نے اس احساس کو بہت دبایا۔ جتنا دباتی' اتنا ابھرتا۔ میں نے بڑے جتن کئے۔ ڈاکٹروں سے ملی۔ ہسپتالوں میں اس قدر گھومی پھری کہ لوگ مجھے ہاسپٹل واکر سمجھنے لگے۔ سپیشلسٹ کیا دوا دیتے' انہوں نے میری بیماری کو سمجھا ہی نہیں۔ میں نے بہت سمجھایا لیکن سمجھانا آسان ہوتا ہے' سمجھنا بہت مشکل۔ ڈاکٹروں سے مایوس ہو گئی۔

شادی سے پہلے تو سلمان میری Unpredictable پر اس قدر مسحور کن ہوتا تھا جیسے سانپ بین پر ہوتا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ شادی کے بعد بھی یوں ہی پھن پھیلا کر میرے ہیرے پھیرے لیتا رہے گا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا' اس کا پیش خبری کا مطالبہ بڑھتا گیا۔ اسے میرے دو موہنی پن پر غصہ آنے لگا۔ میں گھبرا گئی۔ سوچتی رہی۔ سوچتی رہ۔ ادھر میں بھی تو ایک نہ تھی۔ میرے اندر کی دوسری میرے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔ ہٹاؤ سلمان کو۔ کوئی اور سہی جو تیرے دو موہنی پن پر مسحور ہو جائے۔ اپنے گرد کوئی اور پھن پھلا دیکھو۔ دنیا میں نوجوان سبھی اولتی بدلتیوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ یہ سر زمین پر رکھ دو۔ دوسرا اٹھاؤ۔

دوسرا سر اٹھا کر سلمان کی طرف دیکھتی تو وہ سپاٹ نظر آتا۔ روکھا پھیکا۔ ہئے--- کیا میں اس پر جان دیتی رہی؟

پھر وہ واقعہ پیش آگیا اور میں لرز کر رہ گئی۔

ایک روز سلمان کا ایک نیا دوست گھر آگیا۔ اس وقت سلمان موجود نہ تھا۔ میں تو اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ وہی--- وہی دو سال پہلے کا سلمان جسے دیکھ کر خود کو میں نے اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ وہی رنگ' وہی روپ' وہی شوخی' وہی تازگی۔ میں نے انجانے میں ایک بھرپور چھیڑنے والی نگاہ ڈال دی۔ اس نے پھن پھیلایا۔ اور بین کے ہیرے پھیرے لینے لگا۔ عین اس وقت سلمان آگیا۔ میں جاگ پڑی۔ ہوش میں آئی تو دیکھا کہ میری "میں" الٹ پلٹ ہو رہی ہے۔ ڈر گئی۔ بری طرح سے ڈر گئی۔ اس روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ تیاگ کلینک جاؤں گی۔ ضرور جاؤں گی۔ چاہے کچھ ہو جائے۔

چھ مہینے پہلے تیاگ کلینک کے متعلق میری ایک سہیلی نے مجھے بتایا تھا۔ وہ خود ذہنی بیماری میں مبتلا تھی۔ ایک مہینہ تیاگ کلینک میں زیر علاج رہی۔ صحت مند ہو کر لوٹی۔

دو پہاڑیوں میں تیاگ ایک قصبہ تھا۔ وہاں ڈاکٹر داؤد نے ذہنی بیماروں کے لئے ایک ہسپتال کھول رکھا ہے۔ ڈاکٹر داؤد ایک زمیندار ہے۔ ولایت سے ایم ڈی کر کے آیا ہے۔ مقصد پریکٹس کرنا نہیں بلکہ علاقے کے لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔ عمر بھر کے تجربے اور تحقیق کے بعد اس نے اپنا طریق علاج ڈسکور کیا ہے۔ جڑی بوٹیوں اور مش رومز سے علاج کرتا ہے۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ دور دور سے مریض آتے ہیں۔ ان کی رہائش کے لئے ڈاکٹر نے ایک ہوسٹل تعمیر کیا ہے۔

یہاں تک تو بات ٹھیک تھی لیکن میری سہیلی نے بتایا ہے کہ علاج شروع کرنے سے پہلے وہ مریضوں سے زبانی اور تحریری حلف لیتا ہے کہ علاج کے دوران میں بغیر چون و چرا ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کروں گا۔ اس دوران میں ذاتی سوچ و بچار کو عمل میں نہیں لاؤں گا۔ میں سچے دل سے اپنی ول سرنڈر کرتا ہوں۔ یہ سن کر میں ڈر گئی۔ نہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ میں سبھی کچھ تیاگ سکتی ہوں' اپنی ول نہیں تیاگ سکتی۔ میرے پاس لے دے کر اک "میں" ہی تو ہے۔ اسے میں کیسے تیاگ دوں؟ کیسے کسی دوسرے شخص کے تابع کر دوں؟ نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو

سکتا۔ میری سہیلی نے مجھے بہت سمجھایا کہ ذہنی بیماری کے علاج میں سب سے بڑی رکاوٹ ”میں“ ہی تو ہوتی ہے۔ اس نے بڑی دلیلیں دیں۔ لیکن میں نہ مانی۔

اس سے کچھ دیر پہلے میرے چچا نے مجھے ایک بزرگ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ انہوں نے کہا کہ سانوری بیٹی ساری مشکلات دور ہو جائیں گی۔

بزرگ کی خدمت میں پہنچی۔ انہیں تفصیل سے اپنی ذہنی کیفیت سنائی۔ سن کر بولے۔ ”بیٹی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہماری بیعت کر لو۔“

”بیعت کیا ہوتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

بولے۔ ”بیعت کا مطلب ہے۔ حوالگی، سپردگی۔ خود کو ہمارے سپرد کر دو۔“

”کیسے سپرد کر دوں؟“ میں نے پوچھا۔

”بولے۔ ”اپنی میں تیاگ دو۔ سارا شر تمہاری میں کا ہے۔ وہ خود سر ہو گئی ہے۔ بٹ کر دو ہو گئی ہے۔ جیسے سانپ کی زبان بٹ کر دو ہو جاتی ہے۔“

غصے میں، میں کھولنے لگی اور جواب دیئے بغیر بھاگ آئی۔

ہاں تو اس روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ تیاگ کلینک جاؤں گی۔ لیکن حلف نہیں اٹھاؤں گی۔

اس رات میں نے سلمان سے کہا۔ ”سلمان میں ایک مہینے کے لئے ہل سٹیشن جانا چاہتی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے اکیلی رہوں۔ کسی ایسے پہاڑی مقام پر جہاں بھیڑ بھڑکا نہ ہو۔ کراؤڈ نہ ہو۔“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر بولا کہ دیکھو اگر واقعی تم تن تنہا رہنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

تیاگ کا سفر خاصا دشوار تھا۔ پہلے تو گلیات کی طرف جانا پڑا۔ رات وہاں ٹھہری۔ پھر پھول گلی سے تیاگ جانے والی سوزوکی مل گئی۔ سڑک بہت تنگ اور نیم پختہ تھی۔ ساٹھ میل کا سفر سات گھنٹوں میں طے ہوا۔ شکر ہے کلینک سے ملحقہ ہوسٹل میں جگہ مل گئی۔ رات گویا گھوڑے بیچ کر سوئی۔ اگلے دن نو بجے کے قریب کلینک پہنچی۔ ایک گھنٹہ ریسپشن میں انتظار کرنا پڑا۔ پھر ڈاکٹر نے اندر بلا لیا۔

اپنے روبرو ایک نوجوان ڈاکٹر کو دیکھ کر میں حیران ہوئی۔ سہیلی کی باتیں سن کر میں سمجھی تھی کہ ڈاکٹر داؤد معمر آدمی ہو گا۔

”آپ ڈاکٹر داؤد ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں ان کا بیٹا ڈاکٹر خالد ہوں۔“ وہ بولا۔ ”والد صاحب انتقال کر گئے ہیں۔ اب میں ان کی جگہ کام کر رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے خالد نے ایک لمبا سا کاغذ اٹھا لیا۔ بولا۔ ”سب سے پہلے اپنی کیس ہسٹری لکھوا دیجئے۔ ہر وہ تفصیل بتائیے جسے آپ اہم سمجھتی ہیں۔“

پتا نہیں اس وقت میرے ذہن میں یہ بات کیسے آئی۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ یہ بتائیے مجھے کہ اس گاؤں کا نام تیاگ کیوں ہے؟

وہ مسکرایا۔ کہنے لگا۔ ”بس نام ہے۔ جس طرح آپ کا نام سانوری ہے حالانکہ آپ گوری ہیں۔“ تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے پھر سے بات شروع کی۔ کہنے لگا۔ ”والد صاحب کا اس کے متعلق ایک نظریہ تھا۔ مفروضہ کہہ لیجئے۔“

میں پھر سے بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر خالد میں مجھے ایک بے نام سی کشش محسوس ہونے لگی تھی۔

”بتائیے نا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ مفروضہ کیا تھا؟“ لیکن پہلے تو یہ بتائیے کہ تیاگ کا مطلب کیا ہے؟“

کہنے لگا۔ ”تیاگ ہندی کا لفظ ہے۔ مطلب ہے، چھوڑ دینا۔ ترک کر دینا۔ یہ قصبہ ہندوؤں نے آباد کیا۔ اوپر ٹیلے پر ایک مندر بنا ہوا تھا۔ مندر کے ساتھ ایک عمارت ہے۔ غالباً اس عمارت کا نام تیاگ بھون تھا۔“ وہ رک گیا۔

”والد صاحب کا نظریہ بھی تو بتائیے نا۔“ میں نے پوچھا۔

مسکرا کر بولا۔ ”والد صاحب کا کہنا تھا کہ پہاڑوں کی بلندی کا انسانی جذبات سے گہرا تعلق ہے۔ جوں جوں نیچے اترو۔ جذبات کی شدت بڑھتی جاتی ہے۔ وہ گاڑھے ہو جاتے ہیں۔ بوجھل۔ بھاری۔ جوں جوں اوپر جاؤ۔ جذبات میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔ مٹھاس پیدا ہوتی ہے۔ نیچے لاگ لگاؤ بڑھتے ہیں۔ اوپر بے نیازی کا سماں پیدا ہوتی ہے۔

والد صاحب کہا کرتے تھے، دس ہزار کی بلندی پر بھور سمے کا عالم ہوتا ہے۔“

”بھور سمے کیا؟“

”جس طرح صبح سویرے ڈان کے وقت سپیدی سی ہوتی ہے۔ ایک عجیب سا سکون، اطمینان، نروان۔ دس ہزار کی بلندی پر جذبات کی ایسی کیفیت ہوتی ہے۔ نیچے کے لوگ تالاب میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اوپر خواہش تو ہوتی ہے۔ پر اس میں ڈنگ نہیں ہوتا۔ نیچے انسان کی ”میں“ میں اتنا ملبہ ہوتا ہے کہ وہ پتھر بن جاتی ہے۔ اوپر روئی کے گالے جیسی ہلکی پھلکی رہتی ہے۔ نیچے محبت و نفرت دونوں میں دھار ہوتی ہے۔ اوپر نفرت بھی ہوتی ہے، محبت بھی۔ لیکن دھار نہیں ہوتی۔“

"اوپر سے آپ کی کیا مراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آٹھ دس ہزار کی بلندی۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ کو حیرت ہو گی کہ یہاں تیاگ میں کوئی ذہنی بیماری نہیں ہوتی۔ ذہنی بیماریاں نیچے جنم لیتی ہیں۔ وادیوں میں، میدانوں میں۔ ایک بات یقینی ہے ذہنی بیماری "میں" سے پھوٹتی ہے۔ "میں" میں گرہیں لگ جاتی ہیں۔ آپ ایک سال یہاں قیام کریں۔ ساری گرہیں کھل جائیں گی۔ آپ ہی آپ ڈنک نکل جائیں گے۔ دھاریں کند ہو جائیں گی۔"

میں خالد کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس میں سے ایک عجیب سا اطمینان چھن چھن کر کمرے کی فضا کو منور کئے جا رہا تھا۔ اس کی باتیں میرے لئے بہت انوکھی تھیں۔ میری "میں" پلپلی ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے ایک شدید کوشش کی۔ اٹھ بیٹھی۔ "تھینک یو۔"

اس رات میں اپنے کمرے کی ٹیرس پر بیٹھی رہی۔ بیٹھی رہی۔ پتا نہیں کب تک بیٹھی رہی۔ میں محسوس کر رہی تھی جیسے میرا وزن کم ہوتا جا رہا ہو۔ میرا تعلق دھرتی سے کٹتا جا رہا ہو۔

اگلے روز ڈاکٹر خالد نے کہا۔ "میں نے آپ کا کیس سٹڈی کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ دو ہفتے میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ آج سے آپ کا علاج شروع ہو جائے گا۔ علاج شروع کرنے سے پہلے آپ کو ایک فارمیلٹی ادا کرنی ہو گی۔ یہ ایک حلف ہے۔" اس نے ایک چھپا ہوا کاغذ اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ایک تو ہاتھ اٹھا کر یہ حلف پڑھئے اور دوسرے اس فارم پر دستخط کر دیجئے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔" میں نے کہا۔ "میں اپنی "میں" کسی کے حوالے نہیں کر سکتی۔"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اس حیرت میں ستائش بھی شامل تھی۔ میں نے جواب میں ایک بھرپور نگاہ چھلکائی لیکن خالد پر کلف تھا ہی نہیں جو ٹوٹتا۔ ہاں ذرا سا لڑکھڑایا ضرور تھا۔

کہنے لگا۔ "مسز سلمان۔ تمام ذہنی بیماریاں "میں" سے پھوٹتی ہیں۔ یا تو "میں" میں گرہیں لگ جاتی ہیں یا دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ یا کانٹے اگ آتے ہیں۔ اس لئے "میں" کو تیاگے بغیر شفا نہیں ہوتی۔"

"نہ ہو شفا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ مجھے سمجھانے لگا۔ بولا۔ "سائیکی ایڑی میں بھی ڈاکٹر مریض کی توجہ ذات کی جانب سے ہٹا کر اپنی جانب مبذول کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر مریض لڑکیوں کو ڈاکٹر سے محبت ہو جاتی ہے۔"

مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ "ڈاکٹر خالد۔ میں اتنی دور چل کر آپ سے محبت رچانے نہیں آئی۔" پھر میں نے ایک ایسی نظر اس پر ڈالی جس کا مطلب تھا۔ "آپ بے شک مجھ سے محبت رچائیں۔"

وہ گھبرا گیا۔ کہنے لگا۔ "اچھا آپ یوں کریں کہ آٹھ دس روز یہاں قیام کریں اور اس مسئلہ پر سوچیں۔ شاید.........." وہ رک گیا۔

"کیا آپ حلف لئے بغیر علاج شروع نہیں کر سکتے؟" میں نے پوچھا۔

"حلف علاج کا ایک حصہ ہے۔ اہم ترین حصہ۔" وہ چڑ کر بولا۔

"خدا حافظ۔" میں اٹھ بیٹھی۔

شام کے وقت جب میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی تو دروازہ بجا۔ میں نے بن سوچے سمجھے کہہ دیا۔ "کم ان۔" میرے سامنے ڈاکٹر خالد کھڑا تھا۔

"بیٹھئے۔" میں نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پوچھے گا، کہے آپ نے کیا فیصلہ کیا۔ لیکن اس نے آتے ہی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ بولا۔ "وہ سامنے ٹیلے پر جو جنگل ہے، اس جنگل میں عجیب و غریب قسم کے مشروم اگتے ہیں۔ مثلاً ایک مشروم ہے جو ٹہلتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"ایک فٹ کے دائرے میں ٹہلتا ہے۔ صبح یہاں ہے۔ دوپہر کو آدھ فٹ سرکا ہوا۔ شام کو پورا ایک فٹ۔"

میں ہنسی۔ "اب مجھے الف لیلوی کہانیاں نہ سنائیے۔"

وہ مسکرایا۔ بولا۔ "حقیقت، ریلٹی آدھی سے زیادہ الف لیلوی ہے۔ آپ خود الف لیلوی برتاؤ بیت رہی ہیں۔"

"دو رخی برتاؤ۔" اس نے جواب دیا۔ اس کے بعد دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وہ مجھے عجیب و غریب قسم کے مشرومز کے متعلق بتاتا رہا۔

جب وہ جانے لگا تو میں نے پوچھا۔ "آپ مشرومز سے علاج کرتے ہیں؟"

کہنے لگا۔ "ہاں۔ بیشتر۔"

میں نے پوچھا۔ "مشروم کیسا اثر رکھتا ہے؟"

کہنے لگا۔ "سب سے پہلے مریض کو ہم وہ مشروم دیتے ہیں جو مریض کی "میں" سے پھونک نکال دے۔" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اسی رات خانساماں کھانا لے آیا تو کہنے لگا۔ "بیگم صاحبہ ڈاکٹر خالد کبھی ہوسٹل میں نہیں

آئے تھے۔ آج پہلی مرتبہ انہیں ہوسٹل میں دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا۔” خانساماں کی بات سن کر میری “میں” میں پھونک اور بڑھ گئی۔

اگلے روز شام کو وہ پھر آگیا۔

میں نے پوچھا۔ “ڈاکٹر آپ شادی شدہ ہیں کیا؟”

اس نے نفی میں سرہلا دیا۔ کہنے لگا۔ “میں لیڈی ڈاکٹر سے شادی کروں گا۔ ہمارے طریق علاج کو اپنا لے۔”

میں نے اسے چھیڑا۔ “اور اپنی “میں” چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر آپ کو بھینٹ کر دے۔”

“نہیں۔” وہ مسکرایا۔ “میں اپنی “میں” چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر اسے پیش کروں۔ وہ اسے قبول کرلے محترمہ۔” وہ بولا۔ “محبت کیا ہے؟ اپنی دل سرنڈر کر دینا۔ اپنی “میں” دوسرے کے تابع کر دینا۔”

“ساری دنیا محبت کرتی ہے۔” میں نے طنزاً کہا۔ “لیکن...............”

“اونہوں۔ وہ محبت نہیں ہوتی۔ خواہش ہوتی ہے۔ حرص ہوتی ہے۔ اور زیادہ تر محبوب سے نہیں بلکہ اپنی انا سے محبت ہوتی ہے۔ محبوب تو ایک بہانہ ہوتا ہے۔ ایک پردہ ہوتا ہے۔ ایک ڈیلوژن۔ آپ سمجھتی ہیں کہ آپ نے سلمان سے محبت کی ہے۔ اگر آپ سچے دل سے سلمان سے محبت کرتیں تو دو رخی مدت سے ختم ہو چکی ہوتی۔ آپ کو تیاگ میں آنے کی زحمت نہ کرنا پڑتی۔”

پھر دفعتاً اس نے موضوع بدلا۔ کہنے لگا۔ “صبح کے وقت آپ کیا کرتی ہیں؟” کلینک میں آجایا کیجئے۔ مریضوں کی کیس ہسٹریاں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ دلچسپ اور بصیرت افروز۔”

اگلے روز میں کلینک میں جا بیٹھی۔ ڈاکٹر خالد مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا لیکن اس نے اظہار نہ کیا۔ کہنے لگا۔ “آج ایک ہی مریض ہے۔ بہت دور سے آیا ہے۔ بہت بڑا عابد ہے۔”

“کیا تکلیف ہے اسے؟” میں نے پوچھا۔

“پتا نہیں۔” بولا۔ “ابھی آکر آپ کے سامنے بیان کرے گا۔”

عین اسی وقت ایک باریش نورانی شخص کمرے میں داخل ہوا۔ “اسلام علیکم۔”

“وعلیکم السلام۔” ڈاکٹر نے جواب دیا۔ “تشریف رکھئے۔ فرمائیے آپ کس طرح تشریف لائے ہیں؟”

بوڑھے نے بامعنی نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

“یہ میری اسٹنٹ ہیں۔” ڈاکٹر خالد نے کہا۔

یہ سن کر بوڑھا مطمئن ہو گیا۔

“فرمایئے؟” ڈاکٹر نے کہا۔

بوڑھے نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ “میری آپ بیتی بہت مختصر ہے۔”

“جی فرمایئے۔” خالد بولا۔

“میں نے گزشتہ بیس سال تخلیئے میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کی ہے۔ بیس سال۔” اس کی آواز جذبات کی شدت سے کانپی۔ وہ رک گیا۔ کمرے میں گہری بوجھل خاموشی چھا گئی۔ “صدیاں گزر گئیں.......... لیکن..........” اس کی آواز پھر گونجی۔

“لیکن.......... میں آج تک اللہ کو نہیں مان پایا۔ کوشش کے باوجود نہیں مان پایا۔ میں اس کے وجود کو دل سے قبول نہیں کر سکا۔” کمرے میں پھر سے بوجھل خاموشی چھا گئی۔

مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے سر پر پتھر دے مارا ہو۔ میری آنکھوں میں تارے ناچ اور پھر گھپ اندھیرا چھا گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ بوڑھا جا چکا تھا اور خالد سر جھکائے بیٹھا ہے۔

“ڈاکٹر خالد۔” میں نے کہا۔

وہ چونکا۔ بولا۔ “فرمایئے۔”

“میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔” میں نے جواب دیا۔

“کیا؟” وہ بولا۔

“میں کل صبح واپس جا رہی ہوں۔”

“میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے۔” ڈاکٹر خالد نے کہا۔

“کیا؟” میں نے پوچھا۔

“ہم حلف لئے بغیر آپ کا علاج کریں گے۔”

میں اٹھ بیٹھی۔ “شکریہ۔ ڈاکٹر۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔”

“تو کیا آپ علاج نہیں کرائیں گی؟”

“نہیں۔” میں دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ “اگر اپنی دل ہی سرنڈر کرنا ہے تو میں اس کی بھینٹ کیوں نہ کروں جس کے پردے میں، میں نے دو سال ٹوٹ کر اپنی انا سے محبت کی ہے۔ خدا حافظ ڈاکٹر۔”

# کہانی کی تلاش

تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ تھک کر چور ہو گیا تو میں رک گیا۔ وہ بھی رک گیا۔ سڑک کنارے ایک تھڑے پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔

مجھے اس کا ساتھ پسند نہیں۔ بڑا نکتہ چین ہے۔ بات بات پر ٹوکتا ہے۔ لیکن وہ میری مجبوری ہے۔ میں اس سے پیچھا چھڑا نہیں سکتا۔

میں نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ پاکستان کا حسین ترین شہر اسلام آباد میرے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔ کیوں نا اسلام آباد پر ایک کہانی لکھوں۔ دفعتاً مجھے خیال آیا۔

"اونہوں۔" وہ بولا۔ "یہ ہمارا شہر نہیں ہے۔"

"کیوں؟" میں نے غصے سے اسے دیکھا۔

"اس میں اپنوں کا رنگ نہیں ہے۔ بیگانہ ہے۔"

"اسلامی مملکت کا دارلخلافہ ہے بھئی۔"

"صرف نام کا اسلامی ہے۔ مساوات کا بیری ہے۔"

"ذات پات کا شوقین ہے۔ اونچ نیچ کا مارا ہوا۔"

"کون سی ذات پات؟" میں نے پوچھا۔

"عہدوں کی۔ گریڈوں کی۔ تم اس پر کہانی نہیں لکھ سکتے۔"

"کہانی تو اپنوں کی ہوتی ہے۔ بے گانوں کی نہیں۔"

میں نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔

دیر تک ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

میری مشکل یہ ہے کہ جب تک مرکزی خیال نہ ہو، میں کہانی نہیں لکھ سکتا۔ اگر

کہانی کے پاس کچھ کہنے کو نہیں تو کیا فائدہ۔ گونگی کہانی کو کوئی کیا کرے۔ پھر یہ بھی ہے کہ کہانی چیخ کر نہ بولے۔ لب نہ کھولے۔ آنکھ سے بولے۔ اکھ نال گل کر گئی۔

کئی ایک دن سے میں کہانی کی تلاش میں تھا۔ کیا لکھوں۔ کس موضوع پر لکھوں۔ ایسی بین بجاؤں کہ سانپ نکل آئے۔

وہ ہنسا بولا۔ "بغل میں کٹورہ۔"

"کہاں ہے کٹورہ؟" میں نے پوچھا۔

اس نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ "تم اس موضوع پر کیوں نہیں لکھتے؟ سارے لکھاڑ اس پر لکھتے ہیں۔ آج کا دور کا من بھاتا موضوع ہے۔ آج کے بوٹے پر لگا ہوا پھل ہے۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ درختوں کے پیچھے کچی آبادی تھی۔ انتظامیہ نے اسے درختوں اور دیواروں کے پیچھے چھپا رکھا تھا تاکہ دودھ میں مکھی کوئی دیکھ نہ لے۔

میں سڑک کے نیچے اتر گیا۔ درختوں کے جھنڈ سے دیکھا۔ وہاں بیس تیس جھونپڑے تھے۔ دو رویہ مکانوں کے درمیان میں کھلا میدان تھا۔ میدان میں یہاں وہاں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ تو لوگ بیٹھے تھے۔ حقے چل رہے تھے۔ بچے چارپائیوں کے اردگرد دوڑ رہے تھے، چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے۔ عورتیں اوپن ائیر باورچی خانوں میں چولہوں پر ہانڈیاں چڑھائے بیٹھی تھیں۔ ہاتھ چل رہے تھے۔ چوڑیاں چھنک رہی تھیں۔ باتیں ہو رہی تھیں۔

"ارے باؤ جی۔" قریب ہی سے آواز آئی۔ دیکھا تو پاس ہی ایک بڈھا بیٹھا جوتے گانٹھ رہا تھا۔

"کس سے ملنا ہے؟" مجھے اس نے پوچھا۔

"کسی سے بھی نہیں۔"

"پھر کیا دیکھ رہا ہے تو؟"

"دیکھ رہا ہوں، کتنی غربت ہے۔ کتنا دکھ ہے۔"

"کہاں ہے دکھ؟" وہ بولا۔ "یہاں تو میلہ لگا ہوا ہے۔ بابو جا۔ سارے اسلام آباد کا چکر لگا۔ گھوم پھر کے دیکھ۔ کہیں بھی ایسا میلہ نہیں لگا ہو گا۔ سب کمروں میں بند ہیں۔ نہ بول نہ بلارہ۔ بوہے بند۔ ہونٹ بند۔ دل بند۔

اور بابو یہ کچی آبادی جو تو دیکھ رہا ہے۔ یہ آبادی نہیں ہے۔ یہ تو ایک کنبہ ہے۔ ایک کو پیڑ ہووے ہے تو دوجا درد سے ہائے ہائے کرے ہے۔ ایک کا چولہا نہیں جلے ہے تو دوجا ہانڈی میں ایک مٹھ اور دال ڈال لے ہے۔ تو غربت کو کیا سمجھے ہے بابو۔ غربت میں

لگ اک دوجے کے نیڑے آجاویں ہیں۔ امارت میں دور ہٹ جاویں ہیں۔

اور تجھے پتہ ہے بابو۔ پاکستان پر کیا پتا پڑی ہوئی ہے۔ ہمیں جتنے کی ضرورت تھی۔ اس سے زیادہ مل گیا ہے۔ زیادہ مل جائے تو شر جاگ اٹھتے ہیں۔ فساد کے بلبلے پیدا ہو جاویں ہیں۔

”تو مسلمان ہے کیا؟“ بڈھے نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”پھر تو اس کو جانتا ہے؟“

”کس کو؟“

”وہ جو سب سے بڑا بندہ تھا۔ جو اللہ کا پیارا تھا۔ اللہ نے کہا میرے پیارے بندے۔ بول تو کیا چاہتا ہے۔ تو جو مانگے گا‘ ملے گا۔ جو چاہے گا‘ ہو گا۔ بتا امارت میں رہنا چاہے گا یا غربت میں۔ اس نے غربت مانگ لی۔ غربت میں کوئی صفت ہو گی تو اس نے غربت مانگی۔“

مایوس ہو کر میں پھر چل پڑا۔

کہانی ڈھونڈ میرے سر پر جنون بن کر سوار تھی۔

چلتے چلتے میں رک گیا۔ وہ بھی رک گیا۔

میرے سامنے وہ کھڑی تھی۔

گلاب کا ایک بوٹا‘ اوپر ایک ڈوڈی۔ ادھ کھلی‘ ادھ بند۔ ادھ گلابی‘ ادھ ہری۔

ہونٹ بند تھے۔ آنکھیں باتیں کر رہی تھیں۔

انگلیوں سے میگنیٹک لہریں نکل رہی تھیں۔

”آؤ۔“ وہ بولی۔ ”میں ہوں وہ کہانی جسے تم ڈھونڈ رہے ہو۔“

”اونہوں۔ مت جاؤ۔ مت جاؤ۔“ میرے ساتھی زیر لبی میں بولا۔ ”اس کی کہانی تو تم سالہا سال سے لکھ رہے ہو۔“

”میری کہانی۔“ وہ بولی۔ ”سبھی لکھ رہے ہیں۔ نہ جانے کب سے لکھ رہے ہیں لیکن کوئی لکھ نہیں پایا۔“

اگر میری کہانی لکھی جاتی تو آج میں صرف آرائش و زیبائش نہ سمجھی جاتی۔ میری حیثیت و یکھن دکھن تک محدود نہ ہوتی۔ تیرے بھائی بند مجھے خوش وقتی نہ سمجھتے۔“

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ مجھے سب باہر سے دیکھتے ہیں۔ کسی نے میرے اندر جھانک کر نہیں دیکھا۔ کسی نے مجھے نہیں جانا۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ دیر تک خاموشی چھائی

رہی۔ دفعتاً“ اس نے سر اٹھایا اور میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

”میں تجھے جانتی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”تو ایلی ہے نا۔ میں ایلن ہوں۔ سنا تو نے۔ میں ایلن ہوں۔“

اس نے ایک پوز بنایا اور یوں کھڑی ہو گئی جیسے مٹھاس کی اک پھوار ہو۔

مجھے ایسا لگا جیسے ورق میں لپٹی ہوئی مصری کی ڈالی ہو۔ جی میں آیا کہ منہ میں ڈال کر چوس جاؤں۔

دفعتاً“ میرا ساتھی بولا۔ ”ہوش کر۔ میرا تو منہ ہی نہیں۔ جب تھا‘ تب جرات نہ تھی۔ اب خالی جرات کا جھنجھنا بجانے سے فائدہ؟“

”دیکھا۔“ وہ بولی۔ ”مجھ میں دونوں روپ ہیں۔ دیوی بھی ہوں‘ ناری بھی ہوں۔ انگاروں سے بھسم بھی کر سکتی ہوں۔ سوکھے کو ہرا بھرا بھی کر سکتی ہوں۔ میں تیری کہانی ہوں۔

میرے ہوتے ہوئے تو کسی اور پر کہانی نہیں لکھ سکتا۔“

”میں لکھوں گا تجھ پر کہانی۔“ میں نے کہا۔

”رک جا۔“ میرا ساتھی بولا۔ اس نے میرا بازو تھام لیا۔

”بے شک۔ یہ رنگ رس بھری کہانی ہے لیکن یہ ایسی کہانی ہے جسے صرف بیتا جا سکتا ہے‘ لکھا نہیں جا سکتا۔ تو بیتنے میں کھو جائے گا‘ لکھنے کا ہوش نہیں رہے گا۔“

شام پڑ چکی تھی۔ پتہ نہیں شام اتنی اداس کیوں ہوتی ہے۔ مدھم اداسی‘ میٹھی اداسی۔ ایسے لگتا ہے جیسے شام نے بال بکھیر رکھے ہوں۔ چہرا ستا ہوا ہو۔ انتظار۔ مایوسی بھرا انتظار۔

راگ ودھیا والوں نے شام کے راگ میں آگ لگا رکھی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ وہ تو بڑے سیانے ہیں۔ پر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے شام آگ نہیں‘ سلگن ہے۔ مدھم سلگن جیسے دیئے میں تیل نہ رہا۔ سوکھی بتی سلگ رہی ہو۔

دکان میں اندھیرا گاڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بتی سلگ رہی تھی۔ وہ تجوری کھولے بیٹھا گن رہا تھا۔

میرا ساتھی بولا۔ ”رک جاؤ۔ اس سیٹھ کو دیکھ رہے ہو نا۔“

”دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم نے اس پر کبھی کہانی نہیں لکھی۔“

”اس کی کوئی کہانی ہو تو لکھوں۔“

“سبھی لکھتے ہیں۔ ”

“ہاں لکھتے ہیں پر وہ کہانی نہیں ہوتی۔ غم و غصے کا اظہار کہانی نہیں ہوتی۔ کہانی نعرے نہیں لگاتی۔ اودھم نہیں مچاتی۔ اشتعال پر نہیں ابھارتی۔ مزاحمت کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتی۔ کہانی تو اک چھوٹا سا چشمہ ہوتی ہے۔ جو دھرتی سے ابلتا نہیں۔ رستا ہے۔ بوند بوند رستا ہے۔ ہمدردی کا چشمہ۔ دکھ بھرے لگاؤ کا چشمہ۔ بھیگ ہی بھیگ۔

“جھوٹ بولتے ہو۔ ” اس نے مجھے ڈانٹا۔ “تمہاری کسی کہانی میں بھیگ نہیں ہوتی۔ سوکھی کاٹھ۔ ”

“سچ کہتے ہو۔ میں اپنی کسی کہانی میں بھیگ پیدا نہ کر سکا۔ قاری کو بھگو نہ سکا۔ لاکھ کوششیں کیں پر بات نہ بنی۔ بیسیوں لکھیں پر کہانی نہ لکھ سکا۔ ”

“جھک مارتے رہے۔ ” وہ بولا۔

“نہیں جھک نہیں مارا۔ ”

“تو پھر.......... ”

“چمکیلی باتیں کرتا رہا۔ دکھاوے کی باتیں۔ توجہ طلبی کی باتیں۔ پھلجھڑیاں چلاتا رہا۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔ ”

“اپنی ڈگڈگی بجاتا رہا نا۔ کہانی اپنی بات نہیں ہوتی۔ ” وہ بولا۔ “دوجوں کی بات ہوتی ہے۔ کیا تم اپنی بات کرنے سے کبھی نہیں اکتائے؟ ”

“کیا مطلب؟ ” میں نے غصے سے پوچھا۔

“اب بھی تو کہانی کے پردے میں تم اپنی بات کر رہے ہو۔ سیٹھ کی بات کیوں نہیں کرتے۔ ”

“کیوں کہتے ہو کہ اس میں کوئی کہانی نہیں ہے۔ ”

“یہ تو دولت کا قیدی ہے۔ دولت نے اسے ہائی جیک کر رکھا ہے۔ اس بے چارے میں تو میں بھی نہیں رہی۔ دل کی جگہ پیسہ ٹک ٹک کر رہا ہے۔ دنیا سے بھی گیا۔ خود سے بھی گیا۔ بے چارہ مظلوم۔ ”

“اس کی مظلومیت پر کہانی لکھو۔ ”

“نہ نہ نہ نہ۔ ”

“کیوں۔ کیا لکھ نہیں سکتے؟ ”

“لکھ سکتا ہوں۔ ”

“پھر لکھتے کیوں نہیں؟ ”

“کس سے ڈرتے ہو؟ ”

“ان سے ڈرتا ہوں جو اسے ظالم سمجھے ہیں۔ ”

کھڑاک سے دکان کا دروازہ بند ہو گیا۔

“وہ دیکھ۔ وہ........ ” وہ چلایا۔ “تیرا موضوع۔ ”

میں نے سر اٹھایا۔ سامنے دربار جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔

“نہیں۔ ” میں نے زیر لب کہا۔ “یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ یہ داتا لوگ ہیں۔ بزرگ ہیں۔ اللہ والے ہیں۔ یہ چوتھی سمت میں جیتے ہیں۔ زیادہ دیکھتے ہیں۔ زیادہ سنتے ہیں۔ زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ زماں اور مکاں سے بے نیاز ہیں۔ ان کا میں احترام کرتا ہوں لیکن میں ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ ان کے بارے میں میں منہ کھولوں، نہ نہ نہ بھائی۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ ”

“تم داتا کو کیوں دیکھتے ہو؟ بزرگ کو کیوں دیکھتے ہو؟ ” وہ بولا۔ “کرامتوں کو کیوں دیکھتے ہو؟ معجزوں کو کیوں دیکھتے ہو؟

تم اس بندے کو کیوں نہیں دیکھتے جو داتا کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ جو اتنا عظیم تھا کہ اس نے داتا کا مرتبہ پا لیا۔ ”

“سب داتاؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ سرکار قبلاؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ باباؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ کرامتوں کے چھنکتے چھنکاتے ہیں۔ اس عظیم بندے کی بات تو کوئی نہیں کرتا۔ جس نے انہیں بابا بنا دیا۔ سرکار قبلہ بنا دیا۔ سلطان الہند بنا دیا۔ داتا بنا دیا۔ تو اس بندے کی بات کیوں نہیں کرتا؟ ” اس کی آواز میں غصہ کھول رہا تھا۔

ہم دونوں درگاہ میں داخل ہو چکے تھے۔

ہمیں دیکھ کر درگاہ کا متولی بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ “وہ بندہ تو ایک ہی ہے۔ ایک ہی ہے جسے دو جہانوں کا مالک بنا دیا گیا۔ پر وہ بندہ بن کر جیا۔ صرف بندہ بنکر۔ نہ بابا بنا نہ سرکار قبلہ بنا۔ نہ داتا بنا نہ کرامتیہ بنا نہ معجزاتی بنا۔ صرف بندہ۔ “صرف بندہ۔ صرف بندہ۔ صرف بندہ۔ ” گنبد چلایا۔

“صرف بندہ۔ صرف بندہ۔ ” باہر سے یوں آواز آئی جیسے آسمانوں میں گنبد کی آواز کی گونج تھر تھرا رہی ہو۔

ساری کائنات اس گونج سے بھری ہوئی تھی۔ “صرف بندہ۔ صرف بندہ۔ ”

# دیکھن دکھن

لڑکیوں کا آخری ٹولہ کٹیا سے نکلا۔ ٹیلے سے نیچے اترتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے کتر کتر کر باتیں کر رہی تھیں۔ شوخیاں کر رہی تھیں۔ فضا ان کے قہقہوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور تھیں۔ لگتا تھا جیسے دکھ درد سے قطعی طور پر ناواقف ہوں۔ لیکن جب وہ باری باری ہاتھ دکھانے کے لئے اکیلے میں جگن جوتشی سے ملتی تھیں' تو دکھ سے بھیگی ہوتیں۔

ایک آہ بھر کر کہتی۔ "جوتشی جی۔ دیکھو تو میرا بیاہ ہو گا یا زندگی یونہی اکیلے میں بسر ہو گی۔" دوسری کہتی۔ "کیا وہ مجھے مل جائے گا جسے میں چاہتی ہوں۔" کوئی اپنے مجازی خدا کی بے وفائی کی کتھا سناتی۔ کوئی ظالم سماج کا رونا روتی۔ کوئی سخت ماں باپ کا۔

جگن جوتشی سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ مل بیٹھنے میں تو زندگی شوخی سے بھرپور ہوتی ہے لیکن اکیلے میں دکھ سے چور چور۔ یہ کیا بھید ہے۔ سوچتے سوچتے وہ کٹیا سے باہر نکل آیا۔

سامنے بنچ پر بنواری بیٹھا تھا۔ ٹھوڑی ہاتھ میں پکڑے' گہری سوچ میں ڈوبا ہوا۔ ارے یہ کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ تو جذبے کا غلام ہے۔ اسے سوچ سے کیا واسطہ۔

پندرہ بیس دنوں کی بات ہے کہ بنواری اپنی قسمت کا حال جاننے کے لئے جگن جوتشی کی کٹیا میں آیا تھا۔ اس نے ایک انوکھا سوال پوچھا تھا۔ کہنے لگا۔ "جوتشی جی۔ میرا ہاتھ دیکھ کر یہ بتاؤ کہ مجھے کوئی ایسی زنانی ملے گی جو جیسی دکھتی ہو' ویسی ہی ہو۔ میں اس زنانی کی ڈھونڈ میں ہوں۔" اس سوال پر جگن حیران ہوا۔ ایسی بات تو کسی نے کبھی پوچھی نہ تھی۔ جگن نے غور سے بنواری کا جائزہ لیا۔

وہ ایک خوبصورت جوان تھا۔ لیکن اس کا حسن پوری طرح سے دکھتا نہ تھا۔ بن ٹھن سے بے نیاز' منہ ان دھلا' بال بکھرے ہوئے۔ موٹا لباس۔

جگن جوتشی کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس گاہک سے کیسے نبٹا جائے۔ اس نے سوچا کہ کنفیوژڈ آدمی ہے۔ اسے مزید کنفیوژ کر دوں تو شاید بات بن جائے۔ بولا۔ "پہلے یہ بتا کہ تیرے دیکھن میں خرابی ہے یا اس کے دکھن میں۔"

"نہ نہ نہ۔" بنواری نے کہا۔ "میرے دیکھن میں تو خرابی نہیں۔ میں عینک لگا کر نہیں دیکھتا۔ سارا جھگڑا زنانی کے دکھن کا ہے۔"

جگن بولا۔ "بھائی میرے دیکھن اور دکھن کھچڑی سمان نہیں ہوتے کہ دال الگ کر لو اور چاول الگ۔ وہ تو شربت سمان ہوتے ہیں۔ میٹھا اور پانی یوں گھل مل جاتے ہیں کہ الگ نہیں ہو سکتے۔" جگن نے اسے کنفیوژ تو کیا مگر ساتھ بہلایا بھی۔ جسے ہر جوتشی پر گاہک کو بہلانا لازم ہوتا ہے۔ آخر میں جگن بولا۔ "تجھے ایسی عورت ضرور ملے گی جو ویسی ہی ہو گی جیسے دکھے گی اور تم دونوں ہنسی خوشی دن گزارو گے۔"

"کب ملے گی؟" وہ بولا۔ "میں تو پانچ سال سے گلیوں اور محلوں میں دربدر ہو رہا ہوں لیکن آج تک نہیں ملی۔"

"مل جائے گی۔ جلدی مل جائے گی۔" جگن بولا۔ "پر تو دربدر کیوں ہوتا ہے؟ یہاں آ بیٹھا کر۔ یہاں عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔"

"اچھا۔" بنواری بولا۔ "پر یہاں بیٹھ کر کروں گا کیا؟"

"کرنا کیا ہے۔ دربدر ہو کر نہیں' بیٹھ کر ڈھونڈ۔ میرا بالکا بن جا۔ جو عورت آئے' اس کا انٹرویو کر۔ اسے پوچھ کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ پھر اس کی پرچی بنا دے اور میں صرف اسے ملوں گا جس کے ہاتھ میں تیری دی ہوئی پرچی ہو گی۔"

بنواری کی باچھیں کھل گئیں۔

جگن نے بات پکی کرنے کے لئے کہا۔ "اور جس روز تجھے وہ مل جائے' بے شک لے جانا۔"

"بول۔ تیری فیس کیا ہے؟" بنواری نے پوچھا۔

"اونہوں۔" جگن بولا۔ "کبھی بالکے سے بھی فیس لیا کرتے ہیں؟"

عجیب آدمی ہے۔ بنواری۔ جگن نے سوچا۔ پر یہ کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ جگن بنواری کے قریب جا بیٹھا۔ بولا۔ "کس سوچ میں پڑا ہے تو؟" بنواری نے ٹھنڈی آہ بھری۔ بولا۔ "اپنے نصیبے میں تو سوچیں ہیں۔"

"کیوں؟ کیا پیسے کی تنگی ہے؟"

“نہیں جوتشی پیشہ تو بنواری کے ہاتھ کا میل ہے۔ جتنا چاہوں کمالوں۔ کل رات تین سو کمایا تھا۔”

“کیا کام کرتا ہے تو؟”

“چھابڑی لگاتا ہوں۔ دو گھنٹے میں سارا مال بک جاتا ہے۔ چاہے جتنا بناؤں۔ اللہ کا کچھ ایسا کرم ہے۔ کہ گاہک انتظار کرتے ہیں کہ کب بنواری چھابری لگائے۔”

“کیا بناتا ہے تو؟” جگن نے پوچھا۔

“پہلے کلفی بناتا تھا۔ پھر ایک رات خواب میں ایک بابا کو دیکھا۔ بابا نے کہا۔ دیکھ بنواری۔ وہ چیز نہ بنا جس کی مانگ گھٹ رہی ہے۔ وہ بنا جو فیشن میں ہے۔ میں نے کہا۔ کیا بناؤں؟ بابا بولا۔ تجھے خود پتہ لگ جائے گا۔”

“پھر پتہ لگا کیا؟” جگن نے پوچھا۔

بنواری بولا۔ “اگلے دن جی اداس تھا۔ باہر جانے کا موڈ نہ تھا۔ ہل ٹاپ کا ہوٹل کا بیرا ادھر سے گزرا تو میں نے کہا۔ یار کچھ کھانے کو بھیج لڑکے کے ہاتھ۔ باہر جانے کا موڈ نہیں ہے۔ آج۔ تو اس نے برگر بھیج دی۔ اسے کھانے لگا تو بابا کی بات یاد آگئی۔ فٹ سے اسے کھول کر دیکھا کہ کیا کیا مصالحہ پڑا ہے اس میں۔ پھر ایک ہفتہ برگر بناتا رہا آزمانے کے لئے۔ پہلے روز چھابڑی لگائی تو گوروں کے بچوں نے بھیڑ لگا دی۔ ہوٹل والے 20 روپے لیتے تھے۔ میں نے دس کا لگا دیا۔ جوتشی۔ پیسے کے معاملے میں اللہ نے مجھے دین دے رکھی ہے کہ جتنا چاہے کما لے۔ پر کمائی کا فیدہ۔ جب گھر ہی نہ بنا تو کمائی کس کام کی؟”

“پر تو اتنا مایوس کیوں ہے؟” جگن نے پوچھا۔

“تجھے نہیں پتہ جوتشی کہ میں وہ بوٹ ہوں جو آہلنے سے گر پڑا ہے۔ اور جو آہلنے سے گرا‘ وہ سدا رلے گا۔”

“یہ پہیلیاں کیوں بجھوا رہا ہے مجھ سے؟ مجھے بتا کہ تیرے ساتھ کیا بیتی؟”

“کیا بتاؤں جوتشی۔ پہلا قدم ہی غلط پڑا۔ یوں سمجھ لے کہ پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دی۔ اب جو اس پر مینار بناؤں تو وہ ٹیڑھا ہی ہو گا نا۔”

“تجھے محبت ہو گئی کیا؟” جوتشی نے پوچھا۔

“ہاں۔ بری طرح گھائل ہوا۔ پر میری بدقسمتی۔ کسی جیتی جاگتی زنانی سے گھائل ہوتا تو نپٹ لیتا‘ کسی نا کسی طرح پر وہ زنانی تو وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔”

“ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟” جگن بولا۔

“ارے یہی تو ہوا۔” بنواری نے جواب دیا۔ “وہ زنانی ناٹک میں جیتی تھی۔ جب جب ناٹک چلاتا۔ وہ اٹھتی بیٹھتی - چلتی پھرتی۔ بولتی چالتی تھی۔ ناٹک ختم ہو جاتا تو ساتھ ساتھ وہ بھی ختم ہو جاتی۔ پر جوتشی۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے۔ میں سمجھا کہ جو لڑکی ناٹک میں کماری بنتی ہے‘ وہی کماری ہے۔ بس جی اس کے مکان کے پھیرے لیتا رہا۔ بڑا کھجل ہوا۔” بنواری چپ ہو گیا۔ دیر تک وہ بیتی ہوئی باتوں کو پھر سے بتیاتا رہا۔

جگن سمجھ گیا کہ بنواری پھوڑا بنا بیٹھا ہے۔ اسے چھیڑنا اچھا نہیں۔ جگن خود زخم خوردہ تھا۔ اسے پتہ تھا کہ جوانی کی بھول کا زخم زندگی بھر رستا رہتا ہے۔ اس لئے وہ بھی چپ بیٹھا رہا۔ صدیاں بیت گئیں۔

پھر بنواری نے سر اٹھایا۔ آہ بھر کر بولا۔

“اگر وہ مجھے نہ ملتی تو اچھا ہوتا۔ ملی تو ایک ہی نظر میں پتہ چل گیا کہ وہ تو رنڈی ہے‘ کماری نہیں‘ اور رنڈی بھی دو ٹکے والی۔ مردار جس کے پنڈے پر گدھوں کی چونچوں کے نشان تھے۔ بس سمجھ میں آگیا کہ کماری وار ہے روزی اور ہے اور کماری تو وجود ہی نہیں رکھتی۔ اسے کیسے ڈھونڈوں؟” وہ پھر خاموش ہو گیا۔

ٹیلے کے اردگرد کی بتیاں بجھ گئی تھیں۔ ہوا چلنے لگی تھی۔ رات نے اپنا کالا تمبو تان لیا تھا۔ مال روڈ کی فیشن پریڈ ختم ہو چکی تھی۔

صدیاں بیت گئیں۔ وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر بنواری نے سر اٹھایا اور اپنی ہی لگن میں گنگنانے لگا۔ پھر آہ بھر کر بولا۔ “ناٹک میں کماری اک گیت گایا کرتی تھی۔”

“کا مکھ لے گھر جاؤں”

وہ اپنی بھدی مگر بھیگی آواز میں مکھڑے کو گنگناتا رہا۔ بس یہ گیت جب وہ گاتی تو سمجھو میں مر جاتا تھا۔ روز ناٹک دیکھتا۔ روز مرتا۔ پھر اک دن ناٹک یہاں سے چلا گیا اور جاتے ہوئے مجھے یہ بول دے گیا۔ دو سال میں یہ بول گنگناتا پھرا۔ پاگلوں کی طرح گلیوں میں۔ ایک دن جب میں تھک کر بنگلے کی ایک کھڑکی کے نیچے ستا رہا تھا تو کیا سنتا ہوں کہ بنگلے میں کوئی یہی بول گنگنا رہی ہے۔ سن کر میں تو پاگل ہو گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے کماری میں جان پڑ گئی ہو۔

بنگلے کے چوکیدار سے ملا۔ پتہ چلا کہ بنگلے میں کوئی وڈیرا اور اس کی بیگم رہتے ہیں۔ میں نے چوکیدار کی منتیں کی کہ ایک بار مجھے بیگم سے ملا دے۔ وہ نہ مانا۔ پھر میں نے اس کی مٹھی گرم کی اور وہ مان گیا۔

بیگم باہر دروازہ پر آگئی۔ غصے میں بولی۔ کون ہے تو اور کیا چاہتا ہے؟ میں نے کہا۔ بیگم صاحبہ۔ غصہ نہ کھائیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا۔ ابھی ابھی جو گیت آپ گنگنا رہی تھیں، میں اس گیت کا دیوانہ ہوں۔

”پھر میں کیا کروں؟“ وہ غصے سے بولی۔

جو تو کبھی کبھی یہ بول گنگنا دیا کرے تو میرا جیون سپھل ہو جائے۔ غصے میں لوٹ جانے کے لئے مڑی تو میں نے منت کی۔ میں نے کہا۔ دیکھ میں بنگلے میں نہیں آؤں گا۔ باہر کھڑکی تلے بیٹھ کر سن لیا کروں گا۔ تیری مہربانی ہو گی۔ تو صرف اک بار گنگنا دیا کر روز کے روز۔ حسنہ نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ اس کا نام حسنہ تھا۔ پورا ایک ہفتہ میں نے اس کی کھڑکی کے نیچے بیٹھ کر گزار دیا۔ لیکن اس نے مجھے گھاس نہ ڈالی۔“

بنواری نے ایک لمبی آہ بھری۔ بولا۔ ”پھر اسے مجھ پر ترس آگیا۔ ایک روز وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی اور ”کا مکھ لے گھر جاؤں“ گنگنانے لگی۔ اتنا بھیگ کر گایا کہ میرا دل ڈوب گیا۔

پھر یوں ہوا کہ جب بھی میں وہاں پہنچتا۔ کھڑکی بجا دیتا اور وہ گیت سنا دیتی۔

پھر وہ کھڑکی کھول کر مجھ سے باتیں کرنے لگی اور ایک دن جب وڈیرا شہر سے باہر گیا ہوا تھا، اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ باتیں کرتی رہی۔ اس روز مجھے پتہ چلا کہ وہ بیگم نہیں ہے۔ وڈیرے نے اسے گھر میں ڈال رکھا ہے۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ جی چاہا کہ اسے کچھ دوں۔ دو دن شہر میں گھوم پھر کر میں نے اس کے لئے ایک ہار خریدا۔

ہار کو دیکھ کر حسنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولی۔ ”نہ بنواری۔ تو تو ایسے نہ کر جیسے دوسرے مرد کرتے ہیں۔ تو پہلا مرد ہے جس نے مجھے دیکھا نہیں، محسوس کیا ہے۔ جانا ہے۔ تو نے اس حسنہ کو جانا ہے جسے کسی مرد نے بھی نہیں جانا تھا۔ تو نے تو مجھے یہ بات بھلا دی ہے کہ میں بکاؤ مال ہوں۔ تو مجھے تحفے دیتا اچھا نہیں لگتا۔“

”جوتشی۔“ بنواری بولا۔ ”دو مہینے ہم ملتے رہے۔ روز کے روز۔ وہ بھی کیا دن تھے۔“ آہ بھر کر پھر خاموش ہو گیا۔

ایک دن وہ بڑے پیار سے کہنے لگی۔ ”بنواری کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہے۔ تجھے مجھ میں کیا نظر آتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”کچھ نظر آتا ہی ہے تو نثار ہو رہا ہوں۔“

بولی۔ ”دیکھ بنواری۔ میں وہ نہیں ہوں جو تجھے دکھتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”کیوں نہیں ہے وہ تو

بولی۔ ”صرف میں ہی نہیں، کوئی عورت بھی وہ نہیں ہے جو دکھتی ہے۔“

”پر کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتہ کیوں۔ عورت دکھن پر مجبور ہے۔ کوئی اس کے اندر لٹھ لئے بیٹھا ہے۔ کہتا ہے دکھ۔ اکتائی ہوئی بیٹھی خود کو نہ دکھانا چاہے۔ پھر بھی دکھنے پر مجبور کر دی جاتی ہے اور اکیلی بیٹھی ہو تو بھی زبردستی ہونٹوں پر مسکان آ جاتی ہے۔“

پھر جب وہ آخری بار مجھ سے ملی تو کہنے لگی۔ ”بنواری۔ تو واحد مرد ہے جو مرد بن کر مجھ سے نہیں ملا۔ مجھے دیکھن دکھن کے چکر میں نہیں ڈالا۔“

میں نے کہا۔ ”دیکھ حسنی۔“ میں نے اس روز پہلی بار اسے حسنی کہہ کر بلایا تھا۔ ”حسنی میں نے کبھی تجھے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ میں تو آنکھیں بند کر کے تیرے پاس بیٹھ جاتا ہوں اور مجھے لگتا ہے جیسے میرے قریب کوئی ہے۔ کوئی میرا ساتھ دے رہی ہے۔ گھر پر بھی جب میں بیٹھتا ہوں تو تو ساتھ ہوتی ہے۔ میں تو کبھی اکیلا نہیں ہوا ان دنوں۔“ جواب میں وہ بولی۔ ”بنواری تو تو میری ہڈیوں میں بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں میں تیرے بغیر رہ بھی سکوں گی یا نہیں۔ اگر تو دیکھن دکھن کا چکر چلا دیتا تو میری ہڈیوں میں نہ بیٹھتا۔“

مجھے نہیں پتہ تھا کہ حسنی آخری بار مجھ سے مل رہی ہے۔“ بنواری نے آہ بھر کر کہا۔ ”اگلے روز میں بنگلے پر گیا تو بنگلہ خالی پڑا تھا۔ پھر آوارہ پھرتے پھرتے میں تیرے پاس آیا۔ میں نے سوچا۔ چلو جوتشی سے پوچھ دیکھو۔ تو نے میرا حوصلہ بندھایا کہ وہ ضرور ملے گی۔ تو میں آس کی دھونی رما کر یہاں بیٹھ گیا۔“ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔

دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

دفعتاً جگن چلایا۔ ”نہیں نہیں۔ نہیں نہیں۔“ جیسے اسے کسی نے زبردستی بولنے پر مجبور کر دیا ہو۔ بنواری چونکا۔ ”کیا نہیں؟“

”میں بھی وہ نہیں۔“ جگن بولا۔ ”جو تجھے دکھتا ہوں۔ میں جوتشی نہیں ہوں۔ مجھے نہیں پتہ کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ مجھے نہیں پتہ کہ ہاتھ کی لکیریں کیا کہتی ہیں۔ میں نے جوتشی کا سوانگ بھر رکھا ہے۔ میں تو لوگوں کو وہ کچھ بتاتا ہوں جو وہ سننا چاہتے ہیں۔ تیرا دل رکھنے کے لئے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ تجھے ضرور ملے گی۔“ یہ سن کر بنواری کو دھچکا لگا۔ بولا۔ ”جو یہ بات ہے تو میں یہاں کس آس پر بیٹھا ہوں۔“

"میں بھی خود سے یہی سوال پوچھا کرتا ہوں کہ جگن جی تم یہاں کس آس پر بیٹھے ہو؟" جگن نے کہا۔ "مجھے اس سوال کا کبھی جواب نہیں ملا۔ لگتا ہے ہم سب آس کی دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ جانتے ہیں کہ اس دھوئیں سے کچھ برآمد نہیں ہو گا۔ پھر بھی بیٹھے ہیں۔" جگن نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی کہانی سنانے لگا۔ بولا "بنواری میں بھی دکھن دیکھن کا مارا ہوا ہوں۔

اسے دیکھتے ہی تن من دھن سے اس کا ہو گیا۔ وہ بھی میری ہو گئی۔ ہم روز ملتے تھے۔ ایک سال بعد اس نے میری بات مان لی۔ وہ میری ہو گئی۔ ہم نے بیاہ کر لیا۔ ایک سال ہم اکٹھے رہے یوں جیسے دو بچے مل کر کھیلتے ہیں۔

پھر ایک دن وہ مجھے چھوڑ کر دوجے کے ساتھ چلی گئی۔ پیچھے ایک رقعہ چھوڑ گئی۔ لکھا تھا:

اب میں نے جانا ہے کہ تو "وہ" نہیں ہے جو دکھتا ہے۔ میں نے دیکھن میں بھول کی۔ میں جا رہی ہوں۔ میرا پیچھا نہ کرنا۔ "جگن خاموش ہو گیا۔ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر جگن نے بات شروع کی۔ بولا۔ "ماں نے کہا۔ بیٹے میں تیرا دوجا بیاہن کر دیتی ہوں۔ گھر بسا کر بیٹھ جا۔" میں نے کہا۔ "نہیں ماں۔ میرا دل ٹھکانے پر نہیں رہا۔ مجھے جانے دو۔ آوارہ پھروں گا تو شاید دل ٹھکانے لگ جائے۔ پھر گاؤں کا بابا فقیرا آ گیا۔ ماں نے اسے ساری بات سنائی۔ کہنے لگی۔ "بابا! اسے سمجھا کہ یہ بیاہ کرے۔ گھر بسا لے دربدر نہ پھرے۔" بابا فقیرا نے ساری بات سن کر سر جھکا لیا۔ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔ "نہ بی بی اسے نہ رک۔ اسے جانے دو۔ شاید باہر جا کر دیکھن دکھن کے چکر میں پھنس جائے۔ جب تک یہ دیکھن دکھن کے چکر میں نہیں پھنسے گا، آباد نہیں ہو گا۔"

"بابا۔" میں نے پوچھا۔ "یہ دیکھن دکھن کا چکر ہے؟"

"بولا۔ "پتر یہ دیکھن دکھن کا چکر اک پردہ ہے۔"

"پردہ۔ کس کا پردہ؟"

بولا۔ "پتر وہ جو ڈال ڈال، پات پات میں دکھتا ہے۔ جو ذرے ذرے میں دکھتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ہم اسے دیکھیں۔ اس لئے اس نے ہمیں دیکھن دکھن کے چکر میں ڈال رکھا ہے کہ ہمارا دھیان ادھر لگا رہے۔ ادھر نہ جائے۔"

"اور جس کا دھیان دیکھن دکھن کے چکر سے نکل جائے، اسے کیا ہوتا ہے بابا؟"

"جو دیکھن دکھن کے چکے سے نکل جاؤ تو پھر کچھ بھی نہیں رہتا۔ نہ میں رہتا ہے، نہ تو۔ نہ دکھ نہ سکھ۔ نہ روشنی نہ اندھیرا۔ کچھ بھی نہیں رہتا۔ صرف وہ رہ جاتا ہے صرف وہ۔" جگن کی بات سن کر بنواری کی گردن لٹک گئی۔ اسے ایسے لگا جیسے کچھ بھی نہ رہا ہو۔ کچھ بھی نہیں۔

عین اس وقت روشنی کی ایک کرن چمکی۔ کوئی آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔

بنگلے کا چوکیدار بنواری کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بولا۔ "یہ تجھے شام سے ڈھونڈ رہی ہے۔"

حسنہ بنواری کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ بولی۔ "بنواری میں آ گئی۔ آئے بغیر رہا نہ گیا۔ مجبور ہو گئی۔ اب تو جان نہ جان۔" وہ بنچ پر بیٹھ گئی۔ بولی۔ "میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ نہ جا۔"

"کیوں؟" بنواری نے پوچھا۔

حسنہ نے اپنا سر بنواری کے کندھے پر رکھ دیا اور گنگنانے لگی۔

"کا مکھ لے گھر جاؤں"

اس کی آواز میں اتنی بھیگ تھی کہ یوں لگا جیسے ٹیلے پر بوندیاں برس رہی ہوں۔

# چوہا

اس بنے بجے آرام دہ کمرے میں ہم دو تھے۔ لیکن دونوں ہی اکیلے، تنہا۔ اگر ہم دونوں اکیلے اکیلے ہوتے تو یقیناً" اس قدر اکیلے نہ ہوتے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ بہت دور۔ وہ مجھ سے بیزار تھی۔ میں اس سے بیزار تھا۔ چالیس سال ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آئے تھے۔

چالیس سال پہلے ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی، عشق تھا۔ ایک دوسرے کے بغیر دم نکلتا تھا۔ مجھے فکر دامن گیر تھی۔ اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں کیا کروں گا۔ اسے ایک غم تھا۔ اگر تاپ نہ ہوا تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ خوش قسمتی سے بات بن گئی۔ ہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ایک پھلجھڑی سی چل گئی۔ پھر کئی ایک سال ہم محبت میں لت پت رہے۔ لت پت۔ وہ میرے لئے جیتی تھی۔ میں اس کے لئے جیتا تھا۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ آہستہ آہستہ اسے پتہ چلتا گیا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھتی تھی کہ ہوں۔ آہستہ آہستہ مجھ پر انکشاف ہوتا رہا کہ اس کی کچھ عادتیں ناقابل برداشت ہیں۔ پھر جھگڑے شروع ہو گئے۔ کئی ایک سال ہم ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہے۔ لڑتے جھگڑتے رہے۔ یہ صورت حال اس قدر بڑھ گئی کہ لڑنے جھگڑنے کے سوا ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی سروکار نہ رہا۔

اور اب۔ اب ہم بوڑھے ہو چکے ہیں۔ لڑ لڑ، جھگڑ جھگڑ کر تھک گئے ہیں۔ اب اتنا تعلق بھی نہیں رہا کہ ایک دوسرے سے لڑیں جھگڑیں۔ اب ہم ایک دوسرے کو برداشت کر رہے ہیں۔ وہ مجھے گوارا کر رہی ہے۔ مجبوراً" میں اسے گوارا کر رہا ہوں۔ مجبوراً" وہ کہتی ہے۔ اس کا تو دماغ خراب ہے۔ یہ سمجھے گا۔ میں کہتا ہوں۔ اس کا تو دماغ سرے سے ہے ہی نہیں۔ سمجھانے کی کوشش عبث ہے۔

یوں ہم ایک دوسرے کے ساتھ لیکن ایک دوسرے سے دور گاؤں کی حویلی میں بڑے سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

میرے پاس اسے کہنے کے لئے کوئی بات نہ تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنے کی روادار نہ تھی۔ دن میں دو ایک بار بات کرنے کی ضرورت پڑ جاتی۔ وہ آلو چھیلتے ہوئے چاقو سے مخاطب ہو کر کہتی۔ "آلو میں بینگن ڈال لوں۔" میں شیو کرتے ہوئے استرے سے کہتا۔ "ڈال۔" اکثر بولنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ بات اشاروں کی مدد سے ہو جاتی۔ وہ بن بولے سمجھا دیتی۔ میں بن کہے سمجھا دیتا۔

اب جب سے ہم دونوں کراچی اپنے بیٹے سکندر کے گھر آئے ہیں، ایک دوسرے سے بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ وہ چپ چاپ اپنے بستر پر بیٹھ کر کھڑکی کو گھورتی رہتی ہے۔ میں کرسی میں بیٹھ کر نیچے سڑک پر چلنے والی ٹریفک کو دیکھتا رہتا ہوں۔ کتنا سکون ہے۔ کتنا اطمینان ہے۔ کسے رابا کسے کارے نہ باشد۔

پہلے ہم گاؤں میں رہتے تھے۔ تھی تو حویلی لیکن سال ہا سال سے مرمت نہیں ہوئی تھی۔ ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ سکندر سے کئی بار مرمت کے لئے کہا۔ اس نے پروا نہ کی۔ بات ٹال دی۔ سکندر ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ گاؤں میں زیادہ دیر نہیں رہا۔ پہلے شہر میں پڑھنے کے لئے بورڈنگ میں رہا۔ پھر بڑا افسر بن گیا۔ بیوی بھی شہر کی ملی۔ اس نے ہم سے پوچھے بنا خود ڈھونڈ لی جیسے میں نے ڈھونڈ لی تھی۔ اور اب اس کی محبت میں لت پت ہو رہا تھا۔ جس طرح میں ہوا تھا۔ سکندر اور اس کی بیوی دونوں کراچی میں صاحبوں کی طرح ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ بال بچہ ہے نہیں۔ بس ایک دوسرے میں ہی ڈوبے رہتے ہیں۔

گاؤں کی حویلی کے مغربی حصے کے تین کمرے ٹھیک ٹھاک ہیں۔ وہاں ہم دونوں رہتے تھے۔ گاؤں سے ذرا فاصلے پر، شور شرابے سے دور حویلی سے سو پچاس قدم پر سائیں دروٹ کا مزار تھا۔ ہماری کھڑکیوں سے صاف نظر آتا تھا۔ انہیں سائیں چپ شاہ بھی کہتے ہیں۔

مشہور ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کسی سے بات نہیں کی تھی۔ بس اشاروں سے ہی بات کہہ دیتے تھے۔ میں پیروں فقیروں کی نہیں مانتا لیکن دو ایک بار میں اتا پتا لگانے کے لئے مزار پر گیا تھا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ سائیں جی کا اصل نام دڑ۔ وٹ تھا۔ جو غلط العام ہو کر دروٹ بن گیا۔ سائیں جی نے عمر بھر دڑ۔ وٹی رکھی تھی۔ یہ جان کر مجھے سائیں جی سے دلچسپی ہو گئی۔ اس لیے کہ ہم بھی سائیں جی کی طرح دڑ۔وٹی زندگی بسر کر رہے تھے۔

مزار پر ایک شخص باقاعدہ حاضری دیتا تھا۔ اور جھاڑ پونچھ میں لگا رہتا تھا۔ اس کا نام

فضلا تھا۔ فضلا شہر میں رہتا تھا مگر جب بھی چھٹی ملتی' مزار کی طرف چل پڑتا۔ مجھے فضلے پر بڑا ترس آتا ہے۔ بے چارہ احمق خواہ مخواہ سائیں کی لگن لگائے بیٹھا ہے۔

پھر ہم دونوں۔ میں اور میری بیوی میں چوہے کی بات چل نکلی۔ ایسی چلی۔ ایسی چلی کہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ پتہ نہیں۔ نہ وہ وہ رہی' نہ میں میں رہا۔ چوہے کی بات ابھی چل ہی رہی تھی کہ سکندر آگیا۔ اور ہمیں زبردستی کراچی لے آیا۔

کراچی میں تین چار ہفتے تو ہم جگہیں دیکھنے میں مصروف رہے۔ ہوا بندر' منگھو پیر' کیماڑی اور پتہ نہیں کیا کیا۔ لیکن آخر جگہیں ختم ہو گئیں۔ اور ہم اس بنی بجی انڈے کی طرح چمکتی ہوئی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

سکندر اور اس کی بیگم صبح اپنے اپنے دفتر چلے جاتے۔ شام کو کوئی پارٹی یا ڈنر ہوتا۔ گھر میں صرف ہم ہوتے یا نوکر ہوتے۔

پھر وہ بنی بجی تنہائی کھلنے لگی۔ وہ کمرے کی سجاوٹ' وہ آرام زدہ صبح و شام' وہ تکلف' وہ رکھ رکھاؤ۔ وہ سب کچھ اک بوجھ بن جاتا۔ دم گھٹنے لگتا۔ گاؤں میں یہ بات نہ تھی۔ وہاں تنہائی تو تھی پر دم نہیں گھٹتا تھا۔ وہاں ہم دونوں اس قدر اکیلے نہ تھے بے زاری اتنی گاڑھی نہ تھی۔

گاؤں میں وہ میرے لئے چائے بناتی تھی۔ کھانا پکاتی تھی۔ میں کبھی کبھار بازار سے سودا لے آتا۔ کراچی میں نہ کھانا پکانے کی بات تھی نہ سودا لانے کی۔ اس لئے ہم ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو گئے تھے۔ میں سارا دن برآمدے میں بیٹھ کر نیچے چلتی ہوئی شاہراہ کا نظارہ کرتا رہتا۔ وہ پتہ نہیں' اندر بیٹھی کیا کرتی رہتی۔

ایک دن جب میں سڑک کا نظارہ کر رہا تھا۔ تو اس کی آواز سنائی دی۔ بولی۔ “شہروں میں چوہے نہیں ہوتے کیا؟” میں نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ وہ ٹائیلوں کے فرش پر نگاہیں گاڑھے بیٹھی تھی جیسے مجھ سے نہیں بلکہ ان سے پوچھ رہی ہو۔

چوہے کی بات سن کر میرا دل ڈوب گیا۔ “لو یہاں بھی چوہا آ پہنچا۔ کتنی مشکل سے گاؤں میں اس سے جان چھڑائی تھی۔”

“ہوتے ہوں گے۔” “میں نے سڑک سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس کی آواز آئی۔ “یہاں تو چوہا نہیں آیا کوئی۔”

“یہاں نہیں آیا تو میں کیا کروں۔ یہ میرا قصور ہے؟” مجھے غصہ آگیا۔ مڑ کر دیکھا۔ عابدہ گملے پر جھکی ہوئی تھی۔ یوں جیسے یہ سوال اس نے گملے سے کیا ہو۔

میں نے اپنے سلیپر کو مخاطب کر کے کہا۔ “چوہا یہاں ٹائیلوں میں بل کیسے بنائے۔”
کمرے میں دیر تک خاموشی طاری رہی۔

پھر وہ چھت سے مخاطب ہو کر بولی۔ “بے شک بل نہ بنائے پر آئے تو سہی۔”

اس پر مجھے بہت غصہ آیا۔ اس عورت کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ جب گاؤں میں تھی تو کہتی تھی۔ “چوہا کیوں آتا ہے؟ اب کہہ رہی ہے چوہا کیوں نہیں آتا؟”

گاؤں میں چوہے کی بات اچانک چل پڑی تھی۔ ہوا یوں کہ گاؤں میں ایک رات میں جاگا تو دیکھا کہ عابدہ چارپائی پر گٹھڑی بن کر بیٹھی ہے۔ میں نے سوچا چلو بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے۔ اپنا کیا جاتا ہے۔ پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

“کیا ہوا؟” میں نے پوچھا۔

خوف زدہ آواز میں بولی۔ “چوہا ہے۔”

اس پر مجھے غصہ آگیا۔ “چوہا ہے تو پڑا ہو۔ گاؤں میں چوہا تو ہو گا۔” میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ رضائی لی اور پھر سے سو گیا۔

“سوتی کیوں نہیں؟” میں نے کہا۔

“نیند نہیں آتی۔”

“کیوں نہیں آتی؟”

“ڈر لگتا ہے۔”

“ڈر کیسا؟”

“چوہا جو ہے۔”

“کیا کرے گا؟”

“کاٹ لے گا۔”

“لاحول ولاقوۃ۔ یہ محترمہ سمجھتی ہے کہ اس کا گوشت اس قدر لذیذ ہے کہ چوہا اسے کاٹنے کے لئے اتنی دور سے چل کر آیا ہے۔”

اگلے روز اس نے مجھے ایک سوراخ دکھایا۔ کہنے لگی۔ “چوہا یہاں سے آتا ہے۔” میں نے اس سوراخ کے مطابق ایک پتھر تلاش کیا اور ہتھوڑے سے پتھر کو اس سوراخ میں ٹھونک دیا۔ “لو۔” میں نے اسے مخاطب کئے بغیر کہا۔ “اب چوہا نہیں آئے گا۔”

رات کو اس نے مجھے جگا دیا۔ بولی۔ “چوہا تو آیا ہوا ہے۔ ذرا سنو تو۔”
میں نے سنا۔ واقعی ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی۔

اگلے دن اس نے ایک سوراخ ڈھونڈ لیا۔ بولی۔ “یہاں سے آتا ہے۔” آٹھ دس دن ہم سوراخ ڈھونڈتے اور بند کرتے رہے۔ اس کے باوجود چوہا آتا رہا۔

پھر میں نے ایک ترکیب سوچی۔ میں نے کہا۔ “دیکھ چوہا تجھے کاٹنے کے لئے نہیں آتا بلکہ کچھ کھانے کے لئے آتا ہے۔ اگر ڈیوڑھی میں کھانے کے لئے کوئی چیز رکھ دی جائے تو وہ نہ تو باورچی خانے میں جائے گا، نہ ہمارے کمرے میں آئے گا۔”

اس نے میری بات مان لی۔ دو تین دن وہ سارے گھر میں بو بو کرتی پھری۔ چوہا کون سی چیز خوشی سے کھاتا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ چوہا کیا کھاتا ہے۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ تیسرے دن پتہ نہیں، وہ کہاں سے سن آئی کہ چوہا پنیر بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ روز وہ رومال میں دہی باندھ کر لٹکا دیتی تاکہ شام تک پنیر تیار ہو جائے۔

اگلے روز صبح سویرے وہ دوڑی دوڑی آئی۔ بولی۔ “چوہے نے سارا پنیر کھا لیا ہے۔” اس کے بعد جب بھی میں باہر نکلتا تو ڈیوڑھی میں چوہے کی تھالی غور سے دیکھتا کہ چوہے نے کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ رات کو آنکھ کھلتی تو کان لگا کر آواز سنتا رہتا کہ چوہا ٹک ٹک کر رہا ہے یا نہیں۔

دس پندرہ دنوں کے بعد عابدہ منہ لٹکائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ بولی۔ “چوہا نہیں آیا۔”

“چوہا نہیں آیا؟” میرے منہ سے نکل گیا۔ “کیوں نہیں آیا؟”

“دیکھ تو۔” وہ بولی۔ “روٹی اور پنیر ویسے ہی پڑے ہیں تھالی میں۔”

میں اٹھ کر ڈیوڑھی میں گیا۔ دیکھا تو چوہے کی تھالی پر ایک چڑیا بیٹھی ٹھونگے مار رہی ہے۔ میں نے عابدہ کو آواز دی۔ “یہ دیکھو چوہے کا پنیر چڑیا کھا رہی ہے۔”

وہ دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ بولی۔ “کھانے دو۔ بے چاری بھوکی ہے۔”

اس کے بعد روز صبح عابدہ مجھے آواز دیتی۔ “چوہا آج بھی نہیں آیا۔” انہی دنوں سکندر آ گیا اور زبردستی کراچی لے آیا۔

کراچی میں آنے کے بعد میں چوہے کو بالکل بھول چکا تھا۔ اس روز اچانک اس نے چوہے کی بات چھیڑ کر مجھے پریشان کر دیا۔ دراصل میں اس بات پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ گاؤں میں اس نے چوہے کی بات چلا کر مجھے احمق بنایا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چوہے کی بات کا جواب نہیں دوں گا۔

دو روز وہ کسی نہ کسی بہانے چوہے کی بات کرتی رہی مگر میں نے جواب نہ دیا۔

تیسرے دن وہ واپس گاؤں جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ سکندر نے بڑی کوشش کی کہ وہ رک جائے۔ لیکن وہ نہ مانی۔ اگلے روز ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔

راستے میں وہ بار بار اپنے آپ سے کہتی رہی۔ “چوہا ہماری راہ دیکھ رہا ہو گا۔” لیکن میں نے جواب نہ دیا۔

اگلے روز ہم ریل گاڑی سے سٹیشن پر اترے جہاں سے تانگہ پر بیٹھ کر گاؤں جانا تھا تو وہاں فضلا مل گیا۔

میں نے کہا۔ “فضلے تو کہاں سے آ رہا ہے؟”

وہ بولا۔ “شہر سے آیا ہوں۔ سائیں جی کی حاضری دینے گاؤں جا رہا ہوں۔”

میں نے کہا۔ “فضلے تو سائیں دروٹ کو مانتا ہے کیا؟”

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بولا۔ “میں نے سائیں کو دیکھا ہی نہیں تو ماننا کیسا؟”

“تو پھر مزار پر حاضری کیوں دیتا ہے باقاعدہ؟” میں نے پوچھا۔

“اس میں ایک بھید ہے۔” وہ بولا۔

“کیا بھید ہے؟” میں نے پوچھا۔

“بس اتنا سا بھید ہے۔” فضلے کو کہا۔ “کہ دھیان خود سے ہٹا کر دوجے پر لگا دو۔ چاہے وہ پیر ہو، فقیر ہو یا چوہا ہو۔”

“چوہا ہو۔” میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

“ہاں۔” وہ بولا۔ “چاہے چوہا ہو۔” اور پھر معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔ بولا۔ “آپ چلیں چودھری جی۔ میں نذر نیاز لے کر گاؤں پہنچ جاؤں گا۔”

تانگہ چلنے لگا تو میں نے صوبہ تانگا والے سے کہا۔ “ذرا رک جا۔” اور پھر بے سوچے سمجھے بولا۔ “عابدہ۔”

عابدہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کتنے سالوں بعد میں نے نام لے کر اسے بلایا تھا۔ میں نے کہا۔ “عابدہ۔ اس کے لئے کچھ لے جائیں یہاں سے۔”

اس کی آنکھوں میں تبسم کی ایک لہر جھلکی۔ بولی۔ “میں لے آئی ہوں۔” یہ کہہ کر اس نے تھیلے سے ولایتی پنیر کا ایک ڈبہ نکالا۔ اور فکر مند آواز سے بولی۔ “سکندر کے ابا۔ وہ ولایتی پنیر کھا لے گا کیا؟”

# بھور سمے

پیاری انو---

دیکھ تو بھور سمے آ رہا ہے۔ دبے پاؤں۔ پگ پگ، مدھم مدھم۔ پتہ نہیں کون گوری پائل کی جھنکار کے بغیر، کس پیتم سے ملنے آ رہی ہے۔ دیکھو تو کیا مدھ بھری چال ہے۔ کیا چھب ہے۔

یہ بھور سمے بھی کیا ہے انو۔ مہک میں رچا بسا ہوا۔ تازگی شگفتگی کی پھوار اڑاتا ہوا۔ مدھم دھڑکنوں سے بھرپور۔ بے نام سکون، بکھیرتا ہوا دودھیا سویرا جیسے ماں کی گود کھل کھل کر دھرتی پر چھائے جا رہی ہو۔ جیسے اجابت دعا کے لئے اپنے مندر کے دوار کھول رہی ہو۔ جیسے اللہ میاں آکاش سے نیچے اتر آئے ہوں۔ زیر لبی میں کہہ رہے ہوں۔ "بندے! آ مجھ سے باتیں کر۔"

کاش کہ تو یہاں ہوتی انو اور میرے پاس بیٹھ کر دیکھتی۔ ہم ہاتھ میں ہاتھ دیئے اکٹھی دیکھتیں۔

صبح کے چار بجے ہیں انو۔ اور میں گھر کے باہر باغیچے میں بیٹھی تجھے خط لکھ رہی ہوں۔

گھر والے گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔ رفیق پہل پہریئے ہیں۔ رات دیر تک جاگتے ہیں۔ جوں جوں رات بھیگتی ہے، ان کی حسیات جاگتی ہیں۔ پھر دو بجے کے قریب گویا غبارے سے ہوا نکل جاتی ہے۔ صبح دیر تک بے خبر پڑے رہتے ہیں۔ انہوں نے کبھی بھور سمے نہیں دیکھا۔

میں پچھلی پہری ہوں۔ جب پو پھٹتی ہے تو مجھے جگا دیتی ہے اٹھ صبو اٹھ۔ دیکھو۔ میں کیا کیا دیکھوں انو۔ ہر طرف سے زیر لبی اٹھتی ہے۔ ادھر دیکھ ادھر دیکھ۔ دیکھ

دیکھ کر میں بوند بوند بھر جاتی ہوں۔ پھر جی چاہتا ہے کوئی ہو جسے میں دکھاؤں اور ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے اکٹھے دیکھتے رہیں۔ دیکھتے رہیں۔

وہ دیکھ انو۔ پھول انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھے۔ سہمی سمٹی ہوئی پتیوں نے سبز چنیاں اوڑھ لیں۔ آنے والے سمے کے سواگت کے لیے دیکھ انو۔ گھگوں نے بوہے کھول دیئے لکھاں نکل آئیں پھولوں نے سفید لباس اوڑھ لئے کہ مکھیاں دیکھ لیں۔ مکھیوں کا پریم سندیس بن کر اپنی سونا بھری کٹوریوں کے سرپوش اتار دیئے۔

لو ہوا جھولنے اٹھائے آ گئی کہ بھور سمے کو جھولن سمے بنا دیا۔ انو ایک ایسا ہی بھور سمے میرے اندر چھایا ہوا ہے۔ دل کے انگ انگ میں رچا بسا ہوا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کوئی اندر جھانکے۔ دیکھے۔ جانے۔ اس آرزو نے مجھے اکیلی کر دیا ہے انو۔ اکیلی۔ تنہا۔ اک میں ہی نہیں، انو۔ تو بھی اکیلی ہے۔ ہم سب اکیلیاں ہیں۔ کوئی جان لیتی ہے کہ اکیلی ہوں۔ کوئی نہیں جانتی۔ کوئی سمجھ لیتی ہے کہ یہی ہمارا مقدر ہے۔ کوئی نہیں سمجھتی۔ کیوں سمجھے۔ کیوں خود کو دکھی کرے۔ پر سمجھنے نہ سمجھنے سے مقدر نہیں بدلتے۔

انو---!

پتا نہیں یہ بھور سمے دیکھن کب دبے پاؤں میرے اندر آ بسا۔ جیسے دریا نیچے ہی نیچے سے آتا ہے اور پھر "سیما" بن کر باہر نکل آتا ہے۔ اس "سیما" نے مجھے بھگو دیا ہے۔ ڈبو دیا۔ اب میں نے جانا ہے انو کہ یہ دیکھن باہر سے نہیں آیا۔ اندر سے پھوٹا ہے۔ اب میں نے جانا ہے کہ یہ دیکھن عورت کا نصیبا ہے۔ پہلے دبا دبا بیٹھ رہتا ہے۔ پھر ہولے ہولے نکلتا ہے۔ چھا جاتا ہے۔

جب میں جوان ہوئی تھی تو ایک دم مجھ پر دکھن کا جنون طاری ہوا تھا۔ میں دکھوں، روشنیوں میں دکھوں، اندھیروں میں دکھوں، بیٹھی ہوئی دکھوں، چلوں تو دکھوں، بولوں تو دکھوں، جھرمٹ میں دکھوں، اکیلے میں دکھوں۔ ایسی دکھوں کہ دوجا چونک جائے۔ انو میں دکھنے کی اتنی دیوانی ہوئی کہ بار بار دیکھتی، کیسی دکھتی ہوں۔

میں سمجھی۔ عورت کے جیون کا مقصد صرف دکھنا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ دیکھنا تو پہل جوانی کا ایک پڑاؤ ہے، منزل نہیں۔ چار سال میں دکھتی رہی۔

توبہ ایسی جوانی آئی کہ جو سامنے آتا، جوتوں میں کھڑا حیرت سے دیکھتا۔ جو گزر جاتا، مڑ مڑ کر دیکھتا۔ جو بات کرنے کے لئے آتا، بات بھول بھول جاتا۔ انو تو تو جانتی ہے کہ نگاہوں کی گود میں ایک جھولن ہوتا ہے۔ میں اس جھولنے پر ایسی چڑھی کہ سدھ بدھ کھو بیٹھی۔

چار سال ہلاروں میں جیتی رہی۔

پھر رفیق آ گئے۔ رفیق میرے کزن تھے۔ ولایت پڑھنے گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ کئی ایک دن بے پتوار کی ناؤ کی طرح ڈولتے رہے۔ ڈگمگاتے رہے۔ پھر انہوں نے نگاہوں کا ایسا تار باندھ دیا کہ میں ان جانے میں پروئی گئی۔ جھولن میں ایسی لے آ گئی کہ رنگ پیدا ہو گیا۔ اس کی بوندیوں کی پھوار پڑنے لگی۔ مجھے بھگو دیا۔ میں سمجھی، یہی محبت ہے۔

پھر شادی ہو گئی۔۔۔۔۔

شادی ہو گئی تو پتا نہیں کیا ہوا۔ کچھ ہو گیا۔ آنا" فانا" ہو گیا جیسے بھڑ پروانہ بن جائے۔ ساری دنیا ہی بدل گئی۔ دکھن د یکھن میں بدل گیا۔ انہیں دیکھ دیکھ کر جینے لگی۔ انہیں بت بنا لیا۔ خود بھینٹ چڑھ گئی۔ ہر وقت آرتی اٹھائے رکھتی۔ پھول برساتی رہتی۔

پھر آہستہ آہستہ وہ بت پھیل کر گرد و پیش پر چھا گیا۔ ہر چیز میں انہیں دکھن لگی۔ پھولوں میں، پتیوں میں، بادلوں میں، ہوا کے جھونکوں میں، ہر جگہ۔ اور انو وہ میرے بند بند میں سما گئے اور میرے اندر بھور سمے پیدا ہو گیا۔

میری ساری سہیلیاں کہتی ہیں۔ صبو تو بڑی خوش نصیب ہے۔ تجھے ان کی محبت حاصل ہے۔ دو سال میں بھی یہی سمجھتی رہی۔ پھر جیسے میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ نہیں یہ تو محبت نہیں۔

ہماری شادی کو تین سال ہو چکے ہیں۔ اب ان کی نگاہوں کا تارا ٹوٹ چکا ہے۔ میں انہیں وقفوں سے دکھتی ہوں۔ لیکن جب دیکھتے ہیں آنکھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ پھر ایک شرارہ اڑتا ہے۔ بھس میں آگ لگ جاتی ہے۔ اک بھانبڑ ابھرتا ہے۔ جولا مکھی جاگتا ہے۔ ان کی آغوش میں میرے اندر پھلجھڑیاں چلتی ہیں۔ گھنٹیاں بجتی ہیں۔ رنگ رس پچکاریاں چھوٹتی ہیں۔ پھر ایک ہوائی شوں کر کے چل جاتی ہے۔ وہ دھم سے زمین پر آ گرتے ہیں۔ یوں آنکھ کھل جاتی ہے جیسے خواب سے بیدار ہوتے ہیں۔ پھر میں انہیں دکھتی۔ ان کی وہ نگاہ سوئچ آف ہو جاتی ہے۔ میں پیش منظر سے پس منظر میں چلی جاتی ہوں لیکن میری نگاہ میں وہ کبھی پس منظر میں نہیں جاتے۔ سدا پیش منظر میں رہتے ہیں۔

اب میں نے جانا ہے انو۔ یہ آگ اگن تو محبت نہیں۔ یہ تو لگن کی شدت کو ختم کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ خود کو دوجے سے الگ کرنے، محفوظ کر لینے کی اک چال ہے۔

مرد کے دل میں محبت بھور سمے پیدا نہیں ہوتا۔ انو وہ تو جلا دیتا ہے۔ محبت تو بناتی ہے، بگاڑتی نہیں۔ یہ تو کپا لنڈھا دینے والی بات ہے۔ محبت تو پلی پلی جوڑن کا نام ہے۔ انگ انگ میں دیپ جلائے رکھنے کا نام ہے۔ ایسے دیپ جو ان بجھ ہوں۔ ہلکی ہلکی لہروں کا نام ہے جو بند بند میں رواں دواں رہیں۔ جوار بھاٹے کا نام نہیں۔

اب مجھے یاد آتا ہے انو۔ باجی کہا کرتی تھی۔ صبو عورت سے دھوکہ ہوا ہے۔ مرد کا پریم تو جیون پیالی رکھنے کے لیے قدرت کی ایک چال ہے۔

اب میں نے جانا انو باجی سچ کہتی تھی۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ محبت کی دین تو صرف عورت کو ملی ہے۔ مرد تو خالی جوار بھاٹا ہے۔ سکندر ہے۔ آتا ہے۔ فتح کرتا ہے۔ چلا جاتا ہے۔ مرد تو انو مداری کا طوطا ہے۔ توپ چلاتا ہے اور پھر آرام سے بے تعلق جھولنے پر جا بیٹھتا ہے اور عورت اپنے بند بند میں ممتا کے دیپ جلائے بیٹھی رہتی ہے۔ بیٹھی رہتی ہے۔

نہیں انو۔ میں قدرت کی چال کے جال میں پھنسنے والا پنچھی نہیں بنوں گی۔ مجھے تو اک ساتھی چاہیے جس کے انگ انگ میں محبت کی بھیگ رچی بسی ہو۔ تار بندھا رہے۔ مدھم لہریں رواں دواں رہیں۔ بند بند میں دیپ جلتے رہیں۔ محبت بھرے دیپ جیسے بھور سمے میں جلتے ہیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے انو جیسے یہ بھور سمے چاروں اور چھایا ہوا بھور سمے، سمے بنانے والے کا، اپنے بندوں کے نام محبت بھرا پیغام ہے۔ اسے سو کے مت گنوا۔ اٹھ۔ اٹھ کر میرے ساتھ باتیں کر۔ محبت بھری باتیں۔

انو میرا جی چاہتا ہے۔ کوئی ہو۔ جو میرے ساتھ بھور سمے کو دیکھے۔ اس کے پیغام کو سنے۔ اسے بیتے اور ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے دیکھتے رہیں۔ دیکھتے رہیں۔

# آدھے چہرے

”میں سمجھتا ہوں کہ آج کی دنیا میں سب سے اہم مسئلہ ایموشنل سٹریس اور سٹرین کا ہے۔“ اسلم نے کہا۔ ”اگر ہم ایموشنل سٹریس کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو بہت سی کمپلی کیشنز سے نجات مل سکتی ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے ٹرانکولائزر قسم کی چیز۔“ رشید نے پوچھا۔

”نہیں نہیں۔“ اسلم نے کہا۔ ”ٹرانکولائزر نے مزید پیچیدگیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ ایلوپیتھی نے جو مرض کو دبا دینے کی رسم پیدا کی ہے‘ اس سے امراض میں اضافہ ہو گیا ہے اور صرف اضافہ ہی نہیں‘ اس سپریشن کی وجہ سے مرض نے کیموفلاج کرنا سیکھ لیا ہے۔ لہٰذا مرض بھیس بدل بدل کر خود کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں اسرار کا عنصر بڑھتا جا رہا ہے۔ تشخیص کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ کیوں طاؤس۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“ اسلم نے پوچھا۔

”میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں۔“ طاؤس بولا۔ ”ہمارا طریق علاج یعنی ہومیوپیتھی یقیناً“ روحانی طریقہ علاج ہے۔ ہماری ادویات مادے کی نہیں بلکہ انرجی کی صورت میں ہوتی ہیں۔ جتنی دوا کم ہو‘ اس میں اتنی ہی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ یہی اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔“

”وہ تو ہے۔“ عظیم نے کہا۔ ”یقیناً“ یہ طریق علاج اپنی نوعیت میں روحانی ہے لیکن ہمارے پریکٹنگ ہومیوپیتھس کا نقطہ نظر ابھی مادیت سے نکل نہیں سکا۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔“

”ڈاکٹر صاحبان۔“ رشید ہنس کر بولا۔ ”آپ لاکھ کوشش کریں لیکن ایلوپیتھی کو ریپلیس نہیں کر سکتے۔“

”وہ کیوں؟“ حامد نے پوچھا۔

”سیدھی بات ہے۔“ رشید نے جواب دیا ”آج کل مریض کیور نہیں چاہتا۔ وہ صرف ریلیف چاہتا ہے۔ کیور کے لئے صبر چاہئے۔ استقلال چاہئے۔ آج کل لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ کیور کا انتظار کریں۔ بس ایک گولی ہو‘ ایک ٹیکہ لگے اور شام کو انٹرکان کی محفل میں شو آف کا موقعہ ہاتھ سے نہ جائے۔“

”سچ کہتے ہو بھائی۔“ حامد نے آہ بھری۔

”اسلم صاحب۔“ طاؤس نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی آئڈینٹٹی کھو چکے ہیں۔ ماڈرن ایج کی یہ ایک ڈزیز ہے۔ کینٹیجنس ڈزیز۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ حامد بولا۔

”میرا مطلب ہے۔ آج کل کے نوجوانوں کو پتہ نہیں کہ وہ کون ہیں۔ پتہ نہیں‘ وہ چاہتے کیا ہیں۔ موومنٹ کے دیوانے تو ہیں۔ چلتے رہنے کا بھوت سوار ہے۔ لیکن انہیں پتہ نہیں کہ ہم کیوں چل رہے ہیں۔ ہمیں کہاں پہنچنا ہے۔ ہمارے نوجوان میڈ کراوڈ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اندر کے فرد کو دبا رکھا ہے۔ بالکل ایسے جیسے اینٹی بایوٹکس اندر کی بیماری کو دبا دیتے ہیں۔ وہ اکیلے ہونے سے ڈرتے ہیں۔“ طاؤس نے ایک لمبی آہ بھری اور گویا اپنے آپ سے بولا۔ ”کاش کہ میں کوئی ایسی دوا بنانے میں کامیاب ہو سکتا جو اندر کے فرد کو ریلیز کر سکتی۔ میڈ کراوڈ کی نفی کر سکتی۔“

”ہوں۔ دلچسپ بات ہے۔“ عظیم نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو اس کا خیال کیسے آیا؟“ حامد نے طاؤس سے پوچھا۔

”دو سال ہوئے۔“ طاؤس کہنے لگا۔ ”جب میں نے پریکٹس شروع کی تو پہلا مریض جو میرے پاس آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا‘ ڈاکٹر صاحب یہ بتائیے کہ میں کون ہوں؟“

”عجیب بات ہے۔“ رشید زیر لب بولا۔

”اور وہ مریض مکمل ہوش و حواس میں تھا کیا؟“ اسلم نے پوچھا۔

”بالکل۔“ طاؤس نے جواب دیا۔

”شاید ڈس بیلنسڈ ہو۔“ عظیم نے گویا اپنے آپ سے پوچھا۔

”بظاہر تو نہیں لگتا تھا۔“ طاؤس نے جواب دیا۔

”حیرت کی بات ہے۔“ رشید نے دہرایا۔ اس وقت یہ سب لوگ رشید کے مکان سے ملحقہ لان میں بیٹھے تھے۔

دراصل رشید ہومیو پیتھی کا بہت دلدادہ تھا۔ ہومیو پیتھ ڈاکٹروں سے اس کے بڑے مراسم تھے۔

اس روز اس نے چار ہومیو پیتھ ڈاکٹروں کو اپنے گھر پر مدعو کر رکھا تھا۔ غالباً" کوئی تقریب تھی یا ویسے ہی۔

رشید خود ہومیو پیتھ نہیں تھا لیکن اسے ہومیو پیتھی کے کیسز کا بڑا شوق تھا۔ بہر حال کھانا کھانے کے بعد وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے سبز چائے پی رہے تھے کہ دور حاضرہ کی بات چل نکلی تھی۔

طاؤس کے اس کیس پر ڈاکٹر تو نہیں البتہ رشید بہت متاثر ہوا۔ اس کے اصرار پر طاؤس نے انہیں اس نوجوان کا واقعہ سنایا۔ طاؤس نے بات شروع کی۔

”ان دنوں میں نے نیا نیا مطب کھولا تھا۔ اور مطب بھی کیا۔ میں نے گھر کے ایک کمرے پر بورڈ لگایا تھا اور وہاں چند ایک ضروری کتابیں اور دوائیں رکھ لی تھیں۔

شام کا وقت تھا۔ میں اپنے مطب میں بیٹھا ایک رسالے کا مطالعہ کر رہا تھا کہ دروازے پر ٹک ٹک کی آواز آئی۔ دیکھا تو دروازے پر ایک خوش پوش نوجوان کھڑا ہے۔ ”میں اندر آ سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

”تشریف لایئے۔ میں نے رسالہ ایک طرف رکھا۔ ”بیٹھئے۔“

”آپ ہومیو پیتھ ہیں کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”جی۔“ میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کی شکل و شباہت ایک پریکٹیکل نوجوان جیسی تھی۔ سمارٹ، ذہین، مضطرب، شوخ، لاابالی، چمکتی آنکھیں، چوڑا منہ، لٹکتی مونچھیں اور سر پر بالوں کا ٹوکرا۔

”دراصل میں آپ سے ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔“ نوجوان نے کہا۔

”پوچھئے۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ غالباً" اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بات شروع کرے۔

پھر وہ ایک دم کہنے لگا۔ ”میری ایک پرابلم ہے۔ جناب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا میں حمید ہوں یا اختر ہوں۔“

طاؤس رک گیا۔ حاضرین حیرت سے طاؤس کی طرف دیکھنے لگے۔

”ہاں ہاں۔“ یہ کیا بات ہوئی۔ رشید بے صبرا ہو رہا تھا۔ ”یہ کیا بات ہوئی بھلا میں حمید ہوں یا اختر۔“

طاؤس نے بات شروع کی۔ بولا۔ ”نوجوان کی بات سن کر میں گھبرا گیا۔ سمجھا۔ شاید اس کا ذہن گڈمڈ ہے لیکن میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ پھر نوجوان خود ہی بولا۔ ”آئی ایم ناٹ اے مینٹل کیس سر۔ میرا ذہن بالکل ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر دراصل مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے بات کروں۔“

”یہ بتایئے کہ حمید کون ہے، اختر کون ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں ہوں۔ میں حمید بھی ہوں، اختر بھی۔ میرا نام حمید اختر ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو کیا حمید اختر ایک ہی فرد کا نام ہے؟ میں نے پوچھا۔

”جی۔ ایک ہی فرد کا۔“ اس نے جواب دیا۔

”پھر آپ نے یہ کیوں پوچھا کہ میں حمید ہوں یا اختر؟“

”میں نے بالکل ٹھیک پوچھا۔ ڈاکٹر یہی میری پرابلم ہے۔ لیکن میں اپنی پرابلم کسی کو بھی نہیں سمجھا سکتا۔ میں اس امید پر یہاں آیا تھا کہ شاید ہومیو پیتھی میں کوئی ایسی دوا ہو جو میری پرابلم کو حل کر سکے۔ لیکن اٹس نو یوز۔“ وہ جانے کے لئے مڑا۔ ”معاف کیجئے۔ میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔“

”ذرا ٹھہریئے تو۔ میں نے اٹھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

”فائدہ؟“ وہ بولا۔

”جب میں اپنی پرابلم پیش ہی نہیں کر سکتا تو..........“

”گولی ماریئے پرابلم کو۔“ میں نے کہا۔ ”آیئے اکٹھے بیٹھ کر چائے کا پیالہ پیتے ہیں۔ دنیا میں سب سے عمدہ دوا اکھٹے بیٹھ کر باتیں کرنا ہے۔“

”لیکن آپ کا وقت۔“ اس نے کہا۔

”بے فکر رہئے۔ میں بالکل فارغ ہوں۔ احمد دین---“ میں نے باآواز بلند اپنے ملازم کو پکارا۔ ”بھئی چائے لے آؤ۔“ اس پر وہ نوجوان رک گیا۔

”بیٹھئے نا۔“ میں نے نوجوان کو صوفے پر بٹھا دیا۔ ”دیکھئے موسم کتنا خوشگوار ہے اور یہاں سے پہاڑوں کا منظر کتنا اچھا لگتا ہے۔“ میں نے اس سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ دیر تک بیٹھے ہم دونوں چائے پیتے رہے۔ اس دوران میں دو ایک مرتبہ اس نے اپنی پرالم کی بات شروع کرنے کی پھر سے کوشش کی۔ آخر میں نے اس سے کہا۔ ”حمید صاحب۔ آپ اپنی پرابلم پیش نہ کریں بلکہ اپنی آپ بیتی سنائیں۔ آپ کی پرابلم آپ ہی آپ ہی باہر نکل آئے گی۔“

بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے مجھے اپنی کہانی سنانی شروع کر دی۔

کہنے لگا۔ ”ڈاکٹر صاحب۔ میرا نام حمید اختر ہے لیکن گھر میں مجھے سب حمید کہتے ہیں۔ ہم شہر کے پرانے حصے کوچہ قاضیاں میں رہتے ہیں۔ میرے آباؤ اجداد نہ جانے کب سے اس محلے میں رہتے ہیں۔ یہ محلّہ ایک کوچہ بند محلّہ ہے۔ میرا مطلب ہے چاروں طرف سے بند ہے۔ اندر جانے کے لئے ایک بہت بڑی ڈیوڑھی بنی ہوئی ہے۔ جانے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ محلے میں صرف قاضی آباد ہیں جو ایک دوسرے کے عزیز یا رشتہ دار ہیں۔“ وہ رک گیا اور کچھ دیر توقف کے بعد بولا۔

”آپ چونکہ شہر کے جدید حصے میں رہتے ہیں، آپ نہیں سمجھ سکیں گے کہ محلے میں رہنے کا مطلب کیا ہے۔ محلے میں ہر شخص ہر دوسرے شخص کو جانتا ہے۔ جونہی آپ محلے میں داخل ہوتے ہیں، لوگوں کی نظریں آپ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ بولتا کس طرح ہے۔ سر اٹھا کر یا نیوا کے لڑکیوں کی طرف کن نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

ہم لوگ جو پشتوں سے محلے میں رہتے آئے ہیں، محلّہ ہماری ہڈیوں میں رچ بس گیا ہے۔ جونہی ہم محلے میں داخل ہوتے ہیں، اپنے آپ آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ گفتگو میں شوخی ختم ہو جاتی ہے۔ اندر کا غنڈہ پن ڈھل جاتا ہے۔ لڑکیاں نگاہ میں لڑکیاں نہیں رہتیں۔ بڑوں کے لئے ادب و احترام کا ایک خول چڑھ جاتا ہے۔

اگرچہ اب محلے میں بڑی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ برقعے اتر گئے ہیں۔ لباس بدل گئے ہیں۔ کاریں آگئی ہیں۔ ڈرائنگ روم سج گئے ہیں۔ لیکن محلے والوں کا رخ نہیں بدلا۔ اگر بدلا بھی ہے تو یہ تبدیلی باہر تک محدود ہے۔ محلے میں داخل ہوتے ہی کایا پلٹ جاتی ہے۔ کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں، ویسے ہی بے اختیاری طور پر۔

ہاں میں اس محلے میں پلا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب۔ سمجھے آپ اور مجھے اپنی ماں سے محبت ہے۔ نہیں محبت نہیں۔ عشق ہے عشق۔ میری ماں نے جتنی محبت مجھے دی ہے، اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ میں اپنی ماں کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں ڈاکٹر۔“

ماں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ جذباتی ہو گیا۔ طاؤس ایک ساعت کے لئے رک گیا۔ پھر بولا۔

”آپ کا باپ؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”اب تو میرا باپ ایک اچھی خاصی نوکری پر ہے۔ پہلے وہ ایک معمولی عہدے پر کام کرتے تھے۔ آج کل تو ہمارا گھر ایک اچھا خاصا مڈل کلاس گھرانا ہے۔ اچھا گزارہ ہو رہا ہے۔ پہلے یہ بات نہ تھی۔ بہت مشکل سے پورا ہوتا تھا۔

پھر ہم پر ایک مصیبت نازل ہو گئی۔ ابا بیمار پڑ گئے۔ وہ ایک عجیب سی بیماری تھی۔ انہیں ریڑھ کی ہڈی میں شدت کا درد اٹھتا تھا۔ ہم نے انہیں ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ ہسپتال والوں نے انہیں درد سے بچانے کے لئے نشے والے ٹیکے لگانے شروع کر دیئے۔ دو سال بعد وہ صحت مند ہو کر گھر آئے تو ان ٹیکوں کے عادی ہو چکے تھے۔ ایڈکٹ ہونے کی وجہ سے ان کی نوکری چھوٹ گئی۔ بد مزاجی حد سے بڑھ گئی۔ جیسے کہ ہر اس ڈرگ ایڈکٹ کی ہوتی ہے جس کے پاس نشہ پورا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔

اف۔ وہ چار سال ہم پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہماری ہڈیاں توڑ دیں۔ امی، چھوٹی بہن اور میں پس کر رہ گئے۔ ہم تینوں نے مزدوروں کی طرح کام کیا۔ ریڈی میڈ کپڑے سیئے۔ بیچے۔ دیسی نائیوں کی سپلائی کرنے کے لئے فیس کریمیں بنائیں۔ تھیلے سیئے۔ سیلوفین کے لفافے بنائے۔ ان دنوں ہمیں کئی کئی روز فاقے آئے لیکن امی نے ابا کے علاج اور ہماری تعلیم کو ہر قیمت پر جاری رکھا۔ اگر امی نہ ہوتیں تو گھر کے پرخچے اڑ جاتے۔ امی ایک بہت بڑی عورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب--- اس نے ہم سب کا حوصلہ بندھائے رکھا۔ ہم میں مصیبتیں سہنے کی ہمت پیدا کی۔ ابا کی دیوانگی برداشت کی۔ خیر وہ دن بیت گئے۔ ابا کی وہ عادت چھوٹ گئی اور پھر انہیں پہلے سے بہتر ملازمت مل گئی۔ ایسی کہ ہم خاصے خوش حال ہو گئے ہیں۔

گھر میں مجھے سب حمید کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ کبھی کسی نے اختر کہہ کر نہیں بلایا۔ محلے میں سب حمید کے نام سے بلاتے ہیں۔ جب کوئی حمید کے نام سے بلاتا ہے تو آواز میرے کانوں میں داخل ہو کر سیدھی دل میں پہنچ جاتی ہے اور میرے دل میں گھر اور محلے کی یادیں یوں جھن جھن کرنے لگتی ہیں جیسے ساز کی تاریں۔ گھر سے وابستہ جذبات ابھرتے ہیں۔ ادب، احترام، خدمت، برداشت، ایک مٹھاس سی پیدا ہو جاتی ہے۔ میری گردن جھک جاتی ہے۔ نگاہیں بھیگ جاتی ہیں۔ منہ سے جی ہاں جی ہاں نکلتا ہے۔ ایک عجیب سا سرور، عجیب سا سکون، میں بیان نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر صاحب۔“ نوجوان نے جھرجھری لے کر کہا۔

”میں سمجھتا ہوں آپ کی بات کو۔“ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”اسے صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو پشت در پشت سے محلے میں رہتا آیا ہو۔ ڈاکٹر۔“ نوجوان نے پھر بات شروع کی۔ ”جب میں کالج میں داخل ہوا۔ ان دنوں ہماری گھریلو مصیبت نئی نئی ختم ہوئی تھی۔ محنت و مشقت اور غربت کا دور دور ہوا تھا۔ کالج میں میرا جی چاہتا تھا کہ الٹی چھلانگیں لگاؤں۔ ہنسوں، کھیلوں، قہقہے لگاؤں اس کو چھیڑوں اس سے الجھوں۔ پھر وہاں محلے کی بندشیں بھی تو نہ تھی۔ ایک عجیب سی آزادی کا احساس ہوا مجھے۔ مادر پدر آزاد پھر یہ بھی تھا کہ

وہاں مجھے کوئی حمید کے نام سے پکارنے والا نہ تھا۔ پتہ نہیں کیسے وہاں کالج میں سبھی مجھے اختر کہہ کر بلاتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے میں محسوس کرنے لگا تھا کہ میں ایک نیا نکور نوجوان ہوں جسے حمید سے دور کا تعلق نہیں۔ یعنی یوں سمجھ لیجئے کہ کالج میں یوں تھا جیسے بوتل سے نکلا ہوا جن ہو۔

میں نے بال بڑھائے۔ مونچھیں لٹکائیں۔ جیکٹ اور جین پہن لئے۔ میرا بولنے کا انداز بدل گیا۔ سوچنے کا انداز بدل گیا۔ جینے کا انداز یوں بدل گیا جیسے کوئی چٹ سے پٹ ہو جائے۔

ایک ہی سال، میں کالج کی ہر ایکٹویٹی میں پیش پیش ہو گیا۔ آزادی کے نعرے لگانے میں، پروفیسروں کا مذاق اڑانے میں، گرل اسٹوڈنٹس کو چھیڑنے میں، گلیڈ آئی چمکانے میں، چمکیلی باتیں کرکے اپنی دھاک جمانے میں، سٹرائیک کرنے میں، جلسہ جلوس آرگنائز کرنے میں، ہاتھ پائی کرنے میں، لڑکیوں سے رومان لڑانے میں۔ میں ڈیبیٹ کلب کا سیکرٹری بن گیا۔ سپورٹس میں کھلاڑی تو نہ بن سکا لیکن پنڈال میں کھڑا ہو کر جس کو چاہتا، سپورٹ کرکے ہیرو بنا دیا۔ جس لڑکی پر توجہ دیتا، وہ ابھر کر کالج کی فضا پر چھا جاتی۔ جس پارٹی کو چاہتا، اسے کامیاب بنا دیتا۔ جسے نہ چاہتا، اسے یوں توڑ کر رکھ دیتا جیسے ہاتھ کا کھلونا ہو۔

یعنی تین سال میں اختر کالج کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ سب سے بڑا بلی بن گیا۔ ڈینڈی بن گیا۔

اب پروفیسر اس سے دبتے ہیں۔ لڑکے اس کے پیچھے چلنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ لڑکیاں اس سے خائف ہیں۔ ساتھ ہی اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔ ”بولتے بولتے نوجوان رک گیا۔“

“اور --- حمید؟” میں نے اس سے پوچھا۔

“حمید۔” وہ مسکرایا۔ “حمید اپنی جگہ جوں کا توں قائم ہے۔ جب بھی اختر محلے میں داخل ہوتا ہے تو اس کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ اوپر سے اختر کا چھلکا اتر جاتا ہے اور نیچے سے حمید نکل آتا ہے۔ گردن جھک جاتی ہے۔ تنے ہوئے سینے میں لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ نگاہوں میں ادب اور لحاظ کا لگاؤ ابھر آتا ہے۔ لڑکی کو دیکھ کر وہ مہتابی نہیں چھوٹتی جس سے کالج کی فضا تارے تارے ہوئی ہے۔ الٹا لڑکیاں ماں بہنوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ بڑے بوڑھوں کے لئے وہ تحقیر نہیں رہتی بلکہ اس کی جگہ احترام اور ادب کا جذبہ ابھرتا ہے اور جب وہ گھر میں داخل ہوتا ہے تو ماں ماں نظر آتی ہے جیسے دیوی ہو اور اس کا جی چاہتا ہے کہ ساری دنیا کو اٹھا کر دیوی کے قدموں کی بھینٹ کر دے۔” نوجوان خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے پیار بھری پھوار نکل رہی تھی۔

دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ آخر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ طاؤس نے کہا اور بن سوچے سمجھے ایک ایسا سوال کر دیا کہ میں خود حیران رہ گیا۔ میں نے کہا۔ “آپ کو کیا یہ احساس شروع سے ہی تھا کہ حمید اور اختر دو مختلف افراد ہیں یا..............”

“نہیں۔ نہیں۔” نوجوان نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلا دیا۔ “مجھے اس کا قطعی احساس نہیں تھا۔ اگر کل وہ واقعہ نہ ہوتا تو شاید میں بے خبری ہی میں رہتا۔

کل دوپہر کے وقت کالج کے کھلے میدان میں ہم ایک بڑے فنکشن کا انتظام کر رہے تھے۔ اختر اس فنکشن کا ناظم بھی تھا اور روح رواں بھی۔ اس وقت وہ لڑکیوں کو ہدایات دے رہا تھا کہ ہمارے محلے کا چچا غفورا وہاں آ گیا۔ اس نے آوازیں دینی شروع کر دیں۔ “حمید۔ حمید۔” اختر نے وہ آواز سنی بھی لیکن اس وقت اس کے لئے حمید کا کوئی مفہوم نہ تھا۔ پتہ نہیں حمید کون تھا۔

پھر لڑکوں نے شور مچا دیا۔ “بھئی اختر یہ صاحب کسی حمید کا پوچھ رہے ہیں۔”

“یہی تو اپنا حمید ہے۔” چاچا نے میری طرف اشارہ کرکے کہا۔

دفعتاً” میں نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے چچا غفورا کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر اختر کا ذہن گڈمڈ ہو گیا۔ شدید دھکا لگا۔ جب چچا نے بتایا کہ ماں بیمار ہے تو اختر کی نگاہ میں وہ میدان، وہ کالج اور وہ لڑکے سب دھندلا گئے۔ ایک خلا نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر حمید جاگ اٹھا۔ یوں جیسے بٹن دبانے سے بتی جل اٹھتی ہے۔

نوجوان خاموش ہو گیا۔ کافی دیر خاموش رہا۔ پھر گویا اپنے آپ سے کہنے لگا۔ “آج سارا دن میرے ذہن میں یہی سوال گھومتا رہا کہ میں کون ہوں۔ اختر یا حمید۔ پھر میری ہومیوپیتھک کتابوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ “میری ماں ہومیوپیتھی کی بڑی قائل ہے۔ یہاں سے گزر رہا تھا کہ آپ کا بورڈ دیکھ کر خیال آیا۔ کیوں نہ آپ سے پوچھوں۔ کیا آپ کے ہاں کوئی ایسی دوا ہے جو میری اصلیت کو ظاہر کر دے۔ سامنے لے آئے تاکہ پتہ چلے کہ مجھے حمید بن کر زندگی گزارنی ہے یا اختر بن کر۔ یہ میری پرابلم ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟”

نوجوان نے جلتی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ طاؤس رک گیا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔

اسلم چھت کی طرف گھور رہا تھا۔ حامد ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی ٹیکے بیٹھا سوچ رہا تھا۔

عظیم بظاہر پھٹی پھٹی آنکھوں سے طاؤس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کی سوچ نہ جانے کن خلاؤں میں بھٹک رہی تھی۔ رشید منہ میں پنسل ڈالے بیٹھا تھا۔

“بڑا دلچسپ کیس ہے۔” اسلم نے چھائی ہوئی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

“اسے صرف سپلٹ پر سنلیٹی تو نہیں کہہ سکتے۔ عظیم بولا ڈول پر سنلیٹی بھی نہیں۔”

“کیا یہ صرف حمید اختر کا خصوصی کیس ہے یا ہر ماڈرن نوجوان کا لچیٹ کا جو پشتوں سے محلے میں رہتا آیا ہے۔” حامد نے پوچھا۔

“کچھ نہیں کہا جا سکتا۔” طاؤس نے جواب دیا۔

“چھوڑو یار ان باتوں کو۔” رشید بولا۔ “یہ بتاؤ کہ تم نے حمید اختر کو کیا جواب دیا؟”

“وہی جو معالج دیا کرتے ہیں۔” طاؤس نے جواب دیا۔ “میں نے کہا' میں آپ کا کیس سٹڈی کروں گا۔ مجھے چار ایک دن کی مہلت دیجئے۔” اس پر نوجوان اٹھ بیٹھا۔ “میں پھر آؤں گا۔ شاید اتوار کے دن۔ امید تو ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔” یہ کہہ کر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔

“کیا وہ اگلی اتوار کو آیا؟” رشید نے پوچھا۔

طاؤس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

“یعنی بات ختم ہو گئی۔”

“نہیں۔” طاؤس بولا۔ “بلکہ بات شروع ہو گئی۔”

“کیا مطلب؟” عظیم نے پوچھا۔

“میرے دل میں ایک سوال کھڑا ہو گیا۔” طاؤس بولا۔ “کہ اگر اس کیس کو ہومیو پیتھی حل کر سکتی تو ہومیو پیتھی کے قیام کا کوئی جواز نہیں۔”

“بالکل۔” اسلم بولا۔ “ایسے کیس کو صرف ہومیو پیتھی ہی حل کر سکتی ہے۔”

“اگر ہومیو پیتھی سپر سلف کو باہر نہیں لا سکتی تو یہ ہمارا قصور ہے۔ سسٹم کا نہیں۔” طاؤس نے کہا۔ “اگر ہومیو پیتھی ہپوکریسی کی عادت کو توڑ نہیں سکتی تو یہ ایک افسوس ناک بات ہے۔ قصور ہمارا ہے کہ ہم نے ہومیو پیتھی کو اس زاویئے سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ میٹریا میڈیکا میں زیادہ تر سمٹپسمز ایسے درج ہیں جو جسم نہیں' شخصیت کی حد میں آتے ہیں۔” طاؤس جوش میں آ گیا۔

“وہ تو سب ٹھیک ہے۔” حامد نے کہا۔ “لیکن ہمیں یہ بتائیے کہ کیا مریض پھر کبھی آپ سے ملا؟”

“ہاں ملا۔” طاؤس نے بات شروع کی۔ “مگر اتفاقاً” تقریباً” چھ مہینے بعد۔ اس روز میں اتفاقاً” میونسپل پارک میں جا نکلا تھا۔ وہاں گھومتے پھرتے دفعتاً” میں نے دیکھا کہ وہ اکیلا ایک بنچ پر بیٹھا گہری سوچ میں کھویا ہوا ہے۔”

“ہیلو۔” میں نے کہا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ “شاید آپ کو یاد نہ رہا ہو۔ میں طاؤس ہومیو پیتھ ہوں۔”

“اوہ۔” وہ اٹھ بیٹھا۔

“کہیے۔ آپ وعدہ کے مطابق تشریف نہ لائے؟” میں نے پوچھا۔

“امی کی بیماری کی وجہ سے میں سب کچھ بھول گیا ڈاکٹر۔” وہ بولا۔

“اب کیا حال ہے ان کا؟” میں نے پوچھا۔

“ٹھیک ہو گئیں ہیں لیکن ڈاکٹر میں ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔” اس نے آہ بھر کر کہا۔

“کیا ہوا؟” میں نے پوچھا۔

“مجھے کالج کی ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے ڈاکٹر۔” اس نے جواب دیا۔

“آپ کا مطلب۔ اختر کو محبت ہو گئی ہے یا حمید کو؟”

“ہاں اختر کو۔” وہ ہنسنے لگا۔

“لیکن اختر اور محبت بے جوڑ بات ہے۔”

“ہاں ہاں۔” وہ چلایا۔ “اختر تو خود ایک بگڑا ہوا محبوب ہے۔ اسے محبت نہیں ہو سکتی تھی لیکن ہو گئی۔ ڈاکٹر۔ ہو گئی۔ پتہ نہیں کیسے۔ پہلے تو اختر یہ سمجھتا رہا کہ محض دل لگی ہے۔ آپ اپنے کو دھوکا دیتا رہا۔ بہلاتا رہا۔ پھر.........”

“لیکن وہ لڑکی کون ہے؟” میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

کہنے لگا۔ “تھرڈ ایئر کی لڑکی ہے۔ اس کا نام سنبل ہے۔ یہ بڑی عجیب و غریب لڑکی ہے ڈاکٹر۔ بڑی عجیب و غریب۔ جب وہ نئی نئی کالج میں داخل ہوئی تھی تو سب نے سمجھا تھا کہ وہ بہت ہی معصوم ہے۔ بات بات پر شرما جاتی تھی۔ اس کی شرماہٹ بہت ہی جاذب نظر تھی۔ وہ ایک چھوٹی سی پتلی' دبلی' سمارٹ لڑکی ہے' تیز' بہت تیز۔ گندمی رنگ' خدوخال تیکھے' سوئی کی طرح چبھ جانے والی لڑکی ہے وہ۔

“خیر صاحب۔” نوجوان نے بات جاری رکھی۔ “چند ہی مہینوں میں سنبل نے پر پرزے نکال لئے اور لڑکیوں کو پتہ چل گیا کہ وہ لجاتی شرماتی نہیں بلکہ شرماہٹ کو استعمال کرتی ہے۔ اور

ڈاکٹر اسے شرماہٹ کو استعمال کرنا آتا ہے۔ لجا لجا کر توجہ جذب کرتی ہے۔ ایسے کہ میک اپ کرے گی۔ جب شرماتی ہے' اس وقت اس کی پلکیں اڑتی تیتری کے پروں کی طرح پنکھی جھلتی ہیں۔ گال سرخ ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں غروب ہو کر طلوع ہوتی ہیں۔ پھر غروب ہو جاتی ہیں۔ باقی لڑکیوں کا انداز تو دھویا دھایا ہوتا ہے۔ میٹر آف فیکٹ قسم کا۔ چونکہ وہ رومانٹک انداز کو رجعت پسندی کا نشان سمجھتی ہیں اور شرمانے کو نفرت کی آنکھ سے دیکھتی ہیں۔ اسی وجہ سے سنبل کی اپیل انوکھی تھی۔ سبھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر پتہ چلا کہ سنبل بڑی حرام زادی ہے۔ وہ لڑکوں سے کھیلتی ہے۔ کھیلنے کا گر جانتی ہے۔ آج آپ کی طرف متوجہ ہوئی۔ شرما شرما کر آپ کا برا حال کر دیا۔ کل آپ کو یوں نظرانداز کر دے گی جیسے جانتی ہی نہ ہو۔

اس کا انداز کچھ ایسا ہے ڈاکٹر کہ جس کی طرف متوجہ ہو جائے' وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میرے قابو میں ہے۔ قابو میں لانے کی کوشش کرو تو یوں انگلیوں سے پھسل جاتی ہے جیسے جیتی مچھلی ہو۔ ایک نگاہ ڈالئے تو اتنی قریب آ جاتی ہے کہ بس ہاتھ بڑھانے کی بات معلوم پڑتی ہے۔ دوسری نگاہ ڈالتے ہیں تو کوسوں دور چلی جاتی ہے۔ بڑی چالاک ہے وہ ڈاکٹر۔ لیکن ہے جادوگرنی۔” نوجوان ہنسنے لگا۔

اس وقت اس کی آنکھوں سے پھوار سی نکل رہی تھی۔ یوں جیسے پھلجھڑیاں چل رہی ہوں۔ ایک ساعت کے لئے وہ رکا۔ پھر از خود بات شروع کر دی۔

“قصہ مختصر یہ کہ چھ سات مہینے میں سنبل نے سب لڑکوں کو گھائل کر کے رکھ دیا لیکن کسی کے ہاتھ نہ آئی۔ اس پر اختر کی انا جاگی۔ وہ سنبل کے قریب ہو گیا۔ اسے جیتنے کے لئے نہیں بلکہ قابو میں لا کر دکھانے کے لئے۔ خیر دو چار روز تو سنبل نے وہ وہ نگاہ ڈالی کہ اختر پگھل کر رہ گیا۔ چھینٹے اڑنے لگے۔ پھر سنبل میں بڑی لڑائی ہوئی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ اختر بری طرح گھائل ہوا۔ اپاہج بن کر رہ گیا۔”

میں نے اس کی بات کو ٹوک کر کہا۔ “آپ تو کہتے ہیں' وہ بڑی مکار ہے۔ چالاک ہے۔ حرام زادی ہے۔ پھر آپ کو اس سے محبت کیسے ہو گئی؟”

“اسی لئے ہوئی ڈاکٹر۔ وہ مکار ہے۔ چالاک ہے۔ حرام زادی ہے۔ گر وہ سیدھی سادی معصوم لڑکی ہوتی تو میں اس سے کھیلتا اور پھر یوں پھینک دیتا جیسے کھلونا ہو۔”

“اوہ یہ بات ہے۔” میں نے مسکرا کر کہا۔ “اچھا تو کیا آپ نے اظہار محبت کیا؟”

“پیشتر اس کے کہ اظہار کرتا۔” نوجوان نے جواب دیا۔ “ایک مشکل پڑ گئی۔ ویسے اظہار کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اسے سب پتہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میری کیا کیفیت ہے۔ اور یہ بھی کہ میں نے واپسی کی سب کشتیاں اپنے ہاتھ سے جلا دی ہیں۔” وہ رک گیا۔

“ہاں تو وہ مشکل کیا تھی؟” میں نے پوچھا۔

“ایک دن امی نے مجھے بلایا۔ کہنے لگی۔ حمید تو نوشابہ کو جانتا ہی ہے۔

نوشابہ امی کی واحد سہیلی تھی۔ جس زمانے میں ہم پر مصیبت پڑی تھی' اس بھری دنیا میں نوشابہ ہماری واحد ہمدرد تھی۔ اس نے ہم پر بڑے احسان کئے تھے۔ میں ان احسانات کو اچھی طرح جانتا تھا۔

“ہاں امی۔ میں نوشابہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔” میں نے امی سے کہا۔ امی بولی۔ “نوشابہ کے میاں فوت ہو چکے ہیں۔ اس کی اکلوتی بچی صفیہ اب جوان ہے۔ کالج میں پڑھتی ہے۔ خوش شکل ہے۔ سمارٹ ہے۔ ماڈرن بھی ہے لیکن سگھڑ اتنی' اتنی سلیقے والی' اتنی خدمت گزار کہ یوں لگتا ہے جیسے اس زمانے کی ہوا بھی نہیں لگی۔ میں چاہتی ہوں' بیٹے کہ اسے بہو بنا کر گھر لے آؤ۔ ارے تو تو گھبرا گیا۔” امی نے غالباً میری حالت بھانپ کر کہا۔ “نہیں نہیں۔ کوئی زبردستی نہیں۔ اگر تیرا جی نہیں چاہتا تو نہ سہی۔ یہ تو میری آرزو ہے۔ اگر تو مان جائے تو میری زندگی سپھل ہو جائے گی۔ سوچ لے۔ کوئی جلدی نہیں۔ سوچ کر مجھے بتا دینا۔”

“پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا؟” میں نے پوچھا۔

“فیصلہ---” نوجوان ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی ٹوٹ کی آواز تھی۔ “جس وقت سے امی نے شادی کی بات کی ہے۔ سنبل کے لئے میرا جذبہ یوں ابھر آیا ہے جیسے دودھ کی کڑاہی پر ملائی آ جاتی ہے۔ اب مجھے پتہ چلا کہ سنبل سے مجھے لگاؤ ہی نہیں' عشق ہے۔ عشق ہے۔ اس کے بغیر زندگی بے مصرف نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔ پھانسی پر لٹکا ہوا ہوں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ امی کی خواہش پر میں اپنی ہر خواہش قربان کر سکتا ہوں لیکن اب........” نوجوان نے بے بسی سے دونوں ہاتھ اٹھائے اور پھر چپ ہو گیا۔

طاؤس نے چاروں طرف دیکھا۔

“کتنی انوکھی بات ہے۔” رشید بولا۔

“انوکھی نہیں۔” اسلم نے کہا۔ “عام سی بات ہے۔ ایسے واقعات روز ہوتے ہیں۔”

“ہاں تو پھر نوجوان نے کیا فیصلہ کیا؟” عظیم نے پوچھا۔

“ہماری وہ مختصر سی ملاقات تھی۔” طاؤس نے بات جاری کرتے ہوئے کہا۔ “ہم دونوں بنچ پر بیٹھے تقریباً ایک گھنٹہ باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ سخت کشمکش میں مبتلا تھا۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ اس کے ذہنی کرب کو محسوس کر کے میں سخت گھبرا گیا اور اسے چھوڑ کر چلا

آیا۔“

”ہاں۔“ اسلم بولا۔ ”ذہنی کرب متعدی ہوتا ہے۔“

”اس کے بعد وہ نوجوان آپ سے ملا کیا؟“ حامد نے پوچھا۔

”ہاں۔ چھ مہینے بعد۔“ طاؤس نے جواب دیا۔

”تو کیا اس نے آپ کو بتایا..........؟“ رشید نے بے تابی سے پوچھا۔

”ہاں۔“ طاؤس نے پھر سے بات شروع کی۔ ”اس روز میں سینما کا سپیشل شو دیکھنے گیا تھا۔ بڑی آوٹ سٹینڈنگ پکچر لگی تھی۔

ہال میں خاصا لیٹ پہنچا۔ سیٹ پر بیٹھ کر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حمید اختر مجھ سے اگلی رو میں بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ نئی بیاہی ہوئی دلہن ہے۔ یعنی اس کی شادی ہو چکی تھی۔ میرے دل میں کھدپسر ہونے لگی کہ وہ لڑکی کون ہے۔ سنبل یا صفیہ۔ سچی بات یہ ہے کہ فلم پر میری توجہ نہ جمی۔ بس یہی سوچتا رہا۔

پھر جب انٹرول ہوا اور حمید باہر نکلا تو میں بھی پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔ اس نے جلد ہی مجھے دیکھ لیا۔ ”ہیلو ڈاکٹر۔“ وہ چلایا۔

”کہئے۔“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”آپ نے کوئی فیصلہ کیا؟“

”میری تو شادی بھی ہو گئی ڈاکٹر صاحب۔“ وہ چلایا۔

”سنبل سے یا صفیہ سے؟“ میں نے پوچھا۔ ”مجھے ساری بات سنایئے۔“

اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ ”ڈاکٹر صاحب امی کی خواہش کو رد کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ لیا اور امی سے کہہ دیا۔ امی میں وہاں بیاہ کروں گا جہاں آپ چاہتی ہیں۔ بس یہی میرا فیصلہ ہے۔“

”پھر کیا تھا ڈاکٹر۔ امی نے جھٹ منگنی پٹ بیاہ کرنے والی بات کی۔ اور اس طرح صفیہ سے میری شادی ہو گئی۔ پھر سہاگ کی رات جب میں نے صفیہ کا گھونگھٹ اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے سنبل بیٹھی ہوئی ہے۔“

”ارے۔“ میرے منہ سے چیخ سی نکلی۔ طاؤس رک گیا۔

”سبھی لوگ حیرت سے طاؤس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”صفیہ --- سنبل نکلی۔ مطلب کیا ہوا؟“ رشید چلایا۔

”مجھے تو ساری بات ہی گپ نظر آتی ہے۔“ اسلم نے کہا۔

”آپ نے حمید اختر سے نہیں پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟“ عظیم بولا۔

”ہاں پوچھا تھا۔“ طاؤس نے کہا۔

”تو پھر کیا بتایا اس نے؟“ رشید نے پوچھا۔

پوچھا تو حمید اختر نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب وہ بھی میری طرح حمید اختر تھی۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ صفیہ سنبل تھی۔“

## سبز پتا

سیانے کہتے ہیں بڑے بڑے واقعات چھوٹی چھوٹی باتوں کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ سچ کہتے ہیں: کتنی چھوٹی سی چیز تھی سبز پتا۔ سبز پتے نے ایک رستے بستے خاندان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

سبز پتا ایک کتاب کا عنوان تھا جو علم النباتات کے ایک مشاہیر نے لکھی تھی۔ اتفاق سے یہ کتاب رفیق کے ہاتھ لگ گئی۔ جوں جوں وہ سبز پتے میں قدرت کے حیرت انگیز نظام کے بارے میں پڑھتا گیا' توں توں اس کے دل میں شعور پیدا ہوتا گیا کہ بیج ایک جن ہے جسے قدرت نے بوتل میں بند کر رکھا ہے۔ گویا روئیدگی کی طاقت کو سربمہر کر دیا گیا ہے۔ جوں جوں وہ سبز پتے کے اسرار و رموز سے واقف ہوتا گیا' توں توں اس کے دل میں کونپلیں پھوٹتی گئیں۔ پھول کھلتے گئے۔ ایک ایسا سبزہ زار ابھرتا گیا جہاں روئیدگی تھی' تازگی تھی' امن تھا' سکون تھا۔ ایسا سکون جو بھورسمے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اللہ میاں اتنے قریب آجاتے ہیں۔ اتنے قریب کہ سب کچھ ان کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔

رفیق کے دل میں سبز پتے کا ایسا عشق جاگا کہ اسے شہر کی شوراشوری' افراتفری اور روپیہ کمانے کی اندھی دوڑ سے نفرت ہو گئی۔

اس پر دونوں بھائیوں کے راستے الگ الگ ہو گئے۔

بڑا بھائی اعظم علی شہر میں جا کر کارخانہ دار بن گیا۔ اس کا گھر مغربی رنگ میں رنگا گیا اور اس کی زندگی پر حصول زر کے جنون کا تمبو تن گیا اور چھوٹے بھائی رفیق علی نے اپنے آبائی گاؤں سے بہت دور ایک فارم قائم کر لیا۔

یہ فارم ایک انوکھا فارم تھا۔ ایک طرف مرغی خانہ تھا جس میں دو ہزار مرغیاں تھیں۔ دوسری طرف ایک تالاب تھا جس میں تلابیہ مچھلیاں افزائش نسل کے لیے ڈال دی گئی تھیں۔

اس کے قریب ہی شہد کی مکھیوں کے بارہ ڈبے تھے جہاں مکھیاں شہد بنا رہی تھیں۔ وسط میں رہائشی مکان تھا جس کے اردگرد تیس قسم کے گلاب لگے ہوئے تھے جو دنیا کے مختلف ممالک سے منگوائے گئے تھے۔ گھر سے ہٹ کر ایک طرف ایپچی کا باغ تھا۔ دوسری جانب مالٹے' کینو اور گریپ فروٹ تھے۔ ایک کونے میں گھاس پھونس کی چھت تلے پان کی بیلیں لگی ہوئی تھیں۔ دوسرے کونے میں تمبو کے پڑھتے۔

رفیق علی کے سر پر یہ دھن سوار تھی کہ ایسے پودے اگائے جو پاکستان میں نہیں ہوتے اور ان کے پھل دساور سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ انہیں اپنے فارم میں لگائے مثلاً سپاری' کالی مرچ' املی۔ اس کے لیے ایک ہاٹ ہاؤس بنوانے کی اشد ضرورت تھی۔ اس کا یہ خواب بڑی دیر تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔ بہرحال وہ فارم خود کفیل تھا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی۔ دودھ کے لیے گائیاں' بھینس اور بکریاں تھیں۔ کھانے کے لیے پھل تھے' سبزیاں تھیں' مرغیاں تھیں' مچھلی تھی' شہد تھا۔ شروع شروع میں دو ایک سال تو رفیق فارم کو تشکیل دینے میں شدت سے مصروف رہا۔ پھر جب فارم کی شکل نکل آئی تو وہ بیٹھ کر اپنی جنت کا جائزہ لینے لگا۔

اس کے دل میں پودوں کی روئیدگی کی حس جاگی۔ سبز پتے پھول اور پھل اپنی خاموش زبان میں اس سے باتیں کرنے لگے۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا۔ مگر ایسا ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو آسمان کے نیچے بیٹھ کر پودوں کی روئیدگی کو دیکھتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ڈنٹھل سے کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ کونپلیں کھل کر پتیاں بنتی ہیں۔ پتیاں بڑھ کر پتے بن جاتے ہیں۔ بوٹے پھیل کر درخت بن جاتے ہیں۔ ان کے روبرو کائنات کا خالق آ کھڑا ہوتا ہے۔

پھر وہ فرط انبساط سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔ اپنی مخلوق کی محبت کے جذبے سے پگھل کر سارے کھیت میں گھل مل جاتے ہیں۔ پتوں میں ہریاول بن جاتا ہے۔ پھولوں میں رنگ بن جاتا ہے۔ پھلوں میں شیرینی۔

خالق اور مخلوق یوں گھل مل جاتے ہیں کہ وحدت کا احساس ابھرتا ہے۔ پتہ نہیں ایسے کیوں ہوتا ہے۔ پر ایسے ہوتا ہے۔

لیکن شہر میں ایسا نہیں ہوتا۔ شہر میں خالق اور مخلوق کے درمیان رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ اس لیے شہر میں گردنیں تنی رہتی ہیں۔ چھاتیاں اکڑی رہتی ہیں۔ مونچھیں مروڑی رہتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ شہر میں انسان خود کو خالق سمجھتا ہے۔

بہرحال رفیق اور اس کی بیوی آصفہ دونوں فارم میں سبز پتوں کی روئیدگی کو دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے۔

پھر شفیق کی پیدائش کے بعد تینوں تخلیق کے حیران کن عمل کو دیکھنے لگے۔ یوں آہستہ آہستہ شفیق جوان ہوگیا اور سبز پتے کے سحر میں رنگا گیا۔ اس پر باپ نے اسے ایگریکلچر یونیورسٹی میں بھیج دیا جہاں سے وہ ڈگری حاصل کرکے واپس فارم میں آگیا۔

تکمیل تعلیم سے واپس آیا تو شفیق ایک مقید حیات ساتھ لے آیا۔ اس مقصد میں بے شک سبز پتے کی بہت اہمیت تھی لیکن وہ فارم جس میں وہ پل کر جوان ہوا تھا' جس کی رفیق کی نگاہ میں بڑی اہمیت تھی' غیر اہم ہو چکا تھا۔

چار ایک ہفتے فارم میں بسر کرنے کے بعد بیٹے نے باپ سے کہا۔ "اباجان! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنا کام شروع کروں۔"

باپ نے جواب دیا۔ "بیٹے! تم اپنا کام فارم میں شروع کیوں نہیں کرتے۔"

شفیق نے کہا۔ "اباجان! میرا کام یہاں نہیں ہو سکتا۔ یہ فارم تو ایک مرغزار ہے۔ میرا کام تو وہاں ہوگا جہاں میلوں سبز پتے کا نشان تک دکھائی نہیں دیتا۔ ہمارے علاقے میں لاکھوں ایکڑ زمین غیر آباد پڑی ہے۔ کٹاؤ کا یہ علاقہ جو چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر مشتمل ہے' بے آب و گیاہ ویران پڑا ہے۔ وہاں کی بھربھری مٹی مردہ ہو چکی ہے۔ اس میں زندگی نہیں رہی۔ قوت نمو نہیں رہی۔ میں چاہتا ہوں کہ تحقیق کروں۔ کوئی ایسا سبز پتا تلاش کروں جو ہلکی بارش میں اپنی جڑیں زمین میں گاڑ دے اور پھر چاروں طرف پھیلتا جائے۔ پھیلتا جائے حتیٰ کہ کٹاؤ کے تمام ٹیلے اور نچان اس کی روئیدگی سے بھر جائیں اور خشک سالی اس پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

اگر مجھے ایسا سبز پتہ مل جائے' چاہے وہ بوٹا ہو' جھاڑی ہو یا زمین کے ساتھ ساتھ رینگنے والی بیل ہو تو میلوں علاقہ ہرا بھرا ہو جائے۔ اس علاقے کی تقدیر بدل جائے۔"

باپ نے بیٹے کو تحسین بھری نظروں سے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ "بیٹے! ہاں تمہاری ماں اور میں تمہاری اس قابل قدر جستجو میں حائل نہیں ہوں گے۔ بلکہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی اس کام میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں لیکن بیٹے تمہاری ماں کی یہ خواہش ہے کہ وہ تمہاری شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جائے۔"

شفیق ہنس کر بولا۔ "اباجان! یہ کام شادی کے بعد نہیں ہو سکتا۔"

"تمہاری ماں کی خواہش ہے بیٹے!"

"اباجان!" اس نے جواب دیا۔ "مجھے شادی سے انکار نہیں لیکن مجھے ایسی جیون ساتھی کہاں سے ملے گی جو اس کام میں میرے ساتھ ویرانوں میں کھجل ہونے کے لیے تیار ہو۔"

عین اس وقت ڈاکیہ تار ہاتھ میں پکڑے داخل ہوا۔ بولا۔ "چودھری جی! آپ کا تار آیا ہے۔"

تار کا سن کر شفیق کی ماں آصفہ دوڑی دوڑی آگئی۔ "اللہ خیر کرے۔ کس کا تار ہے؟"

"بڑے بھائی آ رہے ہیں۔" رفیق نے تار پڑھتے ہوئے کہا۔

"یہاں آ رہے ہیں کیا؟" آصفہ حیرت سے چلائی۔ "فارم پر؟"

"وہ تو یہاں کبھی نہیں آئے۔"

"بہرحال وہ آ رہے ہیں۔ ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا جائے۔ انہیں کھانے میں کوئی ایسی چیز پیش نہ کی جائے جس سے شہر کی خوشبو آتی ہو۔ خالص دیہاتی چیزیں کھلائی جائیں۔ رس کی کھیر' کڑھی' گھٹا ہوا ساگ' دودھ میں پکا ہوا گوشت' لسی' مکھن' شہد۔"

آصفہ بولی۔ "ان باتوں کو چھوڑیئے۔ سوال یہ ہے کہ وہ یہاں کیوں آ رہے ہیں۔ وہ تو فارم پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ہمیں پینڈو سمجھتے تھے۔"

اس پر رفیق نے قہقہہ لگایا۔ بولا۔ "مجھے پینڈو ہونے پر فخر ہے۔ اچھا ہے کہ وہ آ رہے ہیں۔ میں انہیں اپنی حیثیت دکھاؤں گا۔ اگر کچھ دیر ہمارے ساتھ رہیں تو شاید سبز پتے کا سحر ان پر اثر انداز ہو جائے۔"

اعظم علی کی آمد پر فارم قہقہوں سے گونج اٹھا۔

رفیق نے انہیں فارم کی ایک ایک چیز دکھائی۔

اعظم علی کی بیوی بانو تو رسمی طور پر واہ واہ کرتی رہی لیکن ان کی اکلوتی بیٹی اسمارہ حیرت سے ایک ایک چیز دیکھتی۔ تالیاں بجاتی اور قہقہے لگاتی رہی۔

اسمارہ شفیق سے کافی بے تکلف رہتی تھی جیسے کزن ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ کبھی فارم پر نہیں آئی تھی لیکن شفیق جب بھی شہر جاتا' ان کے ہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ اسمارہ ہمیشہ اس کے سبز پتے کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ کہتی۔ "تمہارا بھی جواب نہیں۔ فیقو لوگ پھول تلاش کرتے ہیں اور تم سبز پتے کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہو۔" وہ شفیق کو فیقو کہہ کر بلایا کرتی تھی۔

اسمارہ ایک ماڈرن لڑکی تھی جیسے کالج والیاں ہوتی ہیں۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اسے بات کہہ دینا آتا تھا۔ بات میں ایسا رنگ بھر دیتی کہ وہ رنگ پچکاری بن جاتی اور محفل کو شرابور کر دیتی۔ وہ جھینپنے یا جھجکنے سے قطعی طور پر ناواقف تھی اور اس کی گفتگو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ برملا سچی بات کہہ دیتی۔ چاہے بات خود اس کے خلاف جاتی۔

ماڈرن لڑکی کی طرح اس کے خدوخال جاذب تو تھے مگر انہیں حسین نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اس کی حرکات اور انداز بہت جاذب نظر تھے۔ آج کل خدوخال کا حسن نہیں چلتا۔ انداز کا حسن چلتا ہے۔ اسمارہ کے انداز میں بڑی گریس تھی۔ حرکت میں ردھم تھا اور بات میں رنگ۔

شفیق اسمارہ کو بہت پسند کرتا تھا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ وہ کمپفرٹس میں پلی ہے اور یوں زندگی بتانے کی آرزو مند ہے جیسے جھیل میں اگا ہوا کنول ہو۔ اس میں جدوجہد کی آرزو نہیں۔ زندگی مقصد سے خالی ہے۔ بیگانہ ہے۔

اس روز اسمارہ کو فارم دکھاتے ہوئے اس نے بڑی کوشش کی کہ اسمارہ کے دل میں سبز پتے کی جوت جگا دے۔ مقصد کا دیا جلا دے لیکن جھیل میں اگا ہوا کنول گرد و پیش سے متاثر نہ ہوا۔ اپنے ہی عکس کو دیکھنے میں کھویا رہا۔

رات پڑی تو بڑے بھائی نے رفیق کو اپنے کمرے میں بلایا۔ کہنے لگے۔ "دیکھو رفیق! تم نے اپنی زندگی تو سبز پتے کے لیے تباہ کر دی۔ اب کم از کم شفیق کی زندگی کو تو بچ لو۔"

رفیق نے کہا۔ "بھائی جان! میری زندگی تباہ تو نہیں۔ میں تو جنت میں رہتا ہوں۔"

اعظم علی ہنسے۔ بولے۔ "اب احمقوں کی جنت سے باہر نکلو رفیق! حقائق کی دنیا کو اپناؤ۔ تمہارا شہر کو چھوڑ کر یہاں فارم میں آ بیٹھنا زندگی سے فرار کے مترادف ہے۔ خیر تم نے جو چاہا کر گزرا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اچھا چھوڑو۔ اب شفیق کی زندگی کا سوال ہے۔ اگر وہ بھی اسی فارم میں بیٹھا رہا تو زندگی سے ایڈ جسٹ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جائے گا۔"

رفیق نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اعظم علی نے اسے چپ کرا دیا۔ بولے۔ "میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تم شفیق کو ہمارے ساتھ شہر بھیج دو۔ ہم اسے بزنس کی ٹریننگ دیں گے اور اپنا حصہ دار بنا لیں گے۔"

کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گئے۔ پھر کہنے لگے۔ "تمہیں معلوم ہے کہ اسمارہ میری اکلوتی لڑکی ہے۔ اگر شفیق بزنس میں چل نکلا تو شاید ان دونوں کی شادی ہو جائے لیکن اسے وعدہ مت سمجھنا۔ شاید--- بہرحال ہماری خواہش ہے کہ شفیق ہمارے ہاں رہے۔ یہاں فارم میں رہ کر اپنی زندگی تباہ نہ کرے اور ہاں کل رات تک ہم اس کا جواب چاہتے ہیں۔ ہاں یا نہ۔ چونکہ پرسوں صبح ہم واپس چلے جائیں گے۔"

رفیق بڑے بھائی سے مل کر اپنے کمرے میں واپس آیا تو آصفہ سے بحث چھڑ گئی۔ آصفہ اس صورت حال پر بہت خوش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شفیق چچا کی خواہش کے مطابق شہر چلا جائے۔ کاروبار میں حصہ دار بن جائے اور اسمارہ سے اس کی شادی ہو جائے۔

رفیق آصفہ کا ہم خیال نہ تھا۔ وہ بولا۔ "شفیق نہیں مانے گا۔ وہ کسی صورت اپنا مقصد حیات نہیں چھوڑے گا۔ اسے روپیہ کمانے کا شوق نہیں۔ کچھ کر دکھانے کا شوق ہے۔"

آصفہ بولی۔ "آپ اسے شہ دیتے ہیں نا!"

"نہیں نہیں۔" رفیق نے جواب دیا۔ "اگر شفیق کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتا ہے تو مجھے قطعی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں اس معاملے میں دخل نہیں دوں گا۔"

آصفہ کہنے لگی۔ "ہاں۔ آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ میں اکیلی شفیق سے بات کروں گی۔ آپ جائیں اور اسے یہاں بھیج دیں۔"

شفیق کمرے میں داخل ہوا تو ماں نے چھوٹتے ہی اس پر بھرپور جذباتی وار کر دیا۔ کہنے لگی۔ "شفیق! اب اس گھر کی عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔ چاہے بنا دے یا بگاڑ دے تو ہاں کر دے تو دونوں بھائی پھر سے مل بیٹھیں گے اور جو تو نے نہ کر دی تو خاندان میں ہمیشہ کے لیے پھوٹ پڑ جائے گی اور تیرا ابا اکیلا رہ جائے گا۔ تنہا۔"

شفیق نے کہا۔ "اماں یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ بات کیا ہے؟" ماں نے اسے ساری بات سنائی۔ ساتھ ہی کہنے لگی۔ "دیکھو شفیق! تجھے اسمارہ سے اچھی بیوی نہیں ملے گی۔ وہ تمہیں بہت چاہتی ہے۔ بس اب ہماری عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔"

ماں کی جذباتی اپیل سن کر شفیق کشمکش میں پڑ گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہی کرے جو ماں باپ چاہتے ہیں اور اپنے مقصد حیات کو ان کی خاطر قربان کر دے لیکن کچھ دیر کے بعد اس کے سامنے ایک خوف ناک مستقبل کا نقشہ کھنچ جاتا۔ ایک بے حس سرمایہ دار ابھرتا جس کا مقصد حیات صرف دولت اکٹھی کرنا تھا۔ وہ لرز جاتا اور اس کا فیصلہ پھر سے ڈگمگا جاتا۔

گھبرا کر وہ اپنے کمرے سے باہر لان میں نکل گیا۔ لان چاندنی سے بھرا ہوا تھا۔ مطلع صاف تھا لیکن اس رات وہ منظر کے حسن سے بے خبر تھا۔ رات دیر تک وہ لان میں بے تابانہ ٹہلتا رہا۔ سوچتا رہا۔

دفعتاً وہ چونکا۔ رک گیا۔

اس کے سامنے وہ چادر میں لپٹی ہوئی کھڑی تھی۔

"تم تو کہتے تھے یہ فارم تمہاری جنت ہے۔" وہ بولی۔

"ہاں۔ جنت ہی تو ہے۔"

"کیا جنت میں لوگ یونہی بے قرار رہتے ہیں جیسے کہ تم ہو؟" وہ ہنسی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”ایک گھنٹے سے اپنی کھڑکی سے تمہاری بے چین ٹہل کو دیکھ رہی تھی۔“ اسمارہ نے کہا۔ ”پھر میں نے سوچا چلو پوچھوں تو۔“

”دیکھو اسمارہ!“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”اس وقت میں زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہوں۔“

وہ ہنسی۔ بولی۔ ”ہاں ایک طرف سبز پتا ہے۔ دوسری طرف پھول ہے۔ کتنی مشکل میں گرفتار ہو تم۔ تت تت تت۔“

”بات مذاق میں نہ ٹالو اسمارے۔“ وہ بولا۔ ”میری مدد کرو۔“

”بولو۔ کیسے؟“

”کیا تم میرا جیون ساتھی بنو گی اسمارے؟“ اس نے پوچھا۔

اسمارہ کی بھنویں تن گئیں۔ آنکھ میں پھلجھڑی چل گئی۔ زبان گال میں ٹھونس کر بولی۔ ”اچھا تو پروپوز کر رہے ہو۔ اونہوں۔ ہوں یوں نہیں دونوں پاؤں ملاؤں۔ گھٹنے زمین پر ٹیش دو--- پھر ہاتھ اٹھاؤ اور کہو۔ ڈرالنگ! کیا تم میرا جیون ساتھی بننا قبول کرو گی؟“ اس کا قہقہہ لان میں گونجا۔

وہ پتھر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بولا۔ ”یو آر امپاسی بل۔“

”ہاں۔“ وہ اس کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔ ”یہی چیلنج تو ہے امپاسی بل کو پاسی بل بننا ہے۔ کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ ذرا سی محنت درکار ہے۔ گھبرا نہیں فیقو۔ پھول توڑو گے تو کانٹا تو چبھے گا۔“

وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ ٹہلنے لگی۔ کچھ دیر خاموش ٹہلتی رہی پھر قریب آ کر رک گئی۔ بولی۔ ”رفیقو! پتا اور پھول ایک ہی ٹہنی پر لگتے ہیں۔ مگر دونوں آپس میں کبھی نہیں ملتے۔ پھول کو پانا ہو تو پتا نہیں، بھنورا بنو۔“ یہ کہہ کر وہ خراماں خراماں ٹہلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔

شاید اس کی خواہش تھی کہ وہ اٹھ کر اس کو روک لے لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا رہا۔

اگلی صبح ان کا ملازم گھبرایا ہوا رفیق کے کمرے میں داخل ہوا۔ بولا۔ ”جی چھوٹے چودھری اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے رات کو بستر میں نہیں سوئے۔“

رفیق یہ سن کر گھبرا گیا۔ بھاگا بھاگا شفیق کے کمرے میں گیا۔ وہاں کتابوں کے شلف پر ایک خط پڑا تھا۔ لکھا تھا۔

”پیارے ابا جان!

مجھے افسوس ہے کہ میں اپنا مقصد حیات نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ چچا اور آپ کے درمیان ناخوشگوار تعلقات کا باعث بنوں۔ اس لیے میں جا رہا ہوں۔ آپ چچا جان کو بتا دیجئے کہ مجھے آپ کی بات منظور نہ تھی۔ لہٰذا میں گھر چھوڑ کر چلا گیا ہوں۔“

اعظم علی کو اس حادثہ کا پتہ چلا تو وہ ناراض ہو کر اسی روز شہر واپس چلے گئے۔

رفیق نے بیٹے کو ڈھونڈنے کی دیوانہ وار کوششیں کیں لیکن سب ناکام رہیں۔ آخر وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا اور اس جنت میں یوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے جنت سے نکالے ہوئے ہوں۔

ایک سال گزر گیا۔

ایک روز جب رفیق چپ چاپ حسب دستور باہر دھوپ میں بیٹھا تھا تو ایک اجنبی داخل ہوا۔ چودھری کے قریب آ کر اس نے سلام کیا اور بولا۔ ”آپ رفیق علی چودھری ہیں کیا؟“

رفیق نے اثبات میں سر ہلایا۔

نووارد بولا۔ ”میں کاکڑیاں کے رکھ سے آیا ہوں۔ ہمارے صاحب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے آپ کو بلایا ہے۔“

”مجھے بلایا ہے۔“ رفیق نے حیرت سے کہا۔

”جی۔“ وہ بولا۔ ”صاحب نے کہا تھا کہ چودھری صاحب کو ساتھ لے آنا۔ ان سے کہنا کہ آپ کا بیٹا بہت بیمار ہے۔“

”شفیق بیمار ہے۔“ چودھری گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”وہ شفیق نہیں۔“ نووارد نے کہا۔ ”وہ تو ہمارا گارڈ اکبرا ہے۔ وہیں رکھ میں کام کرتا ہے۔“

رفیق از سرنو گھبرا گیا۔ ”اکبرا۔“ وہ بولا۔

نووارد نے جیب سے ایک تصویر نکالی اور چودھری کو تھما دی۔ بولا۔ ”صاحب نے کہا تھا۔ یہ تصویر دکھا دینا۔“

تصویر میں ایک پینڈو وردی پہنے کھڑا تھا۔ منہ پر گھنی داڑھی اور مونچھیں تھیں اور سر کے بال یوں کھڑے تھے جیسے کانٹے ہوں۔

کاکڑیاں کے رکھ میں پہنچ کر وہ شخص چودھری کو سیدھا صاحب کے پاس لے گیا۔

”آپ رفیق علی چودھری ہیں؟“ صاحب نے پوچھا۔

رفیق نے اثبات میں سر ہلایا۔

”شاہ کوٹ کے فارم سے آئے ہیں کیا؟“

”جی صاحب!“ وہ بولا۔

”میرا بھی یہی خیال تھا۔ وہ بیمار پڑا ہے۔ دس دن سے بہت کمزور ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ آپ کو ابھی اس سے نہیں ملنا چاہیے۔ آپ دو چار دن میرے پاس رہیں۔ پھر وہ صحت مند ہوجائے گا تو اسے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔“

”آپ کو میرا پتہ کیسے ملا؟“ چودھری نے پوچھا۔

”اس کے کمرے سے ایک پرانا لفافہ ملا تھا۔ اس پر آپ کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ دراصل شروع سے ہی ہم اکبرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب وہ گارڈ بھرتی ہونے کے لیے آیا تو صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ لیکن اس نے اپنے کوائف چھپائے رکھے۔ ہم نے تو اسے کلرک بنانے کی پیشکش کی تھی لیکن وہ نہ مانا۔

”یہاں ہمارا گارڈ قادرا ہے۔ اس کی ایک نوجوان لڑکی ہے مومی۔ وہ یہاں رکھ میں مومی کے ساتھ صبح و شام گھوما کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے قادرا سے کہا کہ مومی کو اپنے گاؤں میں بھیج دے ورنہ تیری بدنامی ہو جائے گی۔ بس جب سے وہ لڑکی گئی ہے، اس روز سے یہ ڈانوا ڈول پھرتا رہا ہے۔ میں نے مومی کو گاؤں سے بلوایا ہے تاکہ آپ اس کی زبانی ساری بات سن لیں۔“ وہ رک گیا۔

پھر بولا۔ ”ان لوگوں کے سامنے یہ ظاہر نہ کریں کہ آپ اس کے باپ ہیں بلکہ یہ کہیں، انکوائری کرنے کے لیے ہیڈ آفس سے آئے ہیں۔“

عین اس وقت قادرا اپنی بیٹی مومی کے ساتھ داخل ہوا۔ ”بیٹھ جاؤ لڑکی۔“ صاحب بولا۔ ”قادرا تم چلو۔“ قادرا باہر نکل گیا لیکن مومی جوں کی توں کھڑی رہی۔

وہ سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی تھی۔ پتلی دبلی لیکن بڑی شوخ۔ طبیعت میں جھجک نام کو نہ تھی۔

”بیٹھ جا۔“ صاحب نے کہا۔

”نہ۔“ وہ بولی۔ ”ماں نہیں بیٹھتی۔ ماں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“

صاحب نے کہا۔ ”دیکھ یہ جو صاحب بیٹھے ہیں۔“ اس نے رفیق کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بڑے دفتر سے آئے ہیں۔ اکبرا گارڈ کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے۔ تجھے اکبرے کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے، سچ سچ بتا دے۔ وہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے سب کچھ۔“

پر مومی بولی۔ ”صاحب جی! مجھے کیا پتہ کہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ بارہ چودہ مہینے ہوئے۔ وہ ادھر رکھ میں بیٹھا تھا۔ ماں جو ادھر سے گجری تو بولا۔ ادھر نیڑے نیڑے کوئی گاؤں ہے کہا۔

منے کہا۔ ادھر کوئی گاؤں نہیں۔ جنگل کے صاحب کا دپھر ہے۔ بس وہ بولا۔ مجھے رات گجارنی ہے۔ اس پر مجھے ترس آگیا۔ ماں وسے باپو کے پاس لے آئی۔ باپو نے کہا۔ اسے توڑی وائے جھونپڑے میں ڈال دے۔

اگلے روز بابو نے پچھارے تیرا آگے پیچھے کوئی ہے۔ وہ بولا۔ نہیں کوئی نہیں۔ پھر باپو نے پچھیا رے تو نوخری کرے گا۔ وہ بولا۔ کروں گا۔ اس پر باپو وسے آپ کے پاس لے آیا۔ اودھر ایک گارڈ کی جگھوں کھالی تھی۔ آپ نے وسے گارڈ رکھ لیا۔ چلو بات کھتم ہوئی۔ رہنے کو کوٹھڑی مل گئی۔

پر صاحب جی وہ اکبرا تو پاگل نکلا۔ ایک دم پاگل۔ وسے سچ پتے کا پاگل پنا لگا تھا۔ مجھ سے بولا۔ مومی مجھے ایسا پتا ڈھونڈ دے جو جمین ماں جڑیں گاڑ دے۔ ایسی جڑھیں گاڑ دے کہ وہ سوکھیں نہیں۔ سدا ہری رہیں چاہے برکھا ہو نہ ہو۔ پانی ملے نہ ملے اور یہی نہیں صاحب جی وہ چاہے تھا کہ ایسا سبز پتا جو جمین پر پھیلتا جائے۔ پھیلتا جائے، جڑھیں گاڈتا جائے، گاڈتا جائے۔

لو صاحب جی یہ کوئی ڈھونڈ تھی کیا۔ یو تو شیدائی پنا تھا اور صاحب جی آپ سے جھوٹ کیوں بولوں۔ مجھے وَس کے پاگل پنے پر ترس آگیا۔ ماں رکھ کی دیوانی تو پہلے سے ہی تھی۔ اس لیے اس کے ساتھ مل کر سچ پتا ڈھونڈن لگ گئی۔ آٹھ مہینے ہم دونوں صبح شام اندھیرے سویرے ہروخت رکھ ماں وہ سچ پتا ڈھونڈتے پھرے۔

سچی بات یو ہے صاحب جی کہ پاگل پنا جو وس کا تھا، وہ مجھے بھی لگ گیا۔ بس دن رات۔ رات دن ہروخت ایک دھن سوار تھی۔

ویسے صاحب جی یو بات تو پہلے روح سے ہی جان گئی تھی کہ اکبرا ہم ماں سے نہیں۔ وہ وکھرا وکھرا دکھے تھا۔ وسکی باتاں وکھری وکھری تھیں۔ وسکی رہت بہت وکھری تھی۔ وس نے یہاں آکر منہ دھونا چھوڑ دیا۔ داڑھی بڑھالی۔ سر کے وال یوں کھڑے کر لے جیسے کانٹے ہوں۔ وس نے ہم سا بننے کے سارے جتنے کیے پر وہ ہم سا نہ بن سکا۔ پر ایک بات ہے صاحب جی۔ وہ مجھ سے اتنا گھل مل گیا جیسے میرے ساتھ کھیل کھیل کر بڑا ہوا ہو۔ مجھے ایسا لگنے لگا جیسے وہ میرا بچپن کا ساتھی ہو۔ جرا وکھرا نہ لگے تھا مجھے۔

صاحب جی ہم نے جھاڑیوں تلے گھس گھس کر وہ سچ پتا ڈھونڈا۔ کانٹوں والی بیلوں میں

ڈھونڈا رکھ کے درکھتوں پر چڑھ کر ڈھونڈا۔ ”

”پھر وہ تمہیں ملا بھی؟“ صاحب نے پوچھا۔

”مل گیا۔ صاحب جی مل گیا۔ پر وہ بوٹا نہ تھا۔ پتا نہ تھا۔ وہ اک ویل تھی جو جمین کے ساتھ ساتھ سنپولئے کی طرحیوں رینگنے تھی اور پوٹے پوٹے پر جمین میں جڑھیں گاڑ دے تھی۔ وہ ویل ہم نے چار پانچ جگھوں پر لگا دی۔ چار جگھوں پر رکھ ماں اور پانچوں جگہ اکبرے کی کوٹھڑی سے باہر اور ماں نے وسے بتا دیا کہ جد توڑی اس ویل کی ڈنڈی پر اک پتی بھی ٹکے رہے گی، ویل مرے گی نہیں۔

پھر صاحب جی میری اوارہ گردی پر غصے ہو گیا۔ بولا۔ تو اس گاؤ کے ساتھ ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ گاؤں میں برادری والے باتیں کرنے لگے ہیں۔ یا تو تو اس کے ساتھ گھومنا پھرنا چھوڑ دے۔ نہیں تو ماں تجھے گاؤں بھیج دوں گا۔

میں نے باپو سے کہا۔ نہ باپو وس کے ساتھ گھومنا پھرنا نہیں چھوڑوں گی۔ بے شک تو مجھے گاؤں بھیج دے۔

گھسے میں بابا نے مجھے گاؤں بھیج دیا۔ پر جانے سے پہلے منے اکبرے سے کہہ دیا۔ منے کہا۔ اکبرے دیکھ پت جھڑ کے دن آ رہے ہیں۔ گھبرا نہ جاپو۔ جد توڑی اک پتی ویل پر لگی رہے گی، تد تک جڑ نہیں سوکھے گی۔“

صاحب بولا۔ ”مومی! تجے پتہ ہے اکبرا تو اس دس روز سے چارپائی پر پڑا ہے۔ بیمار ہے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔“

”ہئے اللہ۔“ وہ چلائی۔ پھر بولی۔ ”نہیں نہیں۔ صاحب جی وے کوئی بیماری نہیں۔ بس وس کی ویل کا پتا سوکھ گیا ہو گا۔ ماں ابھی دیکھ کر آئی۔“ یہ کہہ کر وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ بولی۔ ”منے کہا نہ تھا وس کی ویل کا پتا سوکھ گیا ہو گا اور وہ پتے کے غم میں سوکھ رہا ہو گا۔ منے جا کر دیکھا تو اکبرے کے کواٹر کی ویل سوکھی وی تھی۔ پھر ماں رکھ کو بھاگی۔ ادھر جا کر دیکھا تو چاروں جگھوں پر ویل ہری بھری تھی۔

پھر ماں اکبرے کے پاس گئی۔ منے کہا رے تو تو سچ مچ پاگل ہے۔ غم لگانے سے پہلے رکھ ماں جا کر وہاں کی ویلیں تو دیکھ لی ہوتیں۔ وہ تو ہری بھری ہیں رے۔ ماں دیکھ آئی ہوں۔ چل تجھے دکھا دوں۔

مجھے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا بولا۔ سچی مچی ہری بھری ہیں۔

منے کہا ”اور کیا ماں تجھے سے جھوٹ بولوں ہوں۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ پھر وہ دروازے کی طرف دیکھ کر چیخی۔ ”رے تو کیوں آ گیا میرے پیچھے پیچھے؟“

صاحب اور چودھری نے مڑ کر دیکھا۔

دروازے میں شفیق کھڑا تھا۔ اس نے دیوار کا سہارا لے رکھا تھا۔

”چل اب جا کر پڑ جا اپنی کھاٹ پر۔“ مومی نے اسے ڈانٹا۔

لیکن وہ تو حیرت سے اپنے باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

# ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری

افسانہ نگاری کے حوالے سے اردو ادب میں ممتاز مفتی اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ 1936ء میں پہلی کہانی ”جھکی جھکی آنکھیں“ کی اشاعت سے ہی انہوں نے اس دور کی موجودہ افسانہ نگاری سے ہٹ کر اپنی راہ متعین کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت ترقی پسند تحریک جڑ پکڑ رہی تھی اور اس کے زیر اثر اردو ادب میں بھی مختلف سوالوں کو معاشی حوالے سے سمجھنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ افسانے میں پریم چند کی روایت پنپ رہی تھی اور سماجی حقیقت نگاری اپنے عروج کی طرف رواں دواں تھی۔ ایسے میں ایک آیسی آواز جو فرد کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کرے، اجنبی سی محسوس ہوتی ہے۔ جدید اردو نظم میں میراجی اور افسانے میں ممتاز مفتی نے فرائیڈ کے زیر اثر فرد کے باطن میں اترنے کی سعی کی ہے۔ ہمارے ہاں فرائیڈ کے نظریات کو عموماً جنس کے آزاد اظہار کے مبلغ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو یقیناً فرائیڈ کی یک رخی تشریح ہے۔ فرائیڈ کا اصل مسئلہ انسانی ذہن کے اس حصے کا مطالعہ تھا جس پر انسان کا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ اسے لاشعور کا نام دیا گیا۔ اب اس لاشعور میں بہت کچھ موجود ہے۔ یونگ نے تو اس سے انسانی تہذیب کے صدیوں پر پھیلے اثرات بھی ڈھونڈ لیے۔ ابتدا میں یہی لاشعور ممتاز مفتی کو بار بار اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ خود انہوں نے اپنی پہلی کتاب ”ان کہی“ (مطبوعہ 1940ء) میں واضح انداز میں لکھا تھا۔

”اس مجموعے کی بیشتر کہانیوں میں نفس لاشعور کی کسی نہ کسی پہلو کے اظہار کی کوشش کی گئی ہے اور نفس لاشعور کا اظہار ہی میرے مصنف بننے کا جواز یا بہانہ ہے۔ یہ موضوع ایک بہت الجھا ہوا بکھیڑا ہے۔ بہرحال اگر میں نفس لاشعور کے ابوالہول کے پراسرار تبسم کی جھلک نہیں دکھا سکا تو مجھے بھی تسکین ہے کہ میں نے اہم اور دقیق موضوع پر لکھنے کی جرات اور کوشش کی۔

---

”ان کہی“ میں شامل ان کی بیشتر کہانیاں لاشعور کے انسانی کردار پر اثرات کا مطالعہ کرتی ہیں۔ لاشعور کا مطالعہ صرف نفسیات کا ہی موضوع نہیں ہے بلکہ نفسیات سے قبل لاشعور کے انسانی کردار پر اثرات کا مطالعہ ادیب، شاعر اور فن کار کرتے آئے ہیں۔ خود فرائیڈ نے اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا تھا کہ لاشعور کی دریافت اس کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ اس کی کارگزاریوں سے تخلیق کار صدیوں سے آگاہ رہے ہیں۔ اس نے تو بس لاشعور کے مظہر کو سائنسی انداز میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

ادب، لاشعور اور نفسیات کے روابط پر بات کرتے ہوئے ہمیں یہ ذہن نشین کرنا ہو گا کہ اگر کوئی لکھنے والا فقط نفسیات کے دریافت شدہ حقائق کو ہی اپنی شاعری یا افسانے میں پیش کرتا ہے تو وہ نچلی سطح کا لکھنے والا ہے۔ ایک سچا لکھنے والا انسانی شخصیت اور کردار کے ان گوشوں کو ٹٹولنے کی کوشش کرے گا جو ابھی تک نفسیات یا دیگر علوم کی دسترس سے باہر رہے ہیں۔ ان معنی میں سچا تخلیق کار سماجی و کرداری علوم کے ماہرین سے ایک قدم آگے ہی رہے گا۔ اس اصول پر پرکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ممتاز مفتی نے نفسیات کے نہ صرف دریافت شدہ حقائق کو افسانہ بنانے کی کوشش کی بلکہ اپنے طور پر کرداروں کی تحلیل سے انسانی نفسیات کے بارے میں نئی آگاہی حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ میں ذاتی طور پر ممتاز مفتی کے تقریباً تمام مطبوعہ افسانوں کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کے ہاں صرف لاشعور کو جاننے کی سعی نہیں ہے بلکہ انہوں نے انسان پر ماحول کے اثرات کا مطالعہ بھی عرق ریزی سے کیا ہے اور اس معاملے میں وہ کسی سماجی حقیقت نگار سے کمزور نہیں پڑتے۔ ان کے افسانے ”غلط ملط“ اور ”افسر“ اس سلسلے کی اہم مثالیں ہیں۔ اسی طرح انہوں نے بعض افسانوں میں مافوق الفطرت عناصر کو بھی استعمال کیا ہے جیسے ”نیلی رگ“ ”الصدف“ اور ”کرن محل کا بھوت“ اور کم از کم ایک افسانے میں مزاحیہ اسلوب کو بے پناہ کامیابی سے برتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ ”آپ بیتی“ میں برتے مزاحیہ اسلوب کو آگے بڑھاتے تو وہ اس سمت بھی بہت اچھے افسانے پیش کر سکتے تھے۔

ممتاز مفتی کی تخلیقی ذات بہت متحرک اور فعال رہی ہے۔ اس بات کا اندازہ ان کی متنوع تحریروں سے بھی لگایا جا سکتا ہے اور اس بات سے بھی کہ انہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی فکر اور سوچ میں آنے والی تبدیلیوں کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ان کو بہت اچھے انداز میں اپنے افسانوں میں سمویا بھی ہے۔ اسلام آباد کی زندگی اور خاص طور پر جدید طرز زندگی کو موضوع بنانے والے ان کے افسانے اس سلسلے کی اچھی مثال ہیں۔ اس بات سے اختلاف کی گنجائش تو نہ ہونے کے برابر ہے کہ ان کا سب سے دلچسپ موضوع کرداروں کی تحلیل اور باطنی زندگی کا

مطالعہ ہے اور اس کے لیے وہ سیدھے سادے بیانیہ اسلوب کو اختیار کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے پہلے مجموعے میں ہی تمثیلی آہنگ کے افسانے جیسے “اندھیرا” بھی موجود ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اپنے کئی افسانوں میں ہندی دیومالا، ہندی ماحول اور ہندی آہنگ کو بھی اچھی طرح استعمال کیا ہے اور اپنے آخری مجموعے میں تو ان کا افسانہ “چوہا” بھی شامل ہے جو علامت نگاری کے اسلوب کی بہت اچھی مثال ہے۔

ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں کی بنیاد کردار پر رکھی ہے۔ ان کے تمام افسانے کسی نہ کسی کی زندگی کے گرد گھومتے ہیں۔ بلکہ زیادہ درست تو یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں عموماً تین اہم کردار ملتے ہیں اور سارا افسانہ ان کرداروں کے آپس کے تعلقات اور ان کرداروں کے ایک دوسرے پر اثرات کا مطالعہ کرتا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ “جھکی جھکی آنکھیں” عذرا، سلیم اور نذر کے باہمی تعلقات کا مطالعہ کرتا ہے اس میں ساس باپ اور طوطا ضمنی کردار ہیں۔ شادی کے بعد عذرا کے تصوراتی مرد اور حقیقی شوہر کے تضاد کا سامنا کر رہی ہے۔ حقیقت اور تصور کا ٹکراؤ افسانے میں اس کشمکش کو سامنے لاتا ہے جس پر اس افسانے کی بنیادیں استوار ہیں۔

“آپا” ان کا بے مثال افسانہ ہے اور خود اپنے اس افسانے کے سحر میں ممتاز مفتی ایک عمر گرفتار رہے ہیں۔ “آپا” کے کردار کے بارے میں پہلا جملہ ہی قاری کو بہت کچھ بتا جاتا ہے لیکن جب رفتہ رفتہ آپا کے کردار کی گرہیں کھلتی ہیں تو اردو فکشن کا ایک اہم کردار جنم لیتا ہے۔ افسانہ کا پہلا جملہ ہے:

> “جب کبھی بیٹھے بٹھائے آپا کی یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے
> چھوٹا سا بلوری دیا آجاتا ہے جو مدھم لو سے جل رہا ہو۔”

اسی طرح ایک اور جملے میں اپنے ایک کردار کو یوں پیش کیا گیا ہے کہ جلے ہوئے اپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے، اوپر سے نہیں دکھتی۔ اس افسانہ میں بھی محبت کی تثلیث ابھرتی ہے۔ آپا تصدق جانی اور باجی، چوتھا کردار آپا کی چھوٹی بہن کا ہے جو افسانے میں بطور راوی کے موجود ہے۔ تصدق آپا اور باجی دونوں کے لیے کشش محسوس کرتا ہے۔ آخر میں وہ باجی سے منہ موڑ کر “آپا” کے پاس آجاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ممتاز مفتی کے ہاں یہ تثلیث بار بار ابھرتی ہے۔ “باجی” وہ افسانہ ہے جس کے کردار، ماحول آپا کی ہی فوٹو کاپی ہیں لیکن انجام مختلف ہو گیا ہے۔ ممتاز مفتی کے افسانوں کے مسلسل مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے ہاں بعض کردار اور واقعات بہت دفعہ دہرائے گئے ہیں۔ “آپا” کے تینوں کردار کئی بار دوسرے افسانوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یا “جھکی جھکی آنکھیں” میں بننے والی محبت کی تثلیث کئی بار ابھرتی

ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ماحول جس میں یہ کردار ایک دوسرے سے Interact کر رہے ہیں، یکساں رہتا ہے۔ قصہ کی صورت حال کے اعتبار سے بعض جملے بھی بار بار دہرائے گئے ہیں۔ کردار، واقعات، ماحول اور جملوں کی کثرت سے دہرانے کے باعث قاری یکسانیت سے اکتانے بھی لگتا ہے۔ مثلاً بانو، نوکرانی کا کردار ہے جو چار پانچ بار آیا ہے اور ہر بار گھر کا مرد اس کو اپنے جذبات کی تسکین کے لیے استعمال کرتا ہے۔ سکول کی استانی جو بالکل میم کی طرح ہے، کا موٹیف بار بار آیا ہے اور جہاں بھی یہ آتا ہے، اس کے ساتھ یہ جملہ ضرور جڑا ہوا ہے۔

> “ایسی ہی ہوتی ہیں یہ سکول والیاں۔”

اسی طرح شادی شدہ عورت کا غیر شادی شدہ اور خود سے کم عمر مرد کے لیے کشش محسوس کرنے کا موٹیف بھی متعدد بار دہرایا گیا ہے۔ ہر تخلیق کار کسی کردار، واقعہ یا صورت حال کے لیے کشش محسوس کرتا ہے اور ان کا ایک سے زیادہ بار افسانوں میں در آنا کوئی عیب نہیں لیکن جس کثرت سے یہ تکرار ممتاز مفتی کے ہاں ہے، وہ یقیناً ایک عیب ہے اور پھر ہر بار پڑھتے ہوئے احساس ہونا کہ اس سے پیشتر اس موضوع اور کرداروں کا حامل افسانہ بہتر تھا، تخلیق کار کی یہ ایسی خامی ہے جس سے گریز لازمی ہے۔

ممتاز مفتی کے افسانوں مین کرداروں کی تحلیل اور ان کے باطن میں جھانکنے اور ان پر لاشعور اور ماحول کے اثرات کا مطالعہ کے بارے میں بات ہو چکی ہے۔ اب ذرا دیکھیں کہ بذاتہ ممتاز مفتی کے کردار ہیں کیا۔ نوخیز لڑکیاں، جوانی کی حدوں میں قدم رکھتے لڑکے، پختہ عمر کی عورتیں اور مرد۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ان کے کردار اپنی دیگر شناخت بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثر اوقات تو ان کے ہاں کرداروں کا پروٹو ٹائپ ملتا ہے جو بار بار ظاہر ہوتا ہے۔ مرد اور نسوانی کرداروں کے تقابل میں ایک بات سامنے آتی ہے کہ ان کے نسوانی کردار جاندار اور فعال ہیں۔ ان کے مقابلے میں مرد کردار دبے دبے محسوس ہوتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے افسانوں میں جو عورت ظاہر ہوتی ہے، وہ چلتر ہے۔ خاوند کے دوستوں کو دیکھ کر اس کی آواز میں لوچ پیدا ہو جاتا ہے۔ چال میں لچک آجاتی ہے۔ مرد حاسد شکی اور تنگ نظر ہیں۔ آگ میں جلتے ممتاز مفتی کے کرداروں میں سوچتا ہوا ذہن نہیں بلکہ دھڑکتا ہوا دل نظر آتا ہے۔ ان کے کرداروں کی باطنی کائنات دل سے عبارت ہے۔ اس میں وہ منطق اور خارجی معروضیت سے آزاد ہیں۔ مفتی کے کردار اپنے ماحول کو نظر انداز کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات اور افعال کی عقلی توجیہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس حوالے سے ممتاز مفتی ہمیں ایسا فن کار نظر آتا ہے جو انسانی زندگی پر عقل کی برتری کو رد کرتا ہے۔ انسانی افعال میں منطقی ربط تلاش کرنے کی

بجائے جذبے کی فسوں کاری کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔

نسوانی کردار تراشتے ہوئے ممتاز مفتی عورت کے بارے میں سٹریو ٹائپ سے بہت کم جان چھڑا پاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنی ابتدائی زندگی میں عورت کا منفی نقش ان کے ذہن میں کندہ ہوا ہے۔ عورت کی یہ تصویر کچھ ان کے افسانوں ہی پر موقوف نہیں بلکہ ان کے ناول “علی پور کا ایلی” میں بھی ایک جاندار مگر اپنی ذات کی اسیر عورت بار بار مختلف ناموں سے ظاہر ہوتی ہے۔ ممتاز مفتی ایسے فنکاروں میں شامل ہوتے ہیں جن کا فکشن ان کے سوانح میں بری طرح پیوست ہے۔ اس لیے ان کے افسانوں میں عموماً اور ناول میں خصوصاً آپ بیتی کا آہنگ جا بجا دکھائی دیتا ہے۔

میں نے اشارہ کیا تھا کہ ممتاز مفتی کے افسانوں میں عورت اور مرد کے رشتے کو دریافت کرنے کی سعی بار بار نظر آتی ہے۔ جہاں جہاں وہ خود کو دہرانے سے بچا سکے ہیں، وہاں انہوں نے اس تعلق کی نئی جہت دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

“سوپور کی کھڑکی” میں میاں اور بیوی رات کو چھپ چھپ کر عاشق اور معشوق کی طرح ملتے ہیں اور انہیں دنیا کی پروا نہیں۔ “شپ” کی جیناں بھی ایسا ہی کردار ہے۔ لوگوں کی باتیں اس کے جذبات کو بھی ابھارتی ہیں۔ وہ قاسم سے طلاق لینے اور مومن سے شادی کرنے کے بعد بھی اپنے گھر کی کھڑکی قاسم کے لیے کھلی رکھتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ قاسم ضرور آئے گا۔ “پل” میں شادی شدہ برجیس اور اقبال اپنے پڑوس میں نئے شادی شدہ جوڑے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ یہاں “پل” علامتی معنوں میں انسان کے لاشعور اور شعور کو جوڑنے کے حوالے سے بھی معنی خیز ہے۔ اس میں جسم اور روح کی کشمکش بھی نظر آتی ہے۔ خاص طور پر یہ بات کہ “جسم کا جال روح کو کیا پھنسائے گا” یعنی ایک سطح پر جسم اور روح کے درمیان کسی پل کی ضرورت کی طرف اشارہ ہے۔ “میاں کی مرضی” میں عورت کی چال بازی ہے کہ وہ کیسے اپنے خاوند کو اپنے دھرے پر لاتی ہے۔ “دودھیا سویرا” ایک ایسی ہی دلچسپ کہانی ہے کہ اس میں چار افراد ایک عورت کی محبت میں گرفتار ہیں اور یہ عورت ان چاروں کے لیے الگ الگ معنویت کی حامل ہے۔ “نفرت” نسوانی کردار کی قلب ماہیت کی روداد ہے جو ایک “جنگلی مرد” کو دیکھنے اور اس کی باتیں سننے کے بعد ہوتی ہے۔ بظاہر “نازلی” “جانگلی” سے نفرت اور بے زاری کا اظہار کرتی ہے لیکن دراصل اس جانگلی کی باتیں اس کی قلب ماہیت کر دیتی ہے۔ شریف، نفاست پسند اور بااخلاق، خوش پوش مرد کی جگہ وحشی دہقان لاشعوری خواہشات کے اعتبار سے “بدمعاش” کی دل آرا پر حاوی ہے۔ اسی طرح اس کوچے کی عورت ایذا دینے والے کو پسند کرتی ہے۔ “گڑیا گھر” میں ایک مضبوط اور بارعب مرد ڈرائیور کی شکل میں ملتا ہے۔ “آراء اور اسمارائیں” میں باپ اپنی بیٹی کو مکمل روپ میں دیکھنا چاہتا ہے اور آخر میں عیسائی ہو جاتا ہے۔ “مسز کھٹلے کا خاوند” اور “موقعہ” کے کردار سوسائٹی کی عام اخلاقی روش سے ہٹے ہوئے ہیں۔

عورت اور مرد کے مابین مختلف النوع کے تعلقات کو اپنا موضوع بنانے کے علاوہ ممتاز مفتی کے ہاں انسانی کرداروں کی دوسری جہات بھی موجود ہے۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے میں دو افسانے “بیگانگی” اور “خلط ملط” بھی شامل ہیں جن کے مرکزی کردار بچے ہیں۔ “بیگانگی” میں رشید کے کردار کی نشوونما کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کسی بچے کو جب اس کے والدین بدصورتی کی بنا پر دھتکارتے ہیں تو اس کا کردار کس طرح مسخ ہوتا ہے، اس کا بہت اچھا مطالعہ رشید کے کردار میں کیا گیا ہے۔ نظر انداز کیا جانے والا بچہ اپنے اندر رقابت، حسد، جارحیت اور شرارت کے عناصر کو کیسے پروان چڑھاتا ہے؟ بچے کے کردار کے مطالعے کے ضمن میں یہ بہت اچھی کہانی ہے۔ “خلط ملط” میں بھی مرکزی کردار بچے کا ہے لیکن یہاں اہم بات یہ ہے کہ بڑوں کی دنیا میں بچے کیسے سیکھتے ہیں اور اس سارے عمل سے دنیا کے بارے میں ان کے تصورات کیسے تعمیر ہوتے ہیں، اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ یقیناً اردو کا ایک نمائندہ افسانہ ہے۔ بچوں کے کردار اور ان کے جذباتی اور جسمانی احساسات کی تفہیم کو انتظار حسین اور بعض دیگر افسانہ نگاروں نے بھی اپنا موضوع بنایا ہے لیکن ان کا نمبر ممتاز مفتی کے بعد کا ہے۔

افسانوں میں “تمثیلی آہنگ” کے استعمال کے بارے میں اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا افسانہ “اندھیرا” ہے جس میں “روغنی پتلے” کے حوالے سے انسانی زندگی کے دو اہم پہلوؤں پر بات ہے۔ ایک یہ کہ ہمیں کس نے اور کیوں پیدا کیا ہے، دوسرا عورت کی موجودگی مرد کے کردار میں کیا تغیر پیدا کرتی ہے۔ مردانہ ٹوپیوں کی دکان میں رکھے ہوئے یہ پتلے اپنی شناخت سر پر رکھی ٹوپی سے کرواتے ہیں۔ ٹوپی کی مناسبت ہی سے پتلوں کے کردار متعین کیے گئے ہیں۔ یہ پتلے آپس میں فکری مسائل پر باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی یہ ان چند افسانوں میں سے ایک ہے جس میں افسانہ نگار نے جذبے کی بجائے عقل کے حوالے سے بات کی ہے لیکن “روغنی پتلے” کا فکری بحث کرنا کہیں اس طرف تو اشارہ نہیں کہ جذبہ ہی انسان کے ہونے کی دلیل ہے اور اگر انسان جذبے کی بجائے عقل کی آنکھ سے دنیا کو دیکھنے لگے تو وہ “روغنی پتلے” میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یوں یہ افسانہ تمثیل کی سطح سے اٹھ کر علامت کی سطح کو چھونے لگتا ہے۔ رات کی تاریکی ان پتلوں کے لیے دن کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ آپس میں تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ زندگی کے رموز و اسرار سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب ان میں ایک عورت کا پتلا شامل ہوتا ہے تو ردعمل کچھ یوں ہے:

"ناری۔ ناری کون ہے؟" نائٹ کیپ والے نے پوچھا۔ پھر اس کی نگاہ عورت کے پتلے پر جا پڑی۔ "ارے میرے اللہ۔ تم کون ہو؟" وہ بھاگ کر آگے بڑھا۔ "افوہ۔ میں سمجھا۔ اب میں سمجھا تم زندگی کا بھید ہو۔"
وہ عورت کے سامنے جھک گیا۔

آپ نے دیکھا کہ جہاں بھی زندگی اور انسانی زندگی کی بات ہے' جذبہ اثر دکھاتا ہے اور ایسے ہر مقام پر ممتاز مفتی کے ہاں مرد کردار عورت کے آگے جھکا نظر آتا ہے۔ "روغنی پتلے" کے عنوان کے افسانے میں انہوں نے اس تمثیل کو ایک بار پھر سے استعمال کیا ہے۔ اب ٹوپیوں کی دکان کی جگہ شہر کا "ایسٹ شاپنگ سنٹر" لے لیتا ہے۔ یہاں وہ ہمیشہ جدید طرز زندگی اور اس میں عورت کے کردار پر طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آخر میں جب پورے ملک کے لوگ "روغنی پتلے" میں ڈھل جاتے ہیں تو اس افسانے کا افق پھیل جاتا ہے اور اس کی تشریح ہم ایک سے زیادہ سطحوں پر کرسکتے ہیں۔

"اگلے روز ساڑھے نو بجے جب معزز مہمان آرکیڈ میں داخل ہوئے تو صدر دروازے کے اوپر فیشن آرکیڈ کی جگہ پاکستان آرکیڈ کا بورڈ لگا تھا۔ اندر دروازے کے عین سامنے اچکن والا بڑے طمطراق سے کھڑا تھا۔ اس کے پاس ہی دائیں طرف رومی ٹوپی والا اپنا پھندنا جھلا رہا تھا۔ بائیں ہاتھ طرہ باز مونچھ کو تاؤ دے رہا تھا۔ قریب ہی بچے کو انگلی لگائے چادر میں لپٹی ہوئی خاتون بچے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس سے پرے کرتے پاجامے والا چھاتی پھلائے استادہ تھا"

"ساڑھی والی لمبا چغہ لٹکائے نگاہیں جھکائے لجا رہی تھی۔
سی تھرو جیمپٹ کا گھگھرا پہنے سر پر پانی کی گاگر رکھے قدم اٹھائے کھڑی تھی۔
سگریٹ والی چست پاجامہ پہنے بازو پر جدید لمبا لوٹ اٹھائے مسکرا رہی تھی۔"

اپنے پہلے افسانوی مجموعے "ان کہی" ہی سے ممتاز مفتی نے انسانی زندگی میں مافوق الفطرت واقعات کے وجود کا اقرار کرنا شروع کیا تھا۔ "کرن محل کا بھوت" میں ایک نوخیز نوجوان اپنے گاؤں کے پاس اجڑے محل کی کھڑکی میں ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھتا ہے جو اسے آوازیں دے کر اپنی جانب متوجہ کر رہی ہے۔ آخر میں محل کا چوکیدار "کرن" کو محل کا بھوت قرار دیتا ہے اور کرن کو سارا محل خود پر ہنستا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ "الصدف" میں یہ محل ایک بار پھر ظاہر ہوتا ہے۔ "میں" اپنے دوست اسد کے خط کے جواب میں جلد از جلد واپس گھر پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اپنی بیوی "بیگم" کے بارے میں جان سکے کہ وہ اس سے سچی محبت کرتی ہے یا نہیں لیکن راستے میں رات پڑ جاتی ہے تو ایک بوڑھے کی رہنمائی میں وہ ایک قلعہ نما مکان میں چلا جاتا ہے۔ جہاں ایک تمثیل دکھائی گئی ہے جس میں ایک عورت اپنے خاوند سے چھپ کر اپنے محبوب

سے ملتی ہے۔ تمثیل ختم ہوتی ہے تو وہی بوڑھا اسے محل سے باہر لے آتا ہے اور جب وہ بوڑھا بھوت کہہ کر غائب ہو جاتا ہے تو نہ وہاں محل ہے نہ کوئی شخص۔ بس ایک ویرانہ ہے۔ یہاں ہمیں داستانوں کی جھلک نظر آتی ہے جہاں طلسم کے ٹوٹنے کے بعد خوب صورت محل اور باغ کی جگہ بس ویرانہ رہ جاتا ہے اور آخر میں افسانہ ایک خوب صورت موڑ پر ختم ہو جاتا ہے۔ قریبی قصبے کا ایک فرد بتاتا ہے کہ مکان کا مالک نواب اور اس کا خاندان بجلی کوندنے سے مر گئے۔

"تباہ ہو گیا۔" میں نے دہرایا۔

"ہاں۔ جب سے یہ محل نما مکان ویران پڑا ہے۔"

"صاحب ساری رات نہ جانے کیا کیا چیخ پکار سنائی دیتی ہے۔ کبھی کوئی آزاد آزاد چیختا ہے۔ کبھی بیگم بیگم اور کبھی قیدیوں کو آزاد کر دو۔" بیرا بولا۔

یہاں "بیگم" اور "آزاد کر دو" افسانے میں دوہری معنویت پیدا کر دیتے ہیں اور اس کو سمجھنے کے لیے بھی ہمیں ممتاز مفتی پر لاشعور کی چھاپ کو سامنے رکھنا ہوگا۔ "نیلی رگ" میں ایک عورت کی زندگی پر بازو کی رگ کے ابھرنے اور مٹنے کے خیال کو افسانے میں ڈھالا گیا ہے جو اس عورت سے وابستہ مردوں کی قسمت کا فیصلہ وقت سے پہلے سنا دیتی ہے۔

عورت اور مرد کے باہمی تعلق کو ممتاز مفتی نے عمومی جذبے سے ہٹ کر بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً "لیڈی ڈاکٹر" میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ انسان ہمیشہ ہاتھ نہ آنے والی چیز کی خواہش میں تڑپتا رہتا ہے۔ "محلّہ" کی چاچی اپنی حکمت عملی سے اپنی بیٹی کی شادی منظور سے کرواتی ہے۔ اگرچہ یہ منظور کی دوسری شادی ہے لیکن یوں وہ اپنی ہاری ہوئی جنگ جیت لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ "وہ ہاتھ" میں ایک آرٹسٹ صرف ہاتھوں کے عشق میں گرفتار ہو کر سرگرداں پھرتا ہے۔ "ماں" وہ واحد افسانہ ہے جہاں ہمیں ممتاز مفتی کے ہاں عورت حیوانی سطح سے اٹھ کر ایک بلند سطح پر دکھائی دیتی ہے۔ مادرانہ جذبہ عورت کے کردار پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے' اس کا مطالعہ "ماں" میں کیا گیا ہے۔ "ممتا کا بھید" میں اس موضوع کو ذرا وسیع پس منظر میں بیان کیا گیا ہے کہ عورت ماں بن کر تکمیل پاتی ہے اور ناری کے درجے سے آگے نکل جاتی ہے۔

"سمے کا بندھن" میں ممتاز مفتی نے عورت کی بنیادی فطرت کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے کہ اس کا کام دیکھنا ہے' دکھنا ہے اور اس کے لیے وہ طوائف کے کوٹھے کو اسٹیج کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہی موضوع بعد میں "دیکھن دکھن" میں تمثیلی آہنگ میں ظاہر ہوا ہے۔

اپنی تقریباً ساٹھ سالہ افسانہ نگاری کی زندگی میں ممتاز مفتی نے عورت اور مرد کے

تعلقات کے علاوہ سماجی موضوعات پر بھی افسانے تحریر کیے ہیں۔ ''افسر'' میں انہوں نے عہدے میں تبدیلی کے مرد کی شخصیت پر اثرات کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے موضوع اور اسلوب بیان کے اعتبار سے یہ بہت جاندار افسانہ ہے۔ ''غسل آفتابی'' میں بے لبادہ دھوپ میں لیٹنے کا عمل ''میں'' کے باطن میں بھی تبدیلی پیدا کرنے لگتا ہے۔ ''مورا'' میں مولوی صاحب اپنے ماحول کے زیر اثر اس راہ پر چل پڑتے ہیں جس سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ یہاں جذبہ انسان کے تصورات پر فتح پاتا ہے۔ ''دوراہا'' ایک تمثیلی کہانی ہے جس میں ''پریم نگر'' اور ''عقل پور'' جانے والے مسافر بار بار بھول کر اس نگر جا نکلتے ہیں جہاں کے لیے وہ گاڑی میں سوار نہیں ہوئے۔ ''لکھ پتی'' اس کھیل کا بیان ہے جو دولت انسان کے ساتھ کھیلتی ہے۔ ''چار گوٹ'' میں علامتی انداز میں دنیا کی حکایت بیان کی گئی ہے۔ ''چکٹ گاڑی، ہونکتا موٹر اور موم بتی'' میں مزدور طبقے کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کہانی میں مزدوروں کی محرومیوں اور ان کی بے بسی کو اچھی طرح گرفت میں لیا گیا ہے۔ ''گھور اندھیرا'' فسادات کے پس منظر میں رونما ہونے والے انسانی المیے کا بیان ہے۔ جدید زندگی اور اس کے انسانوں پر اثرات کے بیان پر ''ایلینز'' ''بلیک پاٹ'' اور ''آدھے چہرے'' بہت کامیاب کہانیاں ہیں۔

بنت کے اعتبار سے مفتی کے افسانے زیادہ تر سیدھے خط پر سفر کرتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ ان کی تخلیقی ذات پر سوانحی واقعات کا اثر ہے۔ زمان و مکان کے اعتبار سے ان کے ہاں حرکت بہت کم ہے۔ اکثر پورے افسانے میں مکان ساکن رہتا ہے اور زبان میں معمولی تغیر ہوتا ہے۔ اسوں نے اپنے افسانوں میں زبان موضوع کی مناسبت سے استعمال کی ہے۔ جہاں جدید زندگی کا بیان ہے، وہاں انگریزی کے لفظ بلکہ پورے پورے جملے آئے ہیں۔ جو کہانی جس ثقافتی آہنگ میں ہے، اس کی زبان بھی اسی مناسبت سے ہے۔ اپنے زیادہ تر افسانوں میں ایک دائرے میں رہنے کے باوجود ان کے ہاں بہت کامیاب اور بھرپور افسانے ملتے ہیں۔ افسانوی مجموعوں کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مجھے ان کا پہلا مجموعہ ''ان کہی'' سب سے زیادہ جاندار نظر آتا ہے۔ ان کے بعد کے مجموعوں میں کامیاب افسانوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ جو تنوع پہلے مجموعے میں ہے، وہ تقریباً ان کی ساری تخلیقی زندگی کا احاطہ کرتا ہے لیکن ایک بات کا احساس ہمیں ان کے آخری مجموعے تک ہوتا ہے کہ وہ نئے اثرات قبول کرنے کے لیے زندگی کے آخری سانس تک تیار تھے اور اس معاملے میں اردو کا شاید ہی کوئی اور افسانہ نگار ان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

**امجد طفیل**